besturdubooks.wordpress.com
اسلامک اکیڈمی مانچسٹر کی لاجواب نادر علمی پیش کش
آثار الحدیث
جلد دوم
عنوانات:
لفظ حدیث
تاریخ حدیث
موضوع حدیث
ضرورت حدیث
مقام حدیث
اخبار حدیث
قرآن الحدیث
حجیت حدیث
حفاظت حدیث
تدوین حدیث
رجال حدیث
شیعہ اور علم حدیث
اسلوب الحدیث
امثال حدیث
غریب الحدیث
تالیف
ڈاکٹر علامہ خالد محمود
ڈائریکٹر اسلامک اکیڈمی مانچسٹر
دار المعارف
الفضل مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

اسلامک اکیڈمی مانچسٹر کی لاجواب نادرِ علمی پیش کش
آثار الحدیث
جلد دوم
عنوانات
آداب الحدیث قواعد الحدیث اقسام الحدیث متون الحدیث
شروح حدیث تراجم حدیث ائمہ حدیث فقہاء حدیث
ائمہ جرح و تعدیل ائمہ تالیف ائمہ تخریج
اہل حدیث منکرین حدیث مدارس حدیث
تالیف
ڈاکٹر علامہ خالد محمود
ڈائریکٹر اسلامک اکیڈمی مانچسٹر
دار المعارف
الفضل مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

اصل دین آمد کلام اللہ معظّم داشتن پس حدیث مصطفےٰ بر جان مسلّم داشتن

اشاعت اوّل	۱۹۸۸ء
تعداد	۵۰۰
کتابت	حنیف الحق صدیقی
ناشر	دار المعارف لاہور
قیمت	-/۹۰ روپے

19 CHARLTON TERRACE OFF UPPER BROOK STREET
MANCHESTER - U.K.

عابد محمود ناظم دار المعارف
الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور

فہرست

آداب الحدیث

قواعد الحدیث

اقسام حدیث

متونِ حدیث

شروح حدیث

تراجم حدیث

ائمہ حدیث

دورِ صحاح کے دیگر اکابر محدثین

تالیفِ حدیث نئے دور میں

اہل الحدیث

منکرین حدیث

مدارسِ حدیث

پیش لفظ

اَلحَمدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِینَ اصطَفٰی اما بعد

آثار الحدیث جلد اوّل کو شائع ہوئے تین سال ہو رہے ہیں اور جلدِ ثانی ابھی تک پریس سے باہر نہیں آئی۔ کتنی مشتاق نگاہیں اس کی منتظر اور کتنے خوش عقیدت اس کے لئے بیتاب ہیں۔ اِس کا اندازہ وُہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے آثار الحدیث جلد اوّل کی خُداداد مقبولیت کو دیکھا ہے یا طالبین کے پچھلے دو سال کے خطوط جو انہوں نے دار المعارف کے نام لکھے کہ جلدِ ثانی کب منصۂ شہود پر آ رہی ہے۔ آنکھوں دیکھے ہیں۔

اِس تاخیر کی وجہ یہ نہیں کہ یہ کوئی نئی تالیف ہے جس نے تین سال اور لے لئے نہیں۔ اِس کی ایک وجہ ادارہ دار المعارف کے نظام کی تبدیلی ہے۔ ناظم صاحب اسے پُورا وقت نہ دے سکے تھے اور راقم الحروف کا جنوبی افریقہ کا طویل سفر بھی اِس کی وجہ وجیہہ بنا۔ جو سفر دنوں کی نیّت سے اختیار کیا گیا تھا مہینوں تک جا پہنچا اور پھر ادارہ کی مالی کمزوریاں بھی کچھ اِس میں حائل رہیں۔ کراچی کے آتشزدگی کے واقعات اور کاغذ کی ہوش رُبا گرانی بھی اِس میں وجۂ تعویق رہی ورنہ کتاب کا مسوّدہ تو اُس وقت کی یادگار ہے جب احقر ابھی عازمِ انگلستان نہ ہُوا تھا۔

یہ جلدِ ثانی جن مضامین پر مشتمل ہے ان میں سے بعض برسوں پہلے مُلکی اور غیر مُلکی رسائل وجرائد میں منت پذیرِ اشاعت ہو چکے ہیں۔ جلدی محض اِس لئے ہُوئی کہ یہ علمی امانت جتنی جلدی ہو سکے اپنے اہل حضرات تک پہنچ جائے ورنہ ظاہر ہے کہ بالاقساط اشاعت سے کتاب کی اشاعت کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ جلدِ ثانی کا پہلا مضمون

آداب الحدیث ماہنامہ الرشید ساہیوال میں کئی قسطوں میں شائع ہوا تھا اُس وقت کے شیخ الجامعہ حضرت مولانا محمد عبد اللہ رائپوری خلیفۂ ارشد حضرت شاہ عبد القادر رائپوری قدس سرہ نے اِس کی جن الفاظ میں قدردانی اور حوصلہ افزائی فرمائی اس پر راقم الحروف اللہ ربّ العزّت کے حضور سجدۂ شکر کیے بغیر نہ رہ سکا۔ علمی ذخائر میں بکھرے ہوئے مضامین کو ایک مضمون کی مناسبت سے اِس مختصر رسالے میں لے آنا خاص توفیقِ ایزدی کے بغیر کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اب یہ مضمون یکجا آپ کے سامنے ہے اور جلدِ ثانی کی یہ پہلی کتاب ہے۔

حدیث کے یہ آداب، اسے حاصل کرنے کے یہ التزامات اور اسے پڑھنے پڑھانے کے یہ احترامات کس لئے ہیں؟ محض اِس لیئے کہ حدیث کا منتہیٰ ذاتِ رسالت ہے۔ یہیں آکر سندیں ختم ہوتی ہیں اور یہی متن میں حرفِ آخر ہے۔ قرآنِ کریم بھی اِسی کی روشنی میں سمجھا جائے گا اور تسلسلِ اُمّت بھی اسی کی روشنی میں راہ پائے گا اور حق یہ ہے کہ جس بات اور عمل کی نسبت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے ہو گئی اُس کا ہر جہت سے اکرام ضروری ہے۔ آداب الحدیث کی ساری ہدایات اِسی ایک نقطہ کے گرد گھومتی ہیں۔ صحابہ اہلِ بیت اور عترت رسول سب اس لیے کرام وعظام ہیں کہ وہ آپ سے نسبت پائے۔

علمِ روایت یُونہی نہیں جمع ہو گیا اِس کی تحقیق وتثبیت میں وُہ تمام پہلو ملحوظ رکھے گئے ہیں جو درایت چاہتی ہے۔ انسان کسی بات کے ہونے یا نہ ہونے کی فطری طور پر کن کن طریقوں اور کس کس انداز سے تحقیق کر سکتا ہے؟ انہیں عقل وتجربہ اور فہم وبصیرت سے ہی طے کیا جا سکتا ہے محض نقل سے نہیں۔ سو یہ درایت ہے جس نے روایت کو اصُول بخشے۔ مغربی تعلیم کے وُہ حلقے جنہیں ارمغانِ مشرق نہیں ملا اور نہ انہیں دیوبند جیسی کسی درسگاہ میں تحقیقِ حدیث سُننے کی نوبت آئی ہے وُہ ہمیشہ یہ کہتے سُنے جاتے ہیں کہ عُلماء روایت میں درایت سے یکسر خالی ہو کر چلتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ وُہ نہیں جانتے

کہ علمِ حدیث جن قواعد پر مرتّب ہُوا ہے صِرف ان کے اصُول نقل سے ماخوذ ہیں۔ روایت کا ردّ و قبول اور اس کی تحسین و تضعیف ہمیشہ ان تجربات اور ضابطوں سے ہی طے ہُوئی ہے جو انسانی فکر و فراست اور تجربہ و دانش نے تجویز کئے تھے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ اِن تجربات اور ضابطوں نے آگے نقل کی صُورت اختیار کر لی کیونکہ ہر آنے والے نئے مفکّر کو نئے سرے سے ضابطے طے کرنے کی اجازت نہ دی جا سکتی تھی۔ یہ اِس لئے نہیں کہ علمائے حدیث اصُولِ درایت کے خلاف تھے بلکہ اِس لئے کہ ہر نئے مجتہد کی فکر و ذکاوت سے متاثر ہو کر پُوری قوم کی تاریخ بدلی نہیں جا سکتی اور اصُولِ حدیث کے پہلے طے ہونے والے ضابطوں کو ہمیشہ کے لئے متزلزل اور محلِ ترمیم نہیں ٹھہرایا جا سکتا ورنہ قوم کو اپنی علمی تاریخی میں کبھی اور کہیں نقطۂ یقین میسّر نہ آسکے گا۔ ہاں یہ بات صحیح اور درست ہے کہ روایت کے گرد ہمیشہ درایت نے پہرہ دیا ہے۔ پہرہ سند کے گرد ہو تو قواعدِ حدیث کا موضوع ہو گا اور متن کے گرد ہو تو اس سے فقہ کی راہ کھُلے گی۔ آدابِ حدیث کی صحیح قدر کے لئے قواعدِ حدیث پر نظر کرنا بھی ضروری ہے۔ قواعد سے اس کا ثبوت ملتا ہے اور آداب سے اسکے حقوق طے ہوتے ہیں۔

قواعدِ حدیث سے حدیث کی قسمیں ہُوئیں اور اقسامِ حدیث کا عنوان قائم ہُوا۔ محدّثین نے اس باب میں اِتنی کاوشیں کیں کہ ہر صادق کاذب سے اور ہر حافظ و ضابط مُخطیٔ اور ناسی (بھُولنے والے) سے ممتاز ہوتا گیا اور پھر اِن رواۃ و طبقات کے اتنے تراجم لکھے گئے کہ اب سندِ حدیث اپنے وجُود و ثبوُت میں کسی مزید درایت کی محتاج نہ رہی اور حدیث اپنی مختلف قسموں سے پھر نقل و خبر کی راہ پر آگئی اور طلبہ اقسامِ حدیث میں بصیرت حاصل کر کے نئے سرے سے جانچ اور پڑتال کی زحمت اُٹھانے سے بچ گئے۔

پھر یہ اقسام صِرف علمی حدود تک محدود نہ رہیں۔ محدّثین نے کُتُبِ حدیث ان اقسام پر مرتّب کر ڈالیں۔ صحیح بخاری اور صحیح مُسلم ایک خاص درجے کی صحیح احادیث کے ستُون ہیں۔

پھر امام ابو عبدالرحمٰن النسائی اور امام ابو عوانہ اسفرائینی کچھ اس شان ثقاہت سے چلے امام ترمذی روایات کے ساتھ ساتھ ان کی اقسام بھی ذکر کرتے گئے اور محدثین کی اس محنت نے آنے والے طلبۂ حدیث کو اس باب میں بھی کافی حد تک مزید گرد پیمائی سے بچالیا ہے۔ متن کی گہرائی میں امام ابو داؤد اور امام طحاوی مجتہدانہ شان سے چلے ہیں

یہ محنت سمٹ کر کتب حدیث میں جمع ہوئی اور پھر یہ کتابیں سبقاً پڑھی پڑھائی جانے لگیں۔ ان میں پھر فنی مباحث اُچھلے اور معارف و معانی نکھرے تو ان تحقیقات و تدقیقات نے شروح کی شکل اختیار کی۔ آج حدیث کی مشکلات میں یہی شروح ہیں جو چراغِ راہ کا کام دیتی ہیں اور ضروری ہے کہ شروحِ حدیث کو ایک مستقل عنوان دیا جائے اور جو طلبہ عربی نہیں جانتے اُن کے لئے تراجم حدیث ایک عنوان کے تحت ذکر کر دیے جائیں۔

اس ماحول میں اردو اور انگریزی تراجم کفایت کرتے ہیں۔ بنگلہ کے تراجم ان کے علاوہ ہیں

ان عظیم کاوشوں میں خراجِ تحسین محدثین کو جاتا ہے۔ جو قوم اپنے محسنوں کی شکر گزار نہ ہو وہ خدا کی شکر گزار کیسے ہوگی۔ پس ضرورت ہے کہ آثار الحدیث میں ائمہ حدیث کو بھی ایک مستقل عنوان کے تحت ذکر کیا جائے۔ احقر کی یہ ایک پرانی تالیف ہے جو عرصہ سے نایاب تھی۔ الحمد للہ کہ اب یہ پھر سے ہدیۂ قارئین ہے۔ ائمہ حدیث بہت سے ذیلی موضوعات پر مشتمل ہے ہم نے ان کو مستقل عنوانوں سے فہرست میں جگہ دی ہے تاکہ طلبہ کو جس باب سے دلچسپی ہو انہیں اُن کی ضرورت کا مواد اس عنوان کے تحت مل سکے۔ مجتہدین کرام، ائمہ جرح و تعدیل، ائمہ تالیف اور ائمہ تخریج تقریباً سبھی اس میں آگئے ہیں۔

ناظرین حیران نہ ہوں کہ حدیث کے ان مباحث میں ہم نے صرف دو فرقوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ (۱) جماعت اہلحدیث اور (۲) منکرین حدیث۔ دیگر کسی حلقے کے علماء کو ہم نے کسی مستقل عنوان سے ذکر نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علماء حدیث کے دیگر حلقوں کی اپنی کوئی راہ نہیں۔ وہ مذاہب اربعہ کے قدماء محدثین کی روش پر

چلے ہیں اور اُن قدماء کا ذکر ہم ائمہ حدیث کے تحت پہلے کر چکے ہیں۔

حالات کے تطور میں حدیث کی نسبت سے یہی دو طبقے اِس نئے ماحول کی پیداوار ہیں اور ان کا عوامی تعارف رداً ہو یا قبولاً حدیث کی نسبت سے ہی ہوا ہے۔ سو ہم نے اہلِ حدیث (باصطلاح جدید) اور منکرینِ حدیث کو اِس جلدِ ثانی میں مستقل عنوانوں سے جگہ دی ہے۔ جماعت اہلحدیث سے ہمیں تحقیقاتِ حدیث میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو لیکن اِس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پچھلی صدی میں اپنی بے بضاعتی کے باوجود حدیث کے جھنڈے اِنہی لوگوں نے قریہ قریہ اور شہر شہر اُٹھائے ہیں۔ اُس وقت نہ اُنہیں کوئی بیرونی امداد حاصل تھی جس کے سہارے ان کی بڑی بڑی بلڈنگیں اور تنظیمیں بنی ہوں۔ بس ایک ولولہ اور جذبہ تھا جو اُن کے عوام کو ہر جگہ تراجم حدیث اُٹھائے لئے پھرتا تھا۔ مَیں سچ کہتا ہُوں کہ برّصغیر پاک و ہند میں اگر ترکِ تقلید کی ہوا نہ چلتی تو علمائے دیوبند بھی شاید اور رنگ زیبؒ سے ذرا آگے نہ بڑھتے۔ مولانا محمدؒ حسین بٹالوی دس سوال لکھ کر دیوبند نہ بھیجتے تو حضرت شیخ الہندؒ کی ایضاح الادلہ جیسی علمی کتاب کب منصۂ شہود پر آتی۔ یہ اِنہی حضرات کی تگ و دو تھی جس کے باعث عالمِ اسلام حدیث کے اعلاء السنن جیسے عظیم علمی ذخیرہ سے بہرہ یاب ہُوا۔

پھر منکرینِ حدیث بھی اِس پہلو سے لائقِ ستائش ہیں کہ اُنہوں نے حدیث کی جڑوں کو ہی چیلنج کر دیا۔ اگر یہ نہ ہوتے تو شاید ہمیں بھی ضرورتِ حدیث، حجیتِ حدیث اور تدوینِ حدیث جیسے رسائل نہ لکھنے پڑتے۔ عدُو شرے بر انگیزد کہ خیر ما دراں باشد کے تحت اِن لوگوں کی حدیث پر یلغار بڑھتی گئی اور ہماری اِن ابواب میں تحقیق کی رفتار بڑھتی گئی۔ سو انصاف کا تقاضا تھا کہ اِس دَور میں جن طبقوں کا تعارف حدیث کے نام سے ہُوا ہے وہ اہلِ حدیث ہوں یا منکرینِ حدیث انہیں مستقل عنوانوں سے ذکر کیا جائے اور اِس سے بھی ہمارا مقصد صرف اُن کا تاریخی تعارف ہے کسی سے کوئی دِل لگی نہیں۔ ہاں

یہ ضرور ہے کہ منکرین حدیث کے مقابلہ میں ہم حدیث کو حجت ماننے والے ایک ہیں اور ہمارا آپس کا فقہی اختلاف اس مرحلے میں ہمیں ایک دوسرے سے دور نہیں رکھتا۔

فقہی اختلاف میں ہمیں صحابہ کی روش اختیار کرنی چاہئیے علماء حقیقت میں یہی لوگ تھے اور بقول حافظ ابن تیمیہ (۷۲۸ھ) یہی بر و بحر کی تاریکیوں میں روشنی کے چراغ تھے۔

جعلهم الله بمنزلة النجوم يهتدى بهم فى ظلمات البر والبحر وقد اجمع المسلمون على هدايتهم ودرايتهم (رفع الملام عن الائمة الاعلام)

یہ حضرات کئی فقہی مسائل میں آپس میں مختلف تھے لیکن کبھی ایک دوسرے کی تضلیل و تفسیق نہ کرتے اس اختلاف کو وسعت عمل اور رحمت امر سمجھتے ان مسائل پر کبھی جماعت بندی نہ کرتے اور اختلاف عمل کے باوجود وحدت امت کی رسی کبھی ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹتی تھی۔

سیدنا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ ہم امام کے پیچھے ہوں تو کیا سورت فاتحہ پڑھ لیا کریں؟ آپ نے فرمایا اپنے جی میں پڑھ لیا کرو لفظاً پڑھنے پر اصرار نہ فرمایا نہ یہ کہا کہ اس کے بغیر امام کے پیچھے بھی نماز نہ ہوگی۔ وہ جانتے تھے کہ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فتوے دیتے ہیں کہ جو شخص امام کے پیچھے سورت فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ہو جاتی ہے (موطا امام مالک جامع ترمذی جلد ۱ ص ۴۲) حضرت عبداللہ بن عمر رکوع کے وقت رفع یدین نہ کرتے (طحاوی شریف) مگر حضور کے رفع یدین کو روایت کرنے میں انہیں کوئی جھجک نہ تھی یہ اگلے علماء کا کام ہے کہ وہ ان میں تطبیق کی راہیں تلاش کریں صحابہ اس وسعت عمل میں خود ایک ذہنی راحت محسوس کرتے تھے ــــــ ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر صبح کی نماز کے لیے مسجد میں آئے دیکھا کہ جماعت کھڑی ہے دونوں نے ابھی سنتیں نہ پڑھی تھیں حضرت عبداللہ بن عمرؓ آتے ہی جماعت میں مل گئے لیکن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے پہلے سنتیں پڑھیں پھر امام کے ساتھ ملے حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرضوں سے فارغ ہو کر وہیں بیٹھے رہے یہاں تک کہ سورج نکل آیا اور پھر آپ نے وہ دو رکعت ادا کیں۔ اس ماحول سے پتہ چلتا ہے کہ ایسے فقہی مسائل میں وہ کبھی ایک دوسرے پر نکیر نہ کرتے تھے اگر اسلام میں اس قسم کے اختلاف کی گنجائش نہ ہوتی تو وہ کبھی نہی عن المنکر سے باز نہ رہتے حافظ ابن تیمیہؒ نے ان کے اختلاف عمل کا یہ محاکمہ کیا ہے

فان السلف فعلوا ھٰذا وھٰذا وکان کلا الفعلین مشھوراً بینھم - کانوا یصلون علی الجنازۃ بقراءۃ وبغیر قراءۃ کما کانوا یصلون تارۃً بالجھر بالبسملۃ وتارۃ بغیر جھر بھا وتارۃً باستفتاح وتارۃً بغیر استفتاح و تارۃ برفع یدین فی المواطن الثلاثۃ وتارۃ بغیر رفع الیدین وتارۃً یسلمون تسلیمتین وتارۃً تسلیمۃً واحدۃ وتارۃ یقرؤن خلف الامام بالسر وتارۃً لا یقرؤن وتارۃ یکبرون علی الجنازۃ اربعاً وتارۃ خمساً وتارۃً سبعاً۔ کان فیھم من یفعل ھذا وفیھم من یفعل ھٰذا - کل ھٰذا ثابت عن الصحابۃ رضی اللہ عنھم (فتاوےٰ ابن تیمیہؒ جلد ۲۴ صہ ۱۹۷)

(ترجمہ) سلف صالحین نے اس پر بھی عمل کیا اور اُس پر بھی عمل کیا ہے اور دونوں طریقے ان میں مشہور و معروف تھے بعض نماز جنازہ میں قراءت کرتے اور بعض نہ کرتے تھے۔ کبھی بسم نماز میں اونچی آواز سے پڑھتے اور کبھی اسے بغیر جہر کے پڑھ لیتے۔ افتتاح کبھی پڑھ لیتے کبھی نہ ــــ رکوع میں جاتے رکوع سے اٹھتے اور تیسری رکعت شروع کرتے کبھی رفع الیدین کرلیتے اور کبھی نہ کرتے، نماز پوری ہونے پر کبھی دونوں طرف سلام پھیرتے اور کبھی ایک طرف پر ہی اکتفا کرتے ــــ کبھی امام کے پیچھے قراءت کرلیتے اور کبھی امام کے پیچھے قرآن بالکل نہ پڑھتے ــــ نماز جنازہ پر چار تکبیریں بھی کہہ لیتے پانچ اور سات بھی ــــ سلف میں ان میں سے ہر طریقے پر عمل کرنے والے تھے اور یہ سب طریقے عمل صحابہ سے ثابت ہیں۔

ان اختلافی مسائل میں اگر صرف ایک راہ حق ہوتی تو ان حق پرستوں میں یہ اختلاف عمل نہ ہوتا اس سے واضح ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کے ہاں ان فقہی مسائل میں کسی ایک کی تعیین ضروری نہ تھی ائمہ اربعہ کے مقلدین بھی پھر اسی طرز پر چلے ہیں کہ اپنے اپنے مسلک کو راجح سمجھنے کے باوجود کبھی کسی نے دوسرے کو باطل پر نہیں کہا نہ ائمہ کے باہمی اختلاف کو کہیں حق و باطل کا فاصلہ بتایا سو جو کام صحابہ کے دور میں نہیں ہوا وہ آج بھی دین کا تقاضا نہیں ہوسکتا صحابہ نے اس اختلاف مسالک پر نہ کبھی جماعت بندی کی نہ ان اختلافات کو کبھی موضوع دعوت بنایا نہ کبھی کوشش کی کہ ان میں کوئی فروعی اختلاف نہ رہنے پائیں۔

یہ فروعی اختلافات قرآن کریم کے حکم اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ (پ ۲۵ الشوریٰ) کے تحت نہیں آتے صاحب روح المعانی علامہ محمود آلوسی ؒ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں :۔

ولا یشمل هٰذا النهی الاختلاف فی الفروع فانها لیست من الاصول المرادة هنا ولم یتحد بها النبیّون ۔[1]

ترجمہ:۔ یہ نہی کہ دین قائم کرنے میں آپس میں اختلاف نہ کرو اس اختلاف کو شامل نہیں جو فروع میں ہوتا ہے

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ائمہ اربعہ کے حق ہونے پر امت صدیوں سے متفق چلی آرہی ہے تاہم آپ نے قرون وسطی میں کہیں نہ دیکھا ہوگا کہ اسلامی دنیا میں کبھی حنفی مالکی اور شافعی حنبلی مسالک عمل پر کوئی جماعت بندی ہوئی ہو یہ سب مسالک اصول واعتقاد میں صرف ایک جماعت اہل سنت والجماعۃ ہیں اور یہ فروعی اختلافات امت کے وسعت عمل کی مختلف راہیں ہیں جو اس امت میں ہمیشہ رحمت سمجھی گئی ہیں ۔ افسوس کہ آج ہماری صفوں میں فروعی مسائل پر جماعت بندی ہونے لگی ہے اور یہ وہ بدعت ہے جو عہد صحابہ میں نہ تھی ظاہر ہے کہ جو چیز صحابہ کے عہد میں نہ ہو وہ کبھی ہمارا دین نہیں ہوسکتی جلیل القدر صحابی حضرت حذیفہ بن الیمان ۳۶ھ فرماتے ہیں

کل عبادۃ لم یتعبدها اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فلا تعبدوها[2]

(ترجمہ) دین کا ہر وہ عمل جسے صحابہ نے دین نہیں جانا تم اسے دین نہ سمجھنا

یہ سوال نہ کیا جائے کہ جب حنفی شافعی نام پر مسلمانوں میں کوئی جماعت بندی نہیں تو اہل حدیث حضرات نے فروعی مسائل پر کیوں علیحدہ جماعت بنا رکھی ہے تاریخ اسلام میں یہ پہلا گروہ ہے جس نے مختلف فقہی مسالک میں وسعت عمل کی لائن چھوڑ کر فروعات میں بھی صرف ایک ایک راہ کو حق سمجھ رکھا ہے ، یہ اسلیئے کہ یہ کوئی عالمی جماعت نہیں ہے ان کا تعارف صرف برصغیر پاک و ہند میں ہی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی ایک معین مسلک نہیں جسکی باقاعدہ تدوین ہوئی ہو یہ کوئی باقاعدہ مسلک ہوتا تو دنیا کے ہر خطے میں پایا جاتا غیر عالم عامی کا ترک تقلید کا نعرہ دوسرے کسی اسلامی ملک میں نہیں سنا گیا اور نہ عرب ممالک میں کسی ملک کے ذمہ دار مفتی صاحبان نے تقلید ائمہ اربعہ کو گناہ کہا ہے ۔

مطالعہ حدیث میں صحابہ کے فروعی اختلافات ان میں وسعت عمل اور ائمہ اربعہ کے مختلف مسالک

---

[1] روح المعانی جلد ۲۵ صہ ۲۱ [2] الاعتصام للشاطبی جلد ا صہ ۵۴ ۔

یہ وہ راہیں ہیں جن کا لحاظ ضروری ہے اس سے مطالعہ حدیث میں کوئی الجھن پیدا نہ ہوگی اور منکرین حدیث اس راہ سے حدیث میں کوئی اور تشکیک کے کانٹے نہ بوسکیں گے اور اگر آپ ہر ایک موضوع میں صرف ایک ایک راہ عمل کو حق سمجھیں اور باقی سب کو باطل جانیں تو ظاہر ہے کہ کتب حدیث کے علمی ذخیرے اس گرانباری کے متحمل نہ ہوسکیں گے امت میں ہر طرح سے اتحاد چاہیئے لیکن ایسا بھی نہیں کہ پوری امت کی ولایت کسی ایک فقیہ میں جمع ہوجائے یہ منصب صرف رسالت کا ہے کہ اس کی ہر ہاں پوری امت کیلئے ہاں ہو اور اس کی ہر نہ پوری امت کے لیے نہ ہو۔

وما کان لمومن ولا مومنة اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم پ۲۲ الاحزاب ع ۵

اور یہ کسی مومن مرد یا عورت کا کام نہیں کہ جب اللہ اور اُسکا رسول کوئی کام طے کردے تو انہیں اپنا کوئی اختیار رہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ ایران کے مذہبی پیشوا علامہ خمینی نے اپنے مسلک کے علماء حدیث کو اب ایک شرعی حیثیت دے دی ہے اور اس پر ولایت فقیہ کے موقف کی تاسیس کی ہے خمینی کا استدلال اس حدیث سے ہے۔

اللھم ارحم خلفائی ثلث مرات قیل من خلفاءک قال الذین یروون احادیثی وسنتی فیعلمونھا الناس من بعدی۔ الحکومۃ الاسلامیہ مصنفہ خمینی ص ۴۴

ہم پہلی جلد کے ص ۴۹ پر شیعہ کتب حدیث کے حوالہ سے اس روایت کو نقل کر آئے ہیں اہل السنۃ کے ہاں یہ روایت صحیح نہیں ہے دارقطنی نے اس کے راوی احمد بن عیسیٰ کو کذاب کہا ہے (مجمع الزوائد جلد ۱ ص ۱۲۶)

خمینی کا استدلال یہ ہے کہ جو علماء احکام الٰہی اس کے بندوں تک پہنچائیں اور انہیں معالم دین کی طرف راہنمائی کریں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ معصومین کے نائب ہیں اور انہیں حق پہنچتا ہے کہ وہ امام کی عدم موجودگی میں ولایت فقیہ کا عہدہ قائم کریں اس فقیہ عادل کا اقتدار پوری کائنات کا اقتدار اعلیٰ ہوگا اور ان کو وہی حق حاصل ہوگا جو ائمہ کو ہے خمینی لکھتا ہے

ان الفقہاء ھم اوصیاء الرسول من بعد الائمۃ وفی حال غیابھم وقد کلفوا بالقیام ما کلف الائمۃ بالقیام بہ۔ الحکومۃ الاسلامیہ ص ۷۵

(ترجمہ) بیشک فقہاء ائمہ کے بعد اور ان کی غیبت میں اوصیاء الرسول ہیں اور ائمہ اسلام جس طرح

اقامت دین کے مکلف ہیں فقہاء بھی اس کے مکلف ہیں"۔۔۔۔ ولایت فقیہ قائم ہونے پر اس فقیہ اعظم کی پیروی اللہ اور اس کے رسول اور ائمہ ہی کی پیروی سمجھی جائے گی اور اس سربراہ کی مخالفت اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت شمار ہوگی۔

دوسرے علماء شیعہ جیسے قم کے آیت اللہ طباطبائی اور آیت اللہ العظمی شریعت مداری اس نظریہ ولایت فقیہ کے خلاف ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس پر کوئی دلیل عقلی موجود ہے اور نہ اس پر کوئی حجت شرعی قائم ہے۔ (دیکھئے الثورہ البائسہ صر ۱۵ اور نہج خمینی صر ۱۷، صر ۱۹)

ہمیں خمینی کے اس استدلال سے اتفاق نہیں یہ روایت جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان علماء کو اپنا خلیفہ بنایا ہے جو آپ کی احادیث وسنن روایت کریں اور لوگوں کو ان کی تعلیم دیں کسی ایک فقیہ کو جانشین رسول نہیں بنا رہی آپکے خلفاء کا پتہ دے رہی ہے اور یہ اسی طرح ہے جیسے حدیث میں العلماء ورثة الانبیاء کہا گیا سو اس روایت میں خلافت خاصہ کا بیان ہے جو تمام محدثین اور فقہا کو حاصل ہے اور خلافت کبری وحدت چاہتی ہے اس روایت میں خلافت کا تعدد مذکور ہے اور ولایت فقیہ (خلافت کبری) وحدت چاہتی ہے۔

ولایت فقیہ قائم ہونے کی صورت میں کسی محدث یا فقیہ کو فقیہ اعظم سے اختلاف کا حق نہیں رہتا اور دیگر سب محدثین اور فقہاء اس کے ماتحت ہو جاتے ہیں ظاہر ہے کہ اس سے احادیث و روایات میں وسعت عمل کا تصور جو حضور کے بعد اب تک امت کا سرمایہ عمل رہا ہے یکسر ختم ہو جاتا ہے ۔۔۔ اس پیش لفظ میں خمینی کے اس نظریہ پر کوئی علمی بحث مقصود نہیں بتلانا صرف یہ ہے کہ اس دور آخر میں بھی حدیث کی روایت اور نقل وسند کو وہ رتبہ حاصل ہے کہ جو لوگ اصلاً اجتہاد پر یقین نہیں رکھتے ائمہ معصومین کی تا قیامت رہنمائی کے قائل ہیں وہ بھی غیبت امام کے وقت نقل و روایت کے سائے میں پناہ لے رہے ہیں گو ولایت فقیہ پھر انہیں اس وسعت عمل سے دور کر دیتی ہے جسکے سائے احادیث و روایات کی روشنی میں دور تک پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں ۔۔۔ اس صورت حال میں ہم نے مدارس حدیث میں قم، مشہد اور نجف اشرف کے مدارس حدیث کا ذکر نہیں کیا اور دوسرے مسالک کے کچھ مدارس حدیث ذکر کر دیئے ہیں۔

ان مسالک میں کوئی کسی ایسی امامت یا ولایت فقیہ کا قائل نہیں اور نہ جماعت اہلحدیث کے ایک فرقہ امامیہ کے سوا کسی کا دعوے ہے کہ حق اب صرف انہی کی اتباع میں ہے۔

ائمہ اربعہ کے پیرو عقیدہ رکھتے ہیں کہ اجتہادی مسائل میں ان کے امام کی تفریع درست ہے لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ اس میں خطا کا احتمال موجود ہے ہوسکتا ہے کہ اس میں دوسرے امام کی رائے درست ہو اس صورت میں بھلا ان میں سے کوئی اپنے لیے کسی آسمانی حق کا قائل ہوسکتا ہے ؟ اس صورت حال میں حق ایک وسیع دائرہ میں پھیلا ہوا نظر آتا ہے جس میں وسعت عمل کی بھی راہیں ہیں اور اختلاف میں بھی ملامت نہیں رحمت ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی غیر منصوص مسائل میں فقہ حنفی پر عمل پیرا تھے اور اس میں بھی اگر مختلف اقوال ہوں تو مفتیان کرام کو اپنے طور پر راجح کی تلاش کا پورا حق ہے اس صورت میں اگر کوئی اختلاف راہ پا جائے تو اسے بآسانی الٰہی رحمت کہا جاسکتا ہے نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں۔

> شاہ ولی اللہ محدث کہ در علم و عمل ہمسر خود در عرب و عجم نداشت و خاندان او حنفی مذہب بود از اولاد عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ۔ ۔ ۔ ۔ در غیر منصوص تابع حنفیہ ماند و قشر ان را از لُب منفصل ساخت و جادہ تطبیق و توفیق در مذاہب اربعہ بتقدیم احکام سنن سپرد و بعد از وے پسرانش ہم بریں نہج قیام کردند۔ (ھدایۃ السائل)

(ترجمہ) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا عرب و عجم میں علم و عمل میں کوئی ہمسر نہ تھا آپ حضرت عمر کی اولاد میں سے تھے اور حنفی خاندان کے فرد تھے غیر منصوص مسائل میں حنفی فقہ پر چلتے اور اس کے چھلکے کو مغز پر حاوی نہ ہونے دیتے تھے آپ نے مذاہب اربعہ میں موافقت اور تطبیق کی راہ نکالی کہ سنن کو مقدم رکھا جائے آپ کے بعد آپ کے بیٹے بھی اسی طریق پر چلتے رہے

خاتم المحدثین حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رح حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رح حضرت شاہ اسمعیل شہید حضرت شاہ محمد اسحاق سب اسی لائن کے پیرو تھے اور برصغیر پاک و ہند کی دینی قیادت انہی کے ہاتھ میں تھی ان کی علمی سلطنت سمرقند اور بخارا تک پھیلی ہوئی تھی۔

اسی دور کے قریب نجد میں شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک اٹھی یہ مذاہب اربعہ میں حنبلی طریقے کے پیرو تھے اور ان کا ہندوستان کے محدثین دہلی سے کسی ضابطے کا رابطہ نہ تھا نواب صاحب مرحوم لکھتے ہیں

> خاندان محمد بن عبدالوہاب بیت علم حنابلہ بود و خاندان ایشاں بیت علم حنفیہ است

وایشاں را با اوشاں ہیچ علاقہ تلمذ یا ارادت یا ہموطنی یا صحبت یا معرفت گاہی نبودہ پس الصاق ایں جماعت ہند بجماعہ اہل نجد چہ واز کجا صحیح مے تواند شد۔

ھدایہ السائل الی ادلہ المسائل صد ۱۲۰

(ترجمہ) شیخ محمد بن عبدالوہاب کا خاندان حنبلیوں کا مرکز علم تھا اور شاہ ولی اللہ کا خاندان حنفیوں کا مرکز علم ہے۔ ان کو ان سے شاگردی یا عقیدت یا ہم وطنی یا ہم مجلس اور معرفت کا کوئی علاقہ نہیں پس انہیں ان نجدیوں سے جوڑنا کیسے درست ہو سکتا ہے۔

معلوم ہوا کہ وہابیہ نجد امام احمد بن حنبل کے مقلد تھے غیر مقلد نہ تھے محدثین دہلی حضرت امام اعظم کے مقلد تھے غیر مقلد نہ تھے ہندوستان کے غیر مقلدین ان میں سے کسی کے ساتھ نہیں نواب صاحب مرحوم ان کے بارے میں اپنی رائے لکھتے ہیں۔

اما وہابیہ ہند پس از حال ایشاں ومخالفین ایشاں ہیچ مپرس کہ عجب جہل مرکب نصیب ایشاں شدہ وتوقع خلاص ازاں علی مر الدہور منقطع گردیدہ صد ۱۱۹

یہاں ان لوگوں کے (غیر مقلدین کے) بھی اپنے مدارس ہیں اور ان کے آپس میں اختلافات بھی ہیں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی جماعت دیوبند کے امام الائمہ ہیں ان کے اپنے مدارس ہیں۔ بریلوی جماعت جو علماء دیوبند علماء حرمین اور جماعت اہلحدیث (غیر مقلدین) تینوں کے خلاف ہے ان کے اپنے مدارس ہیں بعض پرانے بزرگوں کی خانقاہوں پر بھی مدرسے قائم ہیں جیسے تونسہ اور گولڑہ کے خانقاہی مدارس ان کا بریلوی مدارس سے جوہری اختلاف ہے یہ خانقاہی مدارس علماء دیوبند اور علماء حرمین کو کافر کہنے والوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔ اور نہ اپنے ذاتی مفاد کے لیے تفریق امت کے قائل ہیں۔

ہم نے خانقاہی مدارس کا محض ایک مختصر ذکر کیا ہے ورنہ ان کی ایک لمبی فہرست تیار ہو سکتی ہے برصغیر پاک وہند میں یہ خانقاہی مسلک اکثریت میں ہے اور بریلوی مقابلۃً اقلیت ہیں تاہم یہاں ہر مکتب فکر کے اپنے مدارس ہیں اور کچھ مدرسے یہاں جماعت اسلامی کے زیر انتظام بھی چل رہے ہیں۔ ان میں زیادہ موافقت علماء دیوبند سے ہے لیکن یہ ایک طریق کے پابند نہیں ہیں کچھ مدارس منتسبین، دیوبند کے بھی ہیں اور ان کی اپنی اہمیت ہے۔

منکرینِ حدیث کے مقابلہ میں ہم سب ایک ہیں اور ہمارا آپس کا فقہی اختلاف اِس مرحلے میں ہمیں ایک دوسرے سے دُور نہیں رکھتا۔

مدارسِ حدیث ہر مسلک کے اپنے ہیں لیکن اِن سب میں حدیث کو حجتِ شرعی اور شریعت کا دُوسرا علمی ماخذ سمجھ کر پڑھایا جاتا ہے۔ منکرینِ حدیث کے ہاں درسِ حدیث گو اُن کی اپنی اُفتادِ طبع اور تاریخی حیثیّت سے ہی کیوں نہ ہو کہیں موجود نہیں۔ سو یہ صحیح ہے کہ انہیں حدیث کے کسی ایک پیرائے یا محدّثین کے کسی ایک طبقے سے اختلاف نہیں ان کی تمام فکری اساس ہی حدیث دُشمنی پر مبنی ہے اور مُسلمانوں کی علمی صفوں میں کسی جگہ ان کی صف نظر نہیں آتی جسطرح قادیانی اپنے دعوےاسلام کے باوجود مسلمان نہیں سمجھے جاتے منکرین حدیث بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت اجابت میں کہیں جگہ نہیں پاتے۔ اور عملاً بھی مسلمانوں میں اُن کی صف نظر نہیں آتی۔ ربّ العزّت کا کس زبان سے شکر کیا جائے جس نے آثار الحدیث جلد ثانی کی تکمیل کی توفیق بخشی۔ ہر بن مُو زبان ہو جاتے تو پھر بھی اس کے احسانِ عظیم اور فضلِ عمیم کا شکر ادا نہیں ہو سکتا۔ کہاں یہ ناکارہ اور کہاں قصرِ شاہی کی پہرہ داری۔

آثار الحدیث کا اصل مسودہ سالہا سال پہلے کا ہے بعد میں حالات میں بہت تبدیلیاں ہوئیں تاریخ کئی نئے موڑوں سے گزری کئی بزرگ مرحوم ہو گئے جو دوران تالیف دامت برکاتہم کی صف میں تھے نظر ثانی کے وقت کئی مقامات پر سطور تبدیل کرنی پڑیں تاہم مجھے اعتراف ہے کہ بعض مقامات میں تالیف کا حق ادا نہیں ہو سکا احباب سے صرف نظر اور بزرگوں سے نقد نظر کی نیازمندانہ درخواست ہے۔

آثار الحدیث کی تیسری جلد اختلاف الحدیث سے شروع ہو رہی ہے۔ اِس کی اساس حضرت امام شافعیؒ کا رسالہ اختلاف الحدیث ہے جو کتاب الام کے ساتھ چھپا ہے۔ راقم الحروف نے اِس پر عراقی نقطۂ نظر سے بحث کی۔ اللہ ربّ العزّت سے دُعا ہے کہ وہ اِس کی بھی تکمیل کی توفیق بخشے اور راقم الحروف کو بھی ان خوش قسمتوں میں جگہ دے جنہوں نے پُورے اخلاص و محبّت سے علمِ نبوّت کے گرد پہرہ دیا ہے خالد محمود عفا اللہ عنہ

حال وارد پاکستان ۱۰۱۰۸۸

رائے گرامی حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ

علم القرآن اگر اسلامی علوم میں دل کی حیثیت رکھتا ہے تو علم حدیث شہ رگ کی۔ یہ شہ رگ اسلامی علوم کے تمام اعضاء و جوارح تک خون پہنچا کر ہر آن ان کے لیے تازہ زندگی بہم پہنچاتا ہے۔

مسلمانوں نے آغاز اسلام سے قرآن پاک کے بعد اسی علم کو اپنے سینہ سے لگایا ہے اور اپنی پوری محنت قابلیت اور اخلاص و عقیدت کے ساتھ اس کی ایسی خدمت کی ہے کہ دنیا کی کوئی قوم اپنی قدیم روایات و اسناد کی حفاظت کی اس کی مثال نہیں پیش کرسکتی اور ایسا ہونا ہی ضروری تھا کیونکہ اسلام قیامت تک کی زندگی لے کر آیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ہر حرف کو دوام بخشا ہے اور علم حدیث کے اوراق میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اب بھی اہل بصر کو چلتے پھرتے اور بولتے چالتے دکھائی دیتے ہیں۔

جتنے بدعتی فرقے پیدا ہوئے وہ وہی ہیں جنہوں نے کتاب کو سنت سے یا سنت کو کتاب سے الگ کرنا چاہا خوارج نے کتاب کو مانا اور سنت سے انحراف کیا اور ان کے مقابل کے فرقہ نے صرف اپنے ائمہ کی خفیہ سنت کی پیروی کی اور کتاب کو محرف بنا کر چھوڑا اسی طرح معتزلہ نے قرآن کو بتاویل تسلیم کیا اور سنت سے اعراض کیا اور راہ راست سے دور ہوئے۔

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ۔ اما بعد:

آج کا موضوع بحث حدیث کو قبول کرنے، سُننے سنانے، اس کے پڑھنے پڑھانے اور اس کی طلب و یافت میں پیشِ نظر رکھے جانیوالے آداب ہیں۔ گذشتہ موضوعات میں یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی بایں جہت کہ آپ اللہ کے رسُول ہیں، اور صحابہ کرامؓ کی شخصیات کریمہ بایں جہت کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ اور تربیت یافتہ ہیں؛ حدیث کے موضوع ہیں۔ اب اس سے یہ بات سمجھنا آسان ہو گئی کہ حدیث کا ادب کیا ہے اور حدیث سُننے سنانے اور پڑھنے پڑھانے کے آداب کیا ہیں!

جو ادبؒ حضورؐ کا ہے وہی آپ کی حدیث کا ہے

جو ادب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے وہی آپ کی احادیث کا ہے، اور جو ادب صحابہ کرامؓ کا ہے وہی ادب ان کے آثار و سنن کا ہے۔ جو عظمت اللہ رب العزت کی ہے وہی اسکے کلام کریم کی ہے سو ادب حدیث ادب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی ایک پہلو ہے۔ اور آثار صحابہؓ کی توقیر و تعظیم فیض رسالتؐ ہی کی تعظیم و تکریم ہے اور ان کا احترام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل "تزکیہ اصحاب" کا ہی ایک اکرام ہے۔

جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گستاخی و بے ادبی کفر ہے اسی طرح اُن کے ارشادات کی بے ادبی و گستاخی بھی کفر ہے۔ اور جسطرح صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی بے ادبی گمراہی کی انتہا ہے اُن کے آثار و ارشادات سے لاپرواہی بھی ایک کھلی ضلالت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ارشاد اور ہر طریقے کو قبول کرنا ضروری ہے خواہ ہماری عقل میں آئے یا نہ آئے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہماری عقل اسکو سمجھنے سے قاصر ہو لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات غلط ہو۔ آپکے ہر ارشاد کے آگے سر تسلیم خم کرنا ضروری ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بات کے بارے میں دل میں کسی قسم کا ثقل او جھ وغیرہ نہ ہونا چاہیئے۔ ورنہ ایمان قائم نہ رہ سکے گا۔ قرآن کریم میں ہے:

فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا في انفسهم حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما ○ (پ ۵ : النساء)

(ترجمہ) "قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے یہاں تک کہ تجھ کو منصف جانیں اس جھگڑے میں جو ان میں اٹھیں، پھر نہ پاویں اپنے جی میں تنگی تیرے فیصلہ سے اور (تیرے فیصلہ کو) قبول کریں خوشی سے۔"

ادبؒ رسالتؐ قرآن پاک کی رُو سے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر حکم کو دل سے قبول کرنا ضروری ہے اور اس کے بغیر کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا۔ تو یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب دل سے بھی اسقدر ہونا چاہیئے کہ مجال ہے آپ کی کسی بات کے بارے میں تنگی آئے۔ قرآن کریم میں ہے

یاایہاالذین امنوا لاترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولاتجہروا لہ بالقول کجہر بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم وانتم لاتشعرون ۝ (پ ۲۶ : الحجرات)

ترجمہ: "اے ایمان والو اپنی آوازیں بلند نہ کرو نبی کی آواز سے اور آپ سے تیز آواز کے ساتھ نہ بولو جیسے تم آپس میں ایک دوسرے سے بولتے ہو۔ اندیشہ ہے کہ کہیں تمہارے اعمال ضائع نہ ہو جائیں اور تمہیں خبر نہ ہو۔"

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں حضرت رسالت مآب کا ادب بتایا ہے۔ اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے امتیوں کو اپنے نبی کے آداب سکھائے ہیں کہ تمہیں اپنے نبی کی توقیر و احترام عزت و اعظام اسقدر کرنا چاہئے کہ تم اپنے سارے کاموں کو خدا اور اس کے رسول کے پیچھے رکھو۔ اس آیت میں ارشاد ہوا کہ نبی کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرو جیسے ایک دوسرے سے بے محابا بات کرتے ہو۔ اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اونچی آواز کرنا ایک قسم کی بے ادبی اور گستاخی ہے۔

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں شور نہ کرو، اور جیسے آپس میں ایک دوسرے سے بے تکلف جھک جھک کر بات کرتے ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ طریقہ اختیار کرنا خلافِ ادب ہے۔ آپ سے خطاب کرو تو نرم آواز سے، تعظیم و احترام کے لہجہ میں۔ ادب و شائستگی کے ساتھ۔ دیکھو ایک مہذب بیٹا اپنے باپ، لائق شاگرد استاد سے، مخلص مرید پیر و مرشد سے اور ایک سپاہی اپنے افسر سے کس طرح بات کرتا ہے۔ پیغمبر کا مرتبہ تو ان سب سے کہیں بڑھ کر ہے۔ آپ سے گفتگو کرتے وقت پوری احتیاط رکھنی چاہئے مبادا بے ادبی ہو جائے اور آپ کو تکدر پیش آئے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ناخوشی کے بعد مسلمان کا ٹھکانہ کہاں ہے ایسی صورت میں تمام اعمال ضائع ہونے اور ساری محنت رائیگاں جانے کا اندیشہ ہے۔"[1]

حضرت شیخ الاسلام کی اس تفسیر میں علماءِ دیوبند کا موقف روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ یہ حضرات رسالت کا ادب و احترام کس طرح مانتے ہیں۔ اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ نبی کا درجہ اپنے بڑے بھائی کا سا نہیں۔ باپ، اُستاد، پیر و مرشد اور اپنے افسر و آقا ہر ایک سے بڑھ کر ہے۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا عقیدہ بھی یہی تھا۔

"بشر کے حق میں رسالت سے بڑا کوئی مرتبہ نہیں اور سارے مراتب اس سے نیچے ہیں"[2]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ لکھتے ہیں کہ:

"ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) سارے جہان کے سردار ہیں کہ اللہ کے نزدیک ان کا مرتبہ سب سے بڑا ہے اور اللہ کے احکام پر سب سے زیادہ قائم ہیں اور لوگ اللہ کی راہ سیکھنے میں ان کے محتاج ہیں"[3]

آپ اس سے پہلے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لکھ آئے ہیں:

"سب انبیاء و اولیاء کے سردار پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور لوگوں نے ان کے بڑے بڑے معجزے دیکھے انہیں سے سب اسرار کی باتیں سیکھیں اور سب بزرگوں کو انہی کی پیروی سے بزرگی حاصل ہوئی"[4]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں کسی پہلو سے کوئی گستاخی اور بے ادبی نہ ہونے پائے

---

[1] فوائد القرآن صفحہ ۶۸۴ [2] تقویۃ الایمان صفحہ ۵۴ [3] تقویۃ الایمان صفحہ ۵۵ [4] تقویۃ الایمان صفحہ ۲۱

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کو ایک بڑا خطرہ قرار دیتے ہیں:

"خطرہ اس لئے ہے کہ رسول کی شان میں گستاخی یا اُن کی آواز پر اپنی آواز کو بلند کر کے غالب کرنا ایک ایسا امر ہے جس سے رسول کی شان میں گستاخی اور بے ادبی ہونے کا احتمال ہے جو سبب ہے ایذاء رسول کا۔" [1]

حضرات صحابہ کرامؓ اس آیۃ شریفہ کے نزول کے بعد بہت احتیاط سے آپ کے ساتھ کلام کرتے تھے اور ڈرتے تھے کہ کہیں ان کی آواز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے بلند نہ ہو جائے۔ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضوان اللہ تعالیٰ علیہم جیسے اکابر صحابہ کرام بھی آپ سے بات کرتے ہوئے جھجکتے تھے فھاباہ ان یکلماہ (بخاری شریف ج ۲ ص ۷۲ مصر) یہ دونوں حضرات بڑی ہیبت کھاتے تھے کہ آپ سے کلام کریں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ صحابہؓ کے ہاں دربار رسالت کا عز و احترام اور توقیر و احترام کتنا تھا۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضورؐ سے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی قسم اب تو میں آپ سے اس طرح بات کروں گا جس طرح کوئی سرگوشی کرتا ہے۔ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اسی طرح آہستگی سے بات کرتے تھے کہ بعض اوقات حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی بات سن نہ پاتے جب تک کہ دوبارہ استفہام نہ فرماتے۔ [2]

قرآن کریم آپ کی تعظیم و توقیر کا ان الفاظ میں حکم دیتا ہے:

انا ارسلنٰک شاھدا و مبشرا و نذیرا ۝ لتؤمنوا باللہ و رسولہ و تعزروہ و توقروہ ۔۔

ترجمہ: "ہم نے تجھ کو بھیجا احوال بتانے والا اور خوشخبری اور ڈر سنانے والا تاکہ تم اللہ پر اور اس کے رسول پر یقین لاؤ اور اس کی نصرت کرو، اور اس کی عظمت قائم رکھو اور خدا کی پاکی بولو صبح و شام۔" (الفتح، پ ۲۶، ع ۱)

یہ حکم خداوندی بتا رہا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و توقیر اور آپ کا اکرام و احترام ہر بندہ مومن کے ذمہ لازم ہے یہ تعظیم ایمانی اور قلبی حدود میں تو ہے ہی کہ بدوں اس کے مومن ہونے کا تصور بھی نہیں ہو سکتا لیکن بیرونی حدود میں بھی تعظیم درکار ہے کہ آپ کی آواز سے آواز بلند نہ کرے۔ آپ کو اپنوں جیسوں کی طرح نہ جانے، آپ کی ہر پکار پر لبیک کہے، آپ کے ہر حکم کو اپنے لئے واجب العمل جانے، اس کے انکار کو کفر جانے اور اس کے ترک کو گناہ سمجھے۔ رہا موضوع بدنی تعظیم کا تو آپ کے لئے دست بستہ قیام رکوع اور سجدہ نہ کرے۔ بدنی تعظیم اتنی ہی کرے جتنی چھوٹے درجے کے انسان بڑے درجے کے انسانوں کی کرتے چلے آتے ہیں۔

بعد الوفات آپ کے ادب و احترام کی صورت

جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ کے روبرو اونچی آواز سے کلام کرنا گویا اپنے اعمال کو ضائع کرنا ہے اسی طرح آپ کے اس دنیا سے روپوش ہونے کے بعد بھی آپ کے کلام یعنی احادیث کریمہ کے سامنے اونچی آواز نہ کرنی چاہیئے شیخ الاسلام حضرت عثمانیؒ لکھتے ہیں:

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضورؐ کی احادیث سننے اور پڑھنے کے وقت بھی یہی ادب چاہیئے اور جو قبر شریف کے پاس ہو تو وہاں بھی ان آداب کو ملحوظ رکھے نیز آپ کے خلفاء علماء ربانیین اور اولو الامر کے ساتھ درجہ بدرجہ اسی ادب سے پیش آنا چاہیئے۔" [3]

---

[1] معارف القرآن، جلد ۸ ص ۱۰۲ [2] تفسیر ابن کثیر پ ۲۶ ص ۴۲ [3] فوائد القرآن صفحہ ۶۹۱

جس طرح بعد وفات آپ کی احادیث کریمہ کے سامنے اونچی آواز کرنے سے منع فرمایا ہے اسی طرح آپ کے تمام اعمال اور آپ کی سنتوں اور آپ کے احکام سے تجاوز کرنا بھی بے ادبی اور گستاخی سمجھا جائیگا اور یہ حکم قیامت تک کے لئے ہے۔ یہ حکم قیامت تک باقی رہے گا منسوخ نہیں ہوا۔ لہٰذا سنتوں سے آگے بڑھنا اور آپ کے احکام سے تجاوز کرنا بعد وفات بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ حالتِ حیات میں تھا اس میں کوئی فرق نہیں[1]

حضرت قاضی ابوبکر بن عربی فرماتے ہیں کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اور ادب آپ کی وفات کے بعد بھی ایسا ہے جیسا کہ حیات میں تھا اسی لئے بعض علماء نے فرمایا کہ آپ کی قبر شریف کے سامنے بھی زیادہ بلند آواز سے سلام و کلام کرنا ادب کے خلاف ہے"[2]

آپ کی مسجد میں آواز بلند نہ کرے

یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دو شخصوں کو مسجد نبوی میں بلند آواز سے کلام کرتے سنا تو آپ نے انکو منع فرمایا کیونکہ اس حالت میں آپ کا ادب و احترام قائم نہ رہ سکتا تھا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں بلند آواز سنی اور دریافت فرمایا تو معلوم ہوا کہ مسجد مقدس میں دو اشخاص آواز بلند کر رہے ہیں۔ آپ نے انکو بلایا اور فرمایا تم لوگوں کو پتہ نہیں کہ تم کہاں بیٹھے ہو۔ فرمایا کہ یہ مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ کسی نے کہا کہ حضرت یہ دونوں اہل طائف ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم لوگ باہر سے نہ آئے ہوتے تو میں تمہیں دُرّوں کی سزا دیتا[3]

لو کنتما من اھل المدینۃ لاوجعت کما ترفعان اصواتکما فی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ترجمہ: "اگر تم اس شہر کے رہنے والے ہوتے تو میں تمہیں بدنی سزا دیتا تم حضورؐ کی مسجد میں اپنی آواز بلند کر رہے ہو"

(مشکوٰۃ شریف رواہ البخاری وفی روایۃ ان مسجد ناھذا لایرفع فیہ الصوت)

فی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں مناط کلام مسجد نہیں بلکہ مسجد یا رِ نسبت ہے کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا روضۂ انور ہے اور اس میں آواز بلند کرنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اکرام و احترام کے خلاف ہے۔

آداب حدیث قرآن کریم کی رو سے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بلانے کا فوری حق یہ ہے کہ جس وقت اور جدھر بلائیں سب اشغال چھوڑ کر اُدھر ہی پہنچ جائے۔ حدیثِ رسول کوئی ایسی بات نہیں کہ اس پر فوری دھیان نہ کیا جائے حدیث کا پہلا ادب یہ ہے کہ اس پر فوری توجہ دی جائے دیر نہ کرے۔ قرآن کریم یہ آداب یوں سکھاتا ہے: یاایھاالذین اٰمنوا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم

ترجمہ: "اے ایمان والو حکم مانو اللہ کا اور رسول کا جس وقت وہ بلائیں اس کام کی طرف جس میں تمہاری زندگی ہے"[4]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد و عمل یا بلاوا ایسی چیز نہیں جس سے مومن ایک لمحہ کے لئے بھی پہلو تہی یا روگردانی کرے۔ قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بلانے پر فوراً لبیک کا حکم دیتا ہے اور حضورؐ کا بلانا صرف آپ کا ہی بلانا نہیں خدا کا بلانا بھی ہے۔ سو قرآن کریم کی روشنی میں حدیث رسول کا ادب یہ ہے کہ اس کے حکم پر فوراً لبیک کہی جائے

[1] مدارج النبوۃ جلد ۱ صفحہ ۵۲۵ [2] معارف القرآن جلد ۸ صفحہ ۱۰۱ [3] مواہب الرحمٰن پ ۲۶ صفحہ ۲۳۲ [4] پ ۹ الانفال ۳

اس میں مومن کی زندگی ہے اور اس کے آداب میں سے ہے کہ مومن حدیث کے سامنے مطیع و منقاد ہو جائے کہ اپنے آقا میں بسر و چشم حاضر ہوں۔ اب یہ بات مومن کی مرضی پر نہیں کہ حدیث کو تسلیم کرے یا نہ کرے یا اس سے کس طرح بچے رہے۔ ہاں حدیث کے حدیث ہونے میں شک ہو تو یہ ایک علمی اختلاف ہوگا۔ حدیث کے ادب و احترام سے سرتابی نہ ہوگی۔

ادبِ حدیث خود حدیث کی رُو سے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین میں بیٹھے کوئی حدیث بیان فرمارہے تھے کہ ایک شخص (کوئی اعرابی) آیا اور اس نے آپ کے دورانِ بیان، ہی ایک سوال کر دیا۔ آپ نے اس کی طرف توجہ نہ فرمائی اور حدیث برابر بیان فرماتے رہے جب بات پوری کر چکے تو فرمایا وہ شخص کہاں ہے جو قیامت کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔۔۔ الخ[1]

آپ کے طرزِ عمل سے حدیث کے احترام کا پتہ چلا کہ حدیث جب بیان ہو رہی ہو تو اور کوئی بات درمیان میں نہ لانی چاہیئے گو وہ بات خود دین کی ہی کیوں نہ ہو۔ پوری حدیث آگے اسی بحث میں آئے گی کہ حدیث کے بیان کے دوران کسی اور طرف توجہ نہ کرے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام میں ایک دفعہ ان کے حالات کے تفاوت سے غنیمت تقسیم فرمارہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ہر ایک کے حالات پیشِ نظر اس کے لئے مقدار مختلف تھی اور اسی لئے آپ نے اسے کسی اور کے سپرد نہ کیا تھا بلکہ خود ہی تقسیم فرمارہے تھے کہ اچانک ذوالخویصرہ تمیمی نے کہا حضورؐ! عدل فرمائیے، برابر تقسیم کیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

ویلک من یعدل اذا لم اعدل "تیری بربادی، میں عدل نہ کرونگا تو اور کون کریگا"[2]

اور ایک روایت میں ہے کہ یہ بھی فرمایا: "انا امین من فی السماء یاتینی خبر السماء صباحا و مساءً" میں تو آسمان والے کا امین ہوں صبح و شام میرے پاس آسمانی خبریں آتی ہیں۔[3]

یعنی آسمانی باتوں میں تو مجھے امین کہا جاتا ہے تو کیا ان دنیوی امور میں کوئی بات خلاف امانت و دیانت مجھ سے ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ ذوالخویصرہ کے اس اعتراض پر آپ ناراض ہوئے۔ آپ نے اس شخص کے بارے میں یہ بھی فرمایا:

انہ یخرج من ضئضئ ھذا قوم یتلون کتاب اللہ رطبا لا یجاوز حناجرھم یمرقون من الدین کما یمرق السھم من الرمیۃ[4]

ترجمہ: اس کی پشت سے ایک ایسی قوم نکلے گی جو کتاب اللہ کی تلاوت میں ہر وقت رہیں گے لیکن تلاوت ان کے حلق سے نیچے اُتر کر دل تک، نہ جاسکے گی، دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔

آپ کی یہ پیشگوئی بالکل درست نکلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں بے ادبی کا ارتکاب کر نیوالا خوارج کا مورثِ اعلیٰ بنا۔ نبی کی بات کے سامنے یہ جسارت بالکل ناجائز تھی، نبی کی تو شان یہ ہے کہ اس کے سامنے آپس میں بھی کوئی جھگڑا نہ ہونا چاہیئے۔ جھگڑا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یا آپ کی طرف توجہ نہیں یا کسی کو آپ کی حدیث کو قبول کرنے میں تردد ہو رہا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری جلد ۱ ص۱۴ [2] ایضاً ص۵۱۰ [3] ص۶۲۴، ۱، ص۵۰۹، ص۴۷۲ [4]

سیدنا حضرت ابن عباس رض فرماتے ہیں :

و لا ینبغی عند نبی تنازع[1] ترجمہ : "اور نبی کے پاس تنازع نہ ہونا چاہیئے"

بلکہ اگر کہیں آپس میں اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ نبی کی ذات اقدس سے لینا چاہیئے ۔ اس اختلاف کو ہی آپ کی طرف منسوب کر دینا کسی بدنصیب کی فکر ہی ہو سکتی ہے ۔

آدب حدیث عمل صحابہؓ کی رو سے جن حضرات نے حلقہ نبوت میں تربیت پائی تھی ان سے زیادہ حدیث کا احترام کرنیوالا کون ہو سکتا ہے ۔ حضرت عمرو بن میمون تابعی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی خدمت میں ہر جمعرات کو حاضر ہوتے تھے آپ ایک رات کا واقعہ نقل کرتے ہیں : فلما کان ذات عشیة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فنکس قال فنظرت الیہ فہو قائم محللۃ ازرار قمیصہ قد اغرورقت عیناہ و انتفخت اوداجہ قال " او دون ذالک او فوق ذالک " ۔ او قریباً من ذالک او شبیہاً بذالک ۔ (سنن ابن ماجہ ص[2]) ترجمہ : ایک رات آپ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا تھا آپ حضورؐ کی حدیث بیان کرتے سرنگوں ہو گئے تھے پھر میں نے آپ کی طرف دیکھا کہ آپ کھڑے ہیں بٹن ٹوٹے کے کھلے ہیں آنکھیں آنسوؤں سے تر ہیں رگیں پھولی ہوئی ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے ذرا کم یا کچھ زیادہ یا اس کے قریب قریب یا اس سے ملتی جلتی بات فرمائی تھی ۔ اس حلقہ ارشاد میں جب حدیث رسول کا اتنا ادب تھا کہ مجال ہے کوئی بات خلاف مراد رسول صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی زبان سے نکلے ، تو ظاہر ہے کہ ہماری مجالس اور ہمارے مدارس میں بھی حدیث بڑے ادب و احترام سے روایت کی جانی چاہیئے ۔

صحابہ کرامؓ جنہوں نے حلقہ نبوت میں تربیت پائی تھی وہ حدیث کے احترام میں جھکے جاتے تھے ۔ جب حضورؐ کی کوئی حدیث سامنے آتی وہ جھٹ اپنی بات چھوڑ دیتے ۔ ایک دفعہ حضرت کعب احبار اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما میں کسی موضوع پر اختلاف ہو گیا ۔ کعب احبار کی تورات کی ایک یادداشت صحیح نہ تھی ۔ حضرت ابوہریرہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے خلاف روایت کر رہے تھے ۔ حضرت کعبؓ نے جب تورات کھولی تو روایت ابوہریرہؓ کو درست پایا ۔ فوراً پکار اٹھے صدق رسول صلی اللہ علیہ وسلم آنحضرتؐ نے سچ فرمایا :[3]

حضرت ابوہریرہؓ کا صحت حدیث پر اصرار اور اس کے مقابلہ میں تورات کی بات کو نہ ماننا اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ صحابہؓ کے ہاں حدیث کی اہمیت اور اسکا ادب کتنا تھا

حضرت عمرو بن میمون فرماتے ہیں کہ " میں ابن مسعودؓ کے پاس ایک سال تک برابر آتا جاتا رہا مگر ان کو کسی وقت بھی بے تعظیمی سے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے نہیں سنا اور جبکہ ایک دن بے خیال میں ان کی زبان پر یہ جاری ہو گیا تو وہ اتنے روئے کہ ان کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور وہ پسینہ پسینہ ہو گئے[4]

حضرت انس بن مالکؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جب کوئی حدیث نقل کرتے تو محض اس ڈر سے کہ نادانستہ طور پر کوئی بات خلاف مراد مصطفےٰ زبان سے نہ نکل گئی ہو ۔ آخر میں کہہ دیتے " او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "

---

[1] بخاری جلد ۲ ص[illegible] [2] سنن نسائی جلد ۱ صفحہ ۲۱ [3] مدارج النبوۃ جلد ۱ ص ۱۶۵ [4] سنن ابن ماجہ

جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو، یعنی میری بات اگر کسی پہلو سے صحیح نہ ہو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات تو یقیناً صحیح اور حق ہے وہی میری بات سمجھ لو۔

آداب الحدیث عمل ائمہ کی رُو سے

افضل التابعین حضرت سعید بن المسیب رضؒ (۹۳ھ) کا حدیث کے لئے احترام ملاحظہ ہو: "حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضرت سعید بن المسیبؒ کے پاس آیا اور اس نے ان سے ایک حدیث دریافت کی تو وہ ایک پہلو پر لیٹے ہوئے تھے فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے اور حدیث بیان کی۔ اس شخص نے کہا مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ آپ تکلیف اٹھائیں اور اٹھ کر بیٹھیں۔ انہوں نے فرمایا میں اسے مکروہ جانتا ہوں کہ پہلو پر لیٹے لیٹے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کروں

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ادب حدیث ملاحظہ ہو:

"جو لوگ حضرت امام مالکؒ کے پاس آتے تو پہلے ان کی باندی باہر آتی اور پوچھتی کہ تم شیخ سے مسائل شرعیہ پوچھنے آئے ہو یا حدیث! اگر لوگ کہتے کہ ہمیں مسائل دریافت کرنے ہیں تو امام مالکؒ فوراً باہر تشریف لے آتے اور اکثر مسائل کا جواب ارشاد فرماتے اور اگر لوگ کہتے کہ ہم لوگ حدیث معلوم کرنے آئے ہیں تو آپ پہلے غسل خانہ تشریف لیجاتے غسل کرتے اور بدن پر خوشبو ملتے اور نئے کپڑے پہنتے اور اپنا چغہ جو سیاہ یا سبز ہوتا زیب تن کرتے اور عمامہ سر پر رکھتے اور ایک تخت بچھایا جاتا، پھر باہر تشریف لاتے تخت پر خشوع و خضوع سے بیٹھتے بخور جلایا جاتا جب تک حدیث کے بیان سے فارغ نہ ہوتے اسی ہیئت کے ساتھ بیٹھے رہتے"

لیجئے حضرت عبدالرحمٰن بن مہدیؒ (۱۹۸ھ) کا حال بھی ملاحظہ ہو:

جب ان کے سامنے حدیث پڑھی جاتی تو لوگوں کو خاموش رہنے کا حکم دیتے اور فرماتے لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی اور فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی قرأت کے وقت خاموش رہنا اسی طرح فرض ہے جسطرح کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام فرمانے کے دوران خاموش رہنا اور سننا فرض تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح مقام رسالت کا ادب ہے اسی طرح حدیث رسالت لائق احترام ہے آپ کی احادیث کریمہ کا ادب انتہائی لازمی ہے جہاں حدیث پڑھی پڑھائی جاتی ہو وہاں اونچی آواز نہ کرے اور خلاف ادب ذرا شور و شغب نہ کرے آداب حدیث میں یہ پہلا ادب ہے۔

حضرت ابو ابراہیم یحییٰ فرماتے ہیں: "ہر مسلمان پر فرض ہے کہ جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرے یا اس کے سامنے حضور کا ذکر کیا جائے تو وہ خشوع و خضوع کا اظہار کرے اور بدن کو ساکن کرکے جنبش تک نہ دے اور خود پر ہیبت و جلال طاری کرے۔ گویا کہ اگر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو ہوتا اور اسوقت جو ادب فرض تھا وہی ادا کرتا تو اسوقت بھی ویسا ہی ادب کرے"

۱؎ مدارج النبوۃ ص ۱۴۱ ۲؎ مدارج النبوۃ جلد ا ص ۵۴۲ ۳؎ مدارج النبوۃ جلد ا ص ۵۲۹ ۴؎ مدارج النبوۃ جلد ا ص ۵۲۰

حدیث ماننے کے آداب

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے سامنے اپنی بات نہ چلائیے

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی بات کا فیصلہ فرمادیں تو کسی مرد مومن یا مومنہ عورت کو یہ حق نہیں رہتا کہ آپ کے ارشادات کے سامنے وہ اپنی بات چلائیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے: وماکان لمؤمن ولا مؤمنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم (پ۲۲ الاحزاب، ع ۶)

ترجمہ: "اور نہیں کسی مرد مومن کے لئے اور نہ کسی مومن عورت کے لئے اپنے معاملے کا کوئی اختیار بعد اس کے کہ خدا اور اس کا رسول اس کام کے بارے میں کوئی فیصلہ صادر کریں"۔

حدیث کو قبول کرنے کا جذبۂ اطاعت

آیت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث کو قبول کرنے میں دل میں تنگی نہ ہونی چاہئے مومن کو چاہئے کہ آپ کے ہر ایک حکم کو خوشی کے ساتھ دل سے قبول کرے اور آپ کے ہر حکم کو ظاہراً و باطناً تسلیم کرے۔ ایسا نہ کرے گا تو اس کے ایمان کا کہیں اعتبار نہیں۔ قرآن کریم میں ہے:

فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ ان تصیبھم فتنۃ او یصیبھم عذاب الیم[۱]

ترجمہ: "سو ڈرتے رہیں وہ لوگ جو خلاف کرتے ہیں اس کے حکم کا کہ آپڑے ان پر کوئی فتنہ یا پہنچے ان کو کوئی دردناک عذاب"۔

ایک یہودی اور ایک منافق میں کسی بات پر جھگڑا ہوا۔ فیصلے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم بنایا گیا۔ جب دونوں آپ کی خدمت میں آئے اور مقدمہ پیش کیا تو آپ نے اس یہودی کے حق میں فیصلہ دیدیا۔ وہ منافق اس فیصلہ سے مطمئن اور راضی نہ ہوا، اس نے کہا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں چلتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کو فیصلہ کرنے سے پہلے اس یہودی نے بتادیا کہ ہم حضور علیہ السلام کے پاس سے آرہے ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے حق میں فیصلہ دیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس منافق سے اس بات کی تصدیق کی۔ پھر حضرت عمرؓ تلوار لیکر آئے اور اس منافق کو تہہ تیغ کرڈالا۔ اس مقتول کے اولیاء نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا کہ انہوں نے ایک مسلمان کو بلاوجہ قتل کیا ہے۔ جب یہ استغاثہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا تو آپ کی زبان مبارک سے بھی بے ساختہ یہ الفاظ نکلے:

ماکنت اظن ان عمر یجترئ علی قتل رجل مومن[۲]

ترجمہ: "مجھے گمان تک نہ تھا کہ عمر بھی کسی مومن کے قتل کی جسارت کرے گا"۔

لیکن جب اس آیت کریمہ (فلا وربک لا یومنون الخ) کا نزول ہوا تو حقیقت واضح ہوگئی کہ وہ شخص مومن ہی نہ تھا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گمان حضرت عمرؓ کے بارے میں بالکل درست تھا کہ وہ کبھی قتل مومن کے مرتکب نہ ہوسکتے تھے۔

حضرات مفسرین نے اس آیت کریمہ کے تحت یہ بات لکھی ہے کہ یہ عمل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک کیساتھ ہی نہیں، آپ کے بعد آپ کی شریعت مطہرہ کا فیصلہ آپ کا ہی فیصلہ شمار ہوگا۔ سو یہ حکم قیامت تک اسی طرح جاری رہے گا۔ آپ

---

[۱] پ ۱۹: النور: ع ۹ [۲] تفسیر جلالین ص ۱۴۳

کے زمانہ مبارک میں خود بلاواسطہ آپ سے رجوع کیا جاتا تھا۔ سو آپ کے بعد آپ کی شریعت مطہرہ کی طرف رجوع جاری رہیگا اور یہ حقیقت میں آپ کی طرف ہی رجوع ہے۔ فردوہ الی اللہ والرسول (پ۵ النساء) پر اب اسی صورت میں عمل ہوسکتا ہے کہ قرآن کریم کی طرف رجوع اللہ کی طرف رجوع سمجھا جائے اور حدیث کی طرف رجوع خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع مانا جائے۔ ورنہ یہ آیت اس باقی امت کے لئے بیکار ہو کر رہ جائیگی۔ اور قیامت تک لائق عمل نہ ٹھہرے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضورؐ کے فیصلے آپ کی وفات کے بعد بھی پوری امت کے لئے حجت ہیں۔ آپؐ کی کسی حدیث پر اپنی رائے سے اعتراض کرنے بیٹھ جانا بہت نادانی ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں: "ادب نبوی میں سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد و عمل پر اپنی رائے سے اعتراض اور شک و شبہ نہ کرو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے اپنی رائے پر اعتراض اور شک و شبہ کرلو اور قیاس سے نص کا مقابلہ نہ کرو بلکہ قیاس کو نص کے تابع کر دو اسے اس کے مطابق بناؤ۔ قیاس کے صحیح ہونے کی شرط ہی یہ ہے کہ وہ نص کے مقابلہ میں نہ ہو۔"[1]

حافظ ابن قیم فرماتے ہیں کہ "رسول کی آواز سے اپنی آواز اونچی کرنا جب عمل کو اکارت کر دیتا ہے تو اسکے احکام کے سامنے اپنی رائے کو مقدم کر دینا اعمال صالحہ کے لئے کیونکر تباہ کن نہ ہوگا۔"[2]

حدیث رسول سامنے آئے تو اس سے بڑی سند نہ مانگیے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پیش کر دی جائے تو مغرب زدہ لوگ بعض اوقات کہنے لگتے ہیں کہ یہ بات قرآن میں کہاں ہے؟ انہیں حدیث سے بڑی سند کی ضرورت ہوتی ہے مگر یہ بات صحیح نہیں ہے حدیث کو خود ایک بڑی دلیل سمجھنا چاہیئے جسے اور دلیل کی حاجت نہیں نہ اس پر کسی بالا سند کا تقاضا کیا جانا چاہیئے۔

حضرت مقدام بن معدی کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یوشك الرجل متكئا على اريكته يحدث بحديث من حديثي فيقول بيننا و بينكم كتاب الله عز وجل فما وجدنا فيه من حلال استحللناه وما وجدنا فيه من حرام حرمناه الا و ان ما حرم رسول الله صلى الله عليه وسلم مثل ما حرم الله[3]

ترجمہ: قریب ہے کہ ایک شخص جسکے پاس میری حدیث بیان کی جا رہی ہو اپنے صوفے پر ٹیک لگائے (بڑے تکبر سے) کہے ہمارے تمہارے لئے اللہ کی کتاب ہی بس ہے اسی میں جسے حلال کیا گیا اسے ہم حلال سمجھیں گے اور جو چیز اس میں ہم حرام پائیں اسے ہی حرام سمجھیں گے بیشک جو چیز اللہ کے پیغمبر نے حرام بتلائی وہ ایسے ہی ہے جیسے وہ چیز جسے اللہ نے حرام بتلایا۔

معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تحلیل و تحریم سب امر الٰہی کے تحت ہی بیان فرماتے تھے۔ آپ اللہ کے نام پر کچھ بیان فرما دیں یا اللہ کا نام لئے بغیر حلال و حرام کی کوئی بات کہیں سب کا منبع و مرکز وحی الٰہی ہے متلو ہو یا غیر متلو پیغمبر کا اس میں اپنا دخل نہیں ہوتا۔

اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ صحابہ کرامؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائی ہوئی تمام باتوں کو قرآن کے اس فیصلے کی رو سے کہ ما اتاکم الرسول فخذوہ و ما نهاكم عنه فانتهوا (پ۲۸ الحشر ع۱) قرآنی تعلیمات ہی سمجھتے تھے۔

---

[1] مدارج النبوۃ جلد ا صفحہ ۵۱۴ [2] ترجمان السنۃ جلد ا صفحہ ۱۴۲ نقلاً عن اعلام الموقعین ص۴۴ [3] ابن ماجہ صفحہ ۳

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک شخص کو سلے ہوئے کپڑوں میں خرم دیکھا تو منع فرمایا۔ اس نے قرآن کریم سے دلیل پوچھی تو آپ نے یہی آیت کریمہ پڑھی کہ جو چیز تمہیں رسول دے اُسے لے لو اور جس چیز سے اس نے روکا اس سے رُک جاؤ۔ [۱]

اسی طرح آپ نے ایک مسئلہ کے بارے میں حدیث پڑھی تو ایک عورت نے ایسا ہی سوال کیا آپ نے پھر وہی آیتہ کریمہ تلاوت فرمائی یعنی یہ کہ قرآن کی رُو سے پیغمبر کی ہر بات تمہارے لئے سند ہے۔[۲]

اس قسم کی روایات پتہ دیتی ہیں کہ صحابہ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو خدا کی بات ہی سمجھتے تھے جب حدیث کے پیش ہونے پر قرآن کی سند طلب کرنا بے فائدہ ہے تو جو لوگ حدیث پیش ہونے کے بعد پھر اس پر عقلی دلائل مانگتے ہیں وہ مقام حدیث سے کس قدر بے خبر ہیں۔ حق یہ ہے کہ صحیح حدیث سامنے آجائے تو کوئی اور سند مانگنے کا تصور بھی ذہن میں نہ آنا چاہیئے۔

آنحضرت نے مذکورہ بالا حدیث میں منکر حدیث کا نقشہ جس صورت میں کھینچا ہے اس سے اس کی تکبر کی حالت عیاں ہے۔ معلوم ہوا کہ سند حدیث پر اکتفا نہ کرنا متکبرین کا شعار ہوگا۔ ایک طریق میں یہ الفاظ بھی ہیں: الا یوشك رجل شبعان علی اریکتہ یقول علیکم بھذا القرآن (رواہ ابوداؤد والدارمی بمعناہ) "خبردار رہو قریب ہے کہ ایک سیر شدہ (امیر) آدمی اپنے صوفے پر ٹیک لگائے کہے تمہیں اس قرآن کی پابندی کافی ہے جو اس میں حلال ہے اسے ہی حلال جانو اور جو اس میں حرام ہے اسے ہی حرام کہو" انتہی

حضرت عرباض بن ساریہؓ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا: ایحسب احدکم متکئاً علی اریکتہ یظن ان اللہ لم یحرم شیاء الا ما فی ھذا القرآن (مشکوٰۃ ص ۲۹) ترجمہ: کیا تم میں سے کوئی شخص صوفے سے ٹیک لگائے اس گمان میں ہوگا کہ حرام صرف وہی کچھ ہے جو قرآن میں ہے۔

حدیث کے مقابل کسی کی بات نہ ماننے

ائمہ اربعہ جن کی اجتہادی اُمور میں امت میں تقلید جاری ہوئی اور جن کا قول ان کے مقلدین کے ہاں حجت اور سند کہا جاتا ہے ان سب کا بھی ارشاد ہے کہ حدیث صحیح سامنے آجائے تو ہماری بات فوراً چھوڑ دو۔ حدیث کے مقابل کسی کی بات مانے جانے کے لائق نہیں۔ حضرت علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

فقد صح عنہ انہ قال اذا صح الحدیث فھو مذھبی وقد حکی ذالك ابن عبدالبر عن ابی حنیفۃ وغیرہ من الائمۃ ..... و نقلہ ایضاً الامام الشعرانی عن الائمۃ الاربعۃ و لا یخفی ان ذالك لمن کان اھلاً للنظر فی النصوص و معرفۃ محکمھا من منسوخھا [۳]

---

[۱] مواہب الرحمٰن پ ۲۸ ص ۱۲۷ و ترجمان السنہ، جلد ۱ [۲] مشکوٰۃ شریف ص ۳۸۱ [۳] رد المحتار جلد ۱ ص

زبہ؛ حضرت امام صاحب سے صحیح طور پر ثابت ہو چکا کہ جب کوئی حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو وہی میرا مذہب ہے عبدالبر نے بھی یہی امام ابوحنیفہؒ اور دوسرے اماموں سے نقل کیا ہے۔ امام شعرانی نے ائمہ اربعہ سے یہی نقل کیا ہے اور یہ بات مخفی نہیں کہ یہ اس کے لئے ہے جس کی نصوص (کتاب و سنت) پر نظر ہو اور محکم اور منسوخ کو سمجھتا ہو۔ یہ صحیح ہے کہ اس شخص میں جو حدیث کے بالمقابل اپنے امام کی بات چھوڑ رہا ہے حدیث سمجھنے کی پوری اہلیت ہونی چاہئیے۔ جو لوگ حدیث کے محض ترجمے پڑھ کر ائمہ کی بات کو ٹھکرانے لگتے ہیں اور فن حدیث اور اس خاص موضوع کی دیگر روایات پر نظر نہیں رکھتے انہیں چاہئیے کہ محض اپنی رائے سے اس روایت کو حدیث نہ سمجھیں بلکہ بات سمجھنے کے لئے راسخ العلم علماء کی طرف رجوع کریں تاہم یہ پھر بھی ضروری ہے کہ ان کے سامنے جو حدیث پیش ہو اس کے مقابل کوئی کلمہ جسارت زبان پر نہ آجائے۔ ہاں جس وسیع النظر عمیق العلم عالم کی دوسری احادیث پر بھی پوری نظر ہو اور پھر وہ دیانتداری سے محسوس کرے کہ اس میں میرے امام کی بات واقعی حدیث کے مقابل ہے تو پھر صرف حدیث ہی ہے جس کی اتباع کی جائے قول امام کو حدیث کے سامنے کوئی وزن حاصل نہیں نہ مقلدین کے ہاں امام شریک فی الرسالۃ سمجھا جاتا ہے۔ سو اس صورتحال میں فتنگ تعلیم یہی ہے کہ وہ شخص امام کی بات چھوڑ دے اور حدیث کی بات مانیں۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ (۳۲۱ھ) اور امام کرخیؒ جیسے سادات حنفیہ نے اسی اصول پر کئی مواقع میں قول امام کو چھوڑ لیے۔ ہر وقت ملحوظ رہے کہ مقلدین کے ہاں قول امام ہرگز حدیث کے مقابلے میں نہیں لیا جاتا نہ ان کے ہاں ان کا امام معصوم سمجھا جاتا ہے اصول برحق یہی ہے کہ حدیث کے مقابل کسی کی بات نہ مانی جائے۔ یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ضروری نہیں کہ اگر کچھ علماء نے کسی حدیث کے باعث قول امام چھوڑا ہو تو ضروری نہیں کہ اور سب علماء بھی ان کے ہم خیال ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان دوسرے علماء راسخین کو کچھ اور احادیث ایسی مل گئی ہوں کہ انہیں قول امام کی سمت پھر محقق ہو گئی ہو۔ علامہ شعرانی رحمۃ اللہ علیہ (۹۷۳ھ) لکھتے ہیں کہ ائمہ کا یہ ارشاد کہ حدیث کے بالمقابل ہماری رائے چھوڑ دو انہی لوگوں کے لئے ہے جو فہم حدیث میں اونچے درجے کے عالم ہوں؛ جو حدیث جانتے ہی نہیں انہیں حق نہیں کہ محض ترجمہ پڑھ کر مجتہدین پر نکتہ چینی کرنے لگیں۔ اور ان کے فیصلوں پر جلد بازی میں خلاف حدیث ہونے کا فتویٰ دینے لگیں۔

حدیث کو وحی سمجھکر پڑھا اور سنا جائے

قرآن وحی متلو ہے اور حدیث وحی غیر متلو ہے لیکن اس کا سرچشمہ اور مخزن و منبع بھی اللہ رب العزت کی ہی ذات ہے۔ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

(قال) ان الناس یقولون اکثر ابوھریرۃ ولولا آیتان فی کتاب اللہ ما حدثت حدیثا ثم یتلو ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات ..... الی قولہ الرحیم - ان اخواننا من المھاجرین کان یشغلھم الصفق بالاسواق وان اخواننا من الانصار کان یشغلھم العمل فی اموالھم وان ابا ھریرۃ کان یلزم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشبع بطنہ یحضر ما لا یحضرون ویحفظ ما لا یحفظون (بخاری شریف ج۱ ص۲۲)

ترجمہ: بیشک لوگ کہتے ہیں کہ ابوہریرہ بہت حدیثیں روایت کرتا ہے۔ قرآن کریم میں اگر یہ دو آیتیں نہ ہوتیں تو میں کوئی بھی حدیث بیان نہ کرتا۔ پھر آپ نے وہ آیتیں پڑھیں (۱) بیشک جو لوگ ہدایت اور ان روشن باتوں کو جو ہم نے اتاریں

چھپاتے ہیں بعد اس کے کہ ہم نے لوگوں کے لئے بیان کر دیا وہ ایسے ہیں کہ اللہ ان پر لعنت کرتا ہے اور سب لعنت کرنیوالے بھی ان پر لعنت کرتے ہیں۔ (۲) مگر وہ لوگ جنہوں نے توبہ کی اور (جو چھپایا تھا) بیان کر دیا سو میں ان کی توبہ قبول کرتا ہوں اور میں تواب قبول کرنیوالا رحم کرنے والا ہوں۔ (پ۲ البقرہ ع ۱۹) (حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا) ہمارے مہاجر بھائیوں کو مارکیٹوں میں آنے جانے کی مصروفیت رہتی اور انصار بھائیوں کو کھیتی باڑی کی مصروفیت روکے رکھتی اور ابو ہریرہ (یعنی ہیں) پیٹ بھوکا رکھے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس پکڑے رہتا اور جہاں اور نہ جا سکتے وہاں بھی جاتا اور جو باتیں اور یاد نہ رکھ سکتے انہیں بھی یاد رکھتا (سو اس لئے وہ زیادہ حدیثیں روایت کرتا ہے۔)

اس روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے صریح طور پر حدیث کو رب العزت کے ما انزلنا (جو ہم نے نازل کیا) میں داخل سمجھا ہے۔ آپ کے اس ارشاد پر صحابہ و تابعین میں سے کسی کا انکار ثابت نہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حضرات حدیث کو وحی الٰہی سمجھ کر پڑھتے اور پڑھاتے اور سنتے اور سناتے تھے اور حضرت حسان بن عطیہؒ نے تو اس پر جبریلؑ کے آنے کی بھی صراحت کر دی ہے۔

(قال) کان جبریل علیہ السلام ینزل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالسنۃ کما ینزل علیہ بالقرآن و یعلمہ ایاھا کما یعلمہ القرآن (قواعد التحدیث من فنون مصطلح الحدیث للشیخ جمال الدین القاسمی الدمشقی)

ترجمہ: حضرت جبریل علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم (کے قلب مبارک پر) سنت لیکر بھی اسی طرح اترتے تھے جسطرح قرآن کریم لیکر نزول فرماتے اور آپ کو سنت بھی اسی طرح سکھاتے تھے جسطرح آپ کو قرآن سکھاتے تھے۔

حدیث پڑھنے میں ادب کو ملحوظ رکھے

قرأت حدیث کے وقت جب بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی آئے وہاں صلی اللہ علیہ وسلم ضرور ساتھ کہے اور جہاں انبیاء کرام علیہم السلام میں سے کسی کا نام آئے وہاں بھی علیہ السلام پڑھے اور جب صحابہؓ اور امہات المؤمنین کا نام گرامی آئے وہاں ترضی (رضی اللہ عنہ کہنا) کی پوری پابندی کرے۔

انبیاء کرامؑ اور صحابہ کرامؓ کی شخصیات علم حدیث کا محور ہیں انہی کے گرد یہ سارا علم گھومتا ہے۔ ان کا پورا احترام نہ کیا جائے گا تو حدیث کا طالب علم کبھی ساحل مراد پر نہ اتر سکے گا۔

صحابہ کرامؓ کیلئے دو طرفہ رضا

قرآن کریم میں صحابہؓ کے لئے دو طرفہ رضا کا بیان ہے۔ ایک یہ کہ اللہ ان سے راضی ہوا اور دوسرا یہ کہ وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ ان حضرات سے اللہ کا راضی ہونا ہی کافی تھا۔ رضوان من اللہ اکبر سے آگے اور کس مقام رضا کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ لیکن اللہ رب العزت نے ان نفوس قدسیہ کے ایمان و اخلاص کی اس طرح شہادت دی کہ محبت خداوندی میں ان حضرات کی طبیعت شریعت ہو چکی تھی اللہ اور رسول کی ہر بات ان کے لئے ان کی اپنی خوشیوں میں ایک نیا اضافہ ہوتا تھا وہ اللہ اور اس کے رسول کی ہر بات میں دل و جان سے راضی تھے۔

انسان جب کبھی کسی مقصد کی راہ میں قدم اٹھاتا ہے اور مصیبتوں سے دوچار ہوتا ہے تو دو طرح کی حالتیں پیش آتی ہیں کچھ لوگ جوانمرد اور باہمت ہوتے ہیں وہ بلا تامل ہر طرح کی مصیبتیں جھیلتے ہیں لیکن انکو جھیلنا جھیل لینا ہی ہوتا ہے۔ یہ بات نہیں ہوتی کہ مصیبتیں نہ رہی ہوں عیش و راحت ہو گئی ہو۔ کیونکہ مصیبت پھر مصیبت ہے۔ باہمت آدمی کڑوا گھونٹ

بوالہوسی جھجک کے پی لے گا لیکن اس کی کڑواہٹ کی بدمزگی محسوس ضرور کرے گا لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں صرف ہاہست ہی نہیں کہنا چاہیئے بلکہ اس سے بھی زیادہ کچھ کہنا چاہیئے۔ ان میں صرف ہمت و جوانمردی ہی نہیں بلکہ عشق و شیفتگی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے وہ مصیبتوں کو مصیبتوں کی طرح نہیں جھیلتے بلکہ عیش و راحت کی طرح ان سے لذت و سُرور حاصل کرتے ہیں۔ راہِ محبت کی ہر مصیبت ان کے عیش و راحت کی ایک نئی لذت بن جاتی ہے۔ اگر اس راہ میں کانٹوں پر لوٹنا پڑے تو کانٹوں کی چبھن میں انہیں ایسی راحت ملتی ہے جو کسی کو پھولوں کی سیج پر لوٹ کر نہیں مل سکتی۔ حتیٰ کہ اس راہ کی مصیبتیں جسقدر بڑھتی جاتی ہیں اتنی ہی زیادہ ان کے دل کی خوشحالیاں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ ان کے لئے صرف اس بات کا تصور کہ یہ سب کچھ کسی کی راہ میں پیش آرہا ہے اور اس کی نگاہیں ہمارے حال سے بے خبر نہیں عیش و سُرور کا ایک ایسا بے پایاں جذبہ پیدا کر دیتا ہے کہ اس سرشاری میں جسم کی کوئی کلفت اور ذہن کی کوئی اذیت محسوس ہی نہیں ہوتی۔

یہ بات سُننے میں عجیب معلوم ہوتی ہوگی لیکن فی الحقیقت اتنی عجیب حالت نہیں بلکہ انسانی زندگی کے معمولی واردات میں سے ہے اور عشق و محبت کا مقام تو بہت بلند ہے۔ بوالہوسی کا عالم بھی ان واردات سے خالی نہیں۔

کہ حریف کاوش مژگان خونریزش نہ ناصح ٭ بدست آور رگِ جانِ و نشتر را تماشا کن

سابقون الاولون کی محبت ایمانی کا یہی حال تھا۔ ہر شخص جو ان کی زندگی کے سوانح کا مطالعہ کرے گا بے اختیار تصدیق کرے گا کہ انہوں نے راہِ حق کی مصیبتیں صرف جھیلی ہی نہیں بلکہ دل کی پوری خوشحالی اور روح کے کامل سُرور کیساتھ اپنی پوری زندگیاں ان میں بسر کر ڈالیں۔ ان میں سے جو لوگ اول دعوت میں ایمان لائے تھے ان پر شب و روز کی جانکاہیاں اور قربانیوں کے پورے ۲۳ برس گزر گئے لیکن اس تمام مدت میں کہیں سے بھی یہ بات دکھائی نہیں دیتی کہ مصیبتوں کی کڑواہٹ ان کے چہروں پر کبھی کھلی ہو۔ انہوں نے مال و علائق کی ہر قربانی اس جوش و مسرت کے ساتھ کی گویا دنیا جہان کی خوشیاں اور راحتیں ان کے لئے فراہم ہو گئی ہیں اور جان کی قربانیوں کا وقت آیا تو اس طرح خوشی خوشی گردنیں کٹوا دیں گویا زندگی کی سب سے بڑی خوشی زندگی میں نہیں موت میں تھی لے۔

تعلیمِ حدیث میں یکطرفہ ترضی پر اکتفا

علماءِ حدیث صحابۂ کرام ہو کے نام پر دو طرفہ ترضی نہیں کہتے صرف رضی اللہ عنہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہ قرآنِ کریم کے بظاہر خلاف ہے۔ قرآنِ کریم رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کہہ کر دو طرفہ اظہارِ رضا کرتا ہے۔ جواباً عرض ہے کہ روایتِ حدیث میں صحابہؓ کا نام سند کے طور پر آتا ہے اور ہمارے لئے یہ بات کافی ہے کہ اللہ ان سے راضی ہوا، تبھی تو وہ ہمارے لئے سند بنے کہ انکی پیروی سے ہم سے بھی اللہ راضی ہوگا۔ رہی یہ بات کہ وہ بھی خدا سے راضی ہو گئے، یہ انکے اپنے محبوبِ خدا ہونے کا تذکرہ ہے۔ جس میں ہم ان کے اور خدا کے درمیان کسی پہلو سے دخل نہیں رکھتے۔ سو سنتِ اسلاف اسی طرح جاری ہوئی کہ انکے اسماءِ گرامی کے بعد یکطرفہ ترضی کو کافی سمجھ لیا گیا۔

حدیثِ رسولؐ کو احادیثِ صحابہؓ سے علیحدہ نہ کرے

اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حدیث کے عملی گواہ سمجھتے ہوئے ان کی مرویات کو روایاتِ نبوی کیساتھ ہی بیان کرے جہاں دو مختلف حدیثیں بظاہر مختلف یا متعارض ملیں تو وہاں صحابہ کے عمل سے فیصلہ لازم جانے۔

لے ترجمان القرآن ۲ ص ۱۴۳

امام ابوداؤد السجستانی (ھ ۲۷۵) لکھتے ہیں : اذا تنازع الخبران عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم نظر الی ما عمل بہ اصحابہ من بعدہ ۔ (بذل المجہود فی حل ابی داؤد ص۳۷۶) ترجمہ : جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو مختلف خبریں ملیں تو دیکھا جائیگا کہ آپ کے بعد آپ کے صحابہؓ نے کس پر عمل کیا یعنی وہ سنت باقیہ ہوگی اور دوسری جانب منسوخ یا مخصوص بالحال سمجھی جائیگی۔

حضرت امام مالکؒ سے بھی سن لیجئے : اذا جاء حدیثان مختلفان عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وبلغنا ان ابابکر وعمر عملا باحدھما وترکا الآخر کان فی ذالک دلالۃ علی ان الحق فیما عملا بہ ۔ لہ

حضرت صالح بن کیسان کہتے ہیں کہ میں اور امام ابن شہاب زہریؒ (۱۲۴ ھ) سماع حدیث اور طلب علم میں ساتھی تھے ہم دونوں نے حدیث لکھنے کا فیصلہ کیا اور حدیث لکھتے رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احادیث ہم تک پہنچیں ہم نے لکھیں پھر امام زہریؒ نے کہا : نکتب ایضاً ما جاء عن اصحابہ فقلت لولیس بسنۃ فقال بل ھی سنۃ (قال) فکتب ولم اکتب فانجح وضیعت۔

ترجمہ : ہم وہ روایات بھی لکھیں جو صحابہ سے آئی ہیں۔ میں (صالح) نے کہا نہیں وہ تو سنت نہیں۔ امام زہری نے کہا وہ بھی سنت ہیں۔ (صالح نے کہا) سو زہری نے تو (روایات صحابہ بھی) لکھیں اور میں نے نہ لکھیں، زہری کامیاب گئے اور میں ضائع ہوا۔

صالح بن کیسان کا یہ اعتراف بتلا رہا ہے کہ اب وہ بھی اس عقیدے پر آگئے تھے کہ اعمال صحابہ سنت ہیں اور انہیں بھی امت تک پہنچانا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ ان نفوس قدسیہ کے آثار کو بھی حدیث کا ہی سرمایہ سمجھا جائے اور ان کا اس درجہ احترام ہو کہ ان کا عمل تعامل بھی دین کا پورا ماخذ سمجھا جائے، اور ان کا وہی احترام ہو جو صحابہ کرامؓ کا ہو سکتا ہے۔

امام مالک، امام احمد، امام بخاری، امام دارمی، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام ابوعوانہ، امام ترمذی، امام نسائیؒ، امام طحاوی اور امام بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین وغیرہم من الائمۃ الکرام نے اپنی حدیث کی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و اعمال کیساتھ ساتھ صحابہ کرامؓ کے آثار روشن کو بھی بڑی وسیع جگہ دی ہے اور بڑی تفصیل سے انہیں ذکر کیا ہے اور جگہ جگہ ان سے روایات کی ہیں، سو جو ان سے بے پرواہ رہا اس نے اپنے علم کو ضائع کیا۔

حضرت امام شعبیؒ (۱۰۳ ھ) فرماتے ہیں :

ما حدثوک عن اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فخذوا بہ وما قالوا برأیھم فبل علیہ

ترجمہ : علماء کرام تمہارے سامنے جو بات صحابہؓ سے روایت کریں تو اسے لے لو اور جو بات وہ اپنی طرف سے ہیں تو اُسے جانے دو۔

امام اہل الشام امام اوزاعی (۱۵۷ ھ) نے بقیہ بن الولید کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا :

یا بقیۃ العلم ما جاء عن اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم وما لم یجئ عن اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم فلیس بعلم۔ مقدمہ اوجز المسالک ص۱

ترجمہ : اے بقیہ! علم وہی ہے جو اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے آئے اور جو ان سے نہیں آیا وہ علم ہی نہیں۔

سو صحابہ کا ادب وہی ہے جو ایک مسلمان کے دل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دائرہ فیض کا ہو سکتا ہے یہی وہ دائرہ ہے جس کا ہر نشان مرکز سے برابر نسبت رکھتا ہے حق یہ ہے کہ صرف انہی حضرات کے ذریعہ مرکز سے تعلق قائم رہ سکتا ہے کیونکہ یہ دائرہ اس مرکزِ نبوت پر ہی تو کھچا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس اُمت میں صحابہ کرامؓ کا درجہ ہے۔ یہ حضرات بھی جیسا کہ گذارش کیا جا چکا ہے حدیث کا موضوع ہیں لہٰذا ان کی تعظیم و تکریم بھی تبعاً لازم ہے۔ قرآن کریم کی روشنی میں اس کی بھی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

مقامِ صحابہؓ قرآن پاک کی رُو سے

جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب بایں جہت کہ آپ اللہ کے رُسول ہیں سب پر لازم ہے اسی طرح صحابہ کرام کا ادب بھی بایں جہت کہ آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ اور تربیت یافتہ ہیں سب پر لازم ہونا چاہیئے۔ صحابہ کرام کی عزت و عظمت اور ان کے تقویٰ قلوب کے بارے میں قرآنِ کریم میں ہے:

ان الذین یغضون اصواتھم عند رسول اللہ اولٰئک الذین امتحن اللہ قلوبھم للتقوٰی لھم مغفرۃ و اجر عظیم ﴿ (پ ۲۶: الحجرات: ع ۱)

ترجمہ: "جو لوگ دبی آواز سے بولتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس وہی ہیں جن کے دلوں کو جانچ لیا ہے اللہ نے ادب کے واسطے ان کے لئے معافی ہے اور بڑا ثواب"

یہ خدا کی گواہی ہے کہ صحابہ کرامؓ کے دل تقویٰ کی دولت سے مالا مال تھے اللہ نے انہیں پوری طرح جانچ لیا تھا جو باتیں پہلے ان سے ہو چکیں اُن پر مغفرت کا وعدہ دے دیا اور آئندہ اعمال پر ان کے لئے اجر ہی اجر کی بشارت دی اور فرمایا کہ وہ بڑا اجر پائیں گے۔ تقویٰ کی بات اس طرح ان کے دلوں کے ساتھ لازم کی کہ گویا وہ ان کا جوہر ذات ہے اور حق یہ ہے کہ وہی حضرات ان کے زیادہ حقدار تھے۔ قرآن کریم میں ہے:

الزمھم کلمۃ التقوٰی وکانوا احق بھا واھلھا (الفتح: پ ۲۶: ع ۳)

ترجمہ: "اور لازم کر دیا ان کے ساتھ کلمہ تقویٰ اور وہی اس کے زیادہ حقدار تھے اور اس کے اہل تھے:

کلمہ تقویٰ سے ان کی بصیرت چمک اٹھی تھی اور ادب رسالت سے ان کی بصیرت آسمانِ عروج پر پہنچی تھی اب ان کا ہر فعل اور ہر قول حقیقتہً علمِ رسالت کا ہی ترجمان تھا اور جو کچھ ان کا اجتہاد تھا اس کا مدار بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہی تھی۔

قرآن کریم جس احترام سے صحابہ کرامؓ کا ذکر کرتا ہے اس سے لازم ہے کہ ان کی روایات، ان کے ارشادات اور ان کے اعمال کو اسی عقیدت و بصیرت سے قبول کیا جائے جو عقیدت ان کی قرآن کریم مسلمانوں کے دلوں میں بٹھاتا ہے۔ اگر ان حضرات کی ذوات صدق و صفات حدیث کا موضوع نہ ہوتیں تو قرآن کریم اس طرح انہیں آئینہ عظمت میں نہ اتارتا۔ حق یہ ہے کہ یہی حضرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ سنن و نوامیس کے حافظ و وارث تھے:

ء مات رسول اللہ فیھا و بعدہ بسنتہ اصحابہ قد تاؤلبوا
وفرق سبیل العلم فی تابعیھم وکل امرئ منھم لہ فیہ مذھب
حضورؐ کی وفات کے بعد آپ کے صحابہ آپ کے طریقے پر چلے اور علم کی راہیں ان کے تابعین میں بٹ گئیں اور ان میں سے ہر مرد ایک مستقل مسلک پر چلنے لگا۔

مقام صحابہؓ تاریخ کے آئینہ میں مولانا ابوالکلام آزادؒ نے صحابہؓ کی تاریخ کا نقشہ کس ایجاز سے کھینچا ہے۔ اسے دیکھئے:
"محبت ایمان کی اس آزمائش میں صحابہ کرام جس طرح پورے اترے اس کی شہادت تاریخ نے محفوظ کرلی اور وہ محتاج بیان نہیں۔ بلاشائبہ ومبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں انسانوں کے کسی گروہ نے کسی انسان کے ساتھ اپنے سارے دل اور اپنی ساری روح سے ایسا عشق نہیں کیا ہوگا جیسا صحابہؓ نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے راہ حق میں کیا۔ انھوں نے اس محبت کی راہ میں وہ سب کچھ قربان کردیا جو انسان کرسکتا ہے اور پھر اسی کی راہ سے سب کچھ پایا جو انسانوں کی کوئی جماعت پاسکتی ہے۔"

صحابہ کرامؓ کی روایت پر رائے زنی سے بچئے حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے پوچھا گیا کہ جب صحابہ کرامؓ کسی مسئلہ میں خود مختلف ہوں تو ان میں غور کرنا کہ کس کی بات درست ہے کیا جائز ہے؟
تو آپ نے فرمایا "نہیں" تم جس کی چاہو پیروی کرلو۔ لیکن ان میں سے کسی کے موقف پر رائے زنی نہ کرو۔

اذا اختلف اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مسألۃ ھل یجوز فیہ ان ننظر فی اقوالھم لنعلم مع من الصواب منھم فنتبعہ؟ فقال لی "لا یجوز النظر بین اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقلت کیف الوجہ فی ذلک قال تقلد ایھم احببت۔

ترجمہ: صحابہ کرامؓ کا جب کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو کیا جائز ہے کہ ہم ان کے اقوال کا جائزہ لیں کہ راستی کس کے پاس ہے کہ ہم اس کی پیروی کریں؟ تو آپ نے فرمایا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جائزہ لینا جائز نہیں۔ میں نے کہا پھر کیا کریں آپ نے فرمایا ان میں سے جس کی بات پسند ہو اس کی تقلید کریں۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے استاذ ہیں۔ انہوں نے صحابہ کرامؓ کی روایات سے تمسک کرنے میں وہی موقف اختیار کیا ہے جو حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا ہے۔ (جامع بیان العلم جلد ۲ ص۸۳) ہر دو صحابہؓ کے فیصلوں کو اپنے لئے حجت اور سند سمجھتے ہیں اور اعتقاد رکھتے تھے کہ ان کی بات پر امت کو رائے زنی کی اجازت نہیں ہے۔

حدیث اور اصول حدیث کے امام ابن صلاحؒ بھی لکھتے ہیں کہ صحابہؓ کی خصوصیت ہے کہ ان میں سے کسی کی عدالت پر سوال نہیں کیا جاسکتا۔ سب کے سب عادل ہیں اور امت کے لئے سند ہیں۔

لکونھم علی الاطلاق معدلین بنصوص الکتاب والسنۃ واجماع من یعتد لہ فی الاجماع من الامۃ قال تعالیٰ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس۔ (علوم الحدیث للامام ابن صلاح ص۲۶۴)

لہ التمہید لابن عبدالبر ج۴ ص۲۶۳ لہ جامع بیان العلم وفضلہ از حافظ ابن عبدالبر ج۲ ص۱۰۲

یہ ایک طے شدہ مسئلہ ہے کہ قرآن و سنت کی نصوص قطعیہ اور ان لوگوں کے اجماع سے جن کا اجماع امت میں معتبر ہے یہ ثابت ہے کہ صحابہ علی الاطلاق عادل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم بہترین امت ہو جو باقی لوگوں کے لئے سند ہو۔

صحابہؓ روایت میں تائید سے مستغنی ہیں

محدثین کے ہاں راوی کتنا ہی ثقہ کیوں نہ ہو کثرت ثقات سے روایت میں اور قوت آجاتی ہے مگر صحابی چونکہ خود سند ہے اس لئے اس کی کتنی ہی تائید کیوں نہ ہو ان کی ذوات عادلہ تائید سے مستغنی ہیں۔ جب ایک صحابی کوئی حدیث روایت کرے تو اس کی تصدیق کے لئے دوسرے کے پاس جانا بالکل بے ضرورت ہے۔ صحابی کی بات خود اپنی جگہ ایسی قوی ہے کہ اسے مزید تائید کی ضرورت نہیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر اپنے بیٹے کو نصیحت فرمائی حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حضرت سعد بن ابی وقاص سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سن کر مزید تسلی چاہی تھی۔

اذا حدثک شیئًا سعدؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فلا تسأل عنہ غیرہ [۱]

ترجمہ: جب سعد تیرے سامنے حضورؐ کی کوئی حدیث بیان کریں تو اسکے بارے میں کسی اور سے پوچھنے کی کوئی حاجت نہیں۔

حدیث کی سماعت کے وقت مجلس کا احترام

حدیث کی سماعت کے وقت محدث کے سامنے بڑے ادب و احترام سے بیٹھے۔ حضرت امام بخاریؒ نے باب باندھا ہے باب من برک علی رکبتہ عند الامام او المحدث یعنی جو شخص امام اور محدث کے سامنے تلمذ کا شرف حاصل کر رہا ہو اُسے دو زانو ہو کر بیٹھنا چاہئے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حدیث بیان فرما رہے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک خاص کیفیت طاری تھی۔ آپؐ نے فرمایا سلونی (مجھ سے کچھ پوچھ لو) اس پر حضرت عمرؓ فوراً دو زانو ہو گئے فبرک عمر علی رکبتہ (بخاری شریف جلد ا ص۲۲ مصر) امام بخاریؒ نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جب حدیث بیان ہو تو اپنی ہیئت اور انداز نشست میں بھی ادب کا خیال رکھے اور دو زانو بیٹھے۔

بلکہ علماء تو یہ لکھتے ہیں: "جس مجلس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پڑھی یا بیان کی جا رہی ہوں اس میں بھی شور و شغب کرنا بے ادبی ہے کیونکہ آپ کا کلام جس وقت آپ کی زبان مبارک سے ادا ہو رہا ہو اس وقت سب کیلئے خاموش ہو کر اس کا سننا واجب اور ضروری تھا اسی طرح بعد وفات جن مجلسوں میں آپ کا کلام سنایا جاتا ہو وہاں بھی بدستور شور و شغب کرنا بے ادبی ہے۔" [۲]

روایت حدیث کے وقت کسی اور طرف توجہ نہ کرے

حدیث شریف پڑھتے پڑھاتے سنتے سناتے وقت کسی کی طرف توجہ بھی نہ کرے اور درمیان قرأت حدیث یا سماع حدیث میں کسی کی بات کا جواب نہ دے۔ حضرت امام بخاری نے اپنی صحیح میں باب باندھا ہے: باب من سئل علماء وھو مشتغل فی حدیثہ فاتم الحدیث ثم اجاب السائل یعنی اگر کوئی تم سے اس حال میں کوئی مسئلہ دریافت کرے کہ تم حدیث ہی میں مشغول ہو تو تم پر لازم ہے کہ پہلے حدیث کا اتمام کرو۔ پھر اس سائل کا جواب دو۔ یہی ادب حدیث ہے۔ اس لئے

---

[۱] صحیح بخاری جلد ا ص۳۲ [۲] معارف القرآن جلد ۸ ص۱۰۱

کہ اگر آپ نے حدیث کو درمیان میں چھوڑا اور دوسرے کی بات کا جواب دیا تو تمہارے عمل نے یہ ثابت کیا کہ تم حدیث نبوی پر کسی اور کی بات مقدم سمجھ رہے ہو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ ایک مجلس میں حدیث بیان کر رہے تھے کہ ایک شخص آیا اور اس نے پوچھا قیامت کب آئے گی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پہلی بات میں ہی معروف رہے۔ جب آپ اپنی حدیث پوری کر چکے تو دریافت فرمایا سائل کہاں ہے؟ اس اعرابی نے کہا یا رسول اللہ میں یہاں ہوں فرمایا جب امانتیں ضائع ہونے لگیں تو قیامت کا انتظار کرو۔ اس نے پوچھا امانتوں کا ضائع ہونا کیسا ہوگا؟ آپ نے فرمایا: اذا وسد الامر الی غیر اھلہ فانتظر الساعۃ

ترجمہ: جب کام ان لوگوں کے سپرد ہونے لگے جو اس کے اہل نہیں تو قیامت کا انتظار کرو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل مبارک سے ثابت ہوا کہ حدیث کو نامکمل چھوڑ کر دوسرے کی طرف متوجہ ہونا ادب حدیث کے خلاف ہے۔ یہ حدیث اس بحث میں بھی پیش کی جاسکتی ہے کہ حدیث کا ادب خود دربار رسالت میں کتنا تھا۔

حضرت امام مالکؒ کا عمل اس بارے میں کیا تھا۔ اسے حضرت ابو قتادہؓ سے سنیئے!

امام مالکؒ ہمارے سامنے حدیث بیان کر رہے تھے تو ان کو بچھو نے سولہ مرتبہ ڈنگ مارا اور امام مالکؒ کا رنگ متغیر ہو گیا چہرہ زرد پڑ گیا مگر حدیث کو درمیان میں قطع نہیں فرمایا۔ جب بیان حدیث سے فارغ ہو گئے اور جب سب لوگ روانہ ہو گئے تو میں نے ان سے عرض کیا اے ابو عبداللہ (امام مالکؒ کی کنیت) میں نے آج آپ کا عجیب حال پایا؟ امام مالکؒ نے فرمایا کہ آج حدیث پڑھاتے وقت بچھو نے سولہ جگہ ڈنگ مارا مجھے اس سے تکلیف ہو رہی تھی۔ لیکن میں حدیث کے اجلال و تعظیم کی بناء پر صبر کرتا رہا[2]

معروف اہل فن سے اخذ روایات

اہل علم میں جن اساتذہ کی کسی خاص فن میں شہرت ہو اس فن میں انہی کی طرف رجوع کرے کا ملین فن کے ساتھ مختصر سا وقت بھی بسر ہو جائے تو طالب علم صحیح سمت چل پڑتا ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر (۱۵۳ھ) ارشاد فرماتے ہیں:

لا یوخذ العلم الا عمن شھد لہ بطلب الحدیث [3]

علم انہی لوگوں سے حاصل کیا جائے جو علم حدیث میں شہرت پا چکے ہوں۔ یہ طرز رہے کہ ان مشائخ نے یہ علم باقاعدہ اساتذہ سے حاصل کیا ہو محض مطالعہ اور تجربہ سے نہ سیکھا ہو۔ دین کی اساس لٹریچر نہیں وارثین انبیاء سے باقاعدہ تعلیم و تعلم ہے۔ خطیب بغدادی لکھتے ہیں:

یجب ان یکون حفظہ ماخوذاً عن العلماء لا عن الصحف [4]

ضروری ہے کہ اس کی یادداشت علماء سے ماخوذ ہو لٹریچر سے نہیں۔

حافظ عبدالرحمٰن ابو زرعۃ دمشقی (۲۸۱ھ) حضرت سعید بن عبدالعزیز سے روایت کرتے ہیں۔

لا یوخذ الحدیث من صحفی [5] حدیث لٹریچر والوں سے نہ لی جائے۔

---

[1] بخاری شریف صـ ۲۳ [2] مدارج النبوۃ جلد ا صـ ۵۴۲ [3] الکفایہ فی علوم الروایۃ صـ ۱۶۱ [4] ایضاً صـ ۱۶۳ [5] تاریخ ابی زرعۃ الدمشقی جلد ا صـ ۳۱۸

اس سے معلوم ہوا کہ علم دین کی اساس علماء وارثین انبیاء ہیں۔ لٹریچر اور رسائل سے دین حاصل نہیں کیا جا سکتا صحافی قسم کے لوگوں سے علم دین حاصل کرنے کی کوشش بے فائدہ اور بے ثمر رہے گی۔ امیر المومنین فی الحدیث امام شعبہ (۱۶۰ھ) فرماتے ہیں:

خذوا العلم من المشتہرین[1] علم ان لوگوں سے حاصل کرو جو اس علم میں مشہور ہو چکے ہوں۔

حضرت سلمان بن موسیٰ نے نصیحت فرمائی:

لا تاخذوا العلم من الصحفیین ـــــ لا یوخذ العلم من صحفی[2]

ترجمہ: علم صحافی قسم کے لوگوں سے جو لٹریچر اٹھائے پھرتے ہوں ہرگز نہ لو علم لٹریچر سے نہیں (علماء سے) لیا جاتا ہے۔

غیر اہل فن نیک لوگوں کی روایات

کہیں ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو گو اپنے حلقہ میں نیک اور بزرگ سمجھے جاتے ہوں مگر علم و فن سے ناآشنا ہوں۔ جاہل صوفی آپ کو اکثر دینی حلقوں میں ملیں گے یہ لوگ اپنی جگہ کتنے ہی نیک اور کتنے ہی بزرگ کیوں نہ ہوں ان پر روایت کا مدار نہیں ہو سکتا۔ یہ لوگ حدیث میں ہرگز سند اور حجت نہیں ہو سکتے نہ ان لوگوں کی روایت قابل قبول شمار ہوگی علم کا حق اہل علم ہی ادا کر سکتے ہیں۔ امام وکیع (۱۹۷ھ) سے ایک روایت کے بارے میں پوچھا گیا آپ نے دریافت کیا من یرویہ (اسے کون روایت کرتا ہے؟) عرض کی گئی وھب بن اسمٰعیل اس پر آپ نے فرمایا: ذالک الرجل صالح وللحدیث رجال یہ شخص نیک ہے اور حدیث کے اہل اور لوگ ہوتے ہیں۔

امام مالکؒ نے ان لوگوں کی فہرست میں جن سے علم نہ لیا جائے یہ بھی لکھا ہے:

و رجل لہ فضل وصلاح لا یعرف مایحدث بہ[3]

روایت کے علاوہ فتوے میں بھی اہل کشف کی بات نہ مانی جائے گی۔ یہاں فقہاء کا اعتبار ہوگا۔ صوفی قسم کے لوگ بعض اوقات کشف سے کوئی بات کہہ دیتے ہیں اور اس کی بات صحابہؓ تک نہیں پہنچی ہوتی۔ علماء کے نزدیک دین وہی ہے جو صحابہؓ سے ملے۔ علماء حقیقت میں صحابہ ہی ہیں اور باقی سب ان سے خوشہ چین ہیں۔

مجاہد (۱۰۰ھ) کہتے ہیں: العلماء اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم[4]

حضرت حذیفہ بن الیمان (۳۶ھ) فرماتے ہیں: کل عبادۃ لم یتعبد ھا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلا تعبدوھا۔ ترجمہ: دین کا ہر عمل جسے صحابہؓ نے دین نہ سمجھا ہو تم اس راہ سے خدا کے آگے نہ جھکنا اسے دین نہ سمجھنا۔

حضرت امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بھی فرماتے ہیں:

عمل صوفیہ در حل وحرمت سند نیست ہمیں بس است کہ ما ایشاں را معذور داریم و ملامت نہ کنیم و امر ایشاں بالحق سبحانہٗ وتعالیٰ مفوض داریم اینجا قول امام ابی حنیفہ وامام ابی یوسف وامام محمد معتبر است نہ عمل ابو بکر شبلی و ابو الحسن نوری[5]

ترجمہ: صوفی قسم کے لوگوں کا عمل حلال و حرام کے امتیاز میں سند نہیں ہے یہی کافی ہے کہ ہم انہیں معذور سمجھیں اور ملامت نہ کریں اور ان کا معاملہ خدا کے سپرد کریں۔

سو علم وہی ہے جو انبیاء علیہم السلام اور ان کے وارثین سے تعلیم و تعلم کے ذریعے جاری ہوا۔ اس کے سوا بات جس

---

[1] الکفایہ صفحہ ۱۶۱ [2] الکفایہ صفحہ ۱۶۲، تاریخ ابی زرعہ صفحہ ۳۶۸ [3] جامع البیان العلم جلد ۲ صفحہ ۴۰ [4] جامع البیان العلم صفحہ ۳۵
[5] مکتوبات امام ربانی فارسی دفتر اول مکتوب نمبر ۲۶۶ صفحہ ۳۳۵ لکھنؤ

راہ سے بھی آئے اس کا نام علم نہیں ہو سکتا۔

لیس العلم المعتبر الا الماخوذ من الانبیاء و ورثتھم علی سبیل التعلم (فتح الباری ج ۱ ص ۱۶۱)

ترجمہ: علم معتبر وہی ہے جو انبیاء علیہم السلام اور ان کے وارثوں سے تعلیم کے طور پر ملے۔

سو کشف وغیرہ سے حاصل شدہ معلومات کا نام علم نہیں اور نہ وہ حجت ہے۔

صغر سنی میں سنی گئی روایات

محدثین نے اس نکتہ پر بھی بحث اٹھائی ہے کہ چھوٹی عمر کے بچے کی روایت کیا معتبر ہے؟ روایت کرتے وقت وہ بیشک بیدار مغز اور ضابطہ ہے لیکن جس دور کی سنی بات وہ ذکر کر رہا ہے اسوقت وہ بچہ تھا کیا اسوقت کی روایات اس سے لی جا سکتی ہیں؟

اس کا جواب ہاں میں ہے۔ صحابہؓ کی تو مرسلات بھی حجت ہیں گو وہ جس دور کی روایت کر رہے ہوں اس میں پیدا بھی نہ ہوئے ہوں۔ لیکن دوسرے صغر سن راویوں کی روایت بھی عند المحققین لائق قبول ہوگی بشرطیکہ روایت کرنے کے وقت وہ پورے عادل اور ضابطہ ہوں، قواعد پر پوری نظر رکھتے ہوں۔

عہد جدید کے جو لوگ حدیث سے جان چھڑانا چاہتے ہیں وہ اس نکتہ کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ حدیث کا جو ذخیرہ حضرت حسن (۵۰ھ) حضرت عبداللہ بن عباس (۶۸ھ) حضرت نعمان بن بشیر (۶۴ھ) حضرت ابو سعید الخدری (۷۴ھ) اور حضرت انس بن مالک (۹۱ھ) جیسے اکابر سے مروی ہے اسے بیک جنبش قلم ایک طرف رکھ سکیں۔ ان حضرات کی عمریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت بالترتیب ۸ سال، ۸ سال، ۱۰ سال، ۹ سال، ۱۹ سال اور ۱۹ سال کے قریب تھیں اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی صغر سنی تو معروف ہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حضرات نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی وفات سے پانچ چھ سال پہلے سے جو روایات سنی ہوں گی ان کا تحمل روایت کس عمر میں کیا ہوگا؟ سو ان حضرات کی روایات کو اگر صغر سنی کی بناء پر قابل قبول نہ سمجھا جائے تو دین کا آخر کونسا حصہ امت کے پلے میں رہے گا۔

خطیب بغدادی (۴۶۳ھ) نے الکفایہ میں اسپر پر سیر حاصل بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ راجح مذہب میں صغر سنی کی سنی گئی روایات حجت اور لائق قبول ہیں۔

محقق ابن ہمام (۸۶۱ھ) بھی فرماتے ہیں: من شرائط الراوی کونہ بالغاحین الاداء وان کان غیر بالغ وقت التحمل لاتفاق الصحابۃ وغیرھم علی قبول روایۃ ابن عباس وابن الزبیر والنعمان بن بشیر والنبی بلا استفسار عن الوقت الذی تحملوا فیہ ما یروونہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم[1]

ہاں اہل کوفہ روایت حدیث میں بہت زیادہ محتاط واقع ہوئے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو پہلے حفظ قرآن اور زہد و عبادت میں لگاتے اور جب محسوس کرتے کہ بچہ اب احترام حدیث کے لائق ہو چکا ہے تو اسے تعلیم حدیث کے لئے بٹھلاتے۔

خطیب بغدادی رقمطراز ہیں: ان اھل الکوفۃ لم یکن الواحد منھم یسمع الحدیث الا بعد استکمالہ عشرین سنۃ ویشتغل قبل ذالک بحفظ القرآن والتعبد[2]

---

[1] کمافی فتح الملہم جلد ۱ صفحہ ۴۳ [2] الکفایہ صفحہ ۵۴

اہل کوفہ میں سے ایک شخص بھی حدیث سننے کے لئے نہ بیٹھتا جب تک کہ بیس برس تک نہ پہنچ جاتا اور اس سے پہلے حفظ قرآن اور زہد و عبادت میں وقت لگاتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں صغر سن صحابہ نظر رسالت کے اثر اور آپ کی مجلس کی برکت سے ہی تقویٰ و تعبد کی وہ دولت پا لیتے تھے جو دوسرے نوجوانوں کو بیس برس کی عمر میں بھی نہ ملتی تھی۔ سو بعد کے زمانوں میں اہل اللہ نے تعلیم حدیث کے لئے اگر اس وقت بچے بٹھائے جب وہ حفظ قرآن اور تعبد اسلامی میں کافی آگے بڑھ چکے ہوں۔ تو یہ اس لئے نہ تھا کہ وہ اس سے کم عمر میں حدیث کا سننا اور تحمل روایت ناجائز سمجھتے تھے بلکہ یہ سب اہتمام محض احترام حدیث کے لئے تھا۔ ایک شدید احتیاط تھی جو ان کے عمل میں کارفرما تھی۔

امام علی بن المدینی (۲۳۴ھ) فرماتے ہیں: ہم حضرت جریر کے پاس بیٹھے تھے کہ ہم نے سماع حدیث میں کچھ سخت شرائط لگانی شروع کر دیں۔ آپ نے اس پر فرمایا تو انتم افقه من ابن المبارك! کیا تم حضرت عبداللہ بن مبارک سے زیادہ دین کی سمجھ رکھتے ہو؟ [1]

اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ حضرت عبداللہ بن مبارک سماع حدیث کے لئے سخت شرائط اور کسی شدت کے قائل نہ تھے نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ صغر سنی کی روایت کا قبول ہونا یا نہ ہونا اور تحمل روایت کے لئے کچھ شرطیں لگانا یا نہ لگانا یہ سب باتیں فقہ کا موضوع ہیں اور اس میں جو فیصلہ بھی سامنے آئے گا اس میں اجتہاد ضرور کارفرما ہوگا۔ اس پہلو سے دیکھیں تو اہل کوفہ کے عمل اور جمہور محدثین کے عمل میں اصولی طور پر کوئی تعارض نہیں ہے۔ نہ اہل کوفہ کم عمر میں روایت لینے کو ناجائز سمجھتے تھے۔ ان کا عمل محض احتیاط اور مزید احترام کے پہلو سے تھا اور یہ بھی محض رواج کے طور پر تھا۔ حافظ ابو نعیم فرماتے ہیں:

کان اهل الكوفة لا يخرجون اولادهم فی طلب الحديث صغاراً حتی يستكملوا عشرين سنة [2]

رواج کی بات اپنی جگہ رہی عام فہم بات اس بحث میں یہ ہے کہ فہم حدیث کی صلاحیت جس عمر میں پیدا ہو جائے اس میں وہ سننے کے لائق ہو جاتا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

ان المرد فی ذلك الی الفهم فيختلف باختلاف الاشخاص [3]

اس باب میں بات فہم پر لوٹائی جائے گی اور وہ مختلف لوگوں میں مختلف درجے میں ہوتا ہے۔

کبر سنی میں حدیث روایت کرنے سے احتیاط

عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت زید بن ارقمؓ سے کہا کہ ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث سنائیں۔ اس پر آپ نے فرمایا: كبرنا ونسينا والحديث عن رسول الله صلی الله علیه وسلم شديد [4]

ترجمہ: ہم بوڑھے ہو گئے اور بھولنے پر آ گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بات نقل کرنا تو بہت اہم بات ہے۔ (یعنی اس میں صحت کی بہت تاکید ہے)

اس سے پتہ چلا کہ آداب حدیث میں ایک ادب یہ ہے کہ روایت کرنے والا پوری پختگی اور تیقظ سے روایت کرے جسے بڑھاپے اور نسیان کا غلبہ ہو تو روایت سے احتراز کرے۔ اسی طرح لوگوں کو بھی نہ چاہیئے کہ ایسے حضرات کو روایت کرنے

---

[1] الکفایہ ص۶۰ [2] الکفایہ [3] فتح الباری جلد ۱ ص۱۷۱ [4] مقدمہ مشکوٰۃ ص۱۰۵

پر مجبور کریں ورنہ کوئی نہ کوئی بات درمیان سے ضرور رہ جائے گی۔ مولانا عبد القیوم بجنوری لکھتے ہیں کہ:
"جب کبھی کبر سن یا کسی مرض کی وجہ سے نسیان کا غلبہ ہو یا تغیر و تبدل حدیث کا اندیشہ ہو تو اس وقت حدیث کے بیان کرنے سے گریز کرنا چاہیئے"

حدیث بیان کرنیوالے سے مزید شہادت لینا

ثقہ راوی کی روایت از خود کافی شہادت ہے اس پر مزید شہادت کی ضرورت نہیں نہ ایسے قسم کہلوانے کی ضرورت ہے تاہم یہ صحیح ہے کہ اصولِ حدیث سب اجتہادی ہیں مقصود صحیح بات کو پالینا ہے وہ جس طرح بھی میسر آسکے اور یقین بڑھا سکے۔ خطیب بغدادی اصولِ حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں وجب الاجتہاد فی علم اصول لها[۱] جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس موضوع کی ہر بات میں اجتہاد سے کام لیا گیا ہے۔ فقہاء حدیث نے اپنے اپنے تفقہ کی روشنی میں اس کے اصول طے کئے ہیں سو اگر کسی خاص موضوع پر اس روایت کی مزید شہادت طلب کی جائے یا کوئی شخص کسی راوی حدیث سے قسم بھی کہلوائے تو اس میں مضائقہ نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے میراث جنین کی روایت میں حضرت مغیرہ بن شعبہ کی روایت پر اکتفا نہ کی جب تک کہ محمد بن مسلمہ سے اس کی تائید نہ سن لی۔ حضرت عمرؓ نے استیذان میں حضرت ابوموسیٰ الاشعری کی روایت پر اکتفا نہ کی یہاں تک کہ حضرت ابوسعید نے بھی اس کی شہادت دی۔ حضرت ام المؤمنینؓ نے زندوں کے رونے سے میت کو عذاب ہونے کی حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت میں تردد کا اظہار فرمایا تو اس کی یہ وجہ نہیں کہ ان اکابر کے ہاں ثقہ راوی کی خبر واحد حجت نہ تھی بلکہ اس مزید توثیق کی تلاش میں کوئی حرج نہیں۔ شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ اس بحث میں لکھتے ہیں کہ: واجیب بان ذلک انما وقع منهم اما عند الارتیاب ----- واما عند معارضة الدلیل القطعی کما فی انکار عائشۃؓ..... فقد جاء فی بعض طرقه ان عمر قال لابی موسیٰ اما انی لم اتهمک ولکن اردت ان یتجرأ الناس علی الحدیث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[۲]

اہل بدعت سے لیگئی روایات

اہل بدعت سے وہ لوگ مراد ہیں جو بدعت فی العقائد کے مجرم ہوئے جیسے معتزلہ اور قدریہ شیعہ اور خوارج، کرامیہ اور جہمیہ وغیرہ۔ بدعت فی الاعمال اس سے اخف ہے۔ اور اہل بدعت دونوں ہیں۔ جن محدثین نے فن حدیث پر بطور ایک فن کے نظر کی ان کا نقطۂ نظر صرف یہ رہا کہ جو صورت بھی ہو روایت صحیح ہو انہیں کسی بدعتی میں بھی بیان کی پختگی نظر آئی تو انہوں نے اس سے روایت لے لی۔ جن علماء نے حدیث کو محض ایک فن کے طور پر نہیں پورے تدین اور اعتماد سے دیکھا انہوں نے اہل بدعت سے روایت لینے کو جائز نہ سمجھا وہ دین کو بدعتی سے حاصل کرنا جائز نہ سمجھتے تھے۔

حضرت امام ابن سیرینؒ (۱۱۱ھ) اور حضرت امام مالکؒ (۱۷۹ھ) اہل بدعت سے روایت لینے کے حق میں نہیں وہ اس کی اجازت نہیں دیتے۔ امام ابو یوسفؒ (۱۸۲ھ) حضرت سفیان ثوری (۱۶۱ھ) اور امام شافعیؒ (۲۰۴ھ) اس کے جواز کے قائل ہیں۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ سوائے روافض (اثنا عشری شیعوں) کے دیگر اہل بدعت سے اگر وہ جھوٹ بولنے والے نہ ہوں اور ان کی یادداشت کمزور نہ ہو، روایت لی جاسکتی ہے۔ امام احمد بن حنبل (۲۴۱ھ) اس میں تفصیل کے قائل ہیں جو اہل بدعت

---

[۱] الکفایہ ص۳ [۲] فتح الملہم ج۱ ص۹۵

ن بدعات کو فروغ دینے والے ہوں ان کی روایت کسی صورت میں قبول نہ کی جائے گی اور غیر داعی اہل بدعت کی روایت دیگر
شرائط پوری ہونے پر قبول کی جا سکتی ہے۔
روافض سے روایت نہ لینے کی وجہ یہ ہے کہ تقیہ ان کے مذہب کا جزو ہے وہ کسی مذہبی مصلحت سے خلاف واقع بات کہنا
جائز سمجھتے ہیں۔ سو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کہاں کہاں جھوٹ بول رہے ہیں۔

ع تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

خطیب بغدادی لکھتے ہیں: وقال کثیر من العلماء یقبل اخبار غیر الدعاۃ من اهل الاهواء
فاما الدعاۃ فلا یحتج باخبارھم [1]

ترجمہ: بہت سے علماء نے کہا ہے کہ ان اہل بدعت کی جو داعی الی البدعۃ نہ ہوں روایت قبول کی جا سکتی ہے لیکن ان لوگوں
کی جو اپنی بدعات کی طرف دعوت دیتے ہیں روایت سے احتجاج نہیں کیا جا سکتا۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے شرح صحیح مسلم میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔[2]

امام مالکؒ تو یہاں تک فرما گئے کہ: لا یؤخذ العلم من اربعة من مبتدع ولا من سفیه ولا عمن
یکذب فی احادیث الناس وان کان یصدق فی احادیث النبیؐ ولا عمن لا یعرف ھذا الشان۔

ترجمہ: علم حدیث چار شخصوں سے نہ لیا جائے نہ بدعتی سے نہ بیوقوف سے نہ اس شخص سے جو لوگوں کی باتوں میں
جھوٹ بول لیتا ہو اگرچہ حدیث نبوی میں سچ ہی کہتا ہو اور نہ اس سے جو اس (موضوع) کی شان کو ہی نہ جانتا ہو۔[3]

جہاں تک ہو سکے اہل بدعت سے روایت نہ لے اگر کہیں روایت بایں نظر لی ہے کہ شاید کسی دوسری روایت
میں متابعت کے کام آئے تو بھی ان لوگوں کی مجلس کو لازم نہ پکڑے تاکہ انہیں باقاعدہ استاد نہ کہنا پڑے اور وہ بھی
پوری احتیاط کے ساتھ۔ سیدنا حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

ولا شك ان اخذ الحدیث من ھذہ الفرق یکون بعد التحری والاستصواب ومع
ذلك الاحتیاط فی عدم الاخذ لانه قد ثبت ان ھؤلاء الفرق کانوا یضعون الاحادیث
لترویج مذاھبھم وکانوا یقرون به بعد التوبة والرجوع واللہ اعلم (مقدمہ مشکوٰۃ ص۶)

ترجمہ: اس میں شک نہیں کہ ان فرقوں سے حدیث لینا غور اور پڑتال کے بعد ہی چاہیئے اور اس کے باوجود احتیاط
نہ لینے میں ہی ہے کیونکہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ لوگ اپنے خیالات باطلہ کو رواج دینے کے لئے حدیثیں
گھڑتے تھے اور جب (ان میں کسی کو) توبہ کی توفیق ہو جاتی تو اقرار کرتے (کہ انہوں نے بدعقیدگی کے دور میں کیا کیا
حدیثیں گھڑی تھیں)

یہ ادب واحترام تو شیخ کے عقائد واعمال کے متعلق ہے کہ اہل حق میں سے ہو گمراہ فرقوں میں سے نہ ہو تاہم اس
ادب واحترام کا بھی اپنا ایک مقام ہے جو اخلاق وعادات کی راہ سے قائم ہوتا ہے۔

---

[1] الکفایہ ص۱۲۱ [2] فتح الملہم جلد ۱ ص۶۵ [3] مقدمہ اوجز المسالک ص۶

احادیث احکام میں مزید احتیاط ایسے تو کوئی روایت بھی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو کسی غیر ثقہ راوی سے نہ لینی چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان کہی بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات بتلادی جائے لیکن حرام و حلال کے باب میں اس سے زیادہ سختی کی گئی ہے۔ یہاں کسی غیر پختہ بات پر ہرگز کوئی اعتماد نہ ہونا چاہیئے حلال و حرام کا غلط فیصلہ پوری شریعت پر ایک بدنما داغ اور صاحب شریعت پر ایک بڑا افتراء ہے۔

ہے اور پھر مسئلہ حلال و حرام سے متعلق تو اور بھی احتیاط ضروری ہے۔ عبدالرحمن بن مہدی فرماتے ہیں:

اذا روینا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الحلال والحرام والاحکام شددنا فی الاسانید وانتقدنا فی الرجال واذا روینا فی الفضائل والثواب والعقاب سہلنا فی الاسانید وتسامحنا فی الرجال[1]

ترجمہ: جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیں کوئی روایت پہنچے جو حلال و حرام اور احکام کے بارے میں ہو تو ہم سند کی تحقیق اور راویوں کی تنقید میں سختی کرتے ہیں فقط فضائل اور ثواب و عقاب کی بات ہو تو سند میں ہم نرمی سے کام لیتے ہیں اور راویوں سے ہم درگزر کرکے چلتے ہیں۔

خطیب بغدادی لکھتے ہیں: قد ورد عن غیر واحد من السلف انہ لا یجوز حمل الاحادیث المتعلقۃ بالتحلیل والتحریم الاعمن کان بریئا من التہمۃ بعیدا من الظنۃ[2]

ترجمہ: سلف میں کئی بزرگوں سے منقول ہے کہ وہ احادیث جن میں حلت و حرمت کا بیان ہو وہ انہی راویوں سے قبول کی جائیں جو تہمت سے بری اور غلط گمان سے بچے ہوئے ہوں۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے بھی منقول ہے کہ حلال و حرام کی بحث میں نہایت مضبوط قسم کے راوی ہونے چاہئیں۔

اساتذہ حدیث کا ادب واحترام اساتذہ حدیث کا احترام بایں جہت کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم واقوال ہم تک پہنچاتے ہیں اور یہ ہی وارثین انبیاء ہیں بہت ہونا چاہیئے ان کی عزت وعظمت کا خوب خیال رکھے اور کوشش کرے کہ حدیث میں انہی لوگوں کو استاد بنائے جن کے دین پر اعتماد ہو۔

حضرت امام ابن سیرینؒ فرماتے ہیں:

ان ھذا العلم دین فانظروا عمن تاخذون دینکم[3]

ترجمہ: بیشک یہ علم دین ہے سو دیکھا کرو کہ کن لوگوں سے تم اپنا دین حاصل کرتے ہو۔

حضرت عقبہ بن نافع نے اپنے بیٹے کو نصیحت فرمائی تھی۔ یا بنی لا تقبلوا الحدیث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا من ثقۃ۔ (التمہید لابن عبدالبر جلد ا ص۴۵) ترجمہ: اے میرے بیٹو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کسی معتمد آدمی سے ہی لیا کرو۔

اور حق یہ ہے کہ اس سے بڑی جہالت کی قباحت کیا ہوگی کہ انسان علم کے بغیر مسئلہ بتائے اور غیر معتمد لوگوں سے حدیث لے لے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتے حضرت قاسم بن محمد (۱۰۱ھ) جو اپنے دور کے سب سے بڑے عالم تھے

---

[1] (فتح الملہم ج۱ ص۔۔) [2] (الکفایہ ص۱۳۳) [3] (مسلم شریف جلد ا ص۱۱)

بجا فرماتے ہیں: اقبح من الجمل ان اقول بغیر علم او احدث عن غیر ثقۃ۔[۱]

ترجمہ: "میں اونٹ سے بدتر ہوں گا اگر بغیر علم کے کوئی بات کہوں یا غیر معتمد سے حدیث بیان کروں۔"

خلیفہ راشد سیدنا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: اذا کتبتم الحدیث فاکتبوہ باسنادہ فان یک حقاً کنتم شرکاء فی الاجر وان یک باطلا کان وزرہ علیہ۔[۲]

ترجمہ: جب تم کوئی حدیث لکھو تو اسے اس کی سند کے ساتھ لکھا کرو اگر وہ صحیح ہوگی تو تم اس کے اجر و ثواب میں شریک ہوگئے اور اگر روایت غلط ہوگی تو اس کا گناہ اس غلط راوی پر ہی ہوگا۔

حضرت حسن بصری فرماتے ہیں: لا تاخذوا الحدیث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا عن ثقۃ (الکفایہ ص۱۳۳)

"تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کردہ حدیث اس شخص سے لیا کرو جو ثقہ (قابل اعتماد) ہو۔"

حضرت عقبہ بن نافع ( ) نے بھی اپنے بیٹوں کو یہی نصیحت فرمائی تھی۔

یا بنی لا تقبلوا الحدیث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا من ثقۃ[۳]

"اے بیٹو! تم ثقہ راوی کے بغیر اور کسی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کردہ حدیث نہ لیا کرو۔"

صحابہ سے روایت کرنے والا راوی اگر کمزور بھی ہو تو اس سے اتنا نقصان نہیں پہنچ سکتا جتنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنیوالا کمزور راوی دین کے لئے وجہ خلفشار ہو سکتا ہے۔ سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔

محدثین سلف کا احترام مذکورہ سابقہ مثال سے یہ نہ سمجھیں کہ راویوں پر جس طرح جی میں آئے زبان کھولیں۔ ہرگز نہیں جس طرح اپنے زمانہ کے اساتذہ اور اکابر کا احترام کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے اسی طرح محدثین سلف کا بھی اور ان تمام رواۃ حدیث کا بھی ادب و احترام لازم ہے۔ محدثین کرام نے احادیث کی تخریج بڑی کاوشوں اور محنتوں سے فرمائی ہے اس لئے ان احادیث پر کلی بحث کے دوران کوئی ناشائستہ جملہ زبان سے نہ نکلنے پائے۔ ہاں جرح و تعدیل یا راویوں کی تحقیق اپنی جگہ مسلم ہے لیکن ان میں بھی ایک محدث کا دوسرے محدث سے موازنہ کرتے وقت کوئی بے ادبی کا پہلو نہ آجائے عام طور پر طلباء اس سے غافل رہتے ہیں اس میں احتیاط کی اشد ضرورت ہے۔

مطالعہ حدیث کے وقت کتاب کا احترام حدیث سننے سنانے پڑھنے پڑھانے تک یہ معاملہ نہیں بلکہ آداب میں سے یہ بھی ہے کہ کتب حدیث کا بھی بڑا احترام کرتے تھے۔

حدیث کی کتابوں پر کسی کی کتاب بھی نہ رکھتے تھے کتب احادیث کو اپنے سے نیچے نہ رکھے نہ زمین پر بغیر کوئی کپڑا بچھائے۔ نہ کتب حدیث پر پھلانگ لگا کے جائے۔ کتب حدیث جس پر رکھی جاتی ہے اس کا ادب بھی ملحوظ رہے یہ نہ ہو کہ اس کے اوپر پیر رکھ دے یا پھلانگ کر چلا جائے۔ عام کتب کی طرح نیچے لٹکائے ہوئے نہ چلے بلکہ سینے کے ساتھ چمٹائے ہوئے چلے۔ مطالعہ حدیث کے وقت بھی اس کا خاص اہتمام کرے کہ کسی طرح بے ادبی نہ ہو جائے۔ محدثین عظام اور علماء کرام کا معمول تو یہاں تک رہا ہے کہ کتب حدیث کے مطالعہ کے وقت بھی اس کا اتنا ادب کرتے تھے کہ کتاب

---

[۱] (التمہید لابن عبد البر ص۴۶) [۲] (شرح الجامع الصغیر للمناوی ص۵۵) [۳] (التمہید لابن عبد البر جلد ا ص۴۵)

کا حاشیہ دیکھنے کے لئے اُلٹ پلٹ یا آگے پیچھے نہ کرتے تھے بلکہ حدیث اور کتاب کے احترام اور ادب میں خود اُٹھ اُٹھ کر جایا کرتے تھے۔ دار العلوم دیوبند کے محدث شہیر حضرت مولانا علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا ادب حدیث ملاحظہ کیجئے؛

کتاب کو مطالعہ میں کبھی اپنے تابع نہیں کیا جس نشست پر بیٹھ کر کتاب کا مطالعہ کرتا ہوں اگر حاشیہ دوسری جانب ہوتا ہے تو کتاب کو گردش دیکر حاشیہ اپنے سامنے کرنے کی کوشش نہیں کی کتاب کی ہیئت بدلے بغیر خود اپنی نشست بدل کر حاشیہ کی جانب آبیٹھتا ہوں۔[1]

جونپور کے حضرت مولانا عبد القیوم ایک جگہ لکھتے ہیں:

تحصیل علم کے لئے جس طریقہ سے اُستاد کی تعظیم و تکریم ضروری ہے کتاب کی بھی تعظیم ضروری ہے لہٰذا کتاب کی طرف پاؤں نہ پھیلائے مراتب کتاب کا لحاظ رکھے حدیث کی کتابوں پر تفسیر کے علاوہ کسی دوسری کتاب کو نہ رکھے اور کسی کتاب پر کوئی دوسری چیز نہ رکھنا چاہیئے۔[2]

بلکہ حضرت شمس حلوانی تو یہاں تک فرما گئے کہ جو کچھ مجھ کو علم نصیب ہوا وہ تعظیم کی بدولت یہاں تک کہ میں نے کوئی کاغذ بلا وضو نہیں چھوا۔[3]

جب تک کتاب و استاد کی عزت و عظمت ذہن نشین نہ ہوگی اسوقت تک علم قریب نہیں آتا۔ صحابہ کرامؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتے اور ہر آن فیض رسالت سے فیضیاب ہوتے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی مضمون بیان فرماتے ہیں تو صحابہ کرامؓ ادب و احترام سے بیٹھتے۔ ایسے ہی ایک موقع پر حضرت عمرؓ کے دوزانو ہو کر بیٹھ جانے کی روایت "حدیث کی سماعت کے وقت مجلس کا احترام" کی بحث میں آپ دیکھ چکے ہیں۔

اسی طرح بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ حدیث بیان کرنیوالے کئی حضرات موجود ہوں اس صورت میں عام بات ہو تو جس سے چاہے پوچھ لے لیکن اعلم (زیادہ علم والا) سامنے ہو تو اسی سے پُوچھے۔ اس کے سامنے دوسرے سے پوچھنا اس کے ادب کے خلاف ہے۔ ہاں بات اہم اور پیچیدہ ہو اور بڑے شیخ سے سوال ممکن ہو تو پھر دوسروں سے پوچھنا شیخ کے احترام کے خلاف سمجھے۔ سیدنا حضرت امام عبد اللہ بن مسعودؓ حدیث کے بڑے امام تھے ان کے اسی شہر میں ہوتے ہوئے ایک مسئلہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ (۵۲ھ) سے پوچھا گیا تو آپ نے کچھ کہا اور اس کی تصدیق حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے نہ ہو سکی تو حضرت ابو موسیٰ نے صاف فرمایا لا تسألونی ما دام ھذا الحبر فیکم[4]

جب تک یہ (حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ) بڑے عالم تم میں موجود ہیں مجھ سے کوئی مسئلہ مت پوچھو۔

حضرت ابراہیم نخعی حضرت امام شعبی (۱۰۳ھ) کی موجودگی میں کچھ گفتگو نہیں فرماتے تھے ہاں کبر سنی یا کسی مرض غلبہ ہو تو ایسے حضرات خود ہی احتیاط فرماتے تھے روایت کم کرتے تھے۔ بڑے حضرات کا احترام و ادب اپنی جگہ تاہم یہ ضروری نہیں کہ استاذ لازمی طور پر شاگرد سے زیادہ علم رکھتا ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

---

[1] نقش دوام صفحہ ۱۰۱) [2] مقدمہ شرح مشکوٰۃ صفحہ ۱۰۶ [3] مقدمہ شرح مشکوٰۃ صفحہ ۱۰۵ [4] بخاری شریف جلد ۲ صفحہ ۱۸۸

رب حامل فقہ الی من ھو افقہ منہ مشکوٰۃ شریف

حضرت ابراہیم نخعی بھی تو فقہ میں نادرۂ روزگار تھے اور امام شعبی تو شعبی ہی ہیں۔

اساتذہ کے آداب میں سے یہ ہے کہ طلبا سبق کے وقت استاد کے زیادہ قریب نہ بیٹھیں۔ ادب و احترام کی حدود تبھی قائم رہ سکتی ہیں۔ شاگرد اور استاد کے درمیان کم از کم ایک کمان کا فاصلہ ضرور رہنا چاہیئے اس لئے کہ یہ اقرب الی التعظیم ہے۔

اُستاد اور شاگرد کے ادب کی ایک مثال لیجئے:

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ اپنے کرہ میں مصروف مطالعہ تھے ان دنوں زاد المعاد لابن القیمؒ نئی نئی چھپ کر آئی تھی اور حضرت شیخؒ اسی میں منہمک تھے۔ حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ بھی ان دنوں دار العلوم دیوبند میں مدرس تھے اور حضرت شیخ کے شاگرد رشید تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ اپنی کسی ضرورت سے حضرت شیخ کو ملنے آئے دروازہ کھلا تھا شاہ صاحبؒ مسلسل کھڑے رہے کہ حضرت شیخ کی نظر پڑے تو اندر آئیں۔ حضرت شیخ الہندؒ کتاب میں اسقدر اترے پڑے تھے کہ آدھ گھنٹہ سے زائد ہوگیا کہ حضرتؒ نے نظر نہ بدلی اور حضرت شاہ صاحبؒ مسلسل کھڑے رہے اور محض اس لئے کہ استاذ کے کام میں خلل نہ ہو اور ادب کے خلاف نہ ہو انہیں آواز نہ دی۔ یہ حضرات اپنے وقت کے آفتاب و ماہتاب تھے مگر ادب و احترام میں دیکھیں کہ کسقدر کوشاں رہے یہی وہ حضرات ہیں جو ادب کی وجہ سے علم کے خزانے جمع کر گئے اور پھر سالہا سال تک دنیا میں یہ علم کے موتی بکھیرتے رہے۔

اساتذہ حدیث کی بے ادبی کا انجام جس طرح اساتذہ کی خدمت اور ان کے ادب و احترام سے علم میں ترقی اور نور پیدا ہوتا ہے ظاہر ہے کہ ان کی بے ادبی اور ترک احترام سے علم سے نورانیت اور برکت اٹھ جائے گی اسی طرح علم سے وہ کتنا ہی ذخیرہ کیوں نہ جمع کرلے اس کا علم نافع نہ ہوگا اور ظاہر ہے کہ ایسا علم کی طلب نہ ہونی چاہیئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللّٰھم انا نعوذ بک من علم لا ینفع علم تو بہت ہیں لیکن جس کا علم نفع پہنچائے اور وہ نفع دائمی ہو وہی اصل عالم ہے اور جس کا علم خود اسے نفع نہ دے وہ اوروں کو کیا نفع دے گا۔ وہ مثل حمار کے ہوگا کہ کتابوں کے انبار تو اس پر ہیں مگر بے سود۔ کمثل الحمار یحمل اسفارًا اس لئے طلبہ کے ذمہ ضروری ہے کہ اساتذہ کے ادب و احترام کا دامن مضبوطی سے تھامے۔ مثل مشہور ہے با ادب بانصیب بے ادب بے نصیب۔ مولانا روم فرماتے ہیں:

از خدا خواہیم توفیق ادب — بے ادب محروم گشت از فضل رب
بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد — بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

شیخ پر سوال کا جواب دینا ضروری نہیں طالب علم سوال کرے تو شیخ جواب دے یا نہ دے طالب علم اس پر اصرار اور تکرار نہ کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ سفر میں تھے حضرت عمرؓ بھی ساتھ تھے۔ حضرت عمرؓ نے ایک بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھی۔ آپ نے جواب نہ دیا، تین بار ایسا ہوا۔ آپ پر وحی نازل ہو رہی تھی۔ حافظ ابن عبد البر مالکیؒ (۴۶۳ھ) اس روایت پر لکھتے ہیں:

وفیہ ان العالم اذا سئل عن شیئ لا یجب الجواب ــــ فیہ ان یسکت ولا یجیب بنعم ولا بلا ــــ ورب کلام جوابہ السکوت ــــ وفیہ من الادب ان سکوت العالم عن الجواب یوجب علی المتعلم ترک

الالحاح علیہ ـــــ فیہ الندم علی الالحاح علی العالم خوف غضبہ و حرمان فائدتہ فیما یستانف و قلما غضب العالم الا احترمت فائدتہ (التمہید جلد ۳ ص ۲۶۵)

ترجمہ: اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ عالم سے جب کوئی بات پوچھی جائے تو اس پر جواب دینا لازم نہیں ـــــ اسمیں یہ بھی ہے کہ وہ چپ رہے اور ہاں یا نہ بالکل نہ کرے ـــــ اور کئی ایسے سوال بھی ہوتے ہیں کہ ان کا جواب خاموشی ہی ہوتا ہے ـــــ اور اسمیں ادب کی تعلیم بھی ہے کہ عالم کا جواب دینے سے خاموشی اختیار کرنا ہی طالب علم پر ترک اصرار لازم کر دیتا ہے ـــــ اسمیں یہ بھی ہے کہ عالم سے سوال کرتے اصرار ہو جائے تو اس کی ناراضگی اور اس کے فائدہ سے محرومی کے اندیشہ سے اپنے پھر سے پوچھنے پر نادم ہو اور بہت کم ہوتا ہے کہ عالم کو ناراض کر دیا گیا ہو اور اس کے فائدہ سے محرومی نہ ہوئی ہو۔

اس روایت میں گو آپ کے جواب نہ دینے کا سبب نزول وحی ہے گر محدثین نے اسے عام رکھا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی عالم پر وحی نازل ہونے کا کوئی احتمال نہیں لیکن اور کئی وجوہ ہو سکتے ہیں جن کے باعث عالم جواب نہ دے رہا ہو۔ سو طالب علموں کو چاہیئے کہ ایسے ہر موقع پر ہر شیخ کے احترام کی کوشش کریں اور اس کی ناراضگی کے ہر انداز سے بچنے کی فکر کریں ورنہ عالم کے فیض سے محروم رہنے کا قوی اندیشہ ہے۔

دانستہ سوال کرنا بھی بے ادبی ہے

بعض طلبہ بات معلوم کرنے کے لئے امتحاناً بھی سوال کر دیتے ہیں بات انہیں معلوم ہوتی ہے مگر وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ استاد نے تازہ مطالعہ کیا ہے یا نہیں، یہ دانستہ سوال کرنا ہے اور استاد کا جائزہ لینا سخت بے ادبی ہے، شیخ روحانی باپ ہے، کوئی نیک بیٹا باپ کی پڑتال نہیں کرتا۔

دانستہ سوال کرنے کی ایک اور صورت بھی ہے، طالبعلم سمجھتا ہے کہ اس کے ساتھ بعض ساتھی ایسے ہیں جو کسی خاص مسئلہ میں اس سے اختلاف رکھتے ہیں۔ وہ مسئلے کو جانتا ہوتا ہے اور دانستہ استاد سے سوال کرتا ہے تاکہ اس ذہن کے طلبہ استاد سے اس مسئلہ کو مدلل سن پائیں۔ اس صورت میں سوال کرنا شیخ کی بے ادبی نہیں کسی مصلحت کیلئے ہے کبھی یہ جاننا بھی پیش نظر ہوتا ہے کہ اس باب میں جو کچھ میں سمجھے ہوئے ہوں، وہ درست ہے یا نہیں مقصود اپنی اصلاح ہوتی ہے استاد کا امتحان نہیں یہ بھی بے ادبی نہیں۔

طلبہ سے سوال نہ کرنے کا عہد لینا کیسا ہے

استاد اگر یہ سمجھے کہ طلبہ جب تک پوری بات سن نہ لیں دوران بیان ان کا سوال کرنا تضیع اوقات ہوگا اور وہ طلبہ سے سوال نہ کرنے کا عہد لے تو اسے اس کا حق ہے۔ حضرت خضر نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عہد لیا تھا:

فان اتبعتنی فلا تسئلنی عن شئی حتی احدث لک منہ ذکرا۔ (پ ۱۵، الکہف ع ۹)

(ترجمہ) سو اگر تو نے میرے ساتھ رہنا ہے تو مت سوال کرنا مجھ سے کسی چیز کا یہاں تک کہ میں خود اسے بیان

اُستادِ حدیث کی امتیازی نشست

تابعی کبیر حضرت نصر بن عمران ابوجمرہ (۱۲۸ھ) حضرت ابن عباسؓ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ آپ فارسی زبان جانتے تھے اور حضرت ابن عباس کے مترجم کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ آپ حدیث پڑھاتے وقت حضرت ابوجمرہ کو اپنے ساتھ بٹھاتے۔ امام بخاریؒ حضرت ابوجمرہ سے روایت کرتے ہیں: کنت اقعد مع ابن عباسؓ یجلسنی علی سریرہ[۱] (ترجمہ) میں حضرت ابن عباس کے پاس بیٹھتا تھا آپ مجھے اپنے تخت پر اپنے ساتھ بٹھاتے تھے۔

شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس روایت پر فرماتے ہیں:

اس سے معلوم ہوا کہ ابن عباس سریر (تخت) پر بیٹھتے تھے ۔۔۔۔۔ اس سے معلم کے لئے امتیازی نشستگاہ کا ثبوت ملتا ہے[۲] شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ حضرت امام مالکؒ حدیث کے اعزاز میں خود ایک تخت پر بیٹھ کر اسے روایت کرتے۔ اس سے طالبین اور سامعین پر حدیث اور شیخ دونوں کا ادب و احترام اور ہیبت و جلال طاری رہتا۔ آپ عمامہ سر پر رکھتے اور ایک تخت بچھایا جاتا۔ پھر آپ باہر تشریف لاتے۔ تخت پر خشوع و خضوع سے بیٹھتے۔ بخور جلایا جاتا پھر جب تک حدیث کے بیان سے فارغ نہ ہو جاتے اسی ہیئت کے ساتھ بیٹھے رہتے[۳]

عالم کے لئے خود بھی اپنے علم کی عزت کرنا ضروری ہے یہ اس لئے نہیں کہ وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھے بلکہ اس لئے کہ جو علم اس کے پاس ہے اس کی نسبت خدا اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے۔ اب اس نسبت کے احترام میں وہ کبھی اپنے آپ کو اہلِ دُنیا کے سامنے متواضع نہ کرے عالم میں خود ایک اپنا وقار ہونا چاہیئے اور اپنے علم کا وقار قائم رکھتے ہوئے کبھی اہلِ دُنیا کے دروازوں پر دستک نہ دے۔ حضرت علامہ عینیؒ لکھتے ہیں: لا ینبغی للعالم ان یاتی بعلمہ اھل الدنیا ولا یتواضع لھم اجلالاً للعلم[۴] (ترجمہ) عالم کے لئے مناسب نہیں کہ اپنا علم لے کر اہلِ دُنیا کے دروازوں پر جائے اور نہ ان کے سامنے اپنے آپ کو عاجز ظاہر کرے تاکہ علم کا جلال (رعب و احترام) قائم رکھ سکے۔

شاگردوں میں تیقظ و بیداری پیدا کریں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ حدیث بیان کرتے کرتے کبھی اختباراً سوال بھی کرتے تاکہ صحابہ کی توجہ کو پوری طرح حدیث میں جذب کر دیں۔ توجہ کامل اور بیداری ایسے اوصاف ہیں جو بات کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں اس سے علم میں پختگی پیدا ہوتی ہے اور آگے چلنے کی کئی راہیں کھلتی ہیں۔ نفسیات کا یہ ایک اہم موضوع ہے۔ حضرت امام بخاریؒ نے اس پر ایک مستقل باب لکھا ہے۔

طرح الامام المسئلة علی اصحابہ لیختبر ما عندھم من العلم[۱] (ترجمہ) استاد اپنے شاگردوں کو کبھی سوال بھی کرے تاکہ ان کے علم (اور سمجھ) کا ساتھ ساتھ امتحان بھی ہوتا رہے۔ صحیح بخاری جلد ۱ ص ۱۴

شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ فرماتے ہیں: تیقظ و بیداری ایک ایسا وصف ہے جو حصول علم میں کامیابی کا سبب بنتے ہیں اور غفلت سے ناکامی و محرومی ہوتی ہے اس لئے معلم کو چاہیئے کہ کبھی کبھی تلامذہ سے سوال بھی کرتا رہے یہ استحباب کے درجہ میں ہے وجوب کے درجہ میں نہیں۔ فضل الباری جلد ۱ ص ۵۱۳

---

[۱] صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۱ [۲] فضل الباری ج ۱ ص ۵۵۵ [۳] دیکھئے مدارج النبوۃ ج ۱ ص ۵۴۲ [۴] عمدۃ القاری ج ۲ ص ۸۱

حضرت علامہ عینیؒ لکھتے ہیں: فیہ استحباب القاء العالم المسئلۃ علی اصحابہ لیختبر افہامہم ویرغبہم فی الفکر [۱] (ترجمہ) اسمیں اس استحباب کا بیان ہے کہ عالم کوئی مسئلہ اپنے شاگردوں پر ڈالے (ان سے سوال کرے) تاکہ ان کے فہم کا پتہ کرتا ہے اور انہیں سوچنے کی رغبت دلاتا ہے۔

استاد شاگردوں کو بھی سوال کا موقع دے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی حدیث بیان کرتے تو صحابہؓ بعض اوقات درمیان میں سوال کرتے اور حضورؐ انہیں جواب بھی دیتے اسمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے اپنی بات کو مکمل فرما لیتے اور پھر سوال کا جواب دیتے۔ سوال اس حدیث کے متعلق نہ بھی ہو تو بھی آپ اس کا جواب دیتے۔ امام بخاریؒ نے اس پر ایک مستقل باب باندھا ہے۔

من سئل علماً وھو مشتغل بحدیثہ فاتم الحدیث ثم اجاب السائل [۲]

ترجمہ: "جس سے علم کی کوئی بات پوچھی جائے اور وہ اپنے ہاں کوئی حدیث بیان کر رہا ہو تو پہلے وہ حدیث پوری کرے پھر سائل کا جواب دے" ــــ حافظ بدرالدین العینی لکھتے ہیں: یجب علی العالم ان یؤدی المتعلم لقولہ فاواہ اللہ [۳]

ترجمہ: عالم پر واجب ہے کہ شاگرد کو موقع دے سو اسکو مطمئن کرے۔"

شیخ الاسلام فرماتے ہیں: "اگر کوئی شخص سوال کر بیٹھے تو دیکھا جائے گا کہ اہل مجلس کا نقصان تو نہیں۔ اگر اہل مجلس کا کوئی نقصان نہ ہو تو جواب فوراً بھی دیا جاسکتا ہے اور اگر حارج ہو تو جواب مؤخر کیا جاسکتا ہے ــــ پھر سوال کی نوعیت بھی دیکھی جاتی ہے کہ وہ ضروری ہے یا غیر ضروری ــــ اور اگر کوئی اہم معاملہ ہو یا کسی بنیادی عقیدہ سے متعلق سوال ہو تو اس میں تاخیر کی قطعاً گنجائش نہیں ہوتی [۴]

صحابہ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دوران حدیث اور بعد اتمام حدیث موضوع سے متعلق اور اس سے مختلف سوالات کرنا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب دینا متعدد احادیث سے ثابت ہے۔

تلامذہ کی طرف سے بعض اوقات ایسے سوالات بھی آجاتے ہیں جو طبعاً ناگوار ہوں۔ کبھی بے وقت اور ناموزوں قسم کے استفسارات کی نوبت بھی آجاتی ہے ایسی صورت میں انہیں چپ کرانا اور بعض اوقات زجر و تشدد سے کام لینا بھی ضروری ہوتا ہے۔ استاد کو ایسے موقعوں پر حالات کی مناسبت سے صورت عمل اختیار کرنے کی پوری گنجائش ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ طلبہ کا فائدہ اور حدیث کا احترام اپنی جگہ پر قائم رہے اور علم و تحقیق کا حق بھی اپنی جگہ ادا ہو سکے۔ اگر کوئی استاد طلبہ کو اس لئے سوال سے روکے کہ اس کی اپنی تیاری مکمل نہ تھی تو وہ اس مسند کے لائق نہیں ہے۔

یہ بات تو اساتذہ کے لئے تھی۔ جہاں تک طلبہ کا تعلق ہے انہیں بھی پوری توجہ سے استاد کی طرف متوجہ رہنا چاہیئے ضروری سوالات سے ہرگز نہ رکنا چاہیئے طلبہ کے لئے سوال کرنے سے حجاب کرنا ان کی تعلیم میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور اگر اس لئے سوال نہ کرے کہ استاد کو شاگرد کی جہالت معلوم نہ ہو جائے اور وہ یہ نہ کہے کہ یہ اتنی بات بھی نہیں جانتا تو یہ ایک طرح کا تکبر اور اپنے کو بے وجہ بڑا بنانے کی ایک تمنا ہے۔ سوال کرنے سے حجاب کرنیوالا اور اپنے آپ کو (اپنے اصل پیمانے سے) بڑا ظاہر کرنیوالا کبھی علم حاصل نہیں کر سکتا۔ تابعی کبیر حضرت مجاہد (۱۰۰ھ) فرماتے ہیں:

---

[۱] عمدۃ القاری جلد ۲ ص ۱۵ [۲] صحیح بخاری ص ۲۲ ج ۱ [۳] عمدۃ القاری ص ۳۲ ج ۲ [۴] صحیح بخاری ص ۲۲ ج ۱

لا یتعلم العلم مستحی و لا مستکبر [1] (ترجمہ) حیا کرنیوالا سوال کرنے سے شرمانے اور اپنے آپ کو بڑا ظاہر کرنیوالا کبھی علم حاصل نہیں کرسکتا۔

مرد تو مرد ہے دین کے بارے میں تو عورتوں کو بھی سوال کرنیکا پورا حق حاصل ہے۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ انصار کی عورتوں کی اس سے تعریف کیا کرتی تھیں کہ انہیں سوال کرنے میں کوئی حجاب مانع نہ ہوتا تھا وہ برملا مسائل پوچھتی تھیں۔ آپ فرماتی ہیں: نعم النساء نساء الانصار لم یکن یمنعهن الحیاء ان یسألن عن الدین و یتفقهن فیه

حافظ بدرالدین العینیؒ لکھتے ہیں: لاینبغی لاحد ان یستحی من السوال عما فیه حاجة زاعماً ان العلم مخصوص بقوم دون قوم بل علیه ان یسأل عن کل مالایعلمه من امو دینه و دنیاه [2]

ترجمہ: کسی کو نہ چاہیئے کہ اس سوال سے جس کی اسے ضرورت ہو رُکا رہے اور سمجھے کہ علم کسی ایک قوم کی میراث ہے دوسرے کا اس میں حق نہیں بلکہ اسے چاہیئے کہ جو چیز بھی وہ اپنے دین یا دنیا کی نہ جانتا ہو اس کے بارے میں سوال کرے۔

طلبِ حدیث میں نامور اساتذہ کی تلاش اساتذہ کی تلاش کبھی ان کی جامعیت اور عالی شہرت کے سبب ہوتی ہے اور کبھی سند عالی کی تلاش میں۔ حدیث جتنے کم واسطوں سے ملے اسے بہتر سمجھا جاتا ہے۔ محدثین ہر دو اعتبار سے نامور اساتذہ کی تلاش میں رہتے تھے۔ امام بخاریؒ کی ثلاثیات اسی وجہ سے ممتاز ہیں کہ ان میں امام بخاریؒ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف تین واسطے ہیں۔ سند عالی محدثین کے لئے ایک بڑا تحفہ اور ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ محدثین عظام اور تابعین کرام تو ایک طرف خود صحابہ رضی اللہ عنہم بھی تلاش علم میں ایک عجیب علمی ذوق محسوس کرتے تھے۔ اور طلب حدیث میں ایک والہانہ قلبی شوق رکھتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (۳۲ھ) کی جلالت علمی سے کون واقف نہیں۔ آپ بھی فرماتے ہیں: لو اعلم احداً هو اعلم بکتاب الله منی تبلغه الابل لرکبت الیه۔ کتاب اللہ کے بارے میں علم کی طلب یہ نہیں کہ وہ آیات کی تلاش میں دور دراز جانا چاہتے تھے قرآن کے بارے میں طلب علم سے مراد تلاشِ حدیث ہی ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۷۴ھ) نے حضرت عبداللہ بن انیس سے ایک حدیث سننے کے لئے مہینے بھر کا طویل سفر کیا تھا اس سے آپ ان حضرات کے شوقِ حدیث کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ حضرت امام بخاریؒ لکھتے ہیں:

رحل جابر بن عبد الله رضی الله تعالیٰ عنه مسیرة شهر الی عبد الله بن انیس فی حدیث واحد [3]

ترجمہ: جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک حدیث کی خاطر عبداللہ بن انیسؓ صحابی (۵۴ھ) کی طرف ایک مہینہ بھر چلتے رہے تابعین کو پتہ چلتا کہ فلاں دُور دراز علاقے میں کوئی صحابی موجود ہے جو اس موضوع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سُننے ہوئے ہے تو وہ اسے ملنے اور اس سے حدیث لینے کی خاطر دُور دراز کے سفر اختیار کرتے گو وہ حدیث انہوں نے اور تابعین سے اسی صحابی کی روایت سے سُن بھی رکھی ہو لیکن سند عالی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب کی نسبت ان حضرات کے لئے ایک گوہر کمیاب تھی وہ اس کی گردیمائی کو ایک بڑی سعادت سمجھتے تھے۔ پھر تابعین اور محدثین نامور اساتذہ کی تلاش میں پوری اسلامی دنیا میں چلتے پھرتے رہتے۔ محدثین کے عرض و سماع اور تحدیث و تدریس کے بڑے بڑے حلقے

---

[1] عمدة القاری ۲۲/۲۸ [2] فضل الباری ۱۸/۵۶۹ [3] شرح صحیح بخاری ۲۸/۲۲۴ [4] مسلم شریف جلد ا صفحہ ۲۹

گئے اور لوگ اطراف عالم سے پروانہ وار شمع حدیث کے گرد چلے آتے ۔ حج کے موقع پر بھی بڑی بڑی ملاقاتیں ہوتیں۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مشہور تابعی مکحول (۱۱۸ھ) سے موسم حج میں ہی سند حدیث لی تھی۔

متحدہ ہندوستان میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی سلطنتِ علمی پاک و ہند، مصر و شام اور بلخ و بخارا تک پھیلی ہوئی تھی اور علماء اور طلبہ چہار دانگ عالم سے اس حلقہ حدیث میں کھچے چلے آتے ۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کی علمی شہرت نے تمام ہندوستان کے طالبین حدیث کو ایک مرکز میں جمع کر لیا تھا اور پھر کتنے ہی نیر تاباں ہیں جو ان سے مستنیر ہو کر آفاق عالم پر پوری تابانی سے چمکے اور حق یہ ہے کہ اپنے عہد میں دنیا نے ان کا مثل نہ دیکھا۔

تعلیم حدیث کیلئے اہل لوگوں کی تلاش

جسطرح طلبہ کے لئے نامور اساتذہ کی تلاش وقت کا ایک اہم موضوع رہا ہے اساتذہ کے لئے بھی اہل اور لائق طلبہ کی طلب ایک فطری اور استادانہ ذوق رہا ہے۔ اساتذہ پر پابندی تھی کہ حدیث اس درجہ تک بیان کریں جتنی لوگوں میں سمجھنے کی استعداد ہو۔ ظاہر ہے کہ ہم جولیے علم کے نکھار کے لئے انہیں ایک ایسے ماحول کی ضرورت ہوتی تھی جہاں وہ جم کر غوامض حدیث دقائق روایات اور نقد مطالب پر بات کر سکیں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر کامل حضرت عمرؓ جیسے انسان کے انتظار میں رہی اور امام ابو حنیفہؒ جیسے بزرگ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کو عمر بھر کے ساتھی بنا گئے تو محدثین کی نظر انتظار بھی لائق تلامذہ کی راہیں دیکھتی رہیں اور یہ اسی لئے تھا کہ تعلیم حدیث کے لئے زیادہ سے زیادہ اہل لوگوں کے حلقے قائم ہو سکیں نا اہل لوگوں کے سامنے حدیث بیان کرنے میں خطرہ یہ ہے کہ وہ نا سمجھی میں کہیں خدا اور اس کے رسول کی ہی تکذیب نہ کر بیٹھیں۔ سیدنا حضرت علی المرتضیٰؓ نے فرمایا:

حدثوا الناس بما یعرفون أتحبون ان یکذب اللہ ورسولہ لہ صحیح بخاری جلد اول ص ۲۴

ترجمہ: لوگوں کے سامنے اسی حد تک حدیث بیان کرو کہ وہ سمجھ سکیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کی تمام باتیں جھٹلائی جائیں؟

امام بخاریؒ نے اس حدیث سے استنباط کرتے ہوئے ترجمۃ الباب میں لکھا ہے:

من خص بالعلم قوما دون قوم کراھیۃ ان لا یفھموا

ترجمہ: یہ باب اس سلسلہ میں ہے کہ کوئی شخص کچھ لوگوں کو علم کے لئے خاص کر لے اور دوسروں کو اس میں نہ آنے دے کہ اسے ان کے ان احادیث کو نہ سمجھنے کا اندیشہ ہو اور وہ اسے ناپسند کرتا ہو۔

سو اساتذہ کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اہل طلبہ کے لئے کوشاں رہیں اور استاد کو یہ حق بھی ہے کہ اگر کسی طالب علم کے بارے میں اسے پتہ چل جائے کہ وہ بدعمل ہے اور طحد سوچ کا ہے، اسے اندیشہ ہو کہ وہ علم کا غلط استعمال کرے گا تو اسے وہ اپنے حلقہ درس سے اٹھا دے کہ گو وہ سبق کو تو سمجھ رہا ہے لیکن تقاضائے سبق کو وہ بالکل نہیں سمجھ رہا ایسا طالب علم فتنے کا ایک باب ہے اگر یہ کھل گیا تو معلوم نہیں کون کون اس میں داخل ہو۔

ے سعدیا شیراز یا پندے مدہ کم زاد را
کم زاد گر عالم شود گردن زند استاد را

اہل طلبہ کی تلاش میں اہلیت صرف فہم و ذہانت میں نہ دیکھی جائے ضبط و حفظ کے پہلو سے بھی اہلیت کا جائزہ لیا جائے کئی دفعہ ضابطہ و حافظہ قسم کے لوگ آگے کسی فہیم و ذکی شخص سے روایت کرتے ہیں اور اس تک اپنا علمی سرمایہ پہنچا دیتے ہیں اور وہ اس کی گہرائیوں میں اتر کر اس سے بہت سے موتی نکال لاتا ہے تو یہ ضبط و حفظ آگے جا کر کام آ گیا

اور جن حضرات میں یہ دونوں صفتیں ہوں تو وہ پہلے ہی ایک بڑی سعادت پا گئے تاہم یہ ضروری ہے کہ غوامض حدیث ان لوگوں کے سامنے نہ کھولے جائیں جو انہیں نہ سمجھ کر کسی اور فتنے میں مبتلا ہو جائیں۔ علم ہمیشہ اپنے مناسب حلقوں میں پھیلتا ہے نامناسب حلقوں سے اس میں ظلمت آتی ہے۔ حضرت علامہ عینیؒ لکھتے ہیں:

الاسرار الالٰهية لا يجوز كشفها الا للخواص خوفا من يسمع ذلك من لا علم له فيشكل عليه — يجب ان يخص بالعلم قوم فيهم الضبط وصحة الفهم ولا يبذل المعنى اللطيف لمن لا يستأهل من الطلبة ومن يخاف عليه الترخص والاتكال لتقصير فهمه [۱]

ترجمہ: اسرارِ الٰہیہ کو خواص کے سوا اور کسی کے سامنے نہ کھولنا چاہئے اندیشہ ہے کہ انہیں وہ لوگ سن پائیں جو ان باتوں کو نہیں جانتے اور ان پر کوئی اور مشکل آن پڑے ــــ سوچا ہئے کہ تعلیم کے لئے ایسے لوگوں کو چنا جائے جن میں ایسے علم کو ضبط کرنے کی اہلیت اور صحیح سمجھنے کی قابلیت ہو اور عالم باریک بات کو ان طلبہ کے سامنے عام نہ کرے جو اس کے اہل نہیں اور خدشہ ہو کہ وہ آسانی اور سستی کی راہیں لیں گے کہ ان کا فہم ان تک پہنچنے سے قاصر ہے۔

یہ بات حقائق خواص اور مسائل ذات و صفات کی حد تک ہے جہاں تک متعلق تعلیم دین کا تعلق ہے حدیث ہر ایک تک پہنچانا اپنی جگہ ضروری ہے۔

ہر ایک تک حدیث پہنچانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مختلف مقامات سے لوگ آتے آپ انہیں علم و ایمان کی باتیں سمجھاتے اور ارشاد فرماتے کہ وہ اپنے علاقے میں جاکر یہ باتیں دوسروں تک بھی پہنچائیں۔ آپ کے پاس وفد عبد القیس آیا اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کی بہت سی باتیں دریافت کیں اور جب جانے لگے تو آپ نے فرمایا: احفظوه واخبروه من وراءكم۔[۲]

ترجمہ: انہیں یاد رکھو اور جو لوگ تمہارے پیچھے ہیں انہیں ان کی خبر کرو۔

حافظ بدرالدین العینیؒ رقمطراز ہیں: من علم علما انه يلزمه تبليغه لمن لا يعلمه وهو اليوم من فروض الكفاية لظهور الاسلام وانتشاره في زماني اول الاسلام فانه كان فرض معينا ان يبلغه حتى يكمل الاسلام ويبلغ مشارق الارض ومغاربها [۳]

ترجمہ: جو کوئی (دین کی) بات جانے اس کا ان لوگوں تک پہنچانا لازم ہے جو نہیں جانتے آج یہ چیز فرض کفایہ ہے کیونکہ اسلام ظاہر ہو چکا اور پھیل چکا لیکن پہلے دور میں یہ بات فرض عین تھی کہ ہر جاننے والا اس بات کو دوسروں تک پہنچائے یہاں تک کہ دین کامل ہو جائے اور مشرق و مغرب تک پھیل جائے۔

حضرت ابو شریحؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دوسرے دن قدسیت مکہ پر ایک نہایت وقیع تقریر فرمائی اور آخر میں کہا: ليبلغ الشاهد الغائب۔ صحیح بخاری جلد ۱ ص ۲۱، سنن ابن ماجہ ص ۲۱

ترجمہ: چاہیئے کہ تم میں سے جو میرے پاس حاضر ہے وہ اسے پہنچا دے جو مجھ سے غائب ہے۔

اور سنن ابی داؤد میں ہے: ليبلغ شاهدكم غائبكم

---

۱ عمدۃ القاری جلد ۲ ص ۲۰۰ ۲ صحیح بخاری جلد ۱ ص ۳۲ ۳ عمدۃ القاری جلد ۲ ص ۱۰۱

ترجمہ: تم میں سے جو حاضر ہے اپنی اپنی قوم کے ان لوگوں تک جو مجھ سے غائب ہیں اس پیغام کو پہنچا دے۔
یہ بات صرف مردوں تک محدود نہیں، عورتوں میں بھی دین کی یہ تعلیم جاری کی جا سکتی ہے۔ حضرت امام بخاریؒ نے
اس کے لئے مستقل باب باندھے ہیں:
باب عظة الامام النساء وتعليمهن [1] باب هل يجعل للنساء يوم على حدة من العلم [2]
اس دینی ضرورت کے لئے ان کا مردوں سے ہمکلام ہونا اور سوال وجواب کرنا ممنوع نہیں۔ حافظ عینیؒ رقمطراز ہیں:
فيه سوال النساء عن امر دينهن وجواز كلامهن مع الرجال فى ذالك وحيثما لهن الحاجة اليه [3]
ترجمہ: اس میں عورتوں کا اپنے دین کے بارے میں سوال کرنا اور ان کا دوسرے مردوں سے کلام کرنا مذکور ہے اور یہ کہ جب انہیں
اسکی حاجت ہو یہ ان کے لئے جائز ہے۔

حدیث پڑھنے کے لئے بڑے احترام سے بیٹھے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ تعلیم کے وقت جم کر حلقے باندھتے۔ آپ انہیں بیٹھنے کے آداب بتلاتے اور احادیث
بھی سناتے تھے۔ حضرت ابو واقد اللیثی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک حلقہ درس کے بارے میں فرماتے ہیں:
ان رسول الله صلى الله عليه وسلم بينما هو جالس فى المسجد والناس معه اذاقبل ثلاثة نفر
اما احدهما فرای فرجة فى الحلقة فجلس فيها واما الآخر فجلس خلفهم واما الثالث فادبر [4]
ترجمہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے اور لوگ آپ کے پاس بیٹھے تھے کہ تین آدمی آئے ایک
نے حلقے میں ایک خالی جگہ دیکھی تو وہ وہاں بیٹھ گیا دوسرا دائرے کے پیچھے بیٹھ گیا اور تیسرا واپس چلا گیا۔
اس سے معلوم ہوا کہ صحابہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ کر حدیث کی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے اگر کسی کو بیٹھنے
کی جگہ نہ ملے وہ واپس ہو جاتا لیکن کھڑے کھڑے حدیث سننا اس کے نزدیک احترام حدیث کے خلاف تھا۔ حضرت
ابن عباسؓ حدیث پڑھاتے تو ایک تخت پر بیٹھتے [5] امام مالکؒ بھی ایک امتیازی شان سے بیٹھتے اور حدیث روایت کرتے
کھڑے ہو کر حدیث سننا ان کے ہاں بہت ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا۔ ایک دفعہ آپ حضرت ابو حازم کی مجلس حدیث سے
اس لئے واپس آگئے کہ وہاں بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:
حضرت مالک بن انسؓ ایک روز ابو حازم کے پاس گئے اسوقت وہ حدیث بیان کر رہے تھے حضرت امام مالکؒ
ادھر سے گذر گئے اور فرمایا میں نے وہاں بیٹھنے کی جگہ نہ پائی اور میں اسے مکروہ سمجھتا ہوں کہ کھڑے کھڑے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم
کو حاصل کروں حالانکہ میں کھڑا ہو سکتا تھا۔ [6] حافظ بدر الدین العینی رقمطراز ہیں:
ان من حسن الادب ان يجلس المرء حيث انتهى مجلسه ولا يقيم احداً۔ استحب ان يجلس حيث ينتهي [7]
ترجمہ: حسن ادب یہ ہے کہ انسان وہیں بیٹھ جائے جہاں تک کہ مجلس پہنچ چکی ہے اور کسی کو نہ اٹھائے — یہ مستحب ہے۔
یہ حدیث کو قبول کرنے، پڑھنے پڑھانے اس کی طلب و دریافت اور طلبہ و اساتذہ کے حقوق و آداب کا بیان تھا۔ اب یہ بھی پیش نظر
رکھئے کہ جو روایت نقل کی جا رہی ہے اسکے بارے ذمے کتنے حقوق ہیں روایت نقل کرنے میں کیا کیا باتیں ملحوظ نظر رہنی چاہئیں۔

---

[1] ایضاً ص ۳۵ [2] ایضاً ص ۲۰ [3] عمدۃ القاری ۲ ص ۱۳۳ [4] صحیح بخاری جلد ا ص ۱۶ [5] ایضاً ص ۱۰
[6] مدارج النبوۃ جلد ا ص ۵۴۲ [7] مدارج النبوۃ جلد ا ص ۱۲۰ [8] عمدۃ القاری جلد ا ص ۱۰۰

آداب روایت کا بیان

حدیث کا تکرار کرنا کہ یاد ہو جائے | جتنا کوئی کلام زیادہ مہتم بالشان ہوتا ہے اتنا ہی اسے یاد رکھنے کی زیادہ فکر ہوتی ہے اتنا ہی اسے یاد رکھنے کی زیادہ فکر ہوتی ہے حضرت انس بن مالک (۹۱ھ) کہتے ہیں: عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ کان اذا تکلم بکلمۃ اعادھا ثلاثاً حتی تفھم عنہ [1]

ترجمہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی بات کہتے تو اسے تین دفعہ دہراتے تاکہ اس کا آپ کی طرف سے ہونا اچھی طرح سمجھا جا سکے۔" امام بخاری نے اس حدیث پر یہ باب باندھا ہے: من اعاد الحدیث ثلاثاً لیفھم — فقال الا وقول الزور فما زال یکررھا — وقال ابن عمر قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ھل بلغت ثلثاً

ترجمہ: جس نے حدیث کو تین دفعہ دہرایا کہ پوری طرح سمجھ آجائے — آپ نے ایک دفعہ قول زور سے بچنے کی تاکید فرمائی اور بار بار اسے دہراتے رہے — حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ آپ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں، ہل بلغت کے الفاظ تین دفعہ ارشاد فرمائے تھے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حدیث کو اس دور میں بھی ابدی سچائی کی حیثیت حاصل تھی۔ آپ کی ہدایات اگر صرف اسوقت کے لئے ہوتیں تو ان کے فہم و حفظ میں اسقدر اہتمام کر لیا گیا ہوتا۔

موجودہ دور میں طلبہ کو چاہیئے کہ حدیث بیان کرتے وقت اس ترتیب کو ضرور ملحوظ رکھیں جس ترتیب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرامؓ نے بیان کیا ہے۔ اور اسے اس طرح یاد رکھنے کے لئے آپس میں اس کا تکرار بھی کر لیا کریں تاکہ جب وعظ و درس کی ذمہ داریاں ان پر آئیں تو ذمہ دارانہ بیان کی عادت پڑ چکی ہو۔

حدیث کا طالب علم قلم و دوات ساتھ رکھے | پہلے دور میں تو کچھ اختلاف رہا کہ حدیث لکھی جائے یا نہ۔ گو اس میں بھی تحقیق یہ ہے کہ لکھنے کی ممانعت مطلق نہ تھی تاہم اس میں کہیں اختلاف نہیں ہوا کہ آئندہ ادوار میں محدثین لکھنے کی ضرور پابندی کریں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (۱۰۱ھ) نے امام زہریؒ (۱۲۴ھ) کو حدیث لکھنے کے لئے حکم دیا تو اعیان امت جو اس وقت کثیر تعداد میں موجود تھے ان میں سے کسی نے اس سے اختلاف نہ کیا اور سنت اسلاف اسی طرح جاری ہوئی کہ حدیث کے طالب علم لکھنے کا پورا اہتمام کریں۔ حضرت یحییٰ بن معینؒ (۲۳۳ھ) فرماتے ہیں۔

• حکم من یطلب الحدیث الا یفارقہ محبرتہ و مقلمتہ وان لا یحضر شیئاً یسمعہ فیکتبہ [2]

ترجمہ: حدیث کے طالب علم کے لئے حکم ہے کہ اپنے قلمدان اور دوات کو ہمیشہ ساتھ رکھے اور حدیث سننے کی کسی مجلس میں حاضری نہ دے مگر یہ کہ جو کچھ سنے اسے لکھ لے۔

موجودہ دور میں دورہ میں انہی طلبہ کو داخلہ دینا چاہیئے جو لکھنے کی مشق رکھتے ہوں۔ علماء کے لئے لکھنا سیکھنا بہت ضروری ہے۔ طلبہ میں شروع سے ہی تقریر و تحریر کے لئے محنت ہونی چاہئے۔

حضورؐ کو بھی حدیث یاد کرانے کی بہت فکر ہوتی تھی — خاص مواقع پر ترشیق مزید پر توجہ دلانا مقصود تھا۔

---

[1] صحیح بخاری جلد ۱ ص ۲۲ [2] کتاب التاریخ لیحیی بن معین ص ۱۵۶

لکھتے ہوئے سنی گئی روایات | شیخ حدیث سنا رہا ہو اور طلبہ لکھ رہے ہوں تو کیا لکھتے ہوئے سنی گئی روایات صیغہ سماع سے بیان ہو سکتی ہیں؟

اس میں علماء حدیث کا اختلاف رہا ہے۔ ابراہیم الحربی اور ابوبکر بن اسحٰق الصبغی وقت کتابت سماع کو صحیح نہیں مانتے وہ سمجھتے ہیں کہ اس خیال میں توجہ بٹی ہوتی ہے اور سننے کا حق ادا نہیں ہوتا سو اسطرح سنی روایت کو سماع سے ذکر کرنا درست نہیں۔

امام عبداللہ بن مبارکؒ اس طرح سنی گئی روایات کا سماع درست تسلیم کرتے ہیں اور اسے سماع سے روایت کرنا جائز سمجھتے ہیں جو اسے جائز نہیں سمجھتے وہ اسے تحریر سے روایت کرنے کے ضمن میں لے آسکتے ہیں۔

یادداشت کی بجائے تحریر سے روایت کرنا | اگر کسی صحابی، تابعی، امام یا راوی حدیث کے پاس کوئی باوثوق تحریر ہو۔۔۔ اس نے وہ تحریر خود اپنی یادداشت سے لکھی ہو اس کے پاس محفوظ ہو اور اسے پوری طرح یاد ہو کہ یہ تحریر اسی کی ہے اور وہ اسے پہچانتا ہو یا اس نے وہ تحریر اپنے شیخ یا اپنے باپ یا دادا سے لی ہو اور اس تحریر پر اس اوپر کے راوی کے دستخط یا اس کی توثیق کسی پیرایہ میں درج ہو۔۔۔ اور پھر راوی اب حدیث کو اپنی یادداشت سے نہیں بلکہ اس تحریری دستاویز سے روایت کرے تو جائز ہے؟

ہاں جائز ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو ابن العاص (۶۷ھ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو مجموعہ احادیث لکھا تھا اور وہ صحیفہ جس کا نام "الصادقہ" تھا۔ پھر آپ کی اولاد میں منتقل ہوتا رہا۔ آپ کے پوتے اور پڑپوتے اس دستاویز سے ہی ان احادیث کو آگے روایت کرتے رہے۔

یحییٰ بن سعید القطان عمرو بن شعیب کی روایت کو اسی لئے کمزور سمجھتے رہے کہ وہ اپنے دادا عبداللہ بن عمرو کے تحریر کردہ مجموعے سے احادیث کو روایت کرتے ہیں (یادداشت سے نہیں) لیکن اکثر اہل علم اسطرح روایت کرنے کو ناجائز نہیں سمجھتے۔ امام ترمذیؒ لکھتے ہیں:

قد تکلم یحییٰ بن سعید فی حدیث عمرو بن شعیب وقال هو عندنا واہٍ ومن ضعفہ فانما ضعفہ من قبل ان یحدث من صحیفۃ جدہ عبداللہ بن عمرو واما اکثر اھل العلم فیحتجون بحدیث عمرو بن شعیب و یثبتونہ (جامع ترمذی جلد ۱ ص۱۴۳) ترجمہ: یحییٰ بن سعید نے عمرو بن شعیب کی حدیث میں کلام کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی روایت ہمارے ہاں کمزور ہے اور جس نے بھی اسے ضعیف کہا اس لئے کہا ہے کہ وہ اپنے دادا عبداللہ بن عمرو کے صحیفہ (الصادقہ) سے حدیث روایت کرتے تھے لیکن اکثر اہل علم عمرو بن شعیب کی حدیث سے حجت پکڑتے ہیں اور اسے ثابت مانتے ہیں۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر اہل علم کے ہاں باوثوق تحریر سے حدیث روایت کرنا ناجائز نہ سمجھا جاتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ اس کتاب "الصادقہ" کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "الصادقہ" وہ کتاب ہے جو میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لکھی تھی[۱]

---

[۱] سنن دارمی ج ۱ ص ۱۲۷

حدیث بیان کرتے وقت قبلہ رخ ہونا محدث جب اپنی سند سے روایت کر رہا ہو تو وہ ایک بہت بڑی ذمہ داری ادا کر رہا ہوتا ہے اسے چاہیئے کہ مجلس اور آداب کا پورا لحاظ رکھے۔ حضرت سفیان جب حدیث روایت کرتے تو قبلہ رخ ہو کر حدیث پڑھتے۔ یحییٰ بن معین لکھتے ہیں:

کان سفیان اذا حدث استقبل القبلۃ[1]

حدیث باوضو پڑھنا مستحب ہے قرآن مجید تو وحی متلو ہے جسے بغیر وضو چھونا منع ہے لا یمسہ الا المطھرون۔ حدیث شریف غیر متلو ہے، سو مستحب ہے کہ اسے بھی بغیر وضو نہ چھوئے بلکہ وضو سے ہی پڑھے اور پڑھائے۔ اکابر علماء امت حدیث باوضو ہی پڑھاتے رہے ہیں۔

تابعی کبیر حضرت قتادہؒ (۱۱۸ھ) کے بارے میں مروی ہے: لقد کان یستحب ان لا تقرأ الاحادیث التی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الا علی وضوء[2]

ترجمہ: آپ مستحب سمجھتے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث باوضو ہی پڑھیں۔

حضرت امام مالکؒ (۱۷۹ھ) کا عمل بھی ملاحظہ کیجئے: کان مالک بن انس لا یحدث بحدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا وھو علی وضوء اجلالا لحدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔[3]

ترجمہ: امام مالک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث جب بھی بیان کرتے تو وضو سے ہوتے۔ آپ کا یہ عمل حدیث رسول کی اجلال شان کے لئے تھا۔

حضرت امام لیث مصری (۱۷۵ھ) بھی حدیث کی کتابت طہارت وضو کے ساتھ کرتے تھے[4]

سلف صالحین بے وضو حدیث بیان کرنے کو ناپسند کرتے تھے۔ حضرت اعمش (۱۴۷ھ) سے جب وضوء نہ ہو سکتا تو تیمم ہی کر لیتے تھے (مدارج النبوۃ ص۵۴۲) حضرت امام بخاری کے بارے میں تو مشہور ہے کہ ہر حدیث کی تحریر سے پہلے غسل کرتے اور دو رکعت صلوٰۃ الاستخارہ پڑھتے تھے۔[5]

اس سے آپ اندازہ کریں کہ اس دور میں حدیث کا کس قدر احترام ہوتا تھا اور مومنین کس طرح شریعت کے اس چشمہ زلال پر دل و جان سے قربان ہوتے تھے۔

حدیث کو مختصر کرنے سے احتراز علماء حدیث کا اس باب میں اختلاف رہا ہے۔ خلیل بن احمد کہتے ہیں کہ حدیث اسی طرح روایت کرنی چاہیئے جیسے کہ سنی گئی تھیں اسے اپنی طرف سے مختصر کرنا جائز نہیں۔

لا یحل اختصار الحدیث لقولہ رحم اللہ امرأ سمع مناحدیثا فبلغہ کما سمعہ۔

یحییٰ بن معین کی رائے اس مسئلہ میں یہ ہے: کان یکرہ الانتخاب ویذمہ ویقول صاحب الانتخاب یندم ولذلک کان یکتب علی الوجہ لئلا یسقط علیہ حدیث۔

---

[1] کتاب التاریخ لیحییٰ بن معین جلد ۲ ص۲۱۳ طبع ۱۳۹۹ مکہ [2] المصنف لعبدالرزاق ص۳۴۴ وشرح السنۃ للبغوی ص۳۰۵
[3] جامع بیان العلم لابن عبدالبر ص۱۹۹ج۲ [4] مدارج النبوۃ ص۵۴۳ [5] فضل الباری ص۹۱ للشیخ العثمانیؒ

ترجمہ: آپ حدیث کے انتخاب کرنے کو مکروہ جانتے تھے اور اسے برا کہتے تھے آپ کا مقولہ تھا کہ انتخاب کرنا آخر کار شرمندہ ہوتا ہے۔

سفیان الثوری (۱۶۱ھ) اس شخص کے سامنے جس کے پاس حدیث پوری روایت کی جا چکی ہو اس کا اختصار سے پیش کرنا جائز کہتے تھے۔ یروی الاحادیث علی الاختصار لمن قد رواھا له علی التمام[۱]

ابو محمد حسین بن مسعود الفراء البغوی (۵۱۶ھ) ایک بحث میں لکھتے ہیں: وفیه دلیل علی کراھیة اختصار الحدیث لمن لیس بالمتناھی فی الفقه لانه اذا فعل ذلك فقد قطع طریق الاستنباط علی من بعده ممن ھو افقه وفی ضمنه وجوب التفقه والحث علی استنباط معنی الحدیث واستخراج المکنون من سره (شرح السنة ج ۱ ص ۲۳۶)

ترجمہ: اور اس میں اس شخص کے لئے جو فقہ میں ماہر نہیں حدیث کو مختصر کرنا مکروہ قرار دیا گیا ہے وہ اگر ایسا کرے گا تو اس نے اپنے بعد کے کسی زیادہ فقہ جاننے والے پر طریق استنباط روک دیا اور اس حدیث کے ضمن میں حدیث پر تفقہ کرنا اور حدیث سے معانی کو مستنبط کرنا اور اس کے چھپے اسرار کو کھولنا واجب بتلایا گیا ہے۔

تقطیع حدیث حدیث کو جزو جزو کر کے مختلف ابواب میں لانا تقطیع حدیث کہلاتا ہے۔ صحیح بخاری میں امام بخاریؒ نے بڑی محنت اور گہری فکر سے صحیح کے مختلف باب قائم کئے ہیں سو ہر باب میں آپ اتنی ہی روایت لاتے ہیں جتنی اس سے متعلق ہو اور آپ اس کے مطابق حدیث کی تقطیع (ٹکڑے ٹکڑے کر کے بیان کرنا) کرتے چلے گئے ہیں۔

امام مسلمؒ نے صحیح مسلم میں خود باب نہیں باندھے اس لئے وہ حدیث مسلسل بیان کرتے ہیں تقطیع حدیث نہیں کرتے تاہم صحیح یہ ہے کہ تقطیع حدیث اس شخص کے لئے جو فقہ میں ماہر ہو اور تقطیع سے مضمون میں فرق نہ آنے دے جائز ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی صحیح بخاری کی ایک حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ان البخاری یذھب الی جواز تقطیع الحدیث اذا ما کان یفصله منه لا یتعلق بما قبله ولا بما بعده تعلقا یفضی الی فساد المعنی فصنیعه کذلک یوھم من لا یحفظ الحدیث ان المختصر غیر التام لا سیما اذا کان ابتدا المختصر من اثناء التام[۲]

پھر تقطیع اور اختصار میں بھی فرق ہے تقطیع کی اجازت سے مراد یہ نہیں کہ ہر شخص اور ہر عامی جس حدیث کو چاہے اس کی تقطیع کرلے۔ ہرگز نہیں۔ یہ کسی صورت میں جائز نہیں تقطیع حدیث کی اجازت سے مراد صرف ان محدثین کیلئے ہے جو ماہر فن ہوں بارع فی الاثر والنظر ہوں اور اختصار کرنے سے حدیث کے مضمون میں کہیں فرق نہ آنے دیں۔

سو اصولاً یہ صحیح ہے کہ تقطیع ان شرائط سے جائز ہے۔ وکان غیر واحد من الائمة یفعل ذلک[۳]

روایت بالمعنی سے حتی الوسع احتراز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نضر اللہ امرأ سمع منا حدیثا فبلغه کما سمعه (سنن دارمی ص ۵۰) اللہ تعالیٰ اس شخص کو سرسبز فرمائے جس نے میری کوئی بات سنی اسے یاد رکھا اور اسے آگے اسی طرح نقل کیا جیسا کہ اس نے سنا تھا۔۔۔ سوچئے کہ

---

[۱] الکفایہ ص ۱۹۲ [۲] فتح الباری جلد ۱ ص ۵۰ [۳] الکفایہ ص ۱۹۳

حدیث کو اس طرح روایت کرے جیسا کہ اس نے سُنا۔ اس میں کوئی تبدیلی نہ کرے۔
صحابہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ اتباعِ لفظی کے قائل تھے لیکن حضرت واثلہ بن الاسقعؓ روایت بالمعنی کو جائز سمجھتے تھے۔ فرماتے ہیں: اذا حدثناکم بالحدیث علی معناہ فحسبکم
امام ابوحنیفہؒ گو روایت باللفظ پر زور دیتے ہیں لیکن مفہوم کی روایت میں نفسِ جواز کے قائل تھے۔
ائمہ اربعہ اور اکثر محدثین اور علماء اصول روایت بالمعنی کو جائز سمجھتے ہیں۔ امام سفیان ثوری (۱۶۱ھ) کہتے ہیں ان قلت انی حدثتکم کما سمعت فلا تصدقونی فانما ھو المعنیٰ۔ اگر میں کہوں کہ میں نے حدیث تمہارے سامنے اسی طرح روایت کی ہے جیسے میں نے سُنی تھی تو میری تصدیق نہ کرنا جو میں روایت کر رہا ہوں وہ تو اس کا معنی ہے۔ اور امام وکیع (۱۹۷ھ) کہتے ہیں وان لم یکن المعنیٰ واسعا فقد ھلک الناس
اگر روایت بالمعنی کی گنجائش نہ ہو تو لوگ بے شک ہلاک ہو جائیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں: والاکثر علی الجواز ومن اقوی حججھم الاجماع علی جواز شرح الشریعۃ للعجم بلسانھم للعارف الی بخواص التراکیب ومفھومات الخطاب وعالم بالعربیۃ وماھو فی اسالیب الکلام۔ اکثر علماء اس کے جواز کے قائل ہیں اور ان کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ عجمی ممالک کے لوگوں کے لئے ان کی زبانوں میں شریعت بیان کرنا بالکل جائز ہے۔ ہاں یہ اس کے لئے ہے جو خواص ترکیب کلام اور مفہومات خطاب کو پہچانتا ہو۔ عربیت کا عالم ہو اور اسالیب کلام میں مہارت رکھتا ہو۔
صدر الشریعۃ توضیح میں لکھتے ہیں۔ اگر حدیث محکمات میں سے ہے کہ نہ محتمل تاویل ہے اور نہ محتمل نسخ تو ایسی حدیث کو بالمعنیٰ روایت کرنا صرف ان حضرات کو درست ہے۔ جو علم لغت سے کما حقہ واقف ہیں اور جس حدیث میں احتمال تاویل ہو تو ایسی حدیثوں کو بالمعنیٰ روایت کرنا صرف فقہاء و مجتہدین کے لئے جائز ہے اور اگر حدیث جوامع الکلم میں سے ہے یا اس میں کوئی لفظ مشترک یا مجمل یا متشابہ ہے تو اس کو بالمعنیٰ روایت کرنا کسی کے لئے جائز نہیں۔
حضرت قاسم بن محمد (۱۰۷ھ) امام ابن سیرین (۱۱۱ھ) رجاء بن حیوۃ (ھ) امام مالک (۱۷۹ھ) ابن علیہ، عبدالوارث، یزید بن زریع (۱۸۲ھ) وہیب (ھ) امام احمد بن حنبل (۲۴۱ھ) اور یحییٰ بن معین (۲۳۳ھ) لفظی پابندی کے قائل تھے لیکن امام حسن بصری علامہ شعبی (۱۰۳ھ) اور ابراہیم نخعی جیسے بزرگ اس کے جواز کے قائل تھے۔
دونوں میں راجح بات جواز کی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ روایت حدیث میں الفاظ کی پابندی کرنا افضل ہے اور یہی امام ابوحنیفہؒ کی رائے ہے لیکن یہ بات بھی لائق غور ہے کہ یہ جواز اور عدم جواز کی بحث صرف قرون اولیٰ تک کے لئے تھی۔ اب جبکہ تالیفات حدیث مکمل ہو چکی ہیں اور مجموعہ ہائے حدیث چہار دانگ عالم میں پھیل چکے ہیں احادیث کا ترجمہ تو دوسری زبانوں میں کیا جا سکتا ہے لیکن ان روایات کو اب اور روایت بالمعنی سے گز نادرست نہیں۔ حدیث کسی بھی زبان میں بیان کی جارہی ہے اس کا مضمون اور ترتیب وہی رہنی چاہئے جو موجودہ تالیفات حدیث میں پائی جاتی ہے نہ انہیں اپنی طرف سے مختصر کرے نہ کسی روایت کو اپنے مفہوم میں نقل کرے اور روایت بالمعنی کے جواز کو اس

ھ شرح السنۃ للبغوی ج ۱ ص ۲۳۶ ھ شرح السنۃ للبغوی ج ۱ ص ۲۳۵

پندرھویں صدی تک وسیع نہ کرے جہاں تک ہو سکے روایت بالمعنی سے احتراز کرے اور اس میں احتیاط ہے۔

کثرت روایت سے حتی الوسع احتراز

حدیث بیان کرنے میں پوری احتیاط کرنی چاہیے۔ صحابہ کبر سنی (بڑھاپے) میں جب ذرا محسوس کرتے کہ اب روایت صحیح نہ ہو سکے گی تو صاف کہدیتے کہ ہمیں اب حدیث پر ضبط نہیں رہا۔ حضرت زید بن ارقمؓ نے ایک موقع پر صاف فرما دیا تھا:

کبرنا ونسینا والحدیث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدیدؔ

ترجمہ "اب ہم بوڑھے ہو گئے اور بھولنے لگے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث روایت کرنا تو ایک بڑا اہم معاملہ ہے" حافظ ابن عبد البر مالکیؒ، امام شافعیؒ سے نقل کرتے ہیں: کان مالک اذا شك فی الحدیث طرحہ کلہٗ (التمہید ص۶۳ ج ۱) امام مالکؒ کو جب کسی حدیث کی روایت میں کوئی شک ہو جاتا تو وہ اس پوری کی پوری روایت کو چھوڑ جاتے۔ اسی سے آپ محدثین کی احتیاط فی الحدیث کا اندازہ لگائیں۔ کثرت روایت سے احتراز اسی احتیاط کے لئے تھا

بعض محدثین اسی وجہ سے اکثار الحدیث (حدیث کثرت سے روایت کرنا) کے خلاف تھے کہ اس میں احتیاط نہیں رہ سکتی۔ امام بغویؒ (۵۱۶ھ) لکھتے ہیں ولذلك کرہ قوم من الصحابۃ والتابعین اکثار الحدیث عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم خوفا من الزیادۃ والنقصان والغلط فیہ حتیٰ ان من التابعین کان یھاب رفع المرفوع فیوقفہٗ علی الصحابی ویقول الکذب علیہ اھون من الکذب علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ومنھم من یسند الحدیث الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی اذا بلغ بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال "قال" ولم یقل رسول اللہ .... وکل ذالك ھیبۃً للحدیث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وخوفا من الوعید ؔ

صحابہ اور تابعین میں سے کچھ حضرات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث کثرت سے روایت کرنا مکروہ سمجھتے یہ اس اندیشے سے تھا کہ آپ سے روایت کرنے میں زیادتی کمی اور کہیں غلطی نہ ہو جائے ۔ یہاں تک کہ بعض ایسے تابعین بھی تھے جو حدیث کو مرفوع (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی ہوئی) بیان کرنے سے ڈرتے تھے اور ایسے صحابی پر ہی (جو ایسے روایت کر رہا ہو) موقوف کر دیتے تھے (گویا کہ یہ صحابہ کا ہی ارشاد ہے) اور سمجھتے تھے کہ کوئی بات صحابی کے بارے میں غلط ہو جائے یہ اس سے آسان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے کوئی بات زبان سے غلط نکل جائے اور ان میں ایسے بھی تھے جو حدیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتے تو صرف "قال" (انہوں نے کہا) کہہ کر بیان کر دیتے۔ "قال رسول اللہ" نہ کہتے۔ اور یہ سب کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کرنے میں آپ کی ہیبت اور جلال سے ہوتا اور اس وعید سے (جس میں آپ نے فرمایا کہ جو شخص میرے نام سے کوئی ایسی بات کہے جو میں نے نہ کہی ہو تو اسے چاہیئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے) سے ڈرنے کی وجہ سے ہوتا تھا۔

مقدمہ مشکوٰۃ ص۱۰۵ شرح السنۃ جلد ۱ ص۲۵۵، ۲۵۶

ثقہ راویوں کے زیادہ الفاظ کی قبولیت

حافظ ابن صلاح لکھتے ہیں کہ ثقہ راوی اگر باقی ثقہ راویوں کی روایت پر کچھ زیادہ الفاظ روایت کرے تو وہ زیادہ الفاظ اگر دوسروں کی روایت کردہ حدیث سے ٹکراتے ہیں تو انہیں قبول نہ کیا جائے اگر وہ زیادت ان کے معارض نہیں تو وہ لائق قبول ہے۔ ثقہ راوی کی روایت رد نہیں نہیں کی جاسکتی۔ محدثین کا تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ ثقہ کی زیادتی قابل قبول ہے۔ حافظ جمال الدین الزیلعی (۷۶۲ھ) نے نصب الرایہ میں بسم اللہ بالجہر پڑھنے کی بحث میں اس موضوع پر بڑی مفید بحث کی ہے (دیکھئے جلد اول صـ ۳۶۰)

ابوعوانہ نے حضرت قتادہ سے انہوں نے یونس بن جبیر سے انہوں نے حطان بن عبداللہ سے انہوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اذا صلیتم فاقیموا صفوفکم ثم لیؤمکم احدکم فاذا کبر فکبروا واذا قال غیر المغضوب علیهم ولا الضالین فقولوا آمین

لیکن حضرت سلیمان التیمی نے قتادہ عن یونس بن جبیر عن حطان بن عبداللہ الرقاشی سے اس حدیث کو روایت کرتے ہوئے یہ الفاظ بھی روایت کئے: واذا قرأ فانصتوا (ترجمہ: جب امام قرآن پڑھے تو تم چپ رہو) یہ الفاظ سلیمان کے سوا قتادہ کے دوسرے شاگردوں نے روایت نہیں کئے لیکن ان کی روایت سے ٹکراتے بھی نہیں تو ثقہ راوی کی یہ زیادتی لائق قبول ہوگی۔ امام مسلم سے ان کے شاگرد ابواسحٰق ابراہیم بن سفیان کہتے ہیں کہ ابوبکر بن اخت ابوالنضر نے امام مسلم سے اس زیادتی کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا "اتريد احفظ من سليمان" (تم سلیمان سے زیادہ حافظہ میں کس کو پاتے ہو؟)[طـ۱۷۴] پھر ابوبکر بن اخت ابی النضر نے پوچھا کہ اس موضوع میں حدیث ابی ہریرہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ بھی صحیح ہے

واذا قرأ فانصتوا فقال هو عندي صحيح فقال لم لم تضعه ههنا قال ليس كل شيء عندي صحيح وضعته ههنا

استاد شاگرد کے اختلاف میں مسئلے کا حل

شیخ اور اس سے سننے والے دونوں ہی علم پیغمبر کے وارث و امین ہیں اس لئے ایسے موقع پر کہ کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بات کی نسبت غلط نہ ہو جائے استاذ یا اوپر کے کسی راوی سے اختلاف کرنا یا کسی راوی اور استاد کی جانچ پڑتال کرنا یہ کوئی امر ناجائز نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کا ادب و احترام استاد کے ادب و احترام سے کہیں زیادہ ہے۔

حضرت عمرو بن دینار نے حضرت ابومعبد سے بھی روایات لیں۔ ایک روایت میں استاذ شاگرد کا اختلاف ہوگیا حضرت ابومعبد نے فرمایا کہ میں نے اسطرح یہ حدیث تمہارے پاس روایت نہیں کی۔ (مسلم شریف جلد ا صـ ۲۱۷) روایت یہ تھی کہ صحابہؓ اختتام نماز پر بلند آواز سے تکبیر کہا کرتے تھے اس کے راوی سفیان، عمرو بن دینار، ابومعبد اور حضرت ابن عباسؓ تھے۔ یہ صحیح مسلم کی اسناد یہی ہے اس میں استاد شاگرد کا اختلاف ہوگیا۔ قال عمرو فذكرت ذالك لابي معبد فانكره وقال لم احدثك بهذا قال عمرو وقد اخبرنيه قبل ذالك

ترجمہ: عمرو کہتے ہیں کہ میں نے اس حدیث کو ابومعبد کے پاس ذکر کیا تو انہوں نے اس روایت کا انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں نے تو یہ حدیث تمہارے پاس بیان نہیں کی تھی۔ عمرو کہتے ہیں کہ انہوں نے بیشک یہ حدیث میرے پاس بیان کی تھی۔

ترجمہ امام ابوحنیفہ اور امام یوسف، امام احمد اسطرف گئے ہیں کہ اس روایت پر عمل ساقط ٹھہرتا ہے جیسا کہ پہلی صورت میں تھا اور یہی امام کرخی اور فخر الاسلام اور قاضی ابوزید کا مختار ہے۔

روایت حدیث پر اجرت لینا جو محدث حدیث روایت کر رہا ہو وہ دراصل ادائے امانت کر رہا ہے۔ علم دین کی جو امانت اس کے پاس تھی اُسے آگے پہنچا رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم کہ میری جو بات تمہیں ملے اسے آگے پہنچادو" بلّغوا عنّی ولو اٰیۃ " اور " فلیبلغ الشاهد الغائب" اس پر شاهد ناطق ہے۔

ادائے امانت پر اُجرت لینا یہ کاروبار کہیں نہیں آتا۔ امام احمد بن حنبلؒ سے پوچھا گیا " أیکتب عمن یبیع الحدیث" کیا اس شخص سے روایت لکھی جائے جو حدیث کو بیچتا ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں۔ لا — ولا کرامۃ[1]

روایت حدیث اور تعلیم حدیث میں فرق ہے۔ راوی کی حیثیت سے روایت کرنے پر اُجرت نہیں لی جا سکتی ہاں معلم تعلیم حدیث پر اجرت لے سکتا ہے جیسا کہ تعلیم قرآن پر بھی اجرت لی جا سکتی ہے۔

اب سوال یہ رہتا ہے کہ اس صورت حال میں حدیث لائق استدلال رہتی ہے یا نہیں؟ سو اس سلسلہ میں حنفیہ کا مذہب یہ ہے خالفهم الکرخی من اصحاب ابی حنیفة رضی الله عنهما فقال لا یحتج بہ۔

ترجمہ: امام ابوحنیفہؒ کے اصحاب میں سے کرخیؒ نے اس قسم کی حدیث قبول کرنے والوں کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ اس صورتحال میں متعلقہ حدیث سے استدلال نہ کیا جائے[2]

بلکہ علامہ عینیؒ نے خود حضرت امام ابوحنیفہؒ سے یہی نقل کیا ہے:

فذهب ابوحنیفة وابویوسف واحمد فی روایة الی انه یسقط العمل به کالوجه الاول وهو مختار الکرخی والقاضی ابی زید وفخر الاسلام[3]

امام مالک کھڑے کھڑے حدیث پڑھنے والے پر پچاس کوڑوں کا حکم لگاتے تھے[4] ضعیف حدیث بیان کرے اس کا ضعف بیان کر دینا چاہیئے عقائد میں اس سے استدلال جائز نہیں اور موضوع حدیث تو بالکل بیان نہ کرے اسے موضوع جانتے ہوئے بیان کرنا حرام ہے۔

آداب محدثین کی پوری معرفت طلبہ حدیث کو چاہیئے کہ آداب محدثین سے پوری طرح واقف ہوں ان کے تعبیری فرق سمجھتے ہوں جو روایت صیغہ تحدیث سے آرہی ہے (نچلا راوی اوپر والے راوی کا نام لیکر کہے کہ اس نے میرے پاس یا ہمارے پاس یہ روایت بیان کی ہے) اور جو صیغہ عن (نچلا راوی اوپر کے راوی سے عن کہکر بیان کرے) سے آرہی ہے ان میں فرق جانتے ہوں۔ عن والی روایت میں نچلے راوی نے اوپر والے راوی سے نہ بھی سنا ہو بلکہ اسے دیکھا بھی نہ ہو تو اس سے عن سے روایت کرنا جھوٹ نہیں ہوگا۔ درمیانے راوی کو حذف بھی کیا جا سکتا ہے لیکن اگر وہ عن کی بجائے حدثنی کہہ کر اس سے روایت کرتا ہے تو صیغہ تحدیث یقیناً سماع پر محمول ہوگا جو ثقہ راوی استاد کا نام نہ ظاہر کرنا چاہتے تھے وہ تدلیس سے کام لیتے ہوئے اس سے اوپر کے راوی سے عن کہکر روایت کر جاتے تھے اور وہ غلط نہیں کہہ رہے ہوتے تھے پھر اگر کہیں ان سے صیغہ تحدیث یا سماعت کی صراحت بھی مل جائے تو یہ گمان تدلیس بالکل اُٹھ جاتا تھا

---

[1] الکفایہ صـ۵۴ [2] شرح صحیح مسلم جلد ا صـ۲۱۷ [3] عینی علی البخاری جلد ۶ صـ۱۲۷ [4] مدارج النبوۃ جلد صـ

قواعد الحدیث

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ۔ امابعد:۔

آج موضوع یہ ہے کہ حدیث قبول کیسے کی گئی؟ وہ کون سے اصول تھے جن پر حدیث قبول کی جاتی رہی؟ جو کچھ کسی نے کہہ دیا بس لے لیا جاتا رہا۔ یا روایت قبول کرنے کے لیے واقعی کچھ اصول کارفرما رہے؟ وہ اصول تھے تو کیا تھے کون سے قواعد تھے جن پر حدیث قبول کی جاتی رہی؟ ان میں احتیاط سے کون کون سے اصول کارفرما رہے اور کہاں کہاں ان قواعد میں نرمی اختیار کرنے کی گنجائش رہی؟ اس نرمی کا تدارک پھر کس طرح قرائن سے کیا جاتا رہا؟

پھر ایسے بھی کئی مواقع تھے کہ روایت اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود لکھ لی گئی۔ کیونکہ ہو سکتا تھا کہ آئندہ اس کے بارے میں کوئی اور بات کھلے اور یہ کمزور روایت اس بات کے قرائن میں شمار ہو جائے یا کہیں اس سے اعتبار کا کام لیا جائے۔ گو احتجاج نہ کیا جائے۔ بہرحال یہ ایک نہایت عمیق موضوع ہے۔ جس کی گہرائی میں وہی لوگ جا سکتے ہیں جنہوں نے حدیث پڑھنے پڑھانے میں زندگیاں صرف کی ہوں۔ ان حاذقین کا ذوق بولتا ہے کہ بات کہاں قابل اعتماد ہے۔ اور کہاں اس کے اعتماد میں جھول ہے اور ہے تو وہ کتنا ہے۔ قواعد کا سرسری مطالعہ یا اصول حدیث کی چند کتابوں کا پیش نظر ہونا اس فن کی مہارت کے لیے کافی نہیں۔

اس وقت ہمیں اس فن کی گہرائی میں اترنا نہیں۔ صرف اس موضوع کا کچھ تعارف کرانا ہے۔ اس میں اس فن کا کچھ تاریخی تجزیہ بھی ہو جائے گا اور یہ بات کھل کر سامنے آئے گی کہ فن روایت Science of transmission وہ نیا باب علم ہے جس سے دنیا قبل از اسلام ناآشنا تھی۔ فن تاریخ اور فن روایت کو مسلمانوں نے جو تازگی اور پختگی بخشی۔ اس کی مثال اقوام عالم اور ملل سابقہ

میں کہیں نہ ملے گی۔

محدثین نے حدیث کو یُوں ہی جمع نہیں کر لیا کہ جو کچھ کسی نے کہہ دیا اُنہوں نے سُن لیا قبول کر لیا اور لکھ لیا ——— ان کے سامنے روایت قبول کرنے اور اسے آگے نقل کرنے کے کچھ قواعد تھے اور ان قواعد کے ساتھ روایات پر رداً یا قبولاً بحث ہوتی تھی۔ جتنا کوئی باب نکھرتا جاتا اس کے بارے میں پختگی اور وثوق بڑھتا جاتا اور سند کے مراتب بدلتے جاتے۔ یہاں تک کہ بعض روایات متواتر ہو جاتیں۔ قوت سند کے انہی مراتب سے احادیث کی مختلف قسمیں ہوتی گئیں اور اس دور میں جو کمزور روایتیں قبول کی گئیں۔ وہ بدستور ان کمزوریوں کی حامل رہیں۔ انہیں انہی اسانید کے ساتھ پیش کیا جاتا رہا اور انہیں بالکل نظرانداز اس لیے نہ کیا گیا کہ ہو سکتا ہے کوئی آنے والا محقق اس باب میں کوئی اور انکشاف کرے اور یہ روایت کسی دوسری روایت یا تعامل کی تائید بن جائے۔ ایک رائے یا چند آراء کے ساتھ علم کے کسی گوشے کو کلیۃً دفن کر دینا قرین مصلحت نہ تھا۔

اسلام دینِ فطرت ہے۔ اس کے اصُول فطرت کے پیمانوں میں ڈھلتے اور اُبھرتے ہیں حدیث قبول کرنے میں بنیادی اصول تقریباً وہی ہیں۔ جو فطری تقاضوں کے مطابق کسی بات کو قبول کرنے یا نہ کرنے کے ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان کا تعین ہر شخص کی اپنی فطرت پر موقوف نہیں۔ اہل فن کے تجربات اور فیصلوں سے ہی ہوتا آیا ہے۔

بات کے لائق قبول ہونے کے عقلی تقاضے

کسی بات کے لائق قبول ہونے کے لیئے بہت سی باتوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے لیکن ان سب وجوہ کا اجمال دو باتوں میں لپٹا ہوا ہے۔ اوّل یہ کہ بیان کرنے والے کی یادداشت اچھی ہو وہ قوی حفظ رکھتا ہو۔ دوم یہ کہ دیانت دار ہو۔ مخلصانہ سچائی پر رہتا ہو ———

یہ قوی حفظ Strong memory اور مخلصانہ سچائی Sincere righteousness ہی وہ بنیادی اصُول ہیں۔ جن پر فن حدیث میں تعدیل کی چکی گھومتی ہے۔ آگے جو کچھ ہے وہ انہی اصُولوں کی تفصیل ہے۔ مثلاً یہ کہ (۱) راوی کمزور نہ ہو (۲) جانا پہچانا اور معروف ہو۔ مجہول نہ ہو۔

(۳) اس کی روایت کا کہیں انکار نہ کیا گیا ہو منکر نہ ہو۔ (۴) دیانت اور نیکی سے آراستہ ہو جھوٹ بولنے والا نہ ہو۔ (۵) ہر کس و ناکس کو اعتماد میں نہ لے. علم ذمہ دار لوگوں کے سپرد کرے اور انہی میں رہے وغیر ذلک اب ہم انہیں یہاں ذرا تفصیل سے ذکر کرتے ہیں۔

(۱) راوی کمزور نہ ہو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس میں بات سننے کی ——— یاد رکھنے کی ——— اور آگے نقل کرنے کی قوت موجود ہو۔ اتنا قوی نہ ہوگا تو کمزور شمار ہوگا، سمجھنے میں پوری گہرائی مطلوب نہیں۔ اصولی درجے میں سمجھنے کی اہلیت کافی ہے۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ کئی روایت کرنے والے ایسے ہوتے ہیں جو خود بات کی تہہ تک نہیں پہنچتے۔ لیکن جن کے پاس روایت کرتے ہیں وہ ان سے زیادہ اس بات کو پا لیتے ہیں۔ سو راوی کمزور نہ ہونے سے مراد سننے، یاد رکھنے اور روایت کرنے میں کمزور نہ ہونا ہے سمجھنے میں فقیہ ہونا ضروری نہیں۔

(۲) راوی جانا پہچانا ہو۔ جن سے روایت لے رہا ہے اور جن کو روایت دے رہا ہے ان میں جانا پہچانا ہو اور راویوں میں قابل اعتماد سمجھا جائے۔ اس کی روایت اس شخص کی روایت سے کہیں زیادہ لائق اعتماد ہوگی جس نے ان سے روایت سنی اور اسے اپنے شیخ روایت کے ہاں کبھی اٹھنے بیٹھنے کا اور موقع نہ ملا گو یہ راوی اپنی جگہ سچا ہو۔ مگر اس سے وہ راوی جو سچا بھی ہو اور اپنے شیخ کی مجلس اچھی جگہ پائے ہوئے ہو زیادہ قابل اعتماد سمجھا جائے گا۔

(۳) اس کی روایت کا کہیں انکار نہ کیا گیا ہو۔ اور لوگ جنہوں نے وہ بات سنی تھی۔ ان کا اس سے اتفاق رہا ہو۔ کسی نے اس کی بات سے انکار نہ کیا ہو۔ ایک شخص سے چار آدمی ایک بات سن کر گئے۔ ان میں سے ایک اس بات کو اسی طرح روایت کرتا ہے کہ باقی تین اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ تو وہ شخص شاذ کا راوی یا منکر الروایۃ سمجھا جائے گا۔ کہ اس کی روایت کا انکار ثابت ہو چکا ——— قبولیت کے لیئے ضروری ہے کہ اس کی بات پر کہیں انکار نہ کیا گیا ہو ——— وہ ہمیشہ کے لیئے اپنی بات میں مطاع to be obeyed اور قابل قبول رہے۔

(۴) راوی دیانت دار honest اور راستباز righteous ہو فاسق نہ ہو۔ غلط کار wicked نہ ہو۔ امین ہو ——— فسق سے مراد فسق فی العمل ہے۔ فاسق کی روایت

کمزور ہوگی اور مزید تبیین کی محتاج ہوگی۔ رہا فسق فی القول تو ایسا کذاب راوی لائق تذکرہ ہی نہیں نہ اس کی روایت کسی درجہ میں لائق قبول ہوگی۔

⑤ عام مجلسی نہ ہو۔ ہر کس وناکس سے بات کہنے والا نہ ہو۔ ایسا کرنے والا بسا اوقات خود بھی اس زمرے میں آجاتا ہے۔ صحیح پختہ راوی وہ ہے جو انہی سے روایت کرے جو حفظ وضبط میں پختہ ہوں اور امانت ودیانت کے اہل ہوں اور انہی کو روایت کرے جو اس کی بات میں کمی بیشی کرنے والے نہ ہوں۔ ایسا شخص اگر کبھی غیر معروف کسی شخص سے بھی روایت لے لے تو اس کی اس عام عادت کے سبب اس غیر معروف راوی کی بھی جہالۃ العین اٹھ جائے گی۔

نقل وروایت ان فطری اصولوں سے آگے چلے تو بات نہایت پختہ اور لائق قبول ہو جاتی ہے اور جہاں یہ سب باتیں جمع ہو جائیں تو دل اس روایت کی صداقت کی گواہی دینے لگتا ہے اور اس میں کوئی تردد باقی نہیں رہتا۔ قبول روایت کے یہی فطری اصول ہیں اور دین فطرۃ بے شک انہی اصولوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

بات کے لائق اعتماد ہونے کا قرآنی نظریہ

قرآن کریم میں براہ راست تو اس پر بحث نہیں ملتی کہ نقل وروایت کن اصولوں سے لائق اعتماد بنتی ہے۔ لیکن حضرت جبریل علیہ السلام نے اللہ رب العزت کی باتیں آگے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک نقل کیں۔ تو قرآن کریم نے اس باب میں حضرت جبریل کی چند صفات کا خصوصی ذکر فرمایا۔ یہ صفات ایک راوی کی حیثیت سے ہمارے لیئے رہنمائے اصول ہیں جبریل امین بے شک معصوم ہیں۔ ان سے نقل روایت میں کسی غلطی کا احتمال نہیں لیکن امت کو نقل روایت کے رہنمائے اصول دینے کے لیئے اللہ تعالیٰ نے ان کی ان صفات کا بھی ذکر فرمادیا:۔

علمہ شدید القوی ۝ ذو مرۃ فاستوی ۝ وھو بالافق الاعلیٰ ۝ پ۲۷ النجم ع ۱

ترجمہ۔ سکھایا اسے سخت قوتوں والے نے۔ زور آور طاقت ور نے پھر سامنے سیدھا بیٹھا اور وہ آسمان کے اونچے کنارے پر تھا۔

پھر سورۂ تکویر میں اللہ رب العزت نے جبریل امین کی صفات کے ساتھ اگلے راوی

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی آپ سے اتصال بیان فرمایا۔ آپ کی قوی ذہنی قوت بیان کی اور دونوں کے مابین اتصال اور ملاقات کا اثبات فرمایا۔ یوں کہیئے قرآن کریم نے ان صفات میں روایت کے تقریباً تمام رہنمائے اصول بیان کر دیئے۔

انہ لقول رسول کریم ہ ذی قوۃ عند ذی العرش مکین ہ مطاع ثم امین ہ وما صاحبکم بمجنون ہ ولقد راٰہ بالافق المبین۔ پ۳۰ التکویر ع۱

ترجمہ۔ بے شک یہ بات ہے ایک معزز بھیجے ہوئے کی (یعنی جبریل امین کی) جو قوت والا ہے ——— عرش کے مالک کے پاس مجلس پانے والا ہے ——— سب کا مانا ہوا ہے اور پھر وہاں اعتماد یافتہ ہے ——— اور یہ تمہارا رفیق (حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کوئی دیوانہ نہیں ——— اور اس نے دیکھا ہے اسے (اس فرشتہ کو) آسمان کے کھلے کنارے کے پاس۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رہ لکھتے ہیں:۔

قرآن کریم جو اللہ کے پاس سے ہم تک پہنچا ہے۔ اس میں دو واسطے ہیں۔ ایک وحی لانے والا فرشتہ (جبریل علیہ السلام) اور دوسرا واسطہ جناب پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم ——— دونوں کی صفات وہ ہیں جن کے معلوم ہونے کے بعد کسی قسم کا شک و شبہ قرآن کے صادق اور منزل من اللہ ہونے میں نہیں رہتا کسی روایت کے صحیح تسلیم کرنے کے لیئے اعلیٰ سے اعلیٰ راوی وہ ہوتا ہے جو اعلیٰ درجے کا ثقہ، عادل، ضابط، حافظ اور امانت دار ہو۔ جس سے روایت کرے اس کے پاس عزت و حرمت سے رہتا ہو۔ بڑے بڑے معتبر ثقات اس کی امانت وغیرہ پر کلی اعتماد رکھتے ہوں اور اسی لیئے اس کی بات بےچون و چرا مانتے ہوں۔ یہ تمام صفات جبریل میں موجود ہیں۔ (تفسیر عثمانی صـ۷۶۲)

رسُول ملکی کا اعتبار و ثقاہت

وہ کریم ہیں جن کے لیئے اعلیٰ، نہایت متقی اور پاکباز ہونا لازم ہے ——— بڑی قوت

والے ہیں۔ جس میں اشارہ ہے کہ حفظ وضبط اور بیان کی قوت بھی کامل ہے ــــــ اللہ کے ہاں اُن کا بڑا درجہ ہے ــــــ سب فرشتوں سے زیادہ بارگاہِ ربوبیت میں قرب اور رسائی حاصل ہے ــــــ آسمانوں کے فرشتے ان کی بات مانتے اور ان کا حکم تسلیم کرتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے امین اور معتبر ہونے میں کسی کو شک نہیں۔

رسُولِ مَلکی کے بعد رسُولِ بشری کی ثقاہت

یہ تو رسول ملکی کا حال تھا۔ اب رسول بشری کا حال سُن لیجئے۔ بعثت سے پہلے چالیس سال تک وہ تمہارے اور تم ان کے ساتھ رہے۔ اتنی طویل مدت تک تم نے اس کے تمام کھلے چھپے احوال کا تجزیہ کیا۔ کبھی ایک مرتبہ اس میں جھوٹ، فریب یا دیوانہ پن کی بات نہ دیکھی ہمیشہ اس کے صدق وامانت اور عقل و دانائی کے معترف رہے۔ اب بلا وجہ اُسے جھوٹا یا دیوانہ کیوں کر کہہ سکتے ہو؛ کیا یہ وہی تمہارا رفیق نہیں ہے جس کی رتی رتی احوال کا تم پہلے سے تجربہ رکھتے ہو؟ اب اس کو دیوانہ کہنا بجز دیوانگی کے کچھ نہیں ــــــ مشرقی کنارہ کے پاس آپ نے جبریل کو، اس کی اصل صورت میں صاف صاف دیکھا۔ اس لیے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ شاید دیکھنے یا پہچاننے میں کچھ اشتباہ و التباس ہو گیا ہو گا ــــــ جب جھوٹ، دیوانگی، تخیل و توہم اور کہانت وغیرہ کے سب احتمالات مرفوع ہوئے تو بجز صدق وحق کے اور کیا باقی رہا۔ پھر اب اس روشن اور صاف راستہ کو چھوڑ کر کدھر بہکے جا رہے ہو۔[۱]

قرآن کریم کی ان آیات میں نقل و روایت اور اس کے اعتماد و ثقاہت کے جملہ اصول ملتے ہیں۔ قرآن کریم نے جس انداز میں انہیں بیان کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سب اصول فطرت ہیں جن سے کسی بات کی نقل و روایت میں اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ بات کے لائقِ اعتماد ہونے کے تمام عقلی تقاضے ان قرآنی آیات میں لپٹے ہوئے ہیں، تاہم یہ صحیح ہے کہ اصولی درجے

---

[۱] تفسیر عثمانی ۷۶۲

میں عدالت اور ضبط ہی وہ صفات ہیں جن کی تفصیلات آگے اُصول روایت بن کر پھیلیں اور مختلف پیرایوں میں راویوں اور ان کے باہمی تعلق سے آگے چلتی رہیں۔

راوی کے بنیادی اوصاف

راوی کے بنیادی اوصاف یہی ہیں کہ اس کی ذات کے بارے میں اعتماد ہو کہ وہ یاد رکھنے میں لائق وثوق ہے۔ اس کا ضبط قابل اعتماد ہے اور اس کی دیانت داری (امانت) پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم مہتمم دارالعلوم دیوبند نے راوی کے اوصاف پر ایک نہایت جامع اور وجیز بحث تحریر فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں:

راوی کے وہ تمام اوصاف جو بلحاظ روایت اس کی قبولیت کا معیار بن سکتے ہیں دو اصُولی صفات کی طرف راجع ہوتے ہیں۔ عدالت اور ضبط۔ اگر روایت کے راوی عادل ہوں جن میں عدالت کا فقدان یا نقصان نہ ہو اور ادھر وہ ضابط ہوں جن میں حفظ وضبط اور تیقظ و بیداری کا نقصان و فقدان نہ ہو اور قلت عدالت وضبط سے جو کمزوریاں راوی کو لاحق ہوتی ہیں جن کی تفصیل آگے آتی ہے ان سے راوی پاک ہوں اور ساتھ ہی سند مسلسل اور متصل ہو تو وہ روایت صحیح لذاتہ کہلائے گی۔ جو اوصاف راوی کے لحاظ سے روایت کا اعلیٰ مرتبہ ہے۔ کیوں کہ اس میں عدالت وضبط مکمل طریق پر موجود ہے۔ جو راویوں کو ثقہ اور معتبر ثابت کرتا ہے۔ اس لیے اس دائرہ میں حدیث کی یہ قسم بنیادی اور اساسی کہلائے گی۔ اس کے بعد جو قسم بھی پیدا ہوگی، وہ ان اوصاف کی کمی بیشی اور نقصان یا فقدان سے پیدا ہوگی۔ اس لیئے وہ اسی خبر کی فرع کہلائے گی۔ مثلاً اگر راوی ساقط العدالت ہو تو اس نقصانِ عدالت یا فقدانِ عدالت سے پانچ اصُولی کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں جنہیں مطاعن حدیث کہا جاتا ہے۔ (۱) کذب (۲) تہمت کذب (۳) فسق (۴) جہالت (۵) بدعت۔ یعنی راوی کاذب ہو یا کذب کی تہمت لیئے ہوئے ہو یا فاسق ہو یا

جاہل و ناداں ہو یا بدعتی ہو تو کہا جائے گا کہ وہ عادل نہیں۔ اس لیئے اس کی روایت کا کوئی اعتبار نہیں۔ اسی طرح اگر راوی ضابط نہ ہو تو اس نقصان حفظ یا فقدان حافظہ سے بھی پانچ ہی کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں جو روایت کو بے اعتبار بنادیتی ہیں۔ ① فرطِ غفلت ② کثرتِ غلط ③ مخالفتِ ثقاۃ ④ وہم ⑤ سوءِ حفظ۔ یعنی راوی غفلت شعار اور لا اُبالی ہو۔ جس میں تیقظ اور احتیاط اور بیدار مغزی نہ ہو یا کثیر الاغلاط ہو یا ثقہ لوگوں سے الگ نئی اور مخالف بات کہتا ہو یا وہمی ہو اسے خود ہی اپنی روایت میں شبہ پڑ جاتا ہو یا حافظہ خراب ہو۔ بات بھول بھول جاتا ہو تو کہا جائے گا کہ یہ راوی ضبط و حفظ کا مضبوط نہیں، اس لیئے اس کی روایت کا کچھ اعتبار نہیں۔ لیکن اس نقصانِ عدالت و ضبط یا ان دس مطاعن کے درجات و مراتب ہیں، اگر ان صفاتِ عدل و ضبط میں کوئی معمولی سی کمی ہو۔ مگر روایت کے اور طریقوں اور سندوں کی کثرت سے ان کی کمزوریوں کی تلافی ہو جائے۔ تو اس حدیث کو صحیح لغیرہ کہیں گے۔ اگر یہ تلافی اور جبر نقصان نہ ہو اور وہ معمولی کمزوریاں بدستور قائم رہ جائیں۔ تو حدیث حسن لذاتہ کہلائے گی۔ اگر اس حالت میں بھی کثرتِ طرق سے تلافیٔ نقصان ہو جائے تو حدیث حسن لغیرہ کہلائے گی اور اسی نسبت سے اُن کے اعتبار اور حجیت کا درجہ قائم ہو گا۔

پس اوصاف رواۃ کے لحاظ سے حدیث کی چار اساسی قسمیں نکل آئیں صحیح لذاتہ، صحیح لغیرہ، حسن لذاتہ، حسن لغیرہ۔ اور ان میں بھی بُنیادی قسم صرف صحیح لذاتہ ہے جو اپنے دائرہ میں سب سے اُونچی قسم ہے[1]

ان قسموں کا بیان اقسامِ حدیث کی بحث میں آگے آئے گا۔ اس وقت صرف یہ بتلانا ہے۔ کہ وہ قواعد جن پر حدیث قبول کی گئی ہے کچھ یُونہی مرتب نہیں ہو گئے۔ بلکہ ان میں قرآن کریم اور اصُولِ فطرت پُوری ثقاہت سے کار فرما رہے ہیں۔ یہی قواعد محدثین کی اساس تھے اور انہی پہ

---

[1] فضل الباری للشیخ شبیر احمد عثمانیؒ جلد ۱ صفحہ ۹۸ مقدمہ از مولانا قاری محمد طیب صاحب۔

علم حدیث کا ذخیرہ ترتیب پاتا رہا اور اہل فن میں قبول بھی ہوتا گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے بھی اس پر زور دیا کہ راوی کے بارے میں دیکھا جائے کہ اس کا ضبط اپنے اوپر کتنا ہے اور اس کی دیانت و امانت کیسی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو (۶۷ھ) بیان کر رہے تھے کہ آخری زمانہ میں شر پھیل جائے گا۔ آپ سے پوچھا گیا کہ اس دور میں ہم حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا کریں؟ آپ نے فرمایا:۔

ما اخذ تموہ عمن تأمنونہ علی نفسہ ودینہ فاعقلوہ وعلیکم بالقرآن فتعلموہ وعلموہ ابناءکم فانکم عنہ تسئلون وبہ تجزون وکفی بہ واعظاً لمن عقل [۱]

ترجمہ۔ جو حدیث تم اس راوی سے لو جسے تم اپنے میں سنبھلے پاؤ اور اسے دیانتدار سمجھو تو اس کا اعتبار کر لو اور قرآن کو لازم پکڑو، اسے سیکھو اور اپنے بچوں کو سکھاؤ اور اس کے بارے میں تم قیامت کے دن پوچھے جاؤ گے اور اسی پر تمہیں جزا ملے گی اور سمجھ دار کے لئے اسی میں کافی نصیحت ہے۔

اس سے پتہ چلا کہ قبول روایت میں اصل الاصول یہی ہے کہ راوی کی ذات اور دیانت دونوں قابل بھروسہ ہوں۔ نہ اتنا کمزور ہو کہ یاد نہ رکھ سکے نہ اتنا عام کہ اس کی دیانت مشتبہ ہو۔ روایت کے لائق اعتماد نہ ہونے پر بحث کرتے ہوئے علامہ محمد بن جریر طبری (۳۱۰ھ) نے بھی صفات جبریلی کا ذکر کیا ہے:۔

ترجمہ۔ جبریل اللہ تعالیٰ کے ہاں، اس کے پیغام میں اس سے روایت کرنے میں اور ان تمام کاموں میں جو ان کے سپرد کیئے گئے لائق اعتماد ہیں۔

چھٹی صدی کے مشہور شیعی مفسر الطبرسی (۵۴۸ھ) نے بھی حضرت جبریل علیہ السلام کے صاحب قوت ہونے پر بحث کرتے ہوئے اصول روایت میں جبریلی صفات سے استدلال کیا ہے [۳]

---

[۱] تفسیر المحرر الوجیز للقاضی عبدالحق الاندلسی (۵۴۶ھ) ج۱ ص۱۱ [۲] تفسیر ابن جریر ج۳۰ ص۵۱ [۳] مجمع البیان ج۲۰ ص۴۴۶

یہ صفات راوی کا اصولی بیان ہے۔ چونکہ ان تمام مواقع میں حضرت جبریل امین اور حضور نبی کریم کے ہی روایت لینے اور دینے کا تذکرہ ہے۔ اس لیے ان تمام مواقع پر خدائی حفاظت اور شان عصمت بھی کارفرما ہے اور ان کی روایت اپنی ہر ادا میں غلطی اور بھول سے پاک ہے۔ لیکن جہاں تک دوسرے ثقہ راویوں کا تعلق ہے ان سے بعض اوقات غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں جن کا جبر دوسرے راویوں کی روایت سے کر لیا جاتا ہے اور یہ بات اہل فن کے نزدیک ان کی ثقاہت کو کمزور نہیں کرتی۔ حضرت مولانا سید انور شاہ محدث کشمیری فرماتے ہیں:۔

ومن ظن ان الثقات براء من الاغلاط فلم یسلك سبیل السداد وانما المعصوم من عصمه الله والجاهل لا یفرق بین اغلاط الرواة وبین اخبار الانبیاء علیهم السلام فیحمل خبطهم واغلاطهم علی رقاب الرسل علیهم الصلوٰة والسلام ما اضله وما اجهله[1]

ترجمہ۔ اور جس نے یہ گمان کیا کہ ثقہ راوی غلطیوں سے کلیۃً مبرا ہیں، وہ صحیح رستے پر نہیں چلا معصوم وہی ہے جسے الٰہی عصمت حاصل ہو۔ جاہل لوگ راویوں کی غلطیوں اور انبیاء کرام کی خبروں میں فرق نہیں کرتے۔ راویوں کے وہم اور اغلاط پیغمبروں کے ذمہ لگا دیتے ہیں۔ کتنی بڑی گمراہی اور کتنی بڑی جہالت ہے۔

صفات جبریلی کے ذکر میں صرف اصول اعتماد مذکور ہیں۔ اللہ رب العزت سے ایک ہی خبر لانے والا اور اس سے ایک ہی خبر لینے والا تھا۔ سو یہاں خبر واحد کی بحث نہ تھی جبریل امین اور حضور سید المرسلین دونوں معصوم تھے جہاں تثبت اور عصمت پوری قوت اور تحدی سے کارفرما ہوں۔ وہاں خبر واحد اور خبر متواتر دونوں برابر ہیں۔ ایک معصوم کی بات بھی یقین کا فائدہ دیتی ہے۔ دو معصوموں کی بات بھی اسی یقین کو قائم کرتی ہے اور دوسے

---

[1] فیض الباری جلد ۴ صفحہ ۸۶

زیادہ معصوموں کی بات بھی اسی یقین تک پہنچاتی ہے۔ سو خدائی حفاظت کے ساتھ خبر واحد اور خبر متواتر دونوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ ہاں جہاں خدائی حفاظت کا وعدہ نہ ہو، وہاں کثرۃ رواۃ سے روایت بے شک پختہ ہو جاتی ہے۔

قرآن کریم نے خبر واحد کی قبولیت کا ایک دوسری جگہ ذکر فرمایا ہے اور شرط لگائی ہے کہ راوی فسق سے مجروح نہ ہو اور اگر ایسی جرح موجود ہو پھر بھی روایت کلیۃً رد کرنے کے لائق نہیں، بلکہ اور ذرائع اور قرائن سے اس کا تبیّن کر لیا جائے۔

فسق راوی اور مظنہ جہالت

قرآن کریم میں ہے:۔

یا ایھا الذین امنوا ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا ان تصیبوا قوما بجھالۃ فتصبحوا علی ما فعلتم نٰدمین۔ (پ ۲۶ الحجرات ۶)

ترجمہ: اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ کسی قوم پر نادانی سے جا پڑو اور کل اپنے کیے پر پچھتانے لگو۔

قرآن کریم کی اس آیت سے تین اہم باتیں معلوم ہوئیں۔ (۱) ایک یہ کہ فاسق کی روایت از خود حجت نہیں۔ (۲) دوسرے یہ کہ فاسق کی روایت کلیۃً واجب الرد بھی نہیں بلکہ مزید لائق تحقیق ہے۔ (۳) تیسرے یہ کہ خبر واحد قابل قبول ہے۔ بشرطیکہ اسے نقل کرنے والا فاسق نہ ہو۔ یہ تب اگر مفہوم مخالف کا اعتبار کیا جائے ——— اگر خبر واحد معتبر نہ ہوتی تو وجہ تبیّن صرف فسق نہ ہوتا۔ راوی کا ایک ہونا بھی مزید تائید کا محتاج ہوتا۔

اس آیت کی رو سے کسی خبر کے بارے میں دو باتیں موجب جرح ہیں۔ (۱) راوی کا فسق اور (۲) صورتِ واقعہ سے بے خبری۔ جہاں راوی کی دیانت اور اصل بات کی یاد (حفظ و ثبت) قائم ہو وہاں خبر جرح سے محفوظ اور قابل قبول سمجھی جائے گی۔ محدثین کرام کے نزدیک روایت کی تحقیق اور پڑتال کے انداز بہت ہیں۔ لیکن ان سب کا اجمال یہ ہے کہ حدیث روایت کرنے والا راوی مخلصانہ دیانت sincere righteousness اور اچھی یادداشت strong memory

رکھتا ہو۔ جہاں حافظہ کمزور ہو گا یا دیانت مشتبہ ہو گی۔ روایت کمزور پڑتی جائے گی۔
آیت مذکورہ بالا اگرچہ ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے۔ لیکن اس کا حکم عام ہے اور حدیث قبول کرنے کے بارے میں محدثین نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ فاسق کی روایت قابلِ قبول نہیں، مزید تحقیق سے اسے قبول کر لیا جائے تو یہ امرِ دیگر ہے۔ حضرت امام مسلم اپنے مقدمہ صحیح میں لکھتے ہیں :۔

ان الواجب علیٰ کل احد عرف التمییز بین صحیح الروایات و سقیمها ..... وان یتقی منها ما کان عن اهل التهم والمعاندین من اهل البدع والدلیل علی ان الذی قلنا من هذا هو اللازم دون ما خالفه قول الله تبارک و تعالیٰ ذکره یا ایها الذین امنوا ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا ..... ان خبر الفاسق ساقط غیر مقبول۔[1]

ترجمہ۔ ہر ایک کے ذمہ واجب ہے جو صحیح اور کمزور روایات میں فرق جان سکے کہ .... اور جو باتیں اہلِ تہمت اور معاند اہلِ بدعت سے مروی ہوں اس سے بچے اور جس چیز کو ہم نے اوروں کے موقف کے خلاف لازم ٹھہرایا ہے اس پر دلیل اللہ تبارک و تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے "اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق ایک روایت لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو .... بے شک فاسق کی خبر از خود ساقط اور غیر مقبول ہے۔

امام بخاریؒ باب ما جاء فی اجازۃ الخبر الواحد الصدوق میں لکھتے ہیں :۔

وقوله تعالیٰ ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا وکیف بعث النبی امراءه واحداً بعد واحد۔[2]

ترجمہ۔ اور قولِ خداوندی ہے "اگر تمہارے پاس کوئی فاسق ایک خبر لے کر

---

[1] صحیح مسلم جلد اصلا [2] صحیح بخاری جلد ۹ صفحہ ۱۰۰ پورا ترجمۃ الباب آگے آرہا ہے دیکھئے صفحہ ۸۹ کتاب ہذا۔ اس میں دیکھئے حضور نے کس طرح عبادات اور جملہ فرائض و احکام میں ایک سچے راوی کو قابلِ قبول قرار دیا ہے۔ کیا یہ خبرِ واحد کی قبولیت نہیں؟

آئے تو اسے تحقیق کر لیا کرو" ــــــ اور حضورؐ نے اپنے امیر کس طرح ایک ایک بھیجے۔

(نوٹ) ایک شخص کی روایت اگر لائقِ قبول نہ ہوتی تو حضورؐ کبھی ایک ایک شخص کو اپنے احکام دے کر کہیں نہ بھیجتے اور نہ ایک فاسق کی خبر پر مزید تحقیق کی ضرورت سمجھی جاتی

شیعہ محدثین نے بھی حدیث کے بارے میں اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ ملا تقی مجلسی (۱۰۷۰ھ) من لایحضرہ الفقیہ کی شرح لوامع صاحبقرانی المسمّٰی بہ شرح الفقیہ میں لکھتے ہیں:۔

ترجمہ۔ یہ آیت بتلاتی ہے کہ دیانتدار اور سچے راوی کی روایت قابل قبول ہے۔

علامہ مامقانی (سیزدہم ھ) لکھتے ہیں:۔

ترجمہ۔ یہ آیت فاسق کی روایت کو بغیر مزید پڑتال اور تحقیق کے قبول کرنے سے روکتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ تحقیق و تبین کے بعد فاسق (اور وہ بھی گو شخص واحد ہی ہو اس کی) روایت قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیّب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کا فاضلانہ بیان سُنیئے۔ موصوف مقدمہ فضل الباری میں لکھتے ہیں:۔

اس سے واضح ہے کہ شخص واحد کی خبر اس کے فاسق ہونے کے باوجود بھی معتبر اور حجت ہونے کی شان رکھتی ہے بشرطیکہ تحقیق میں آجائے اور حجت بھی ایسے اہم معاملات میں جن کے بگڑ جانے کی صورت میں ندامت اُٹھانی پڑے جو کسی اہم اور بڑے ہی معاملہ کی شان ہوتی ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ شخص واحد کی خبر بھی قرآنی اصول پر قابلِ رد یا غیر معتبر نہیں۔ بلکہ تبین و تحقیق کے بعد معتبر اور بڑے بڑے معاملات میں حجت ہوتی ہے، جس پر دیانتًا معاملہ کا فیصلہ ہو جاتا ہے رد کا اگر گیا ہے تو قبل از تحقیق اس پر عمل کرنے سے نہ کہ مطلقًا۔ ورنہ یوں کہا جاتا کہ فاسق اگر کوئی خبر لائے تو ہرگز اس کی بات کا

۱؎ شرح الفقیہ جلد۱ صـ۳۲ ۲؎ تنقیح المقال جلد۱ صـ۱۷۵

اعتبار مت کرو۔ نہ یہ کہ تحقیق کے بعد اسے مان لو اور معتبر سمجھو۔ پس تحقیق کی شرط اس لیے لگائی کہ خبر دہندہ اور روایت کنندہ کے فسق و فجور سے اس کی خبر میں جو بے اعتباری کی گنجائش پیدا ہو گئی تھی وہ ختم ہو جائے اور خبر قابلِ اعتبار ہو جائے۔ مگر خبر بہرحال وہ ایک ہی کی رہے گی۔ اس لیے صاف ثابت ہوا کہ ایک کی روایت معتبر اور معاملات میں حجت ہے۔ اب اگر خبر دینے والا فرد فاسق بھی نہ ہو بلکہ غیر مجروح ہو جیسے رجل یسعیٰ کی خبر تو وہ بلا تبین بھی اس اصول سے قابلِ قبول بن سکتی ہے اور اگر راوی غیر مجروح ہونے کے ساتھ عادل و متقی متدین اور امین ہو۔ جیسے ملائکہ، انبیاء اور صلحاء۔ تو اس اصول پر اس کی بلاواسطہ خبر کو معتبر ماننے کے لیے قطعاً تبین و تحقیق کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے لیکن اگر وسائط کی وجہ سے اس پر بھی تحقیق و تبین کر لیا جائے تو پھر تو یہ خبر بطریق اولیٰ واجب الاعتبار بن جائے گی۔ مگر بہرصورت رہے گی خبر فرد ہی۔ اس لیے خبر فرد جسے خبر غریب بھی کہتے ہیں قرآن کی رو سے معتبر اور حجت ثابت ہو گئی۔ گو اس کی حجیت درجۂ ظن ہی کی حد تک ہو کہ ظنیات بھی شرعاً حجت اور معاملات میں قانوناً مؤثر ہوتے ہیں۔ کیونکہ ظنیات کے معنی وہمیات کے نہیں بلکہ صرف اس کے ہیں کہ خبر پر وثوق و اعتماد کے ساتھ جانبِ مخالف کا احتمال بھی باقی رہے نہ یہ کہ اصل خبر بے اعتبار اور قابلِ رد ہو جائے۔ البتہ اس کے ساتھ اس راوی واحد کی جو ثقہ اور عادل ہے تحقیق بھی کر لی جائے۔ یعنی اس خبر کے متابعات، مؤیدات اور شواہد و قرائن بھی فراہم ہو جائیں تو پھر اس خبر فرد سے ظن اس حد تک بھی ہو سکتا ہے کہ وہ یقین کی سرحد سے جا ملے اور ایسی خبر اگر قطعیت کے ساتھ درجۂ یقین تک نہ پہنچے گی تو شبہ یقین تک ضرور پہنچ جائے گی جس کا نام اصطلاح میں غلبۂ ظن ہے۔ سو ایسی خبر اصول و آئین کی رُو سے نہ رَد کی جا سکتی ہے نہ غیر معتبر ٹھہرائی جا سکتی ہے۔ جب کہ قرآن خود خبر فرد کے سلسلہ میں ایک فاسق کی خبر کو بھی کلیۃً غیر معتبر نہیں ٹھہراتا۔ بلکہ بعد تبین اُسے

معتبر قرار دیتا ہے تو ایک ثقہ اور عادل کی خبر کو اس قرآنی اصول کی روشنی میں کیسے رد جا سکتا ہے ؛ اس لیئے خبر فرد اور اس کی حجیت کا ثبوت آیاتِ بالا سے بہت کافی وضاحت کے ساتھ ہو جاتا ہے۔[1]

خبر واحد کے لائق قبول ہونے میں قرآنی موقف

قرآن کریم کی یہ آیت کہ فاسق کی روایت بغیر مزید تحقیق کے قابلِ قبول نہیں۔ بتلاتی ہے کہ اگر وہ راوی فاسق نہ ہوتا تو اس کی روایت لائق قبول تھی۔ اسلام میں اگر خبرِ واحد کا اعتبار نہ ہوتا تو قرآن کریم فاسق کی روایت کو صرف فسق کی بنا پر رد نہ کرتا۔ خبر واحد کی بنا پر بھی رد کرتا۔ خبرِ واحد کے لائق قبول ہونے پر امام بخاریؒ (۲۵۶ھ) نے قرآنی آیات سے استدلال کرتے ہوئے اس آیت کو بھی پیش کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں :-

امام بخاری کی شہادت

باب ماجاء فی اجازۃ خبر الواحد الصدوق فی الاذان والصلاۃ والصوم والفرائض والاحکام وقول اللہ تعالیٰ فلولا نفر من کل فرقۃ منہم طائفۃ لیتفقہوا فی الدین ولینذروا قومہم اذا رجعوا الیہم لعلہم یحذرون۔ ویسمی الرجل طائفۃ لقولہ تعالیٰ وان طائفتان من المومنین اقتتلوا فلو اقتتل رجلان دخل فی معنی الآیۃ وقولہ تعالیٰ ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا وکیف بعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم امراءہ واحدًا بعد واحد فان سہا احد منہم رُدّ الی السنۃ۔[2]

ترجمہ۔ ایک سچے راوی کی خبر اذان، نماز، روزہ اور فرائض واحکام کے بارے میں جائز ہونے کے باب میں جو کچھ آیا ہے خدا کا فرمان کہ ہر فرقہ سے کیوں نہ ایک طائفہ نکلا کہ وہ دین میں تفقہ حاصل کرتے اور واپس لوٹ کر اپنی قوم

---

[1] مقدمہ فضل الباری جلد ۱ صفحہ ۹۶ [2] صحیح بخاری جلد ۹ صفحہ ۱۰۱

کو ڈراتے. تاکہ وہ بچ جاتے. ایک آدمی کو بھی طائفہ کہہ دیتے ہیں. خدا تعالیٰ کا فرمان ہے اگر مومنوں کے دو طائفے آپس میں لڑیں تو اگر دو شخص بھی آپس میں لڑیں گے تو وہ اس آیت کے تحت آئیں گے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو ——— اور حضورؐ نے کیسے اپنے امراء ایک ایک کر کے بھیجے. ان میں سے اگر کوئی بھول جائے تو بات سنت کی طرف لوٹائی جائے گی.

خبر واحد کے لائق قبول ہونے پر نبوی موقف

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اسلامی معاشرہ ترتیب دیا اس میں خبر واحد کی بناء پر بہت احکام چلتے تھے. دینی اطلاعات میں فرائض تک کا اعلان خبر واحد سے کافی سمجھا جاتا اور اس پر اس پہلو سے کہیں نکیر نہ سُنی گئی.

① عن عبد اللہ بن دینار قال بینا الناس بقباء فی صلاۃ الصبح اذ جاء ھم اٰت فقال ان رسول اللہ صلی اللہ قد انزل علیہ اللیلۃ قراٰن وقد امر ان یستقبل الکعبۃ فاستقبلوھا وکانت وجوھھم الی الشام فاستداروا الی الکعبۃ[1]

عبداللہ بن دینار سے روایت ہے کہ لوگ صبح کی نماز کے لیے مسجد قباء میں تھے کہ اُن کے پاس ایک آنے والا آیا. اس نے کہا کہ آج رات حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر حکم قرآنی اُترا ہے کہ آپ نماز میں کعبہ کی طرف رُخ کیا کریں سو تم کعبہ کو ہی قبلہ بناؤ ——— ان لوگوں کے رُخ شام کی طرف تھے. سو سب کعبہ کی طرف گھوم گئے.

نماز دین کا ستون ہے. صحابہ کرام اگر اس میں ایک خبر لانے والے پر اعتماد کر کے اپنا قبلہ بدل سکتے ہیں. تو ظاہر ہے کہ اس معاشرہ میں خبر واحد بشرطیکہ خبر لانے والا ثقہ عادل اور قابل

---

[1] صحیح بخاری جلد ۹ صفحہ۱۰۸

اعتماد ہو گا کتنا قانونی اور اخلاقی وزن ہو گا. اس پر آپ خود ہی غور فرمالیں۔

عن حذیفۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لاھل نجران لابعثن الیکم رجلا امینا حق امینا فاستشرف لھا اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم فبعث ابا عبیدۃ۔[1]

(۲) حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجران کو فرمایا میں تمہاری طرف ایک پورا امین شخص کو بھیجوں گا سب صحابہ سر اٹھا کر دیکھنے لگے (کہ آپ کس کو بھیجتے ہیں اور کون ایسا امین ہے جو حق امانت کا پورا حامل ہو) سو آپ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔

اہل نجران کے سامنے اگر ایک شخص اسلام کی آواز لگا سکتا تھا اور وہ ساری قوم اس کی مکلف ہو سکتی ہے کہ اس ایک کی بتائی ہوئی دینی راہنمائی کو اسلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سمجھے تو خبر واحد کے لائق قبول ہونے میں کسی کو کیا شک ہو سکتا ہے. حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجران کو اس راوی کی صفات بیان کرتے ہوئے جو ان کے ہاں دین کو روایت کرے گا. خبر دی کہ وہ راوی امین ہو گا. اس سے پتہ چلتا ہے کہ امین راوی کی بنیادی صفت ہے. حافظے کے پہلو سے بھی وہ امین ہو. اس سے کوئی بات رہ نہ جائے اور دیانت کے پہلو سے بھی وہ امین ہو کوئی غلط بات نہ کہہ سکے۔

(۳) عن عمرؓ قال وکان رجل من انصار اذا غاب عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وشھدتہ اتیتہ بما یکون من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واذا غبت عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وشھد اتانی بما یکون من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔[2]

ترجمہ. حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک انصاری جب کبھی حضورؐ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکتا تو اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں میں بتا دیا کرتا تھا اور جب کبھی میں حضورؐ سے غائب ہوتا اور وہ انصاری حاضر ہوتے تو وہ مجھے

---

[1] صحیح بخاری جلد ۹ صفحہ ۱۰۹ [2] ایضاً

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں بتا دیا کرتے تھے۔

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دو صحابی جب ایک دوسرے کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ تعلیمات نقل کرتے جو اس ایک نے حضورؐ سے سنی ہوتیں تو اسے سُن کر اسے پوری طرح قبول کر لیتے۔ کیا یہ اس امر کی کھلی شہادت نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اسلامی معاشرہ قائم کیا تھا اس میں خبر واحد بلا تردد لائق قبول سمجھی جاتی تھی۔ صرف یہی دیکھا جاتا تھا کہ خبر واحد لانے والا وہ شخص کس درجہ کا ثقہ اور امین ہے۔

قواعدِ حدیث کے اصولِ اعتماد جس طرح قرآنی آیات میں دلالت اور اشارت سے لپٹے ہوئے ملے تھے۔ انہیں ہم نے نبوی موقف میں بھی نہایت واضح طور پر موجود پایا خبر دینے والا ثقہ اور امین ہو تو خبرِ واحد بلا تردد قبول کی جائے گی۔ اب صرف ایک بات لائق غور رہ جاتی ہے کہ نقل روایت میں الفاظ کی پابندی ضروری ہے یا روایت بالمعنی بھی کفایت کر سکتی ہے۔

روایت بالمعنی کے لائق قبول ہونے میں قرآنی موقف

تاریخ مذاہب کا مشہور واقعہ ہے کہ جب حضرت آدم و حوا علیہما السلام نے شجر ممنوعہ کا پھل چکھا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا تھا کہ دونوں نیچے اتر جاؤ۔ یہ واقعہ قرآن کریم میں کئی طرح سے منقول ہے:۔

(۱) قال اھبطا منھا جمیعًا بعضکم لبعض عدو فاما یأتینکم منی ھدًی فمن تبع ھدای فلا یضل ولا یشقی۔[1]

ترجمہ۔ خدا نے کہا تم دونوں اکٹھے اس سے نیچے اترو کہ ایک کا دشمن ایک ہوگا پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو اس کا اتباع کرے گا تو وہ نہ دنیا میں گمراہ ہوگا اور نہ آخرت میں شقی ہوگا۔

(۲) قال اھبطوا بعضکم لبعض عدو ولکم فی الارض مستقر ومتاع الی حین۔[2]

ترجمہ۔ خدا نے کہا تم سب نیچے اترو ایک دوسرے کے تم دشمن ہو گئے اور

---

[1] پ ۱۶ طٰہٰ ع ۷، [2] پ ۸ الاعراف ع ۲

تمہارے لیئے زمین میں ٹھکانہ اور رہنا ہے ایک وقت تک۔

(۳) قلنا اھبطوا منھا جمیعا فاما یاتینکم منی ھدی فمن تبع ھدای فلاخوف علیھم ولا ھم یحزنون[۱]

ترجمہ۔ ہم نے کہا اُترجاؤ جنت سے سب کے سب سو پھر اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے پیغام ہدایت تو جس نے میری پیروی کی اُن پر کوئی خوف نہ ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔

یہ ایک ہی واقعہ کی تین مختلف تعبیریں ہیں۔ رب العزت نے جب یہ بات کہی ہوگی تو ظاہر ہے کہ ایک بات کہی ہوگی اور باقی تعبیرات اس بات کی روایت بالمعنی ہوں گی۔ روایت بالمعنی اگر جائز نہ ہوتی تو قرآن کریم ایک بات کو مختلف تعبیرات میں پیش نہ کرتا۔ رب العزت نے جب فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو تو یا تو کہا ہوگا۔ اسجدوا لآدم۔ (پ البقرہ ع ۴) یا کہا ہوگا۔ فقعوا لہ سٰجدین۔ (پ۲۳ ص ع ۵) ظاہر ہے کہ ان دو میں ایک تعبیر ضرور روایت بالمعنیٰ ہے گی۔ علامہ محمود آلوسیؒ نے بھی ان آیات سے روایت بالمعنی کا اشارہ کیا ہے۔[۲]

---

[۱] پ البقرہ ع ۴۔ [۲] دیکھئے روح المعانی جلد ۱ ص۲۳۶ جلد ۸ ص ۸۹

قبولیتِ روایت میں اصل الاصول اعتماد ہے۔

قرآن کریم کی رُو سے فاسق کی خبر بھی مطلقاً لائقِ رد نہیں۔ بلکہ اس کی مزید تحقیق کی جائے گی۔ دوسرے ذرائع اور قرائن سے اس کا تبیّن ہو جائے تو اسے بھی قبول کیا جائے گا۔ بات کے لائقِ اعتماد ہونے میں نبوی مؤقف بھی آپ کے سامنے آچکا۔ اس تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ قبولیتِ روایت میں اصل الاصول اعتماد اور وثوق ہے۔ جب یہ حاصل ہو جائے تو یہی مدارِ عمل ہے نہ خبر کا ایک راوی سے ہونا اس میں رُکاوٹ بن سکتا ہے نہ روایت کا بالمعنی مروی ہونا اس میں سبب قدح ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض صورتوں میں سند کا متصل ہونا بھی ضروری نہیں۔ پچھلا راوی اگر کوئی مسلّم علمی شخصیت ہو اور روایت استدلال میں پیش کی جا رہی ہو تو یہ مرسل روایت interupted report بھی اعتماد و وثوق پر قبول کی جا سکتی ہے۔

صحابہ کرامؓ کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات پہنچتی تو گو اس کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست نقل کرنے والا نہ بھی ملتا وہ اُس کی تحقیق میں برابر لگ جاتے۔ اگر اتصالِ روایت نہ ملتا۔ ایسے قرائن میسّر آجاتے جن سے پتہ چل جاتا کہ یہ روایت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے تو وہ اس کو قابلِ قبول سمجھتے اور اس پر عمل پیرا ہوتے اور روایت کا متصل نہ ہونا اس کی راہ میں رکاوٹ نہ بنتا تھا۔ حضرت عمرؓ کو بتایا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حجاز میں دو دین جمع نہیں ہو سکتے۔ بیان کرنے والا صحابی تھا یا تابعی۔ بصُورتِ اولیٰ صحابی نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سُنی تھی یا کسی اور نے اس کے سامنے یہ روایت نقل کی تھی۔ ان تمام امور میں یہ خبر مجہول unknown تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس پر مزید تحقیق اور تفحص فرمایا۔ یہاں تک کہ آپ کو اس پر وثوق و اعتماد حاصل ہو گیا اور آپ نے اس پر عمل فرمایا۔ محدث شہیر عبدالرزاق الصنعانی (۲۱۱ھ) کہتے ہیں:۔

---

[1] مثلاً مختلف تابعین کرام جو مختلف شہروں میں رہتے ہوں اور آپس میں ملاقات نہ ہوئی ہو دین کے کسی موضوع میں ایک ہی بات کہیں تو ظاہر ہے کہ وہ بات انہوں نے مختلف صحابہ کرامؓ سے لی ہوگی اور اگر اس میں اجتہاد کا پہلو نہ ہو تو اسے بحالات حضورؐ کی بات ہی سمجھا جائے گا۔

اخبران النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال فی وجعہ الذی مات فیہ لا یجتمع بارض الحجاز دینان ففحص عن ذلک حتی وجد علیہ التثبت[1]

حضرت عمرؓ کو بتایا گیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس مرض میں جس میں وفات پائی تھی کہا تھا کہ اس زمین حجاز میں دو دین جمع نہ ہونے پائیں (یہ مرکز اسلام ہے جہاں صرف اسلام ہی رہے گا) آپ نے اس کی تحقیق فرمائی اور اس پر تثبت پا لیا۔ (کہ یہ واقعی صحیح خبر تھی)۔

وہ صحابی کون تھے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سُنی تھی ان کا نام نہیں ملا۔ امام مالکؒ نے مؤطا میں اسے امام زہری (۱۲۴ھ) سے روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا۔ صحابی کا نام درمیان میں نہیں ملتا۔ مگر چونکہ اور ذرائع سے اس کی تحقیق ہو گئی اور وہ تحقیق بھی خود حضرت عمرؓ نے ہی فرمائی تھی۔ اس لیئے اس روایت کو محض اس لیئے قبول کر لیا گیا۔ کہ اس پر دوسرے ذرائع سے تثبت و وثوق حاصل ہو چکا ہے۔ معلوم ہوا کہ ان دنوں اصل مدسند کا اتصال،، نہیں تھا۔ قبولیت روایت میں اصل الاصول اعتماد تھا۔ جب یہ حاصل ہو جائے تو روایت قابل عمل ہو جاتی تھی اور اسی پر حضرت عمرؓ نے یہودیوں کا خیبر سے اخراج کیا تھا[2] امام محمدؒ (۱۸۹ھ) اس حدیث کو اس طرح نقل کرتے ہیں:۔

بلغنا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ لا یبقیٰ دینان فی جزیرۃ العرب فاخرج عمر من لم یکن مسلماً من جزیرۃ العرب لھذا الحدیث[3]

ترجمہ ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات پہنچی ہے آپ نے فرمایا کہ جزیرہ عرب میں دو دین باقی نہ رہ سکیں گے حضرت عمرؓ نے اس حدیث کی وجہ سے ہر اس شخص کو جو مسلمان نہ تھا جزیرۂ عرب میں نہ رہنے دیا۔

یہاں پر حضرت عمرؓ نے سند کا اتصال نہیں دیکھا۔ بلکہ قرائن و ذرائع سے اس کی تحقیق فرمائی۔ جب ثابت ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ ہے تو آپ نے اس پر عملی قدم اُٹھایا اور یہودیوں کا اخراج فرمایا۔ پتہ چلا کہ کبھی قرائن بھی ایسے باوثوق ہوتے تھے۔ کہ انکار کی

---

[1] المصنف لعبد الرزاق جلد ۴ صـ ۱۲۶ [2] مؤطا امام مالک صـ ۳۶۰ [3] موطا امام محمد صـ ۳۷۳

گنجائش نہیں ہوتی حضرت عمرؓ کے اس طریق کار پر کسی صحابی نے جرح نہیں کی۔ نہ آپ پر کسی نے کوئی انگلی اٹھائی۔ بلکہ آپ کی اس تحقیق کے بعد سارے صحابہؓ اس پر متفق ہو گئے کہ حضورؐ کی تعلیم یہی ہے۔

کُل صحابہ عادل اور لائق اعتماد

قبولیتِ روایت میں اعتماد یہاں تک دخیل رہا کہ نقل و روایت میں "کل صحابہ عادل اور لائق اعتماد" مانے گئے۔ الصحابة کلهم عدول آپ نے سنا ہوگا۔ سب صحابہ ایک دوسرے کے نزدیک ثقہ اور دیانت دار تھے کوئی کسی کے ہاں جھوٹا نہ تھا۔ صحابہ کرام سب کے سب عادل تھے۔ آپس میں ان کے کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں، مسائل میں بھی کتنے ہی اختلاف واقع ہو چکے ہوں، فقہی موقف بھی جدا جدا ہو چکے ہوں، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نقل کرنے میں سب کے سب ثقہ اور قابل اعتماد سمجھے جاتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی صحابی جھوٹ کہے اس کا اُن کے ہاں تصور بھی نہ ہو سکتا تھا۔ حافظ ابن عبدالبر مالکی (۴۶۳ھ) حضرت امام مزنی ھ) سے حدیث اصحابی کالنجوم نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

وهذا ايبين لك ان قول النبی صلی الله علیہ وسلم اصحابی کالنجوم هو علی ما فسره المزنی وغیره من اهل النظران ذلك فی النقل لان جمیعهم ثقات مأمونین عدول رضی فواجب قبول ما نقل کل واحد منهم وشهد به علی نبیه صلی الله علیه وسلم۔[1]

ترجمہ۔ یہ بات تمہیں بتلاتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان کہ میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں جیسا کہ اہل نظر میں سے امام مزنی نے اس کی تشریح کی ہے یہ ہے کہ یہ بات حضورؐ سے نقل کرنے میں ہے کیونکہ سب کے سب صحابہ ثقہ امین اور عادل ہیں۔ سو ہر ایک سے جو نقل پہنچی اور جس نے جو شہادت بھی اپنے نبی کے بارے میں دی، اس کا قبول کرنا واجب ہے۔

---

[1] التمہید جلد ۴ ص ۲۶۳

ایک شبہ کا ازالہ

بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ بھی ایک دوسرے پر جھُوٹ کی چوٹ کر جاتے تھے۔
یہ صحیح نہیں۔ عربی میں لفظ کذب صرف جھُوٹ کے معنی میں نہیں بعض دفعہ خلاف واقع بات کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مگر اُردو میں یہ لفظ صرف جھُوٹ کے معنوں میں آتا ہے۔ صحابہ کرامؓ ایک دوسرے کی بات کو اگر کبھی خلاف واقع کہتے تھے بھی تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ فلاں صحابی کی بات صحیح نہیں (انہیں غلطی واقع ہو رہی ہے) یہ نہیں کہ وہ صحابی (معاذ اللہ) جھُوٹ بول رہے ہیں۔ صحابہ کرامؓ سے اس قسم کی بات عادۃً ہرگز ممکن نہ تھی۔ مشہور محدث علامہ خطابی (۳۸۸ھ) ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

قوله كذب ابو محمد يريد اخطأ ولم يرد به تعمد الكذب الذى هو ضد الصدق۔[1]

ترجمہ۔ اس کا کہنا کہ ابو محمد نے کذب (غلط) کہا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس نے غلطی کی کہنے والے کی مراد یہ نہیں کہ اس نے جھُوٹ بولا جو سچ کی ضد ہوتی ہے۔

پھر ایک صحابی کے بارے میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

هو رجل من الانصار له صحبة والكذب عليه فى الاخبار غير جائز والعرب تضع الكذب موضع الخطأ فى كلامها فتقول كذب سمعى وكذب بصرى اى زل ولم يدرك ما رأى وما سمع۔[2]

ترجمہ۔ وہ انصاری صحابی ہیں ان پر خبر میں جھُوٹ بولنے کا الزام جائز نہیں عرب بات میں غلطی کرنے پر بھی کذب کا لفظ بولتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں میرے کان نے (کذب) غلطی کی۔ میری آنکھ نے (کذب) غلطی کی یعنی وہ پھسل گیا۔ اور جو دیکھا اور سُنا اسے نہ سمجھ سکا۔

اس محاورے کی تائید ایک واقعہ سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلامؓ اور حضرت کعب احبارؒ کے مابین اختلاف ہوا کہ وہ گھڑی جس میں دُعا لازماً قبول ہوتی ہے سال میں ایک

---

[1] معالم السنن للخطابی جلد ا صـ ۱۳۴ [2] ایضاً صـ ۱۳۵

دفعہ آتی ہے یا ہفتہ وار؟ حضرت عبداللہ بن سلامؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کر رہے تھے کہ وہ گھڑی جمعہ آتی ہے۔ حضرت کعبؓ کہہ رہے تھے کہ نہیں سال میں ایک دفعہ آتی ہے۔ امام نسائی (۳۰۳ھ) روایت کرتے ہیں کہ:۔

قال کعب ذلك يوم في كل سنة فقال عبد الله بن سلام كذب كعب قلت ثم قرأ كعب فقال صدق رسول الله صلى الله عليه وسلم۔[1]

ترجمہ۔ کعب نے کہا وہ گھڑی سال میں ایک دفعہ آتی ہے۔ عبداللہ بن سلام کہنے لگے کعب کی زبان سے جھوٹ نکل گیا۔ پھر کعب نے تورات پڑھی اور کہا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام کا کذب کعبؓ کہنا ان پر جھوٹ کی چوٹ کرنا نہیں تھا۔ نہ یہ مطلب تھا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ ان کی مراد صرف یہ تھی کہ کعبؓ غلط کہہ رہے ہیں۔ چنانچہ کعبؓ نے جب تورات مطالعہ کی تو اپنی غلطی تسلیم کرلی اور کہا۔ صدق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ کہا۔

عدالتِ صحابہؓ کی نرالی شان

صحابہ عام ثقہ رواۃ کی طرح نہیں۔ دیگر راوی گو کتنے ہی ثقہ ہوں کثرت رواۃ سے ان کی روایت میں قوت ضرور آتی ہے۔ لیکن صحابی ایک بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کر دے تو اب مناسب نہیں کہ اس کی تائید میں اور صحابہ سے بھی مزید تحقیق کی جائے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ اس تحقیق کرنے والے نے صحابی کو ناقل ہی سمجھا خود سند نہ سمجھا۔ ورنہ اس کے بعد وہ ایک صحابی سے سن کر دوسرے کسی اور راوی کی تلاش نہ کرتا۔ صحابہؓ سے اس کی تائید لینا اگر روایت میں قوت پیدا کرتا۔ تو امیر المؤمنین حضرت عمرؓ حضرت سعدؓ سے مروی روایت کے بعد اس کی مزید تحقیق سے نہ روکتے۔ علم جس قدر پختہ ہو اس میں کیا حرج تھا۔ معلوم ہوا صحابیؓ کا حضورؐ سے کسی بات کو نقل کر دینا علم کا وہ نقطۂ عروج ہے کہ اب اس کے بعد کوئی خلجان باقی

---

[1] نسائی شریف جلد اوّل صفحہ ۲۱۱

نہ رہنا چاہیئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا :-

اذا حدثك سعد عن النبي صلى الله عليه وسلم فلا تسئل عنه غيره۔[1]

ترجمہ جب سعد تمہارے پاس حضورؐ کی کوئی بات نقل کریں تو اسکے بارے میں کسی اور سے نہ پوچھنا۔

مُرسلاتِ صحابہؓ پر اعتماد

ائمہ اربعہ میں گو اختلاف ہے کہ روایت مرسل جس میں تابعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست روایت کرے قبول کی جائے یا نہ ؟ امام اعظم ابو حنیفہ النعمانؒ اور امام مالکؒ ثقہ تابعی کی مرسل کو قبول کرتے ہیں اور امام شافعیؒ و امام بخاریؒ اسے قبول نہیں کرتے۔ لیکن اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے کہ صحابہ کی مرسلات سب کی سب قبول ہیں۔

صحابہ کی مرسلات سے وہ روایات مراد ہیں جن میں صحابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس دور کی روایت نقل کرے۔ جب وہ اس دور میں مسلمان نہ ہوا تھا یا حضورؐ کے ہاں موجود نہ تھا، ظاہر ہے کہ اس نے وہ بات کسی اور صحابی سے جو وہاں موقع پر موجود ہوگا سنی ہوگی اور اب وہ اس کا نام ذکر نہیں کر رہا ہے یا اس نے اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہوگا اور اب وہ اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے روایت نہیں کر رہا۔ اس دور کی بات کو اپنی طرف سے روایت کر رہا ہے۔ صحابہؓ کی یہ مرسلات بالاتفاق مقبول ہیں۔ درمیانے راوی کی تلاش اس وقت ہوتی ہے جب اس کی ثقاہت معلوم کرنی ضروری ہو۔ صحابہؓ چونکہ کلھم ثقہ اور عادل ہیں اس لیئے ان میں سے کسی کا معلوم نہ ہونا قبولیتِ روایت میں قادح نہیں ہو سکتا۔

مثلاً صحیح بخاری کی دوسری روایت اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے آپ اس میں یہ بیان کرتی ہیں۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز کیسے ہوا؟ ظاہر ہے۔ کہ اس وقت تک حضرت عائشہ کی پیدائش بھی نہ ہوئی تھی اور وہ دور آپؓ کا دیکھا ہوا نہ تھا۔ آپؓ نے یہ حالات و واقعات کسی اور صحابی سے یا خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنے ہوں گے۔ مگر آپ اس واسطۂ روایت کو ذکر نہیں کر رہیں۔ یہ مرسل روایت حضرت عائشہ صدیقہؓ کی

---

[1] بخاری جلد ا صـ۶۲

ثقاہت اور جلالت شان کے پیش نظر کسی طرح بھی رد نہ کی جائے گی۔ صحابہ کی مُرسلات تو ان ائمہ کے نزدیک بھی معتبر اور لائق اعتماد ہیں۔ جو اوروں کی مرسل روایات کو قبول نہیں کرتے۔ امام نووی ؒ مقدمہ شرح مسلم میں لکھتے ہیں :۔

واما مرسل الصحابي وهو رواية ما لم يدركه او يحضره كقول عائشة رضي الله عنها اول ما بدئ به رسول الله صلى الله عليه وسلم من الوحي الرؤيا الصالحة فمذهب الشافعي والجماهير انه يحتج به وقال الاستاذ الامام ابو اسحق الاسفرايني الشافعي انه لا يحتج به الا ان يقول انه لا يروي الا عن صحابي والصواب الاول۔[1]

ترجمہ۔ اور رہا معاملہ مرسلات صحابہ کا اور وہ ایسی روایات ہیں جن کا زمانہ اس راوی نے نہ پایا ہو یا زمانہ پایا ہو مگر اس مجلس میں اس نے حاضری نہ پائی ہو تو امام شافعی اور جمہور علماء کا مذہب یہ ہے کہ صحابہ کی مرسل روایات سے حجت پکڑی جا سکتی ہے۔ البتہ امام ابو اسحٰق اسفرائنی کہتے ہیں اس قسم کی روایات سے استناد صحیح نہیں۔ ہاں اگر وہ کہے کہ وہ صحابی، صحابی کے علاوہ کسی اور سے روایت نہیں لیتا تو پھر اسے اُن کے ہاں بھی قبول کیا جا سکے گا اور صحیح بات پہلی ہے (کہ مرسلات صحابہ مطلقاً لائق قبول ہیں)۔

آپ ایک دوسرے مقام پر ایک حدیث کی بحث میں لکھتے ہیں :۔

هذا الحديث من مراسيل الصحابة وهو حجة عند الجماهير[2]

ترجمہ۔ یہ حدیث صحابہ کی مرسل روایات میں سے ہے اور وہ جمہور علماء اسلام کے نزدیک حجت ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی ؒ ایک بحث میں لکھتے ہیں :۔

ويستفاد من الحكم بصحة ما كان ذلك سبيله صحة الاحتجاج بمراسيل الصحابة۔[3]

---

[1] مقدمہ صحیح مسلم للنووی ص۱۷ طبع ہند [2] شرح صحیح مسلم للنووی جلد۲ ص۲۸۴ [3] فتح الباری جلد۱ ص۱۴۴

ترجمہ. اس طرح کی باتوں پر صحیح کا حکم لگانے سے یہ بات مستفاد ہوتی ہے. کہ صحابہ کی مرسل روایات سے حجت پکڑنا قانونی طور پر صحیح ہے.

اس تفصیل سے یہ بات اور واضح ہو جاتی ہے کہ پہلے دور میں قبولیت روایت کا مدار اعتماد اور وثوق پر ہی رہا ہے. روایت کا متصل ہونا ضروری نہ تھا. صحابہ کرام کا عادل اور ثقہ ہونا یقینی اور قطعی دلائل سے معلوم تھا تو اب ان کی مرسلات بھی حجت سمجھی گئیں. اللہ تعالیٰ نے جب اُن کی عدالت پر مہر کر دی. تو اب اس کی کیا ضرورت ہے. کہ ائمہ حدیث میں سے کوئی ان کی تعدیل کرے. خطیب بغدادی (۴۶۳ھ) ایک جگہ لکھتے ہیں:-

ان عدالة الصحابة ثابتة معلومة بتعديل الله لهم..... فلا يحتاج احد منهم مع تعديل الله لهم المطلع على بواطنهم الى تعديل احد من الخلق له[۱]

ترجمہ. صحابہ کی عدالت اللہ تعالیٰ کی تعدیل سے معلوم اور ثابت ہے. سو صحابہ میں سے کوئی بھی کیوں نہ ہو وہ کسی کی تعدیل کا محتاج نہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی تعدیل حاصل ہے جو ان کے بواطن امور پر پوری طرح مطلع ہے اور انہیں عادل قرار دے رہا ہے.

صحابہ کے اسی عمومی اعتماد کا اثر دوسرے صحابہ میں بھی تھا علمی حلقوں میں اعتماد عام تھا. علمی حلقے سب اعتماد پر چلتے تھے. اس دور میں اسناد پر زیادہ زور نہ تھا. خیر اور صداقت عام تھی. اسنادی مباحث، ہر دو راویوں کے مابین فاصلے اور رابطے اور روایات میں اتصال و ارسال کی بحثیں اس وقت چلیں جب امت میں فتنے پیدا ہوئے. جھوٹ عام ہونے لگا. سو ضروری ہوا کہ اس وقت کے ائمہ حدیث اس سلسلہ میں کوئی قدم اُٹھائیں اور حق یہ ہے کہ اس وقت دینی سرمائے کے تحفظ کے لئے ایسے اقدامات ضروری تھے. امام ابن سیرینؒ (۱۱۰ھ) ایک جگہ فرماتے ہیں:-

عن ابن سيرين قال لم يكونوا يسئلون عن الاسناد فلما وقعت الفتنة قالوا سموا لنا رجالكم فينظر الى اهل السنة ويؤخذ حديثهم وينظر الى اهل البدع فلا يؤخذ حديثهم[۲]

---

[۱] الکفایہ فی علوم الروایۃ ص۴۶، ص۴۸ [۲] صحیح مسلم جلد ۱ ص۱۱

ترجمہ۔ امام سیرین سے روایت ہے کہ پہلے دور میں لوگ سند کے بارے میں اتنے فکرمند نہ ہوتے تھے لیکن جب فتنے اُٹھے تو علماء کہنے لگے اپنی روایت کے راوی سامنے لاؤ تاکہ اہل سنت اور اہل بدعت کی پرکھ ہو، اہل سنت کی حدیثیں لے لی جائیں اور اہل بدعت کی روایات سے پرہیز کی جائے۔

حضرت امام شافعیؒ اس نئے دور کے مجدد سمجھے جاتے ہیں جنہوں نے وقت کی نبض پر ہاتھ رکھا اور آئندہ کے لیے تحقیق حدیث کی اساس صحت سند کو قرار دیا اور راویوں کی جرح و تعدیل اور اتصال رواۃ اس نئے دور کا بڑا موضوع قرار پایا ــــــ اس درجہ کی پڑتال کی ضرورت دورِ اوّل میں کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔

قبول مُرسل میں ائمہ اربعہ کا اختلاف

اس تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ قبولِ مرسل میں امام شافعیؒ اور امام بخاریؒ کا امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ سے اختلاف دراصل اصول کا اختلاف نہ تھا، حالات کا اختلاف تھا۔ قبول روایت میں اعتماد کو سب ائمہ کے ہاں اصولی درجہ حاصل رہا ہے۔ جب تک امت میں صداقت اور انصاف غالب تھے گو فتنے پیدا ہو چکے تھے روایاتِ اعتماد پر بھی قبول کی جاتی تھیں۔ جب وہ حالات نہ رہے، فتنوں کا تخم حنظل درخت بن گیا۔ تو بعد کے ائمہؒ نے صحت اسناد اور اتصال رواۃ پر توجہ تیز کر دی۔ اس حدِ فاصل پر امام شافعیؒ نے مجددانہ کردار ادا کیا۔ فجزاہ اللہ جزاءً حسنا۔

اس سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ پہلے دور کی کتبِ حدیث جیسے مؤطا امام مالک، موطا امام محمد مصنف عبدالرزاق وغیرہ میں اسانید اس پیرایہ بیان اور اہمیتِ شان سے نہیں ملتیں۔ جس انداز میں ہم انہیں صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں پاتے ہیں۔ اسکی وجہ کیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے دور میں اعتماد غالب تھا۔ صحابہ کی مرسلات جس اصول پر قبول ہوتی تھیں وہ اصول اعتماد اگر کہیں بعد میں بھی کسی بزرگ پر راہ پا گیا تو اس کی مرسلات بھی قابل قبول سمجھی گئیں۔ مرسلات حسن، مرسلات ابراہیم، مرسلات زہری وغیرہ پر محدثین نے مستقل آراء قائم کی ہیں۔ تاہم یہ صحیح ہے کہ جونہی اعتماد میں کمی آنے لگی، محدثین کرام صحت سند

اور اتصال رواۃ پر زیادہ زور دینے لگے۔ حضرت امام شافعی ان دونوں طریقوں کی حد فاصل سمجھے جاتے ہیں اور بعد کے دور کے محدثین پھر تقریباً سب اسی راہ پر چلے۔ فجزاہم اللہ احسن الجزاء۔ آپ نے قبولیت روایت میں اس وقت کے حالات کے مناسب صحت اسناد اور اتصال رواۃ پر بہت زور دیا۔ اختلاف الحدیث کے نام سے آپ نے اس موضوع پر ایک کتاب قلمبند فرمائی اور حق یہ ہے کہ آپ نے فن حدیث کا رُخ اسناد کی طرف موڑ دیا۔ یہ اسلام کا اعجاز ہے کہ اس میں ہر وقت کی ضرورت کے مطابق اصحاب کردار پیدا ہوئے جنہوں نے وقت کی ضرورتوں کے تحت تحقیقات کے دہانے کا رُخ صحیح سمت کی طرف کر دیا۔

نوٹ

اس سے یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ پہلے دور میں اسانید قائم نہ تھیں اور حدیث پوری سند سے روایت نہ ہوتی تھی۔ احادیث کا سلسلہ پوری اسنادی شان سے قائم تھا اور محدثین صحیح وضعیف میں برابر فرق کرتے تھے۔ احادیث کو اسانید بعد میں فراہم نہیں کی گئیں۔ جب سے احادیث چلی آرہی ہیں اسی وقت سے سلسلہ اسانید بھی چلا آرہا ہے۔ ہمارے کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ پہلے دور میں روایت کی قبولیت میں سند کا اتصال زیادہ ضروری نہیں سمجھا گیا عمومی اعتماد بہت حد تک کارفرما رہا ہے تاہم یہ صحیح ہے کہ سند کی ضرورت اور اہمیت اپنی جگہ موجود تھی۔

عمل راوی کے اختلاف سے اعتماد روایت میں کمی

قبولیت روایت میں اعتماد کو اتنی اصولی حیثیت حاصل رہی ہے۔ کہ اگر کوئی حدیث ثقہ راویوں سے بھی منقول ہو تمام راویوں میں اتصال بھی پایا جاتا ہو، صیغہ تحدیث بھی ہر جگہ موجود ہو، عن کا منظنہ کہیں نہ ہو، روایت اصولی طور پر بالکل صحیح ہو۔ مگر اس صحابی کا اپنا عمل اس روایت کے خلاف ہو تو فوراً شبہ اُٹھے گا۔ کہ شاید یہ حدیث منسوخ العمل ہو یا اس زمانے سے تعلق رکھتی ہو۔ جب شریعت تکمیل کے تدریجی مراحل طے کر رہی تھی بعض احکام منسوخ ہو جاتے تھے اور اُن کی جگہ نئے آجاتے تھے۔

پہلے دور کی کوئی بات ثقہ راویوں سے منقول ہو وہ صحیح تو ہوگی۔ لیکن بعد کے احکام

کی روشنی میں حجت اور لائق عمل نہ سمجھی جائے گی۔ اسی طرح اگر کسی صحابی کا اپنا عمل اس کی اپنی روایت کے خلاف ہو تو ظاہر ہے کہ صحت اسناد کے باوجود اعتماد روایت میں کچھ کمی ضرور آئے گی۔ اس وقت اس اصول پر بحث کرنا مقصود نہیں، موضوع حدیث کے عنوان میں اس پر ہم کچھ بحث کر آئے ہیں۔ یہاں بتلانا صرف یہ ہے کہ قبولیت روایت میں اصل الاصول ہمیشہ اعتماد رہا ہے اور اسے کسی قیمت پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی ایک جگہ لکھتے ہیں:-

راوی الحدیث اعرف بالمراد به من غیرہ ولاسیما الصحابی المجتهد[1]

ترجمہ۔ حدیث کا راوی اس کی مراد کو دوسروں سے بہتر جانتا ہے۔ خصوصاً جب کہ وہ صحابی مجتہد ہو۔

کوئی بات نقل میں رہ جائے تو موجب قدح نہیں

صحابہ کرامؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جب کوئی حدیث نقل کرتے تو بعض اوقات یوں بھی ہوتا کہ بعض مضامین حدیث روایت کر دیتے اور کچھ باتیں رہ بھی جاتیں۔ جو دوسرے صحابہؓ کے ہاں یا انہی صحابہ کی کسی دوسری روایت میں مل جاتیں۔ یہ بعض مضامین کا رہ جانا اس پہلو سے کبھی نہ ہوا تھا کہ وہ بعض اجزاء باقی حدیث کے معنی پر اثر انداز ہوں۔ بلکہ ہر حصہ مضمون اپنی جگہ مستقل حیثیت سے روایت ہوتا تھا۔

سو ائمہ حدیث اس پر متفق رہے ہیں کہ روایت حدیث میں کسی بات کا نقل سے رہ جانا باقی روایت میں موجب قدح نہیں ہے۔ امام زہریؒ (۱۲۴ھ) حدیث افک کے واحد راوی ہیں، جو مختلف تابعین کرامؒ سے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی حدیث نقل کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:-

کلهم حدثنی طائفة من حدیثها[2]

"کہ ان راویوں نے حدیث افک کے کسی حصہ کو میرے سامنے بیان کیا ہے"

امام زہری تصریح نہیں کرتے کہ کون سا حصہ کن راویوں نے بیان کیا ہے۔ لیکن یہ راوی چونکہ سب کے سب ثقہ ہیں، اس لئے یہ جانے بغیر کہ کس کس راوی نے کیا کیا کہا ہے۔ پوری

---

[1] فتح الباری جلد ۱ صفحہ ۴۴۵ [2] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۳۶۴

حدیث بالاتفاق قبول کرلی گئی ہے اور ساری حدیث صحیح تسلیم کرلی گئی ہے۔ امام نووی (۶۷۶ھ) اس کی شرح میں لکھتے ہیں :-

هذا الذی فعله الزهری من جمعه الحدیث عنهم جائز لا منع منه ولا کراهة فیه لانه قد بین ان بعض الحدیث عن بعضهم وبعضه عن بعضهم وهؤلاء الاربعة ائمة حفاظ ثقات من اجل التابعین فاذا ترددت اللفظة من هذا الحدیث بین کونها عن هذا او ذاك لم یضر جاز الاحتجاج بها لانهما ثقتان وقد اتفق العلماء علی انه لو قال حدثنی زید او عمرو وهما ثقتان معروفان بالثقة عند المخاطب جاز الاحتجاج به[1]

ترجمہ: یہ طریقہ جو زہری نے جمع حدیث میں اختیار کیا ہے جائز ہے ممنوع نہیں اور اس میں کوئی ناپسندیدگی نہیں۔ یہ بیان ہو چکا ہے کہ حدیث کا کچھ حصہ ان میں سے کسی سے ہے اور کچھ حصہ دوسروں سے ہے اور یہ چاروں تابعین حفاظ حدیث اور اپنے فن کے امام ہیں۔ اگر اس میں کچھ تردد رہا ہے کہ یہ لفظ اس راوی کی روایت سے ہے یا اس راوی کی روایت سے۔ تو اس میں کوئی حرج نہیں اس سے احتجاج جائز ہے۔ کیوں کہ وہ دونوں ثقہ ہیں اور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر ایک شخص کہے مجھے یہ حدیث زید نے بتائی یا عمرو نے اور وہ دونوں ثقہ ہیں۔ مخاطب کے ہاں معروف ہیں تو اس سے حجت پکڑنا اور احتجاج کرنا جائز ہے۔

افقہ راویوں کی روایت کو ترجیح

محدثینؒ میں اس پر بھی کلام رہا ہے کہ روایت کی ترجیح راویوں کی قوت حفظ پر ہونی چاہیئے یا اس میں ان کی فقاہت بھی سبب ترجیح ہو سکتی ہے۔ ایک شخص حفظ و یادداشت میں زیادہ معروف ہے اور دوسرا علم و دانش میں گہرائی رکھتا ہے تو کس کی روایت ان میں سے زیادہ

---

[1] شرح مسلم للنووی جلد ۲ صفحہ ۳۶۴

لائق ترجیح ہوگی؟

محدثین میں روایت بالمعنیٰ کا رواج نہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ ترجیح قوتِ حفظ کی بنا پر ہوتی لیکن روایت بالمعنیٰ کا شیوع اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ راوی جتنا گہرا عالم اور فقیہہ ہوگا۔ اتنا ہی بات کے مغز کو زیادہ پائے گا اور یہ نہ ہوگا کہ وہ روایت بالمعنیٰ کی صورت میں بات اور کچھ کہہ جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

نضر اللہ امرأ سمع منا شیئاً فبلغه کما سمعه فرب مبلغ اوعیٰ له من سامع[1]

ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ اس شخص کو سرسبز کرے جس نے ہماری کوئی حدیث سُنی۔ اور اسے اسی طرح آگے پہنچا دیا جیسا کہ اس نے سُنا تھا۔ کیونکہ آگے سننے والے کئی ایسے بھی ہوتے ہیں جو اسے اسی سننے والے سے زیادہ محفوظ رکھ سکیں۔

اوعیٰ (زیادہ حفاظت کرنے والا) سے مراد اسے زیادہ سمجھنے والا ہے۔ جتنا راوی فقیہہ ہوگا اتنا ہی وہ اس مضمون کو زیادہ سنبھالنے والا ہوگا۔ اور اس کی تائید حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (۳۲ھ) کی ہی ایک دوسری روایت سے ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

فرب حامل فقه الی من هو افقه منه[2]

ترجمہ۔ ایسے کئی حامل فقہ ہیں جو اس بات کو اس شخص تک لے جائیں جو ان سے زیادہ اس بات کو سمجھتے ہوں۔

معلوم ہوا کہ جتنا کوئی راوی زیادہ فقیہہ ہوگا اتنا ہی مقصدِ حدیث کو زیادہ پانے والا ہوگا۔ امام احمد بن حنبلؒ (۲۴۱ھ) حدیث کی فقہ کو اس کے حفظ سے زیادہ اہم سمجھتے تھے۔ امام علی بن المدینیؒ (۲۳۴ھ) بھی فقہ حدیث کو ہی سب سے اشرف علم شمار کرتے تھے۔ حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں :۔

قال احمد بن حنبل معرفة الحدیث والفقه فیه احب الی من حفظه وقال علی بن المدینی اشرف العلم الفقه فی متون الاحادیث ومعرفة احوال الرواة[3]

---

[1] رواہ الترمذی عن ابن مسعودؓ (مشکوٰۃ ص۳۵) [2] رواہ الشافعی والترمذی وابوداؤد وابن ماجه والدارمی والبیہقی فی المدخل

[3] منہاج السنۃ جلد ۴ ص۱۱۵

ترجمہ۔ امام احمد بن حنبلؒ کہتے ہیں حدیث اور فقہ کی معرفت مجھے اس کے حفظ سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ امام علی بن المدینی کہتے ہیں میں سب سے اشرف علم متون حدیث اور احوال رواۃ کی معرفت میں فقہ کو کارفرما کرنا ہے۔

غور کیجئے ان ائمہ فن نے فقہ اور حدیث کے معنی و مضمون کو کس قدر اہمیت دی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اس بات کے پُرجوش حامی تھے۔ کہ مدار ترجیح راویوں کی فقاہت ہونی چاہیئے۔ جتنا کوئی راوی زیادہ افقہ ہوگا اتنی ہی اس کی روایت کو ترجیح ہوگی۔ امام اہل شام امام اوزاعیؒ (۱۵۷ھ) سے امام ابو حنیفہؒ (۱۵۰ھ) کی رفع الیدین عند الرکوع کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ تو امام اوزاعیؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ حدیث پڑھی:۔

حدثنی الزهری عن سالم عن ابیه عبد الله بن عمر بن الخطاب ان رسول الله صلی الله علیه وسلم کان یرفع یدیه حذاء منکبیه اذا افتتح الصلوٰة وعند الرکوع وعند الرفع منه

ترجمہ۔ زہری نے مجھے سالم سے انہوں نے اپنے والد حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مجھے حدیث سنائی۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز شروع کرتے وقت اپنے کندھوں کے برابر رفع یدین کرتے اور رکوع کے وقت بھی اور رکوع سے اٹھتے بھی۔

اس پر حضرت امام ابو حنیفہؒ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ حدیث پڑھ دی۔

حدثنا حماد عن ابراهیم النخعی عن علقمة والاسود کلاهما عن ابن مسعود ان رسول الله صلی الله علیه وسلم کان لا یرفع یدیه الا عند افتتاح الصلوٰة ولا یعود لشیء من ذلك۔

ترجمہ۔ حماد نے ابراہیم نخعی سے انہوں نے حضرت علقمہ اور اسودؒ سے اور ان دونوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے یہ حدیث سنائی کہ نبی کریمؐ صرف نماز کے شروع میں رفع یدین کرتے تھے کسی دوسرے مقام پر رفع یدین نہ کرتے تھے۔

اس پر امام اوزاعیؒ نے کہا:۔

احدثك عن الزهري عن سالم عن عبد الله وتقول حدثني حماد عن ابراهيم۔

ترجمہ میں تمہیں زہری سے وہ سالم سے وہ عبد اللہ بن عمر سے حدیث سنا رہا ہوں اور تم مجھے حماد سے لو۔ وہ ابراہیم سے حدیث سنا رہے ہو؟

اس کے جواب میں امام ابو حنیفہؒ نے کہا۔

کان حماد افقه من الزهري وکان ابراهیم افقه من سالم وعلقمه لیس بدون ابن عمر فی الفقه وان کانت لابن عمر صحبة۔ وعبد الله هو عبد الله[1]

ترجمہ۔ حضرت حماد امام زہری سے زیادہ فقیہ تھے حضرت ابراہیم نخعی حضرت سالم سے زیادہ فقیہ تھے اور علقمہ فقہ میں حضرت ابن عمر سے کم نہیں۔ اگرچہ حضرت ابن عمر کو صحابیت کا جو شرف حاصل ہے وہ علقمہ کو نہیں۔ باقی رہے حضرت عبد اللہ بن مسعود تو وہ عبد اللہ بن مسعود ہیں۔

ثقہ راوی ضعف عمر کے باعث اگر یاد نہ رکھ سکے۔

قبول روایت میں جب اصل الاصول اعتماد ہے تو پیرانہ سالی میں جب حافظہ قوی نہ رہے تو ثقہ راویوں کی اس دور کی روایت پھر سے زیر بحث آجائے گی۔ محدثین فن حدیث میں اس درجہ محتاط رہے ہیں کہ انہوں نے ثقہ راویوں کی روایات میں بھی اول دور اور آخری دور کو ملحوظ رکھا ہے۔ اور تو اور صحابہ کرامؓ بھی اس عمر میں روایت نقل کرنے سے جہاں تک ہو سکے احتراز کرتے تھے۔ حضرت زید بن ارقمؓ (۶۶ھ) اپنے اس دور کا یوں ذکر کرتے ہیں۔

واللہ لقد کبرت سنی وقدم عهدی ونسیت بعض الذی کنت اعی من رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فما حدثتکم فاقبلوه وما لا فلا تکلفونیه[2]

(ترجمہ) اے بھتیجے میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں اور میرا وقت آپہنچا ہے اور میں بعض باتیں جو حضورؐ کی مجھے یاد تھیں بھول چکا ہوں سو میں جو خود بیان کروں وہ تو لے لیا کرو اور از خود مجھ سے نہ پوچھا کرو مجھے روایت کرنے کی تکلیف نہ دو۔

---

[1] دیکھئے سند الامام فی شرح مسند الامام ص ۱۹/۲ مطبع محمدی لاہور [2] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۲۷۹۔

تصحیح روایت میں محدثین پر اعتماد

محدثین میں حدیث کی تصحیح کے دو نوں طریقے رائج رہے ہیں۔ (۱) راویوں کی ثقاہت ان کے باہمی اتصال اور شذوذ و نکارت سے سلامتی معلوم کر کے بھی کسی حدیث کو صحیح کہہ سکتے ہیں۔
(۲) کبھی ان تفصیلات میں جائے بغیر اکابر علمائے فن کی تصحیح پر اعتماد کر کے بھی کسی حدیث کو صحیح کہا جا سکتا ہے۔ قبولیت روایت میں اصل الاصول اعتماد ٹھہرا تو جس طرح سے بھی یہ اعتماد حاصل ہو سکے روایت قابل قبول ہو جاتی ہے۔

ہر فن میں اکابر فن کی تقلید کی جاتی ہے۔ اس سے انسان اسی وقت نکلتا ہے جب خود براہِ راست راویوں کی جانچ پڑتال کر سکے اور اس کی جملہ طرق پر نظر ہو سکے۔ اس کے بغیر اعتماد سے چارہ نہیں۔ اس اعتماد کو بھی علم کی ہی ایک شان سمجھنا چاہیئے۔ تقلید سے مراد دوسرے کے علم پر اعتماد کرتے ہوئے اس کی دلیل مانگے بغیر اس کی بات کو قبول کرنا ہے۔ جس بات میں خود مضبوط علم حاصل نہ ہو تقلید سے چارہ نہیں۔ ہاں جب کسی بات کی براہِ راست تحقیق ہو جائے اور اس میں کوئی شک اور دغدغہ نہ رہے۔ تو پھر تقلید درست نہیں۔ لیکن جب تک راویوں کا پورا علم خود حاصل نہ ہو۔ محدثین کرام جو ائمہ فن ہیں ان کی تصحیح اور ان کی تضعیف سے بھی علماء حدیث کسی روایت کو صحیح یا ضعیف کہہ سکتے ہیں۔

حضرت عبدالرحمٰن بن مہدیؒ (۱۹۸ھ) جرح و تعدیل کے جلیل القدر امام ہیں۔ آپ اس اعتماد کے یہاں تک قائل تھے کہ اسے الہام کا درجہ دیتے تھے۔ جس طرح الہام کی خارج میں کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ ایک وجدان ہے جو اندر ہی اندر لو تار رہتا ہے۔ اسی طرح محدثین کرام کو فن کے کمال سے جو ذوق و وجدان ملتا ہے اس پر وہ بعض حدیثوں کو راویوں کی ثقاہت اور سند کے اتصال کے باوجود قبول نہیں کرتے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن مہدیؒ (۱۹۸ھ) کہتے ہیں :۔

معرفة الحديث الهام فلو قلت للعالم لعلل الحديث من اين قلت هذا؟ لم يكن له حجة [1]

---

[1] معرفة علوم الحديث للحاكم ص ۱۱۳

ترجمہ۔ حدیث کی معرفت ایک الہامی چیز ہے جو دل میں اُترتی ہے۔ اگر میں علل حدیث کے کسی عالم سے کہوں کہ تم یہ بات کہاں سے کہہ رہے ہو تو اس کے پاس اس کا جواب نہ ہوگا۔

حافظ شمس الدین الذہبی لکھتے ہیں:۔

اذا العمدۃ فی زماننا لیس علی الرواۃ بل علی المحدثین والمقیدین الذین عرفت عدالتھم وصدقھم فی ضبط اسماء السامعین۔[1]

ترجمہ۔ ہمارے پاس اس دور میں (تحقیق حدیث میں) اعتماد راویوں پر نہیں کیا جا سکتا بلکہ محدثین اور اساتذہ پر ہے اور ان لوگوں پر جن کی عدالت اور سچائی راویان حدیث کے ناموں کو یاد رکھنے میں جانی پہچانی جا چکی ہے۔

جب تک راویان حدیث اپنی سند سے حدیثیں روایت کرتے رہے تحقیق حدیث کا طریق راویوں کی جانچ پڑتال ہی رہا لیکن جب سند والی کتابیں مدون ہو چکیں اور اس جمع شدہ ذخیرے سے ہی حدیث آگے چلی تو اس دور میں علیحدہ علیحدہ راویوں کی جانچ پڑتال کے ساتھ حاذق محدثین کی تحقیق اور اکابر اساتذہ فن کا ذوق بھی ساتھ instinct چلنے لگے تو اب راویوں کی بجائے اساتذہ فن کے فیصلوں پر اعتماد حقیقت کے زیادہ قریب دکھائی دیتا ہے۔

معلوم ہوا کہ علل حدیث میں اکابر فن پر اعتماد کے بغیر طلبہ حدیث آگے نہیں چل سکتے۔ یہاں اہل فن کی تقلید سے چارہ نہیں۔ ہر شخص کا ذوق اس درجے میں پختہ نہیں ہوتا کہ محض راویوں کے حالات جان کر پوری سند اور پوری حدیث پر وہ کوئی حکم لگا سکے۔ حافظ جلال الدین السیوطی لکھتے ہیں:۔

ان الجرح انما جوز فی الصدر الاول حیث کان الحدیث یوخذ من صدور الاحبار لا من بطون الاسفار فاحتیج الیہ ضرورۃ للذب من الاثار و معرفۃ المقبول والمردود من الحدیث والاخبار و اما الآن فالعمدۃ علی الکتب المدونۃ۔[2]

---

[1] میزان الاعتدال جلد ا صفحہ ۴ [2] الکاوی فی تاریخ السخاوی کما فی الرفع والتکمیل صفحہ ۵

ترجمہ۔ راویوں پر جرح کرنا پہلے دور میں اس لیئے جائز رہا کہ حدیث علماء کے سینوں سے لی جاتی تھی نہ کہ کتابوں کے اوراق سے۔ سو اس کی ضرورت رہی تاکہ آثار کی حفاظت کی جا سکے اور احادیث و اخبار میں مقبول و مردود کو پہچانا جا سکے۔ لیکن اب اعتماد کتب مدونہ پر ہونا چاہیئے

امام احمد بن حنبلؒ (۲۴۱ھ) کی کتاب کتاب العلل و معرفۃ الحدیث، امام ترمذیؒ (۲۷۹ھ) کی کتاب العلل اور ابن ابی حاتم کی کتاب الجرح والتعدیل اس سلسلہ کی بہت مفید کتابیں ہیں۔ امام احمدؒ کی یہ کتاب انقرہ سے اور ابن ابی حاتم کی یہ کتاب حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی ہے

ایک موضوع پر دو حدیثیں مروی ہوں۔ راوی ہر دو کے ثقہ ہوں اور اتصال رواۃ بھی اپنی جگہ قائم ہو اور سند صحیح ہے تو ایسے موقعوں پر محدثین علل روایت میں چلے جاتے ہیں علت کا پا لینا ایک بڑی علمی مرتبہ ہے۔ عبدالرحمٰن بن مہدی اس کو الہام الٰہی سے تعبیر کرتے تھے، پھر بھی کوئی حل نہ ملے تو ترجیح و تطبیق کی راہ لینے سے چارہ نہیں۔

ترجیح و تطبیق میں ائمہ کے مختلف اسلوب

شریعت تدریجاً تکمیل کو پہنچی ہے کئی امور جو پہلے جائز یا ناجائز تھے بعد میں ناجائز اور جائز قرار پائے سو اگر کسی موضوع پر متضاد روایات ملیں تو پہلے جو بات ذہن میں آتی ہے یہ ہے کہ دونوں میں سے ایک حکم پہلے دور کا ہوگا جو اب منسوخ ہو چکا یہ اس صورت میں ہے کہ دونوں کی تاریخ معلوم ہو سکے اور اگر عقلاً دونوں میں سے کسی کو آگے پیچھے کیا جائے تو یہ نسخ اجتہادی ترجیح کے بعد لائق غور ہوگا

نسخ کی بات نہ کھلے تو پھر راجح کو دیکھا جائے وجوہ ترجیح سامنے آنے سے ایک بات خود بخود کمزور دکھائی دینے لگے گی ترجیح نہ دے سکیں تو نسخ اجتہادی سے کام لیں اسکے بعد تطبیق کی راہ ہے کہ ہر ایک کو جدا محمل پر محمول کیا جائے پھر بھی بات نہ بنے تو دونوں کو رہنے دیا جائے اور تساقط پر فیصلہ کر لیا جائے حنفیہ کے ہاں پہلے نسخ پھر ترجیح پھر تطبیق اور پھر تساقط کی ترتیب ہے شافعیہ کے ہاں پہلے تطبیق پھر ترجیح پھر نسخ اور پھر تساقط کا عمل ہوگا

واذا تعارض الحدیثان ففی کتب الشافعیۃ یعمل بالتطبیق ثم بالترجیح ثم بالنسخ ثم بالتساقط وفی کتبنا یوخذ اولاً بالنسخ ثم بالترجیح ثم بالتطبیق ثم بالتساقط۔ العرف الشذی ص ۴۳

متون واسانید

حدیث کی سب بڑی بڑی کتابیں صحاح ستہ ہوں یا مسند احمد، المصنف لعبد الرزاق، المصنف لابن ابی شیبہ، شرح معانی آثار و مشکل الآثار للطحاوی، مستدرک حاکم، سنن کبرےٰ بیہقی وغیرہ اور دیگر کئی سنن ومسانید اور معاجم وغیرہ صرف احادیث text پر مشتمل نہیں۔ ان کی اسانید chain of transmitters کو بھی ساتھ لیئے ہوئے ہیں۔ صاحب کتاب اپنے سے لے کر اُوپر تک راویوں کا ایک سلسلہ بیان کرتا ہے اور کہتا ہے ان رواۃ کے ذریعہ یہ حدیث مجھ تک پہنچی ہے۔ حدیث کے طلبہ اس سند سے گزرنے کے بعد ہی اصل حدیث تک رسائی پاتے ہیں۔ اگر یہ نقل کرنے والے ثقہ اور معتمد علیہ ہوں تو حدیث لائق اعتماد ہو جاتی ہے اور یہ کمزور ہوں تو روایت کمزور ٹھہرتی ہے۔

راویوں کا نام دینے میں ایک یہ حکمت بھی تھی کہ جن لوگوں پر ان راویوں کے حالات زیادہ کھلے ہوں اُن کے لیئے ان راویوں کی مزید جانچ پڑتال کا دروازہ کھلا رہے ہو سکتا ہے کہ کسی راوی حدیث کے حالات خود صاحب کتاب پر نہ کھلے ہوں یا کھلے ہوں مگر کچھ پہلو مخفی رہ گئے ہوں اور وہ کسی اور شخص پر کھل جائیں جسے اس سے کسی اور جہت سے بھی واسطہ پڑا ہو۔

جرح وتعدیل

رواۃِ حدیث کے حالات کو جاننا اور انہیں جان کر ان کی روایات کو قبول کرنا یا نہ کرنا ضروری ہے، چونکہ ان کی روایت سے دین میں ایک چیز ثابت ہو گی۔ اس لیئے ضروری ہے۔ کہ وہ خود قابل اعتماد ہوں۔ ورنہ شریعت میں اپنی طرف سے اضافہ کرنا ایک بڑا خطرناک اقدام ہو گا۔ اس اہم شرعی ضرورت کے لیئے راوی کے عیب معلوم کرنا اور انہیں آگے بیان کرنا اس غیبت میں شمار نہ ہو گا جسے شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ راویوں کے نقائص بیان کرنا جرح کہلاتا ہے اور ان کی صفائی پیش کرنے کو تعدیل کہتے ہیں۔ کسی راوی پر جرح کرنے والے کون کون ہیں اور ان کے پاس وجوہ جرح کیا کیا ہیں اور تعدیل کرنے والے کون کون سے ہیں۔ وہ کس

مرتبے کے لوگ ہیں۔ یہ وہ امور ہیں جن سے جرح و تعدیل میں بحث ہوتی ہے۔

معلوم رہے کہ جس طرح پہلے دور میں ایک ایک راوی کی پڑتال کی جاتی تھی۔ اس دور میں اب اس درجے کی محنت ضروری نہیں رہی۔ اب ہم ائمہ فن پر اعتماد کرتے ہوئے بھی کسی حدیث کا صحیح حکم معلوم کر سکتے ہیں۔

ائمہ جرح و تعدیل

وہ محدثین کرام جنہوں نے راویوں کے حالات جاننے اور ان کے مراتب پہچاننے میں وقت لگایا اور تحقیق حدیث میں تحقیق رواۃ ان کا خاص فن ٹھہرا انہیں ائمہ جرح و تعدیل کہا جاتا ہے۔ ان کا صحیح تعارف ائمہ حدیث کے عنوان کے تحت آئے گا۔ اس وقت صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ راویوں کے حالات میں زیادہ تر جن اماموں کے نام آتے ہیں۔ ان میں یہ حضرات زیادہ معروف ہیں۔ امام شعبہ (۱۶۰ھ) امام وکیع (۱۹۷ھ) عبدالرحمٰن بن مہدی (۱۹۸ھ) سفیان (۱۹۸ھ) یحییٰ بن سعید القطان (۱۹۸ھ) یحییٰ بن معین (۲۳۳ھ) علی بن المدینی (۲۳۴ھ) امام نسائی (۳۰۳ھ)۔

الفاظ الجرح والتعدیل

محدثین میں راویوں کی جرح و تعدیل کے لیے مختلف الفاظ رائج تھے اور ان الفاظ سے ہی ہر ایک ہی جرح کا وزن معلوم ہوتا تھا۔ جس درجے میں کوئی راوی کمزور ہو اس کے مطابق ہی اس کے لیے جرح کے الفاظ آتے ہیں۔ پہلے ہم الفاظ تعدیل ایک تدریج سے نقل کرتے ہیں۔ پھر الفاظ جرح ایک تدریج سے پیش کریں گے۔ جرح و تعدیل میں ائمہ کے اختلافات بھی ہیں۔ سو ان سے استفادہ اس فن کو جاننے سے ہی ہو سکتا ہے۔

تعدیل کے مختلف درجات

① ـــــ ثبتٌ حجۃٌ ، ثبتٌ حافظٌ ، ثبت متقنٌ ، ثقۃ ثقۃ

② ـــــ ثقۃٌ ، ثبت ③ ـــــ صدوقٌ ، لا بأس بہ۔

④ —— محلہ الصدق، جید الحدیث، صالح الحدیث۔

جرح کے مختلف درجات

① دجال، کذاب، وضاع، یضع الحدیث۔
② متہم بالکذب۔
③ متروک، لیس بالثقۃ، سکتوا عنہ، ذاھب الحدیث، فیہ نظر۔
④ ضعیف جداً، ضعفوہ، واہٍ۔
⑤ لیس بالقوی، ضعیف، لیس بحجۃ، لیس بذاک، لین، سئ الحفظ، لایحتج بہ۔

ان درجات میں پہلے اعلیٰ درجے کی تعدیل اور سخت درجے کی جرح ہے۔ پھر آہستہ آہستہ ان میں تدریجی کمزوری آتی گئی ہے۔ جس راوی کے بارے میں دونوں طرف سے (تعدیل اور جرح دونوں کے) الفاظ وارد ہوں۔ تو جرح و تعدیل دونوں کو سامنے لانا چاہیئے۔ حافظ ابن کثیرؒ (۷۷۴ھ) فرماتے ہیں:۔

ظلم لاخیك ان تذکر اسوأ ما تعلم و تکتم خیرہ۔[1]

ترجمہ: تیرے بھائی پر یہ تیرا ظلم ہوگا کہ اس کی کوئی بُری بات جسے تو جانتا ہو اُسے تو ذکر کرے اور اس کی اچھی بات جو تجھے معلوم ہو اسے تو چھپالے۔

لم یصح میں وضع نہیں

اگر کسی حدیث کے بارے میں لم یصح کے الفاظ وارد ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حدیث ضعیف یا موضوع ہے ہو سکتا ہے حسن ہو یا ضعیف ہو۔ من گھڑت (موضوع) نہ ہو۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (۸۵۲ھ) لکھتے ہیں:۔

لا یلزم من کون الحدیث لم یصح ان یکون موضوعاً۔[2]

ترجمہ: کسی حدیث کے بارے میں لم یصح (یہ حدیث ثابت نہیں ہوئی) کہنے سے لازم

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۹ صفحہ ۲۳ [2] القول المسدد فی الذب عن مسند احمد صفحہ ۳۹

نہیں آتا کہ وہ حدیث موضوع ہو۔

ان قول السخاوی لا یصح لا ینافی الضعف والحسن۔[1]

ترجمہ۔ سخاوی کا یہ کہنا کہ یہ حدیث صحیح نہیں۔ اس حدیث کے ضعیف یا حسن ہونے کے منافی نہیں۔

ہاں ایسی کتاب جس میں موضوع روایات کا بیان ہو۔ اس میں لم یصح کے الفاظ واقعی اس کے حسن اور ضعیف ہونے کی بھی نفی کر دیتے ہیں لم یصح کے بعد اگر اس کا کسی درجے میں اثبات نہ ہو تو اس کا مطلب واقعی یہ ہوتا ہے کہ وہ روایت موضوع ہو۔

جرح وہی لائق قبول ہے جس کا سبب معلوم ہو۔

کسی کے بارے میں نیک گمان کرنے کے لیئے دلیل کی ضرورت نہیں۔ لیکن بدگمانی کے لیئے دلیل ہونا لازمی ہے۔ بغیر دلیل کے کسی مسلمان کو بُرا سمجھنا یا ناقابل شہادت سمجھنا گناہ ہے۔ جس راوی پر جرح کی گئی ہو اور اس جرح کا سبب بھی معلوم ہو اور وہ راوی واقعی اس سبب کا مورد ہو تو وہ جرح معتبر ہوگی اور کسی ایسے راوی کی روایت مسترد کی جا سکے گی۔ ملّا علی قاری علیہ رحمۃ ربہ الباری لکھتے ہیں:۔

التجریح لا یقبل ما لم یبین وجہہ بخلاف التعدیل فانہ یکفی فیہ ان یقول عدل او ثقۃ مثلاً۔[2]

ترجمہ۔ وہ جرح جس کی وجہ واضح نہ ہو لائق قبول نہیں بخلاف تعدیل کے کہ اس میں راوی کو عادل یا ثقہ جیسے الفاظ سے ذکر دینا ہی کافی ہے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے کتنے راوی ہیں جن پر جرح کی گئی ہے۔ جیسے عکرمہ مولی ابن عباس، اسماعیل بن ابی ادریس، عاصم بن علی، عمرو بن مرزوق، سوید بن سعید وغیرہم۔ مگر چونکہ وہ جرح مفسّر اور مبین السبب نہ تھی۔ اس لیئے شیخین نے اسے قبول نہیں کیا۔ حافظ ابن صلاح (۶۴۳ھ) لکھتے ہیں:۔

وھکذا فعل ابوداؤد السجستانی و ذلک دال علی انھم ذھبوا الی ان الجرح

---

[1] تذکرۃ الموضوعات صد ۸۲ [2]

لا یثبت الا اذا فسر سببہ[1]

ترجمہ۔ ابوداؤد السجستانی نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ محدثین اسی طرف گئے ہیں کہ جب تک سبب جرح کی تفصیل نہ کی جائے۔ جرح ہرگز ثابت نہیں ہوتی ــــــ امام نووی (۶۷۶ھ) لکھتے ہیں :۔

لا یقبل الجرح الا مفسرا مبین السبب[2]

ترجمہ جرح لائق قبول نہیں جب تک کہ اس کی تشریح واضح نہ ہو اور سبب جرح واضح نہ ہو۔

حافظ ابن ہمام الاسکندری (۸۶۱ھ) جن کے بارے میں فقہاء لکھتے ہیں۔ کہ اجتہاد کے درجہ پر پہنچے ہوئے تھے۔ لکھتے ہیں :۔

اکثر الفقہاء ..... ومنھم الحنفیۃ ..... والمحدثین علی انہ لا یقبل الجرح الا مبینا لا التعدیل[3]

ترجمہ۔ اکثر فقہاء اور ان میں حنفیہ بھی ہیں اور محدثین سب اسی کے قائل ہیں۔ کہ جرح جب تک واضح نہ ہو لائق قبول نہیں۔ تعدیل کے بارہ میں یہ قید نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ تعدیل کے لیئے سبب کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ تعدیل کرنے والا کوئی عامی آدمی نہ ہو۔ اس باب میں عالم معرفت رکھنے والا منصف اور ناصح قسم کا آدمی ہونا چاہیئے۔ بحر العلوم (۱۲۲۵ھ) مسلّم الثبوت کی شرح میں رقمطراز ہیں :۔

لابد للمزکی ان یکون عدلًا عارفًا باسباب الجرح والتعدیل وان یکون منصفًا ناصحًا۔[4]

ترجمہ۔ تزکیہ اور تعدیل کے مدّعی کے لیئے یہ ضروری ہے کہ وہ عادل ہو اسباب جرح وتعدیل کو جاننے والا ہو اور انصاف پسند اور خیر خواہ قسم کا آدمی ہو۔

حافظ بدرالدین العینی (۸۵۵ھ) شرح ہدایہ میں لکھتے ہیں :۔

الجرح المبھم غیر مقبول عند الحذاق من الاصولیین[5]

ترجمہ۔ جرح مبہم سمجھ دار علمائے اصول کے ہاں مقبول نہیں۔

---

[1] فتح الملہم جلد ۱ صـ ۶۹ [2] تقریب نووی صـ ۲۰۲ مع التدریب [3] رد المحتار جلد ۳ صـ ۔ التحریر صـ ۲۲۳ [4] فواتح الرحموت صـ ۔ [5] البنایہ جلد ۳ صـ

یاد رہے کہ جرح کی وجوہ وہیں تلاش کی جائیں گی جہاں اس کے مقابلے میں کوئی تعدیل موجود ہو لیکن جس راوی کے بارے میں کوئی تعدیل نہ ملے تو اس کے بارے میں جرح مبہم بھی قبول کرلی جائے گی اور جارح سے سبب کا مطالبہ نہ کیا جائے گا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:۔

اذا اختلف العلماء فی جرح رجل وتعدیله فالصواب التفصیل فان کان الجرح والحالة هذه مفسرا قبل والا عمل بالتعدیل فاما من جهل ولم یعلم فیه سوی قول امام من ائمة الحدیث انه ضعیف او متروك او نحو ذلك فان القول قوله ولا نطالبه بتفسیر ذلك[1]

ترجمہ: علماء جب کسی شخص کی جرح و تعدیل کے بارے میں مختلف رائے رکھتے ہوں تو صحیح راہ یہ ہوگی کہ اس کی تفصیل کی جائے۔ اگر جرح کی وجہ معلوم ہو تو اسے قبول کیا جائے گا، بصورت دیگر تعدیل پر عمل ہوگا۔ ہاں جو راوی مجہول ہو اور اس کے بارے میں کسی امام حدیث کے اس قول کے سوا کہ وہ ضعیف ہے یا متروک ہے یا اسی قسم کا اور کوئی لفظ ہو کوئی اور بات معلوم نہ ہو تو اس امام حدیث کی بات لائق تسلیم ہوگی اور ہم اس سے وجہ جرح کا مطالبہ کریں گے۔

حافظ ابن عبدالبر مالکی ابوعبداللہ المروزی سے نقل کرتے ہیں:۔

کل رجل ثبتت عدالته بروایة اهل العلم عنه وحملهم حدیثه فلن یقبل فیه تجریح احد جرحه حتی یثبت ذلك علیه بامر یجهل ان یکون جرحه فاما قولهم فلان کذاب فلیس مما یثبت به جرح حتی یتبین ما قاله[2]

ترجمہ: ہر شخص جس کی عدالت اہل علم کے اس سے روایت لینے سے ثابت ہو اور وہ اس سے حدیث روایت کرتے ہوں تو اس کے بارے میں کسی کی جرح قبول نہ کی جائے گی جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اس کی وجہ جرح مخفی رہی تھی۔ صرف یہ کہنا کہ فلاں شخص کذاب ہے تو اس سے جرح ثابت

---

[1] ...

[2] التمہید جلد دوم صہ۲۳، صہ۲۴

نہیں ہوتی جب تک کہ دعویٰ جرح واضح نہ ہو۔

جرح تعدیل پر مقدم ہے

تعدیل کے لیے بے شک نیک گمان کافی ہے لیکن جرح کے لیے سبب اور دلیل کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں جارح (جرح کرنے والے) کے پاس معلومات زیادہ ہوں گے۔ اگر وہ معلومات صحیح ہیں تو جرح تعدیل پر مقدم ہوگی۔ جرح کے وجوہ اگر معقول ہیں تو اسے ہر صورت میں تعدیل پر مقدم کیا جائے گا۔ گو معدلین کی تعداد زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔ اکثریت کی تعدیل سے وجوہ جرح غلط نہیں ہو جاتے۔ گو ان کا مدعی ایک ہی ہو بشرطیکہ اس کے پاس اس کی دلیل یا سبب موجود ہو۔

امام فخر الدین رازی (۶۰۶ھ) حافظ ابن صلاح (۶۴۳ھ) علامہ آمدی (ھ) اور علامہ ابن حاجب کی یہی رائے ہے کہ جرح تعدیل پر مقدم ہے۔

لیکن اگر جرح اس امام یا محدث سے منقول ہو۔ جو علماء فن کے ہاں جرح کرنے میں متشدد اور متعنت سمجھے جاتے ہوں تو فقط ان کی جرح سے ہم کسی راوی کو مجروح نہ کر سکیں گے ضروری ہوگا کہ کوئی اور جارح بھی اس کا ہمنوا ہو اور ان جارحین کے پاس اس کا کوئی واقعی سبب موجود ہو۔ وہ کون کون سے امام ہیں جن کے ہاں جرح میں شدت ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

نوٹ

کبھی جرح مفسر پر بھی تعدیل مقدم ہو جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ جارح خود اس باب میں مجروح ہو یا اس وجہ سے کہ وہ جرح دوسرے وجوہ سے رد ہو چکی ہے ——— اس صورت میں تعدیل مقدم سمجھی جائے گی۔

متشدد کی جرح اکیلے کافی نہیں۔

جن ائمہ کا جرح کرنے میں تشدد و تعنت ہو ان کی تعدیل و توثیق بہت وزن رکھتی ہے۔

لیکن ان کی جرح زیادہ وزن نہیں رکھتی ہے۔ سو کسی راوی پر محض ان کی جرح سے فیصلہ ضعف نہ کرلیا جائے۔ متشدد کی جرح اکیلے کافی نہیں ہوتی۔ جس راوی پر کسی متشدد کی جرح ہو۔ اس کی جرح کا حال دوسرے ائمہ سے معلوم کرنا چاہیئے۔

ناقدین کے پہلے طبقے میں شعبہ (۱۶۰ھ) اور سفیان الثوری (۱۶۱ھ) کو لیجیئے۔ شعبہ کو امیرالمؤمنین فی الحدیث ہیں۔ مگر جرح میں ذرا سخت ہیں۔ پھر یحییٰ بن سعید القطان (۱۹۸ھ) اور عبدالرحمٰن بن مہدی (۱۹۸ھ) کو لیجیئے۔ یحییٰ میں سختی اور تشدد ملے گا۔ پھر یحییٰ بن معین (۲۳۳ھ) اور امام احمد (۲۴۱ھ) کو لیجیئے۔ جو سختی یحییٰ بن معین کرتے ہیں امام احمد نہیں کرتے۔ پھر امام نسائی (۳۰۳ھ) اور ابن حبان (۳۵۴ھ) کو دیکھیئے۔ امام نسائی ذرا سخت معلوم ہوں گے۔ ابوحاتم رازی (ھ) اور امام بخاری (۲۵۶ھ) میں ابوحاتم متشدد دکھائی دیں گے۔ ائمہ فن اسماء الرجال کی بحث میں راویوں کا حال لکھتے ہیں تو کہیں کہیں متشددین کی سختی کا ذکر بھی کر جاتے ہیں۔ طلبہ حدیث کو چاہیئے کہ صرف کسی راوی پر جرح کا نام سن کر اسے ناقابل اعتماد نہ سمجھنے لگ جائیں جب تک تحقیق نہ کرلیں کہ جارحین کون کون ہیں اور کتنے ہیں۔ اسباب جرح واضح ہیں یا نہیں۔ اور یہ کہ کہیں کوئی متشدد جارح تو نہیں۔ ائمہ رجال کتب رجال میں کئی جگہ اس تشدد کا ذکر کر جاتے ہیں۔

امام نسائی (۳۰۳ھ) نے حارث اعور سے استناد کیا۔ جسے بعض ائمہ ضعیف کہہ چکے تھے تو امام نسائی کے اس احتجاج کو محض اس لیئے اہمیت دی گئی کہ آپ جرح میں سخت واقع ہوئے تھے۔ سو اس روش کے محدثین جس سے روایت لیں اس کا کسی درجے میں اعتبار ضرور ہونا چاہیئے حافظ ابن حجر عسقلانی حارث اعور کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

والنسائی مع تعنتہ فی الرجال فقد احتج بہ[1]

امام نسائی نے رجال میں اپنی سختی کے باوجود اس راوی سے احتجاج کیا ہے اس کی روایت قبول کی ہے۔

حافظ عسقلانی اپنے رسالہ بذل الماعون فی فضل الطاعون میں بھی ایک راوی کے بارے میں جسے امام نسائی اور ابوحاتم نے ثقہ کہا تھا اور کئی دوسروں نے ضعیف کہا۔ لکھتے ہیں:۔

---

[1] تہذیب التہذیب جلد ۲ صفحہ ۱۴۷

توثیق النسائی وابی حاتم مع تشدد هما ـــــــ ابو حاتم کے متشدد ہونے کا آپ نے مقدمہ فتح الباری میں بھی ذکر کیا ہے[1] ابو حاتم نے تو امام بخاری پر بھی جرح کردی ہے۔

ابن حبان کے تشدد فی الرجال کا ذکر بھی سنیئے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ راویوں پر بھی جرح کر جاتے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ سو اگر جرح کا لفظ دیکھتے ہی راوی سے جان چھڑالی جائے تو پھر آخر کون بچے گا؟ حافظ عسقلانی لکھتے ہیں :۔

ابن حبان ربما جرح الثقة حتی کانه لا یدری ما یخرج من رأسه۔[2]

ترجمہ۔ ابن حبان کئی دفعہ ثقہ راویوں پر بھی جرح کر جاتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ان کا ذہن کدھر جا رہا ہے۔

حافظ ذہبی بھی ابن حبان کے بارے میں کہتے ہیں ما اسرف واجترأ[3] ابن حبان نے بہت زیادتی کی ہے اور بڑی جسارت کی ہے کہ ثقہ راویوں کو بھی ضعیف کہہ دیا۔ ایک اور جگہ پر کہتے ہیں۔ تقعقع کعادته۔[4]

شعبہ امیر المؤمنین فی الحدیث مانے جاتے ہیں۔ لیکن قبول روایت میں اُن کی سختی دیکھئے۔ آپ سے پوچھا گیا۔ کہ تم فلاں راوی کی روایت کیوں نہیں لیتے؟ آپ نے کہا۔ رأیته یرکض علی برذون۔ (میں نے اسے ترکی گھوڑے دوڑاتے ہوئے دیکھا تھا)۔

آپ منہال بن عمرو کے ہاں گئے۔ وہاں سے کوئی ساز کی آواز سُنی۔ وہیں سے واپس آگئے اور صورتِ واقعہ کی کوئی تفصیل نہ پُوچھی۔

حکم بن عتیبہ (م ھ) سے پوچھا گیا۔ کہ تم زاذان سے روایت کیوں نہیں لیتے۔ تو انہوں نے کہا۔ کان کثیر الکلام۔ وہ باتیں بہت کرتے تھے۔

حافظ جریر بن عبد الحمید الضبی الکوفی نے سماک بن حرب کو کھڑے ہو کر پیشاب کرتے دیکھا تو اس سے روایت چھوڑ دی[5]

---

[1] مقدمہ فتح الباری جلد ۲ صفحہ ۱۹۲ [2] القول المسدد فی الذب عن مسند احمد صفحہ ۳۳، افرط ابن حبان (مقدمہ فتح الباری جلد ۲ صفحہ ۱۲۹) [3] میزان الاعتدال جلد ۱ صفحہ ۴۳۶ [4] میزان الاعتدال جلد ۲ صفحہ ۱۸۵ [5] دیکھئے الکفایہ فی علوم الروایہ للخطیب البغدادی صفحہ ۱۱۱ تا ۱۱۴

اب سوچئے اور غور کیجئے. کیا یہ وجوہ جرح ہیں؟ جن کے باعث اتنے بڑے بڑے اماموں نے ان راویوں کو چھوڑ دیا. اگر اس قسم کی جروح سے راوی چھوڑے جا سکتے ہیں. تو پھر آخر بچے گا کون؟ یہ سختی سب کے ہاں نہ تھی. سو طلبہ حدیث کو چاہیئے کہ محض جرح دیکھ کر ہی نہ اچھل پڑیں. سمجھنے کی کوشش کریں. کہ جرح کی وجہ کوئی شرعی پہلو ہے یا صرف شدت احتیاط ہے، اور پھر یاد رکھیں کہ متشدد کی جرح اکیلے کافی نہیں ہے.

یہ مختصر قواعدِ حدیث ہر وقت ذہن میں رہنے چاہئیں. انسانی بساط اور عام بشری سوچ کے تحت جو احتیاطی تدابیر ہو سکتی تھیں وہ محدثین کرام نے طے کیں اور یہ اصول بھی تقریباً استقرائی ہیں جو ائمہ فن نے قواعدِ شریعت کی روشنی میں طے کیئے ہیں. ان میں کئی پہلو اختلافی بھی ہیں. جن میں ائمہ کی رائے مختلف رہی ہے. لیکن یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ تنقید کے بنیادی اصولوں میں سب ائمہ فن متفق رہے ہیں. بلکہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے تحقیق روایات اور تنقیح اسناد میں دنیا کو ایک نئے علم سے آشنا کیا اور وہ اصول بتائے جن کی روشنی میں پچھلے پہلوں کی باتوں کے جائز طور پر وارث ہو سکیں اور اُن کی صحت پر پوری طرح سے اعتماد کیا جا سکے.

قواعدِ حدیث کی مُستند کتابیں

ان دنوں اس موضوع پر زیادہ متداول کتابیں مقدمہ ابن صلاح اور شرح نخبۃ الفکر سمجھی جاتی ہیں. اصولِ حدیث کے یہ وہ متون ہیں جن پر آئندہ شرحیں لکھی گئیں. ابن صلاح نے ۶۴۳ھ میں وفات پائی. مؤخر الذکر کتاب نخبۃ الفکر اور اس کی شرح حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) کی تالیف ہیں. شرح نخبۃ الفکر کی ملّا علی قاری (۱۰۱۴ھ) نے بھی شرح لکھی ہے. شرح الشرح کے نام سے معروف و مشہور ہے.

قدماء میں علی بن المدینیؒ (۲۳۴ھ) امام احمد بن حنبلؒ (۲۴۱ھ) اور امام مسلمؒ (۲۶۱ھ) نے اس طرف توجہ فرمائی. امام احمدؒ نے اس پر کتاب العلل و معرفۃ الحدیث جس کا ابھی ذکر گزرا تالیف فرمائی. امام مسلمؒ نے صحیح مسلم میں فن حدیث پر ایک عظیم مقدمہ تحریر فرمایا. پھر امام ترمذی (۲۷۹ھ)

نے کتاب العلل لکھ کر اس موضوع میں گرانقدر اضافہ کیا۔ حافظ ابن رجب حنبلیؒ (۷۹۵ھ) نے کتاب العلل کی عظیم شرح تحریر کی۔ ابو محمد عبدالرحمٰن بن ابی حاتم الرازیؒ (۳۲۷ھ) نے کتاب الجرح والتعدیل لکھی جو حیدر آباد سے نو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ دارقطنیؒ (۳۸۵ھ) نے بھی کتاب العلل لکھی۔ آپ خود اسے مکمل نہ کر سکے۔ آپ کے شاگرد ابو بکر البرقانی نے اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ حافظ شمس الدین سخاویؒ (۹۰۲ھ) نے اس کی ایک تلخیص لکھی۔ جس کا نام "بلوغ الامل بتلخیص کتاب الدارقطنی فی العلل"، پھر خطابیؒ (۳۸۸ھ) ابن حزم (۴۵۷ھ) خطیب بغدادیؒ (۴۶۳ھ) حافظ ابن عبدالبرؒ (۴۶۳ھ) اور امام بغویؒ (۵۱۶ھ) عبدالرحمٰن بن الجوزیؒ (۵۹۷ھ) نے اپنی تصنیفات میں اصول حدیث پر گرانقدر تنقیحات کیں۔ یہاں تک کہ چھٹی صدی ہجری میں یہ فن ایک جامع شکل میں مرتب ہو گیا اور حافظ ابن صلاح (۶۴۳ھ) نے اس فن میں مقدمہ ابن صلاح لکھ کر اہل علم سے اپنا لوہا منوایا۔ اس کتاب کی مرکزی حیثیت آج تک مسلّم چلی آرہی ہے۔

پھر آٹھویں صدی ہجری میں حافظ ابن تیمیہؒ (۷۲۸ھ) ابن قیم جوزیؒ (۷۵۱ھ) خطیب تبریزی صاحب مشکوٰۃ (۷۴۳ھ) حافظ جمال الدین زیلعیؒ (۷۶۲ھ) اور حافظ ابن کثیرؒ (۷۷۴ھ) نے اس موضوع پر بیش بہا کام کیا۔ علامہ جرجانیؒ (۸۱۶ھ) نے مختصر الجرجانی میں اور ابوزرعہ (۸۲۶ھ) نے لکھ کر اس باب میں حجت پوری کر دی۔

پھر حافظ ذہبیؒ (۸۴۸ھ) حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (۸۵۲ھ) حافظ بدرالدین عینیؒ (۸۵۵ھ) حافظ ابن ہمام اسکندریؒ (۸۶۱ھ) اپنے دور میں اس فن کے امام تھے۔ لیکن جو مقبولیت اور شہرت حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کی شرح نخبۃ الفکر کو ہوئی وہ ایک الٰہی مقبولیت کا نشان ہے۔ دنیا کے تمام مدارس حدیث میں یہ کتاب داخل نصاب ہے اور متعدد علمائے کرام نے اس کی شروح لکھی ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں بھی اس موضوع پر شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (۱۰۵۲ھ) کا رسالہ جو لمعات التنقیح کے شروع میں ہے مولانا عبدالحی لکھنویؒ (۱۳۰۴ھ) کی کتاب الجرح والتکمیل اور مولانا ظفر احمد عثمانیؒ (ھ) کی قواعد علم الحدیث اس فن کی مستقل کتابیں ہیں۔

اس فن کے مختصر سے تعارف کے بعد اب ہم مختلف اقسام حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اقسامِ حدیث

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی۔ امابعد:۔

حدیث وہ آسمانی روشنی Divine guidance ہے۔ جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک میں بنی نوعِ انسان کی ہدایت کے لیے ودیعت کی گئی۔ اس کا مصدر ذاتِ الٰہی تھی۔ قرآن کریم بھی اللہ رب العزت نے اتارا اور یہ روحانی روشنی بھی اللہ تعالےٰ نے ہی حضورؐ کے دل میں اتاری۔ آنحضرتؐ نے اسے اپنے الفاظ Words اپنے عمل Actions یا اپنی تائید Confirmation سے آگے پھیلایا۔

حدیث میں کوئی تقسیم قرنِ اوّل میں نہ تھی۔

آنحضرتؐ نے اپنی زبان مبارک سے حدیث کی کسی طرح تقسیم نہیں کی۔ نہ آپ کے صحابہ نے آپ کی تعلیم کو کسی تقسیم میں اتارا۔ تاہم اس پہلے دور میں یہ بات مسلمانوں میں مسلّم تھی۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جملہ تعلیمات خواہ وہ کسی قسم کے تحت آتی ہوں سب الٰہی ہدایت ہیں اور سب ضیاء رسالت سے مستنیر اور جملہ عالم کے لیئے جلوہ فگن اور فیض رساں ہیں۔

تعلیماتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بحرِ ذخار میں جس سے کوئی پیاسا آج تک واپس نہیں لوٹا علماء اصول اُترے اور سہولت فہم کے لیئے انہوں نے ان کے انواع و اقسام پر غور کیا۔ پھر اسناد Chain of transmitters کے کچھ حالات بھی ان کے سامنے آئے۔ تو انہوں نے مختلف جہات سے اس الٰہی ہدایت اور رشد ہدایت کا استقراء فرمایا اور علماء

کے لیئے مختلف اقسام حدیث تعیین کر دیں. یہ اقسام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی تقسیم سے نہیں. ائمہ فن کی تقسیم اور تفصیل سے طے ہوئیں ہیں - آج کی مجلس میں انشاء اللہ اسی موضوع پر گفتگو ہوگی.

ہر فن میں اُس کے ماہرین پر اعتماد

کوئی شخص کسی فن میں جب تک مجتہد نہ ہو. اسے اس فن کے ماہرین کی پیروی کرنی پڑتی ہے. شرائط اجتہاد پورا کیئے بغیر خود مجتہد بن جانا چشمۂ تحقیق کو گدلا کرنا ہے. حدیث کے متن Text اور اسناد chain کے مختلف پہلوؤں پر علماء حدیث جب گفتگو کرتے ہیں. تو ائمہ فن کی پیروی کرتے ہوئے بات کرتے ہیں. اس فن میں ائمہ اور مجتہدین وہی حضرات ہیں. جنہوں نے اس فن پر اصُولی گفتگو کی. ان اصولوں کو قرآن وحدیث سے استنباط کیا. ان پر علمی بحثیں کیں. اختلافات پیدا کیئے اور حل کیئے اور علماء امت نے اس باب میں انہیں امام اور مقتدا تسلیم کیا.

ہر اصطلاح، قسم حدیث اور اس کے حکم کے بارے میں ہر شخص درست اور نادرست کی بحث شروع کر دے تو ہر عنوان اور پھر ہر قسم خود مستقل موضوع بن جائیں گے اور اصل بات ان ضمنی مباحث میں کھو جائے گی. سو ضروری ہے کہ قواعدِ حدیث بطور اصول مسلمہ قبول کر لیئے جائیں. زندگی کے ہر باب میں اہل فن کی تقلید ہوتی چلی آئی ہے. کسی امام فن کی بات کو اس اعتماد پر قبول کر لینا کہ وہ اصول کے مطابق بتلا رہا ہے اور اس کی دلیل کی بحث میں نہ پڑنا غیر مجتہد کی اساسِ عمل ہے. جس پر وہ ہر دائرہ زندگی میں عمل کرتا ہے. علماء حدیث جب کسی حدیث پر گفتگو کرتے ہیں. تو ان قواعد پر اعتماد کر کے چلتے ہیں جو محدثین نے فنِ حدیث میں مجتہدانہ کاوشوں سے قائم کیئے ہوئے ہیں اور ان پر فنی بحث اپنے وقت میں کافی دورانی ہو چکی ہے. اس تجربہ اور معرفت کے نتیجہ میں احادیث مختلف قسموں میں تقسیم ہوئی ہیں. حدیث کا تعلق چونکہ زیادہ تر اعمال ان کے مسائل اور پھر فضائل سے ہے. اس لیئے محدثین ہر باب کی مناسبت اور ضرورت کے مطابق مختلف پیمانوں میں قبول ہوتی

رہی ہیں۔ صرف عقائد ایسا موضوع تھا جس میں قطعی دلائل کی ضرورت تھی۔ سو یہ مختلف وجوہ اقسام حدیث کے زیادہ پھیلاؤ کا موجب ہوئے۔ اور مختلف جہات سے حدیث کی مختلف قسمیں سامنے آئیں۔

تقسیم حدیث کے مختلف اعتبارات

متن کے لحاظ سے علماء اسے باعتبار متکلم، باعتبار علم، باعتبار نوع، باعتبار مضمون مختلف قسموں میں تقسیم کرتے ہیں اور سند و رواۃ کے لحاظ سے وہ حدیث کی اور قسمیں بتلاتے ہیں۔ پھر حدیث کے لائق قبول نہ ہونے کے اعتبار سے بھی اس کی کچھ اقسام ہیں اور اس سلسلے میں ہر باب کی کچھ تفصیل ہے۔ ابتدائی تعارف کے لیے ہم ان مختلف اقسام کو ان عنوانوں کے ذیل میں بیان کرتے ہیں۔ مضمون خشک صحیح لیکن توجہ کا مستحق ضرور ہے اور غور کیا جائے تو اس کے تحت بھی علوم کی بہت نہریں بہتی ملیں گی۔

تقسیم حدیث

①	باعتبار علم	حدیث متواتر۔ خبر مشہور۔ خبر عزیز۔ خبر واحد۔
②	باعتبار رواۃ	صحیح۔ حسن۔ ضعیف۔
③	باعتبار نوع	قولی۔ فعلی۔ تقریری۔
④	باعتبار متن	حدیث قدسی۔ حدیث مرفوع۔ حدیث موقوف۔
⑤	باعتبار سند	متصل۔ مرسل۔ منقطع۔ معلق۔
⑥	باعتبار علت	منکر شاذ اور معلول۔
⑦	باعتبار موضوع	حدیث شرعی اور حدیث دُنیوی۔

پیشتر اس کے کہ ہم ان مختلف اقسام پر بحث کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ایک اصولی مسئلے پر گفتگو ہو جائے۔ یہ ایک نہایت اہم بحث ہے۔

تقسیم حدیث باعتبار علم کا عنوان آپ کے سامنے آ چکا ہے۔ کسی خبر سے آپ کو

کس درجے کا علم حاصل ہو رہا ہے یہ اس کا موضوع ہے۔ اگر آپ کو اس خبر سے علم یقین حاصل ہو رہا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ اس کا خلاف ظاہر ہو تو یہ درجہ علم اور ہو گا اور اگر اس خبر کے باوجود کسی درجے میں ظنیت رہی تو ظاہر ہے کہ اس سے علم یقین حاصل نہ ہوا اور یہ خبر مفید علم یقین نہ رہی ـــــ پھر اس میں بھی تفصیل ہو گی کہ ظنیت کس درجے میں ہے؟ پھر اس میں سے بھی ہر ایک کے احکام مختلف ہوں گے۔

عقائد کے باب میں حدیث سے تمسک

اسلام میں سب سے زیادہ اہم بات عقائد کی ہے۔ عقائد کے گرد ہی شریعت کا پورا دائرہ کھچتا ہے۔ عقائد صحیح ہوں تو اعمال صالحہ بھی قبولیت پائیں گے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ کسی عمل کا کوئی وزن نہ ٹھہرے۔

جس قدر موضوع اہم ہو اس کے مناسب اس کے لیے دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ عقائد اسلام کے اہم ترین ابواب ہیں۔ سو ان کے لیے مضبوط ترین دلائل کی ضرورت ہو گی۔ عقائد کے باب میں حدیث سے تمسک صرف اسی صورت میں ہو سکے گا کہ وہ کم از کم خبر عزیز کے درجہ میں ہو۔ خبر واحد سے اگر کوئی عقیدہ بنے گا تو اسی درجہ کا کہ اس کا منکر کافر نہ ٹھہرے۔ عقائد قطعیہ کے لیے دلائل بھی قطعی درکار ہوتے ہیں۔ اسلام کے بنیادی عقائد وہی ہو سکتے ہیں جو یا قرآن کریم سے قطعی الدلالت طریق سے ثابت ہوں یا کوئی حدیث متواتر انہیں ایسی دلالت اور وضاحت سے پیش کرے۔ جس میں کسی دوسرے معنی کو دخل نہ ہو۔ گو یہ تواتر لفظی نہ ہو معنوی ہو۔ اس تواتر کے انکار کی بھی اسلام میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ محدث کبیر ملا علی القاری لکھتے ہیں:۔

ولا یخفی ان المعتبر فی العقائد ھو الادلۃ الیقینیۃ والاحادیث الاحاد لو ثبتت انما تکون ظنیۃ اللّٰھم الا اذا تعددت طرقہ بحیث صار متواتراً معنویاً فحینئذ قد یکون قطعیاً۔[1]

---

[1] شرح فقہ اکبر ص ۱۲۲ مجتبائی۔

ترجمہ۔ اور مخفی نہ رہے کہ عقائد کے لیئے اعتبار دلائل یقینیہ کا ہی ہوتا ہے اور احادیث احاد اگر صحیح ثابت بھی ہوجائیں تو ظنی ہی رہیں گی۔ ہاں اگر ایک مضمون متعدد احادیث (یا کثرت طرق) سے ثابت ہو کہ متواتر معنوی ہو جائے تو اس صورت میں یہ دلیل بھی قطعی ٹھہرے گی۔

اب حدیث کی مختلف قسموں کا بیان لیجئے :۔

یہ بات پہلے آچکی ہے کہ علم دلائل یقینیہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے لیئے ظنی امور کافی نہیں ہو سکتے۔ اس بات کے لیئے کہ کوئی خبر علم و یقین تک پہنچے اور اس کا انکار ممکن نہ رہے دلیل متواتر کی ضرورت ہوتی ہے۔ سو سب سے پہلے حدیث متواتر کا درجہ ہے اور یہاں پہلے اسی کی تعریف کی جاتی ہے۔

حدیث متواتر

متواتر وہ حدیث ہے جس کو ابتداء سند سے لے کر آخر سند تک ہر زمانہ میں اتنے لوگوں نے بیان کیا ہو کہ انکا جھوٹ پر متفق ہونا عادۃً محال نظر آئے اور سند کی انتہا ایسی چیز پر ہو جس کا تعلق محسوسات سے ہو۔ نظر و فکر سے علم یقینی حاصل نہیں ہوتا ہے یہ حدیث متواتر سے حاصل ہوتا ہے۔ قرآن پاک بھی تواتر سے امت تک پہنچا ہے اور علم یقین کا درجہ رکھتا ہے۔

قرآن پاک کی ایک ایک آیت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے ساتھ منقول ہے۔ یہ بات کہ موجودہ قرآن وہی کتاب ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے پیش کی تھی قطع و یقین سے ثابت ہے۔ جو موجودہ قرآن کا منکر ہے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا ہی منکر ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص موجودہ قرآن میں تو شک کرے کسی اور قرآن کا منتظر رہے اور پھر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی سچا پیغمبر مانتا ہو ——— جو یہ کہے کہ قرآن کریم میں معاذ اللہ عام انسانی ہاتھوں نے کمی کر ڈالی ہے اور قرآن کریم میں کمی بیشی کر دی گئی ہے۔ وہ کیسے مسلمان ہو سکتا ہے؟

قرآن کریم متواتر طبقاتی ہے۔ ہر طبقہ امت نے اسے اپنے سے پہلے طبقے سے اسی طرح قبول کیا ہے۔ اب اس میں کسی شک و تردد کی گنجائش نہیں ہے۔ جو اس میں شک کرتا ہے وہ اسلام میں ہی شک کرتا ہے۔ اس کتاب کے "وہ کتاب" ہونے میں کوئی شک نہیں، جو آخری زمانہ کے لیے دستاویز ہدایت تھی۔ خود قرآن پاک میں ہی ہے :-

ذلك الكتاب لا ريب فيه۔ وہ کتاب نہیں کوئی شک اس میں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حدیثیں تواتر کے ساتھ منقول ہیں۔ ان کی تکذیب بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب ہے۔ سو حدیث متواتر سے ثابت ہونے والے جملہ امور پر ایمان لانا ضروری ہے اور ان میں سے کسی کا انکار کفر ہے۔ اُن میں سے کسی ایک کا انکار بھی کر دیا جائے تو انسان مسلمان نہیں رہتا۔ ایمان حضورؐ کو آپ کی جملہ تعلیمات میں سچا ماننے کا نام ہے۔ ایمان کے لیے آپ کی سب تعلیمات کو ماننے کی قید ہے۔ کفر کے لیے کسی ایک کا انکار بھی کافی ہے۔

تواتر کی مختلف قسمیں

تواتر کی دو قسمیں ہیں۔ ۱۔ تواتر لفظی۔ ۲۔ تواتر معنوی۔

تواتر لفظی بہت کم احادیث میں ہے۔ ہاں اگر حدیثوں کے الفاظ مختلف ہوں لیکن ان سب میں بات ایک ہی کہی گئی ہو تو اس قدر مشترک کا تواتر بھی بہر حال قائم اور ثابت ہوگا یہ تواتر معنوی ہے۔ کافی حدیثی مواد تواتر معنوی کے درجے کو پہنچتا ہے۔

"حدیث متواتر کے بکثرت موجود ہونے کی روشن دلیل یہ ہے کہ کتب احادیث جو علماء مصر میں متداول ہیں ان کا انتساب جن مصنفین کی طرف کیا جاتا ہے۔ یہ نسبت ایک یقینی امر ہے۔ پس اگر یہ مصنفین انہی کتابوں میں متفق ہو کر ایک حدیث کو اتنے رواۃ سے روایت کریں۔ جن کا جھوٹ پر اتفاق عادۃً ناممکن ہو تو بلا شک یہ حدیث متواتر ہو گی اور قائل کی طرف اس کا انتساب مفید علم یقینی ہو گا اور یہ بات ظاہر ہے کہ اس قسم کی حدیثیں کتب مشاہیر میں بکثرت موجود ہیں۔" [1]

---

[1] شرح اردو قال ابو داؤد جلد ۱ صفحہ ۳۷ مطبوعہ دیوبند۔

حدیث لانبی بعدی

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قصر نبوت کے ذکر میں بھی[1]، انبیاء بنی اسرائیل کے ذکر میں بھی[2]، تیس دجالوں کی پیشگوئی میں بھی[3]، دیگر انبیاء کرام پر اپنے خصائص بیان کرتے ہوئے بھی[4]، مبشرات خواب کے جاری رہنے کے ذکر میں بھی[5]، حضرت علیؓ کو ہارون اُمت کہتے ہوئے بھی عیسیٰ بن مریم کی دوبارہ تشریف آوری کی خبر دیتے ہوئے بھی اور دیگر کئی مواقع پر بھی یہ بات کہی کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ لانبی بعدی۔ اب اس حدیث کا انکار کفر نہیں تو اور کیا ہوگا۔ یہ حدیث ان پہلوؤں سے یقیناً درجہ تواتر کو پہنچ چکی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ لانبی بعدی کے کلمات لفظاً بھی متواتر ہیں۔

حدیث نزول عیسیٰ بن مریم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف موقعوں پر حضرت عیسیٰ بن مریم کے نزول کی خبر دی تھی۔ یہ صرف کسی ایک موقع پر کہی گئی بات کا حاصل نہیں۔ بلکہ متعدد روایات کی قدر مشترک ہے۔ سو یہ حدیث بھی متواتر معنوی ہے۔ علامہ حافظ ابن کثیر (۷۷۴ھ) لکھتے ہیں:۔

وقد تواترت الاحادیث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ اخبر بنزول عیسیٰ علیہ السلام قبل یوم القیٰمۃ اماماً عادلاً وحکماً مقسطاً[6]۔

ترجمہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث تواتر کے ساتھ منقول ہیں۔ آپ نے خبر دی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت سے پہلے نازل ہوں گے امام عادل کی حیثیت سے اور انصاف کرنے والے حکم کے طور پر۔

والاجماع علیٰ انہ حی فی السماء وینزل یقتل الدجال ویوید الدین (الوجیز)

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۴۸ صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۵۰۱ مسند احمد جلد ۲ صفحہ ۳۹۸ جامع ترمذی جلد ۲ صفحہ ۱۴۵ [2] صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۴۹۱ صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۲۶ مسند احمد جلد ۲ صفحہ ۲۹۷ [3] جامع ترمذی جلد ۲ صفحہ ۱۱ [4] صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۔۔۔ صحیح بخاری جلد صفحہ [5] صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۱۰۳۵ فتح الباری جلد ۲ صفحہ ۳۲۲ [6] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۷۸ صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۲۳۲ [6] ابن کثیر صفحہ ۱۳۲

علامہ عبدالعزیز فرہاردی شرح عقائد کی شرح میں لکھتے ہیں:۔
والاحادیث فی ذلک کثیرۃ متواترۃ المعنی[1]۔ اور ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔
ان حیاۃ عیسیٰ ثابت بالاحادیث المتواترۃ[2]۔ بیشک حیات مسیح احادیث متواترہ سے ثابت ہے۔
حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی اس پر ائمہ حدیث و تفسیر کا اتفاق نقل کیا ہے:۔
واما رفع عیسیٰ فاتفق اصحاب الاخبار والتفسیر علی انہ رفع ببدنہ حیا[3]
ترجمہ۔ اصحاب حدیث و تفسیر کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت عیسیٰ اپنے جسم سمیت زندہ اٹھائے گئے تھے۔
صحیح مسلم کی شرح اکمال اکمال المعلم میں بھی حدیث نزول کو متواتر مانا گیا ہے۔
اذ لابد من نزولہ لتواتر الاحادیث بذلک ۔۔۔۔۔۔ جلد ۱ ص ۲۶۵
محدث جلیل علامہ طاہر فتنی لفظ حکم کے تحت لکھتے ہیں:۔
ویجئ اٰخر الزمان لتواتر خبر النزول ۔۔۔۔۔۔ مجمع البحار جلد ۱ ص ۲۸۶

قطعی الثبوت کی دلالت

جو امور شریعت میں قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہیں۔ اگر ان کی اپنے مدعا پر دلالت بھی قطعی ہے تو وہ امور قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہوں گے اور ان کا منکر یقیناً کافر ہوگا۔ لیکن قطعی الثبوت امور کی اپنے مدعا پر دلالت اگر ظنی ہو اور اس میں کسی اور معنی کی بھی گنجائش ہو تو اس صورت میں یہ دلیل قطعی بھی مفید ظن رہے گی۔ یہ معاملہ صرف حدیث متواتر تک محدود نہیں۔ قرآن کریم کے احکام میں بھی باعتبار معنی اگر کہیں اختلاف کی گنجائش ہو تو اس میں بھی صحیح بات کا منکر صرف گمراہ کہا جائے گا اسے کافر نہ کہہ سکیں گے۔ کیونکہ اس قطعی الثبوت بات کی دلالت میں ظنیت آگئی ہے۔ جس سے حکم بدل گیا ہے۔
دلالت میں قطعیت تواتر معنی سے بھی آجاتی ہے اور کبھی امت کا اجماع بھی اس کے معنی کو قطعی کر دیتا ہے۔ علامہ شاطبیؒ نے اس موضوع پر ایک نہایت نفیس بحث کی ہے لکھتے ہیں:۔

---

[1] نبراس ص ۵۸۷ مطبوعہ ملتان [2] ایضاً ص ۴۸۵ [3] التلخیص الحبیر جلد ۳ ص ۲۱۴ اس سے پہلے یہ الفاظ بھی لکھے ہیں:۔
ورفع عیسیٰ علیہ السلام الی السماء۔ سو رفع ببدنہ حیا سے رفع الی السماء ہی مراد ہے۔ جو بدن سے ہوا۔

وانما الادلة المعتبرة ههنا المستقرأة من جملة ادلة ظنية تضافرت على معنى واحد حتى افادت فيه القطع فان للاجتماع من القوة ما ليس للافتراق ولاجله افاد التواتر القطع وهذا نوع منه. فاذا حصل من استقراء ادلة المسألة مجموع يفيد العلم فهو الدليل المطلوب وهو شبيه بالتواتر المعنوي[1]

ترجمہ۔ جن دلائل کا یہاں اعتبار ہے وہ اس طرح کے ہیں کہ کچھ ادلہ ظنیہ کے استقرار سے ایک معنی واحد پر آ جمع ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں قطعیت آگئی ہے۔ دلائل کے ایک موضوع پر مل جانے سے ان میں وہ قوت آ جاتی ہے جو ان کے علیحدہ علیحدہ ہونے میں نہ تھی اور اسی لیئے تواتر بھی قطعیت کا فائدہ بخشتا ہے اور یہ بھی اسی کی ایک قسم ہے۔ جب کسی مسئلہ کے دلائل کا استقرار کرتے ہوئے ایسا مجموع حاصل ہو جائے۔ جو یقین کا فائدہ دے تو وہ دلیل اس باب میں مطلوب ہے۔ اور یہ تواتر معنوی کی ہی طرح ہے۔

دلائل اپنے اپنے مقام پر گو اخبار احاد ہوں۔ لیکن ان کا مجموعی مفاد ضرور یقین کا فائدہ بخشتا ہے۔ مثلاً :۔

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی کہ قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ بن مریمؑ دوبارہ تشریف لائیں گے۔ یہ بات اپنی جگہ واضح تھی۔ عیسیٰ بن مریم کے تشخص میں امت میں کبھی کوئی اختلاف پیدا نہ ہوا تھا۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وضاحت بھی فرما دی تھی کہ وہی عیسیٰ بن مریم نازل ہوں گے۔ جو مجھ سے پہلے آئے تھے اور میرے اور ان کے مابین کوئی نبی نہیں گزرا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا:۔

لیس بینی وبینه یعنی عیسیٰ علیه السلام نبی وانه نازل[2]

واجمعت الامة على ما تضمنه الحديث المتواتر ان عيسى فى السماء حي وانه ينزل فى اٰخر الزمان[3]

---

[1] الموافقات جلد ۱ صہ ۳۶ [2] سنن ابی داؤد جلد ۲ صہ ۲۴۶ [3] البحر المحیط جلد ۲ صہ ۴۷۳

اس سے پتہ چلا کہ حضرت عیسیٰ بن مریم کے آنے کی خبر جس طرح تواتر معنی سے یقینی درجہ رکھتی ہے۔ اس کی دلالت بھی اپنے مدعا پر اسی طرح واضح اور قطعی ہے۔ جہاں تک حدیث لانبی بعدی کی دلالت کا تعلق ہے۔ قاضی عیاضؒ (۵۴۴ھ) کا بیان اس باب میں بہت واضح ہے۔

لانه اخبر انه صلی الله علیه وسلم خاتم النبیین ولا نبی بعده و اخبر عن الله تعالیٰ انه خاتم النبیین واجمعت الامة علی حمل هذا الکلام علیٰ ظاهره وان مفهومه المراد به دون تاویل ولا تخصیص فلا شك فی کفر هؤلاء الطوائف کلها قطعاً اجماعاً سمعاً۔[1]

ترجمہ: اس واسطے کہ حضورؐ نے خود فرمایا ہے کہ آپؐ خاتم النّبیین ہیں اور یہ کہ آپ کے بعد کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا اور خدا کی طرف سے بھی حضورؐ نے یہی بتلایا کہ آپؐ خاتم النّبیین ہیں اور امت کا اتفاق ہے کہ یہ آیت اپنے ظاہری معنی پر محمول ہے اور جو اس کا مفہوم ظاہری لفظوں سے سمجھ میں آ رہا ہے وہی اس میں بغیر کسی تاویل و تخصیص کے مراد ہے۔ پس ان لوگوں کے کفر میں قطعاً کوئی شک نہیں جو اس معنی کا انکار کریں۔

حضرت امام غزالیؒ (۵۰۵ھ) کی تصریح بھی سُن لیجئے!

ان الامة فهمت بالاجماع من هذا اللفظ ومن قرائن احواله انه افهم عدم نبی بعده ابداً وعدم رسول بعده ابداً وانه لیس فیه تاویل ولا تخصیص۔[2]

ترجمہ: امت نے اس لفظ خاتم النّبیین اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و قرائن سے یہی سمجھا ہے کہ آپ کے بعد نہ کوئی نبی ہوگا اور نہ کوئی رسول۔ اس مسئلہ ختم نبوت میں نہ کسی تاویل کی گنجائش ہے اور نہ کسی قسم کی تخصیص ہے۔

---

[1] شفاء ص ۳۶۲ [2] الاقتصاد فی الاعتقاد ص ۱۴۶ مصر

یہ گمان نہ کیا جائے کہ اس طرح کا تواتر اور یقین تو چند امور کو ہی حاصل ہوگا۔ ان کے ماسوا جو امور ہیں وہ تو سب ظنی ہوں گے۔ پھر اُن کا اعتبار کیسے کیا جائے۔

جواباً عرض ہے کہ اصول دین تو واقعی سب قطعی ہونے چاہئیں اور یہ صحیح ہے کہ اسلام کے سب اصول دلائل قطعیہ یقینیہ سے ثابت ہیں۔ لیکن فروع میں اگر کہیں باعتبار ثبوت یا باعتبار دلالت ظنیت آجائے تو اس کا کوئی نقصان نہیں ہے۔

فروع میں ظنیت آجائے تو حرج نہیں

محدث کبیر حضرت مولانا بدرعالم میرٹھی ثم المدنیؒ لکھتے ہیں:۔

فروع میں اگر ظنیت ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اس کی مثال بالکل قانونی دفعات کی سمجھئے۔ قانون کے الفاظ اپنے اجمال کے ساتھ قطعی ہوتے ہیں اور اس کی ضمنی دفعات و تشریحات بسا اوقات ظنی ہوتے ہیں۔ اسی لیے ان میں ہر عدالت کو اختلاف کرنے کی گنجائش مل جاتی ہے۔ امام شاطبی نے مقدمات کتاب کے پہلے مقدمہ میں اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے پس فروعی مسائل کے ظنی ہونے میں کوئی اشکال نہیں۔ نہ ان مسائل کے تسلیم کرنے سے دین کی بُنیا کا ظنی ہونا ثابت ہوتا ہے۔[1]

حدیث کے ظنی الثبوت ہونے پر تشویش کرنے والوں کو سوچنا چاہیئے کہ قرآن کا ایک ایک حرف اگرچہ متواتر ہے۔ لیکن اس کے باوجود جو مسائل اس سے مستنبط ہوتے ہیں ان میں سے ایک ایک کے قطعی اور یقینی ہونے کا دعوے نہیں کیا جاسکتا بہت سے مسائل ایسے ہوں گے۔ جو گو قرآن سے مستنبط ہوں۔ لیکن ان کی دلالت اپنے مدلول پر ظنی ہو تو اگر احتمال ظن سے حدیث چھوڑی جاسکے گی۔ تو کیا اسی راہ سے قرآن کے بہت سے مسائل بھی بادر ہوا نہ ہو جائیں گے۔ فرق رہ جائے گا تو صرف یہی کہ حدیث میں ظن ثبوت سے آرہا ہے اور ان قرآنی احکام میں دلالت کی راہ سے باقی رہا نتیجہ سو وہ صاف ہے۔

---

[1] ترجمان السنۃ جلد ۱ صفحہ ۱۸۵

علامہ شاطبیؒ (۷۹۰ھ) فرماتے ہیں:۔

کسی متواتر کا قطعیت کو مفید ہونا اس پر موقوف ہے کہ اس کے جمیع مقدمات بھی متواتر ہوں. لیکن اگر اس کے مقدمات ظنی ہیں تو وہ پھر ظن ہی کو مفید ہوگا. مثلاً ہر کلام کا سمجھنا لغت اور نحویوں کی رائے پر بھی موقوف ہے. پس اگر کسی مسئلہ نحوی میں نحویوں کی رائے مختلف ہے یا کسی لغت میں اہل لغت کا اختلاف ہے تو اس اختلاف کا اثر اس متواتر کلام کے مفہوم پر بھی ضرور پڑتا ہے. کیوں کہ جن امور پر اس کلام کے مفہوم کا سمجھنا موقوف ہے. جب وہی ظنی ہیں تو پھر اس کلام کو مفید قطع کیسے سمجھا جاسکتا ہے[1]

ہاں جہاں ثبوت اور دلالت دونوں قطعی ہو جائیں تو ان متواترات دین کا انکار کہیں نہیں کیا جا سکتا. نہ تواتر اسناد کا نہ تواتر معنی کا، نہ تواتر طبقہ کا، نہ عمل طبقہ کا، نہ توارث تعامل کا، نہ تواتر قدر مشترک کا. کسی تواتر سے ثابت ہونے والے کسی دینی مسئلے کا انکار جائز نہیں. ہاں تواتر قدر مشترک سے ثابت ہونے والے مسئلے میں ضرور کچھ تفصیل کی گنجائش ہے کہ اگر مسئلہ نظری ہو تو ہو سکتا ہے کہ اس کا انکار کفر نہ ہو. لیکن اگر مسئلہ بدیہی ہے تو وہ اپنے مفہوم میں عام فہم ہے سو اس کا منکر کافر ٹھہرے گا. حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری فرماتے ہیں:۔

والتواتر عندی ایضاً علی اربعة اقسام احدھا تواتر الاسناد... وھذا التواتر تواتر المحدثین والثانی تواتر الطبقة ... وھذا تواتر فقهاء و تواتر التعامل ... وھذا التواتر قریب من التواتر الثانی ومثاله ھذا تواتر العمل برفع الیدین عند الرکوع و ترکه فانه عمل به غیر واحد فی القرون ثلاثة والرابع تواتر القدر المشترک ... وحکم الثلاثة الاول تکفیر جاحده واما الرابع فان کان ضروریا فکذلك وان کان نظریا فلا[2]

(ترجمہ) اور میرے نزدیک تواتر کی بھی چار قسمیں ہیں ا. تواتر اسناد اسے تو محدثین بھی کہتے ہیں ۲. تواتر طبقہ یہ تواتر فقہاء کہتے ہیں ۳. تواتر تعامل اور ۴ تواتر قدر مشترک پہلے تین تواتر ایسے ہیں کہ ان کا منکر کافر ٹھہرا ہے جو تھے تواتر کا موضوع اگر ضروریات کے درجے میں ہے تو وہ بھی اسی حکم میں ہے اور اگر نظری درجے کا ہے تو اسکے منکر کو کافر نہ کہا جائیگا۔

---

[1] الموافقات جلد ا صـ۳۵ ترجمان السنة جلد ا صـ۱۸۴ [2] العرف الشذی صـ ۳۴

تواتر کی ایک قسم تواتر سکوتی

مقدمہ مظاہر حق میں تواتر کی بحث میں ایک قسم تواتر سکوتی بھی بتلائی گئی ہے کہ ایک شخص نے ایک بات نقل کی اور دیگر حضرات نے اس پر سکوت کیا اور پھر وہ بات اتنی مشہور ہوئی کہ تواتر کے درجے میں آگئی۔ احقر کے نزدیک اس میں یہ احتمال باقی رہے گا۔ کہ ہو سکتا ہے۔ کہ انہوں نے اس پر اس لیئے سکوت کیا ہو کہ وہ خبر واحد کو لائق قبول سمجھتے تھے اور خبر واحد کے طور پر ہی اسے آگے مشہور کر دیا ہو پہلے مرحلے میں وہ خبر واحد ہی رہے گی اس صورت میں اس میں تواتر کا دعوے نہ کیا جا سکے گا۔

الحاصل حدیث باعتبار علم دو قسموں پر منقسم ہے۔

اوّل حدیث متواتر۔ دوم اخبار احاد۔

اور اخبار احاد پھر آگے ان تین قسموں میں منقسم ہو جائیں گی۔

۱۔ حدیث مشہور۔ ۲۔ حدیث عزیز۔ ۳۔ حدیث غریب۔

حدیث متواتر کے مقابل حدیث احاد ہے۔ اسے خبر واحد بھی کہتے ہیں جس کی اعلیٰ ترین قسم حدیث مشہور ہے۔ حدیث متواتر پر گفتگو گزر چکی ہے۔ اب حدیث مشہور، حدیث عزیز اور حدیث غریب کی کچھ تفصیل لیجئے۔
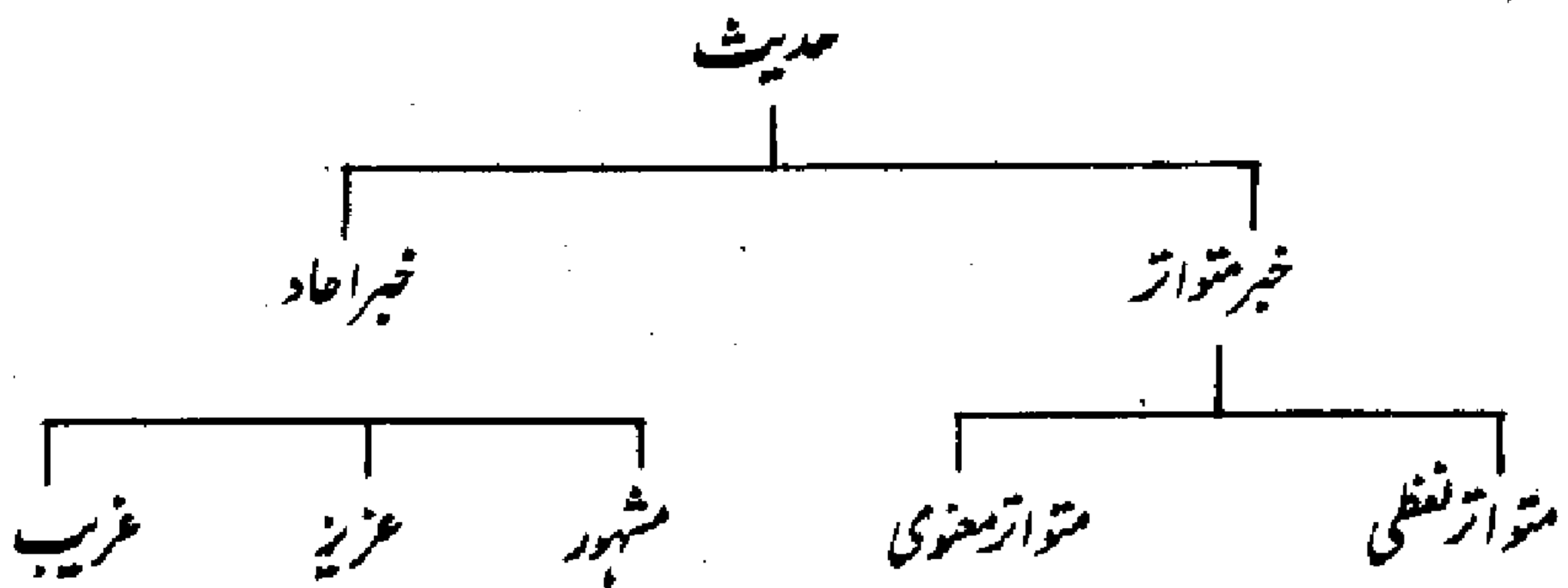
حدیث مشہور

حدیث مشہور وہ حدیث ہے جس کے راوی ابتدار سند سے لے کر آخر سند تک

دو سے زیادہ ہوں۔ لیکن تواتر کو نہ پہنچتے ہوں اور اس حدیث کی محدثین میں شہرت ہوئی ہو۔ اس سے ایسا علم پیدا ہوتا ہے جس سے حدیث کی سچائی پر اطمینان قلبی حاصل ہو جاتا ہے لیکن اسے قطع و یقین کا وہ درجہ حاصل نہیں ہوتا کہ اس کے منکر کو کافر کہا جا سکے۔ قطع و یقین صرف حدیث متواتر میں ہوتا ہے۔ محدثین بعض اوقات اس حدیث کو بھی مشہور کہہ دیتے ہیں جو صرف آخر سند کے لحاظ سے متواتر ہو۔ تاہم وہ بھی خبر واحد ہی ہوتی ہے۔ جیسے حدیث انما الاعمال بالنیات۔ جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف حضرت عمرؓ نے اور ان سے حضرت علقمہؓ نے اور ان سے صرف حضرت محمد بن ابراہیم تیمیؒ نے اور صرف یحیٰ بن سعیدؒ نے روایت کی ہے۔ لیکن اس کے بعد اسے راویوں کی کثیر تعداد نے ہر دور میں متواتر بنا دیا۔ سو یہ ایک ایسی حدیث ہے جو آخر سند کے لحاظ سے مشہور کہی گئی ہے۔ علماء اصول کے ہاں حدیث مشہور خبر واحد نہیں۔ وہ اسے متواتر اور خبر واحد کے درمیان کی ایک منزل قرار دیتے ہیں[1] اور یہ ان کی اپنی اصطلاح ہے۔ ولا مشاحۃ فی الاصطلاح۔

حدیث عزیز

حدیث عزیز وہ حدیث جس کے راوی ابتداء سند سے لے کر آخر تک دو سے کم نہ ہوں[2]۔

---

[1] علماء کے نزدیک حدیث مشہور وہ ہے جس کے راوی پہلے طبقہ (یعنی طبقہ صحابہؓ) میں حد تواتر کو نہ پہنچے ہوں لیکن دوسرے اور تیسرے طبقے (تابعین اور تبع تابعین) میں اسے اتنے راویوں نے روایت کیا ہو کہ ان کا جھوٹ پر اکٹھا ہونا عادۃً محال ہو۔ یہ تین طبقے (قرون ثلاثہ) مشہود لہا بالخیر ہیں۔ جن کے خیر ہونے کی حدیث میں شہادت دی گئی ہے۔ ان طبقوں میں سے دو کے ہاں اسے تواتر کی سی شہرت حاصل ہو گئی۔ سو حدیث مشہور ان حضرات کے ہاں خبر واحد سے کچھ اوپر ہے اسے یہ خبر واحد نہیں کہتے۔ علماء اصول خبر واحد سے قرآن کریم کے کسی عام حکم کو خاص نہیں کرتے۔ لیکن حدیث مشہور سے ان کے ہاں عام کی تخصیص جائز ہے۔ محدثین کے ہاں حدیث مشہور بھی خبر واحد کی ہی ایک قسم ہے۔ [2] کسی جگہ دو سے زائد ہو جائیں تو بھی حدیث عزیز ہی رہے گی۔

جیسے حدیث لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من ولدہ ووالدہ والناس اجمعین۔[1]
اس حدیث کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو صحابیوں نے ان میں سے ہر ایک سے دو تابعیوں نے اور پھر ان سے دو تبع تابعیوں نے روایت کیا ہے۔ اس تعدد رواۃ سے روایت بڑی قوی ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سند سے بھی ایسا قطع ویقین حاصل نہیں ہوتا۔ کہ اس کے منکر کو کافر کہا جا سکے۔ حنفیہ کے ہاں حدیث وتر اسی درجہ میں ہے کہ اس پر عمل تو فرض کے درجہ میں ہے۔ لیکن اس کا منکر کافر نہیں حضرت علامہ شامیؒ لکھتے ہیں :۔

اعلم ان الفرض نوعان فرض عملاً وعلماً وفرض عملاً فقط فالاول کالصلوٰۃ الخمس فانہا فرض من جہۃ العمل لا یحل ترکہا۔

...... وفرض من جہۃ العلم والاعتقاد بمعنی انہ یفترض علیہ اعتقادھا حتی یکفر بانکارھا والثانی کالوتر فانہ فرض عملاً کما ذکرنا۔ ولیس بفرض علماً ای لا یفترض اعتقادہ حتی انہ لا یکفر منکرہ لظنیۃ دلیلہ وشبہۃ الاختلاف فیہ ولذا یسمی واجباً۔[2]

ترجمہ۔ یہ جان لو کہ فرض کی دو قسمیں ہیں۔ ایک جو علماً اور عملاً ہر دو پہلوؤں سے فرض ٹھہرے اور دوسرا وہ جو صرف عملاً فرض ہو اعتقاداً فرض نہ ہو ـــــ پہلے فرض کی مثال نماز پنجگانہ ہے وہ عمل کی طرف سے بھی فرض ہے کہ اسے چھوڑنا حلال نہیں اور علم کی رو سے بھی فرض ہے کہ اس کی فرضیت کا اعتقاد رکھنا بھی فرض ہے۔ یہاں تک کہ اس کا انکار کفر ہے اور دوسری قسم کی مثال میں وتر کو لیجئے۔ وہ عملاً فرض ہے علماً فرض نہیں۔ اس کا اعتقاد فرض نہیں ٹھہرتا۔ یہاں تک کہ اس کے منکر کی تکفیر نہ کی جا سکے گی۔ کیوں کہ اس کا ثبوت دلیل ظنی سے ہے اور اس میں شبہ اختلاف بھی ہے اور اس لئے اسے فرض نہیں کہتے واجب کہتے ہیں۔

---

[1] صحیح مسلم جلد ۱ صد ۴۹ [2] ردالمحتار جلد ۱ صد ۶۲۱

حدیث عزیز لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ ـــــــ الحدیث اس طرح مروی ہے۔
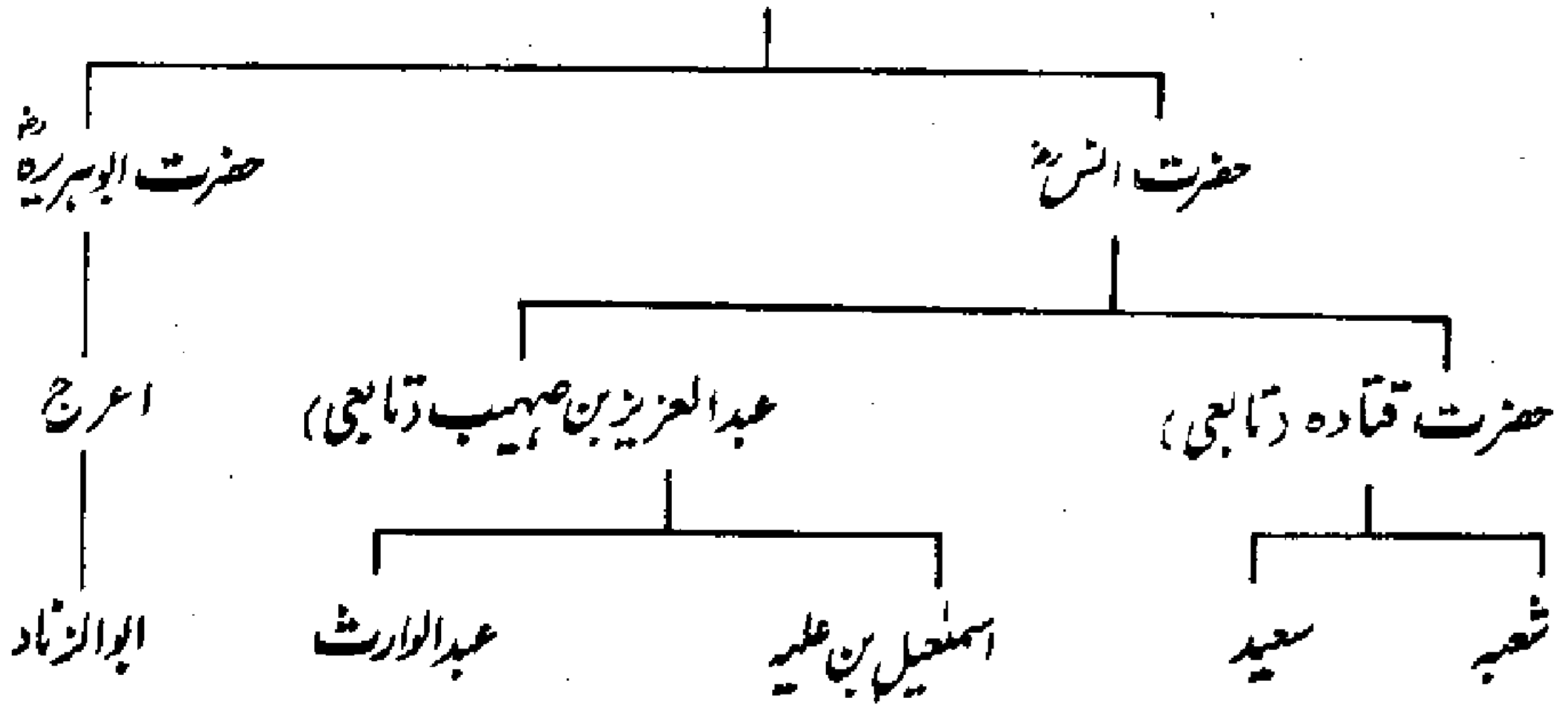
حدیث غریب

وہ خبر واحد ہے جس کی سند کسی مقام پر صرف ایک ہی راوی سے چلی ہو، مثلاً کسی صحابی سے ایک ہی تابعی نے روایت کیا ہو، گو اس کے بعد پھر تفرد نہ رہا ہو۔ جیسے بخاری کی یہ روایت ہے:۔

الایمان بضع وسبعون افضلھا لا الٰہ الا اللہ وادناھا اماطة الاذی عن الطریق۔

اسے حضرت ابوہریرہؓ سے صرف ابو صالح تابعی نے روایت کیا ہے اور ابو صالح سے حضرت عبداللہ بن دینار نے۔ اس طرح کی حدیث غریب کو فرد بھی کہتے ہیں یہ ضعف کی کوئی قسم نہیں ہے۔

حدیث غریب کی قسمیں

حدیث غریب کو فرد بھی کہتے ہیں۔ پھر فرد کی دو قسمیں ہیں۔ فرد مطلق۔ فرد نسبی۔

مذکورہ بالا مثال فرد مطلق کی ہے۔ فرد نسبی یہ ہے کہ صحابی سے تو متعدد تابعی روایت کریں۔ لیکن اس کے بعد راوی کہیں ایک ہی رہ جائے۔ پھر فرد نسبی کی آخر بہت سی قسمیں ہیں کبھی تفرد کسی ایک علاقے کے محدثین کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ جیسے اہل مدینہ، اہل مکہ، اہل بصرہ اہل کوفہ وغیرہ کے رواۃ کرام کہ ایک علاقے کا ایک ہی راوی اسے روایت کرے۔

فرد اور غریب دونوں ہم معنی لفظ ہیں۔ مگر محدثین عام طور پر فرد مطلق کو فرد اور فرد نسبی کو غریب کہتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ بات عجیب ہے کہ زمانہ تابعین میں تو اس حدیث کو زیادہ راوی روایت کریں اور آگے کسی دور میں اس کا راوی ایک رہ جائے ـــــ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسی حدیث غریب ہونے کے باوجود صحیح ہی رہتی ہے۔ بشرطیکہ سند کا اتصال قائم ہو اور رواۃ کمزور نہ ہوں۔ سو کسی حدیث کا غریب ہونا اس کی صحت کے منافی ہے۔

حدیث کا غریب ہونا اس کی صحت کے منافی نہیں

یاد رکھیے حدیث کا غریب ہونا اس کی صحت کے منافی نہیں۔ حدیث غریب حدیث صحیح کی ہی ایک قسم ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ مقدمہ مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں:۔

الحدیث الصحیح ان کان راویه واحدًا یسمی غریبا وان کان اثنین یسمی غریبا وان کانوا اکثر یسمی مشهورًا ومستفیضا وان بلغت رواته فی الکثرة الی ان یستحیل العادة تواطئهم علی الکذب یسمی متواترًا ویسمی الغریب فردًا ایضا ...... وعلم مما ذکران الغرابة لاتنافی الصحة ویجوزان یکون الحدیث صحیحا غریبا بان یکون کل واحد من رجاله ثقة[1]

ترجمہ۔ حدیث صحیح کا راوی اگر ایک ہی ہو تو اسے غریب کہیں گے۔ دو ہوں تو بھی اسے غریب کہیں گے اور اگر راوی دو سے زیادہ ہوں تو اسے مشہور اور مستفیض کہیں گے اور اگر اس کے راوی کثرت میں اس درجے تک پہنچیں کہ عادۃً ان کا جھوٹ پر اتفاق کر لینا محال ٹھہرے تو اسے متواتر کہیں گے، حدیث غریب کو فرد بھی کہتے ہیں (اکیلی) اور اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی حدیث کا غریب ہونا اس کے صحیح ہونے کے منافی نہیں اور ہو سکتا ہے کہ ایک حدیث صحیح بھی ہو اور غریب بھی کہ راوی تو اس

---

[1] مقدمہ مشکوٰۃ صہ۲ دہلی وقد یقع بمعنی الشاذ۔

کے ایک ایک ہی ہوں لیکن سب ثقہ ہوں۔

امام ترمذیؒ نے کتاب العلل میں حدیث غریب پر بحث کی ہے۔ جن وجوہ غرابت کا آپ نے ذکر کیا ہے[۱] وہ حدیث صحیح میں بھی ہو سکتے ہیں۔ حدیث کی یہ مختلف قسمیں مختلف درجوں کا علم بخشتی ہیں۔ حدیث متواتر سے اس یقینی درجے کا علم حاصل ہوتا ہے کہ اس کا منکر بے شک کافر ٹھہرتا ہے۔ حدیث احاد مشہور کے درجہ تک پہنچے تو اس کا منکر سخت گمراہ قرار پائے گا۔ سند کی قلت و کثرت کے باعث ان روایات سے جس درجے کا ثبوت ملے گا اس سے علم کے مختلف درجات قائم ہوں گے۔ اخبار احاد کتنی ہی کیوں نہ ہوں ان سے حاصل شدہ علم علم ظنی ہی شمار ہو گا۔ لیکن یہ ظن اس درجے میں نہیں کہ اسے یونہی ٹھکرا دیا جائے۔ اس سے جو علم حاصل ہوتا ہے اپنی جگہ عمل کے لیے کافی ہے۔ خبر واحد کے حجت ہونے کی بحث ہم قواعد الحدیث میں کر آئے ہیں۔ سو خبر واحد اگر صحیح ہو تو سوائے گمراہ کے اس کا کوئی منکر نہ ہو گا۔

خبر واحد کے مختلف مراتب

یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ وہ حدیث جس پر سب کا اتفاق ہو اور وہ جو کسی خاص مسئلہ کے متعلق صرف ایک راوی سے روایت کی گئی ہو اور اس میں مختلف تاویلوں کی گنجائش بھی ہو۔ دونوں برابر نہیں ہو سکتیں۔ پہلی حدیث کا تسلیم کرنا بلاشبہ قطعی ہے۔ اگر کوئی اس کا منکر ہو تو اس سے توبہ کرائی جائے۔ لیکن دوسری قسم کی حدیث اس درجہ میں قوی نہیں۔ کہ اگر اس حدیث میں کوئی شک کرے تو اس سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے۔ تاہم عمل کرنا اس پر بھی لازم ہو گا۔ گو اس میں کسی وجہ ترجیح کو اختیار کیا جائے۔ جب تک کہ اسباب ترک میں سے کوئی سبب پایا نہ جائے اسے چھوڑنا درست نہ ہو گا۔ جیسا کہ شاہدوں کے بیان پر فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہاں بھی غلطی اور شکوک کا احتمال رہتا ہے۔ لیکن پھر بھی جب تک کہ تحقیق نہ ہو ان کے ظاہر حال پر ہی عمل کیا جاتا ہے۔

---

[۱] کتاب العلل صفحہ ۶۴۰ لکھنو

خبر واحد پر عمل نہ کرنے کی چند صورتیں

ہاں یہ ممکن ہے کہ اگر کسی کے پاس خبر واحد پہنچی ہو تو اس نے اس پر اس لیے عمل نہ کیا ہو کہ اس کے نزدیک وہ خبر حد صحت کو نہ پہنچی ہو یا وہ حدیث دو معنوں کو محتمل ہو۔ اور اس نے دوسرے معنی پر عمل کر لیا ہو یا اس کے معارض اس سے زیادہ صحیح حدیث اس کے پاس موجود ہو۔ غرض جب تک وجوہ ترجیح یا اسباب ترک میں سے کوئی سبب اس کے پاس موجود نہ ہو، ہرگز کسی کے لیے خبر واحد کا ترک کرنا جائز نہیں [1]

خبر واحد کے حجت ہونے پر حضرت امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں بہت ٹھوس دلائل دیئے ہیں۔ حضرت مولانا بدر عالم مدنیؒ نے ترجمان السنۃ جلد اول میں اس پر گراں قدر بحث کی ہے۔ اس میں سے کچھ حجیت حدیث کے عنوان میں ہم ذکر کر چکے ہیں۔

خبر متواتر اور خبر واحد کی یہ بحث یا حدیث مشہور، حدیث عزیز اور حدیث غریب کا تقابل یہ سب ثبوت روایت کی مختلف شئون ہیں۔ حدیث کی یہ اقسام باعتبار علم ہیں کہ راویوں کی تعداد کے لحاظ سے کس طرح علم کے مختلف درجے قائم ہوئے۔ اس میں راویوں کی ذات سے بحث نہ تھی صرف ان کی تعداد پیش نظر تھی۔ اگر ان راویوں کی ذات سے بحث کی جائے اور ان کی صفات صدق و ضبط وغیرہ کو دیکھا جائے تو حدیث کی اور اقسام پیدا ہوں گی۔ ہم انہیں ایک دوسرے عنوان سے ذکر کرتے ہیں۔

(۲) حدیث کی تقسیم باعتبار رواۃ

حدیث صحیح، حدیث حسن اور حدیث ضعیف میں سے ہر ایک کی دو دو قسمیں ہیں۔ پہلے ان کے نام سمجھ لیجئے۔ پھر ہر ایک کی تعریف عرض خدمت ہوگی۔

---

[1] ترجمان السنۃ جلد اول صہ ۱۴۶

حدیث

ضعیف		حسن		صحیح	
ضعیف متروک	قوی بتعدد ترک	حسن لغیرہ	حسن لذاتہ	صحیح لغیرہ	صحیح لذاتہ
۶	۵	۴	۳	۲	۱
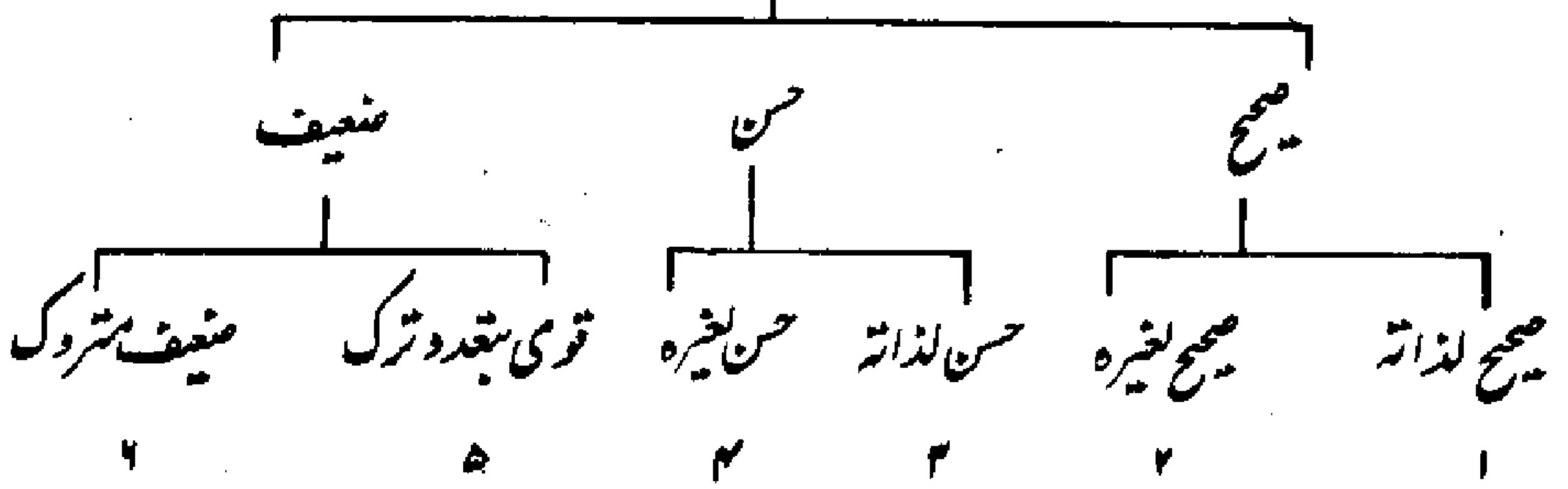
حدیث صحیح

ان میں سے پہلی پانچ قسم کی حدیثیں مقبول ہیں۔ ان میں سب سے اعلیٰ حدیث صحیح لذاتہ ہے۔ یہ وہ حدیث ہے جس کے تمام راوی عادل (جھوٹ اور منہیات شرعیہ سے بچے ہوئے) اور تام الضبط (قوی یاد داشت والے[1]) ہوں اور سند میں اتصال ہو کر ہر راوی دوسرے راوی سے ملا ہوا اور اس حدیث کے خلاف کسی لفظ میں کوئی اور راوی مخالفت کرنیوالا نہ ہو۔

حدیث صحیح لغیرہ

یہ وہ حدیث ہے جس میں سب شرطیں صحیح لذاتہ کی پائی جاتی ہوں۔ علاوہ اس کے کہ کسی راوی کا حافظہ اتنا پختہ نہ ہو جتنا کہ صحیح لذاتہ کے راوی کا ہونا چاہیئے۔ مگر اس کمی کو تعدد طرق نے پورا کر دیا ہو۔ دوسرے لفظوں میں اس کی تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے۔ کہ صحیح لغیرہ وہ حدیث ہے جس کو راوی عادل خفیف الضبط (جس کے ضبط اور یاد داشت میں کچھ کمزوری ہو) نے بسند متصل روایت کیا ہو اور وہ حدیث نہ معلل ہو نہ شاذ اور اس کی سندیں بھی متعدد ہوں۔ راوی کے تام الضبط نہ ہونے کی وجہ سے یہ صحیح لذاتہ نہیں لیکن اس کمی کو چونکہ تعدد طرق نے پورا کر دیا ہے۔ اس لیئے وہ حدیث صحیح لغیرہ ٹھہرے گی۔

---

[1] یہ ضبط صرف زبانی یادداشت سے بھی ہوتا ہے اور کبھی کتاب کی مدد سے بھی ہوتا ہے۔ پہلے ضبط کو ضبط صدر اور دوسرے کو ضبط کتاب کہتے ہیں۔

حسن لذاتہ

یہ وہ حدیث ہے جس کے تمام راوی عادل وضابط تو ہوں، لیکن کوئی راوی خفیف الضبط ہو اور سند میں کسی جگہ سے کوئی راوی چھوٹا نہ ہو اور حدیث معلل اور شاذ نہ ہو ـــــــ حدیث صحیح لغیرہ اور حسن لذاتہ کی تعریفوں سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا، کہ اگر حدیث حسن لذاتہ میں ضبط کی کمی دیگر سندوں کی تائید سے پوری کر دی جائے۔ تو وہی حدیث جو حسن لذاتہ تھی صحیح لغیرہ ہو جائے گی۔ بعض حدیثوں کی کتابوں میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ ایک ہی حدیث کو حسن صحیح لکھا ہے۔ تو اس کا یہی مطلب ہے کہ یہ حدیث اگرچہ حسن لذاتہ ہے۔ لیکن دوسری سندوں کی تائید سے یہ صحیح لغیرہ کے درجہ کو پہنچ گئی ہے۔ حدیث حسن کی اصطلاح امام ترمذی کے ہاں بہت ملتی ہے۔ سو اسے مستقل طور پہ جاننا چاہیئے کہ ان کے ہاں اس کا کیا مطلب ہے آپ لکھتے ہیں:-

ما ذکرنا فی ھذا الکتاب حدیث حسن فانما اردنا حسن اسنادھا عندنا وکل حدیث یروی ولایکون فی اسنادھا من یتھم بالکذب و لایکون الحدیث شاذا ویروی من غیر وجہ نحو ذلک فھو عندنا حدیث حسن۔[1]

ترجمہ۔ ہم نے اس کتاب میں جہاں کسی حدیث کو حسن کہا ہے تو اس سے ہماری مراد اس کا سند کے اعتبار سے حسن ہونا ہے ـــــــ اور ہر حدیث جو مروی ہو اور اس کی سند میں کوئی راوی ایسا نہ ہو جو متہم بالکذب ہے (جس پر جھوٹ کا الزام نہ ہو) اور نہ وہ حدیث شاذ ہو (کہ دوسرے راوی اس شیخ سے اسے روایت نہ کرتے ہوں) اور وہ صرف ایک طریق سے مروی نہ ہو (کئی طریقوں سے اس کی روایت ہوئی ہو) تو ہمارے ہاں اسے حسن کہیں گے۔

---

[1] کتاب العلل للترمذی جلد ۲ صفحہ ۶۲۶

حسن غریب

دیکھئے اس کے تمام راوی عادل اور ضابط ہیں لیکن تعدد طرق سے مروی ہو۔ یہ اس میں شرط نہیں ہے۔ پس اس اعتبار سے حسن اور غریب کہ جس میں راوی کا تفرد بھی ہو۔ کوئی منافات نہیں ہے۔ اس لیئے امام ترمذی نے روایت کے حسن ہونے اور غریب ہونے کو کئی سندوں میں جمع بھی کر دیا ہے۔ جن کے تمام راوی عادل وضابط تو ہیں لیکن کسی مقام پر ان کے نزدیک تفرد آگیا ہے۔ سو ایسی حدیث ان کے ہاں حدیث صحیح غریب یا حسن غریب ہوگی۔

حسن لغیرہ

یہ وہ حدیث ہے جس کی قبولیت میں تردد ہو۔ جیسے کوئی راوی مستور اور مجہول الحال ہو۔ لیکن دوسری سندوں سے اس کو تقویت حاصل ہوگئی۔ یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہوتی ہے۔ لیکن دوسری سندوں کی تائید سے قابل عمل اور لائق استدلال ہو جاتی ہے۔ امام نووی (۶۷۶ھ) نے شرح مہذب میں اور سیدنا ملا علی قاری (م ۱۰۱۴ھ) نے اس سے استدلال کرنے کی تائید فرمائی ہے۔ جیسے حدیث طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم کی بعض روایتوں میں "مسلمۃ" کا اضافہ ہے۔ اس حدیث کے بیان کرنے والے امام ابن ماجہؒ (۲۷۵ھ) امام بیہقیؒ (۴۵۸ھ) اور امام طبرانی (۳۶۰ھ) وغیرہ ہیں اور حضرات صحابہ میں اس کے روایت کرنے والے حضرت ابو ایوب انصاریؓ (۵۱ھ) ابی بن کعبؓ (۱۹ھ) حذیفہؓ (۳۵ھ) سلمان فارسیؓ (۳۵ھ) ابوہریرہؓ (۵۷ھ) حضرت عائشہ صدیقہؓ (۵۷ھ) حضرت انسؓ (۹۳ھ) وغیرہم ہیں اور پھر حضرت انسؓ سے روایت کرنے والے بیس تابعی ہیں۔ لیکن نہایت تعجب کی بات ہے کہ محدثین اس پر متفق ہیں کہ اس کی تمام سندیں ضعیف ہیں۔ بایں ہمہ دیکھئے کہ اس حدیث کے تعدد طرق کو دیکھ کر حافظ سیوطی (۹۱۱ھ) نے اس کو احادیث متواترہ میں شمار کیا ہے۔ یوں سمجھئے کہ یہ تواتر کی ایک اور قسم سامنے آگئی گو باعتبار علم ہم اسے متواتر نہیں کہہ سکتے۔ لیکن یہ بھی نہیں کہ عمل کے لیے یہ محض ضعیف ہی ہے۔

حدیث ضعیف (قوی بتعدد طرق)

وہ حدیث ضعیف ہے جس کی سند موجود ہو (یعنی موضوع اور من گھڑت نہ ہو) لیکن اس کے راوی باعتبار یادداشت یا عدالت کے کمزور ہوں لیکن اگر اسے دوسری سندوں سے تائید حاصل ہو تو یہ قبول کی جا سکتی ہے یہی نہیں کہ صرف فضائل اعمال میں انہیں لے لیا جائے گا بلکہ ان سے بعض حالات میں استخراج مسائل بھی کیا جا سکتا ہے۔ قیاس استنباط مسائل کے لیے ہی ہوتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ ضعیف حدیث کو قیاس پر ترجیح دیتے تھے۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات احکام میں ہی چل سکتی ہے فضائل میں نہیں۔ سو اس بات سے چارہ نہیں کہ حدیث ضعیف کا بھی اپنا ایک وزن ہے یہ من گھڑت نہیں ہوتی۔

حدیث ضعیف کی ترجیح محض قیاس پر

حافظ ابن حزمؒ (۴۵۶ھ) لکھتے ہیں:۔

جمیع اصحاب ابی حنیفة مجمعون علی ان مذهب ابی حنیفة ان ضعیف الحدیث اولی عندنا من القیاس والرای[1]

ترجمہ۔ امام ابوحنیفہ کے تمام شاگرد اس پر متفق ہیں کہ امام ابوحنیفہ کا طریقہ یہی تھا کہ آپ ضعف حدیث کو قیاس پر ترجیح دیتے تھے۔

حافظ ابن قیم حنبلی (۷۵۱ھ) لکھتے ہیں:۔

واصحاب ابی حنیفة مجمعون علی ان مذهب ابی حنیفة ان ضعیف الحدیث عنده اولی من القیاس والرای وعلی ذلك بنی مذهبه ...

... تقدیم الحدیث الضعیف وآثار الصحابة علی القیاس و الرای قوله وقول الامام احمد[2]

ترجمہ۔ امام ابوحنیفہ کے سب شاگرد اس پر اتفاق کرتے ہیں کہ آپ کے

---

[1] ابطال الرأی والقیاس والاستحسان صـ ۶۸ [2] اعلام الموقعین جلد ۱ صـ ۸۸

ہاں حدیث ضعیف قیاس اور رائے پر مقدم تھی اور آپ نے اسی پر اپنے مذہب کی بنیاد رکھی ہے۔ . . . سو حدیث ضعیف اور آثار صحابہ کو قیاس پر مقدم کرنا امام ابوحنیفہ اور امام احمد دونوں کا فیصلہ ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ (۱۵۰ھ) کے بارے میں یہ غلط فہمی پھیلائی جاتی ہے کہ وہ حدیث کے بجائے قیاس سے زیادہ کام لیتے تھے یہ درست نہیں۔ جب وہ حدیث ضعیف کو بھی قیاس پر مقدم کرتے ہیں۔ تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ صحیح حدیث کو چھوڑ کر قیاس کو مقدم کرتے ہوں۔

ضعیف حدیث حسن لغیرہ تک

ضعیف حدیث کی سندیں گو وہ اپنی جگہ ضعیف ہوں۔ لیکن اس کے راویوں کا اگر ان پہلے راویوں سے مل کر روایت کرنے کا مظنہ نہ ہو تو اس تعدد طرق سے حدیث ضعیف قوی ہو کر حسن لغیرہ تک پہنچ جائے گی۔ لیکن اس کا فیصلہ حاذق محدثین ہی کر سکتے ہیں۔ نہ کہ ہر ایک کو اس کا حق دیا جائے نہ ہر ایک اس کا اہل ہے۔ قال اللہ تعالیٰ ان اللہ یامرکم ان تودوا الامانات الی اھلھا۔ اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں کہ امانتوں کو ان کے اہل لوگوں کے سپرد کرو۔

حدیث اصحابی کالنجوم محدثین کے ہاں اسی طریق سے لائق قبول سمجھی گئی ہے۔ وہب بن جریر اپنے والد سے وہ حضرت اعمش سے وہ حضرت ابو صالح سے وہ حضرت ابوہریرہؓ سے اور وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح روایت کرتے ہیں :۔

اصحابی کالنجوم من اقتدیٰ بشی منہا اھتدیٰ[1]

ترجمہ۔ میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں جو ان میں سے کسی کی پیروی کر گیا ہدایت پالی۔

علم کی آفتوں میں سب سے بڑی آفت

ضعیف حدیث سے عقائد کا ثابت کرنا علم کے لیئے ایک بہت بڑی آفت ہے۔ علم سے ناآشنا لوگ ضعیف روایات سے عقائد کا اثبات کرتے ہیں۔ چند مثالیں لیجئے۔

(۱) بعض لوگ اس حدیث سے آپ کا علم محیط یا آپ کا ہر چیز کو ناظر ہونا اس سے ثابت

[1] مشکوٰۃ صفحہ ۵۵۴ پر بھی یہ مختلف الفاظ سے موجود ہے محدث گنگوہی فرماتے ہیں کہ یہ حسن لغیرہ تک پہنچ جاتی ہے۔

کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کانی انظرالی کفی ھذہ۔[۱] میں پوری دنیا کو اس طرح دیکھ رہا ہوں جیسے اپنی اس ہتھیلی کو دیکھ رہا ہوں ـــــــ اس قسم کی ضعیف احادیث پر عقائد کی بنیاد رکھنا قابل رحم علمی بے بسی ہے۔

حدیث ضعیف (متروک)

ضروری نہیں کہ ضعیف حدیث کثرت طرق سے ہمیشہ قوی ہو جائے بعض اوقات روایت کثرت طرق سے اور زیادہ ضعیف ہوتی جاتی ہے۔ طالب علم سوچتا ہے کہ اسے باوجود اپنے مضمون کے اہم ہونے اور کثرت طرق سے مروی ہونے کے صحیح سند آخر کیوں میسر نہ آئی؟ اتنے طرق سے منقول ہوئی۔ مگر ہر طریق سند کمزور ہی رہا۔ سو یہ روایت محض اتفاقی ضعیف نہیں ہوگی۔ بلکہ حقیقۃً ہی کمزور ہوگی۔ اس صورت میں جوں جوں طرق بڑھتے جائیں گے ضعف اور نمایاں ہوتا جائے گا اور یہ بات ماہر محدثین اور حاذق اساتذہ ہی جان سکتے ہیں۔ حافظ زیلعیؒ (۷۶۲ھ) ایک مقام پر لکھتے ہیں:-

کم من حدیث کثرت رواته وتعددت طرقه وهو حدیث ضعیف کحدیث الطیر وحدیث الحاجم والمحجوم وحدیث من کنت مولاه فعلی مولاه بل قد لا یزیدا کثرة الطرق الا ضعفا۔[۲]

ترجمہ کتنی ہی حدیثیں ہیں جن کے راوی بہت ہیں اور ان کے طریق سند بھی متعدد ہیں پھر بھی وہ حدیث ضعیف رہی ہے جیسے حدیث طیر، حدیث حاجم (کہ پچھنے لگانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے) اور حدیث من کنت مولاہ فعلی مولاہ ـــــــ بلکہ بعض اوقات کثرت طرق سے ضعف اور بڑھتا جاتا ہے۔

ابن صلاحؒ (۶۴۳ھ) اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ جب کوئی شخص کسی ضعیف حدیث کو بیان کرنے کا ارادہ کرے تو اس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب الفاظ جازمہ وقطع ویقین کے سے الفاظ سے نہ کرے یوں نہ کہے۔ قال رسول الله کذا او ما اشبہ ذلک۔[۳]

---

[۱] [۲] نصب الرایہ جلد ۱ صفحہ ۳۶۰ [۳] مقدمہ ابن صلاح صفحہ

بلکہ یوں کہے روی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کذا وکذا۔ یا یوں کہے۔ بلغنا عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کذا وکذا وامثال ذلک۔ اور یہی حکم ان حدیثوں کے بارے میں ہے جن کی صحت وضعف میں شک ہو۔

علماء نے صرف پند ونصیحت، بیان قصص اور فضائل اعمال کے مواقع پر احادیث ضعیف کے بیان کرنے کو بلا اس کے ضعف بیان کیے جائز رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتب سیر میں آپ کو احادیث ضعیفہ بغیر تصریح کے بہت ملیں گی بخلاف احادیث موضوعہ کے کہ ان کا بیان کرنا حرام ہے۔ انہیں بیان کرنا کسی موقع پر درست نہیں۔ سوا اس کے کہ ان کے موضوع ہونے کو بیان کرے۔ سو موضوع حدیث کا بیان کرنا اور اسے لوگوں میں رائج کرنا بالکل حرام ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر افتراء اور بہتان ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ فی النار (مشکوٰۃ ص۳۲ عن البخاری)

ترجمہ۔ جس نے جان بوجھ کر مجھ پر بہتان باندھا اسے چاہیئے کہ اپنا ٹھکانا جہنم بنا لے۔

موضوع حدیث

وہ روایت جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر خود وضع کی گئی ہو یا صحابہ کرامؓ کے نام پر گھڑی گئی ہو موضوع روایت کہلاتی ہے۔ اس کی بالکل سند نہیں ہوتی۔ اگر اس کی کوئی سند بھی وضع کرلے تو بھی اس کا موضوع ہونا کسی دوسرے پہلو سے کھل جائے گا۔ سند ہو بھی تو اس میں وضاع اور کذاب قسم کے راویوں سے اس کا من گھڑت ہونا معلوم ہوجاتا ہے۔

موضوع احادیث کے بارے میں اہم کتابیں

علماء اسلام نے جہاں حدیث کی مختلف پہلوؤں سے خدمت کی ہے۔ وہاں انہوں نے موضوع روایات کی نشاندہی بھی پوری محنت سے کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تمام بڑے بڑے محدثین نے علم پیغمبر کے گرد حفاظت کے پہرے دیئے ہیں اور ایسے حضرات بھی سامنے آئے ہیں۔ جنہوں نے موضوع روایات کی نشاندہی میں مستقل کتب تصنیف فرمائی ہیں۔

تذکرۃ الموضوعات

لابی الفضل محمد بن طاھر بن علی بن احمد المقدسی المعروف بابن القیسرانی (۵۰۷ھ)

ان کے بعد اس باب میں اولیت کا شرف علامہ ابو الفرج عبدالرحمٰن بن جوزیؒ (۵۹۷ھ) کو حاصل ہے۔ آپ سے اگر کہیں تشدد اور سختی بھی ہوگئی ہے کہ بعض حدیثوں کو بھی موضوعات میں رکھ دیا تو اس کی اصلاح کے لیئے امام سیوطیؒ (۹۱۱ھ) نے تعقبات علی الموضوعات تحریر فرمائی ہے۔ جو لائق مطالعہ ہے۔

(۱) موضوعات ابن جوزی (۵۹۷ھ)

بے شک اس کتاب کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ مگر چونکہ یہ اس فن کی پہلی محنت ہے اس لیئے آپ سے اس میں کئی فرو گذاشتیں ہوئی ہیں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ آپ نے اس باب میں ایک بڑا علمی مواد فراہم کیا ہے۔

حافظ ابن صلاحؒ لکھتے ہیں کہ ابن جوزیؒ حدیث کو موضوع قرار دینے میں بہت جلد باز ثابت ہوئے ہیں۔ آپ نے اس میں بہت سی ضعیف حدیثوں کو بھی موضوع کہہ دیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہ ہونا چاہیئے تھا۔ یہیں تک نہیں۔ بلکہ کچھ حسن اور صحیح حدیثیں بھی آپ نے موضوعات میں شمار کر ڈالیں اور محدثین نے ان پر پھر تعقبات لکھے ہیں۔

(۲) موضوعات حضرت شیخ حسن الصغانی (۶۵۰ھ)

حضرت علامہ حسن صغانی (لاہوری) صاحب مشارق الانوار نقد حدیث میں بہت سخت تھے۔ ان کے سامنے ابن جوزی کی موضوعات نشان راہ تھی۔ آپ نے اپنی طرف سے بھی اس باب میں گرانقدر معلومات مہیا کیئے ہیں۔ بعد کے آنے والے مؤلفین نے اس باب میں آپ کی کتاب سے بہت استفادہ کیا ہے۔

③ موضوعات المصابیح

حضرت شیخ سراج الدین عمر بن علی القزوینی (۸۰۴ھ) کی تصنیف ہے اور بہت نایاب ہے

④ اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ

یہ حضرت علامہ جلال الدین سیوطیؒ (۹۱۱ھ) کی تصنیف ہے۔ آپ نے اس کے علاوہ کتاب الذیل اور کتاب الوجیز بھی اس باب میں تحریر فرمائی ہیں۔ جو قابل مطالعہ ہیں۔

⑤ تذکرۃ الموضوعات اور قانون الموضوعات

تذکرۃ الموضوعات اور قانون الموضوعات کے مصنف حضرت علامہ محمد طاہر فتنی صاحب مجمع البحار (۹۸۶ھ) لغت حدیث کے جلیل القدر امام تھے۔ آپ کی کتابیں تذکرۃ الموضوعات اور قانون الموضوعات جو ۲۲۹ صفحات اور ۸۰ صفحات پر مشتمل ہیں۔ اس باب کی بہت مفید کتابیں ہیں۔

⑥ موضوعات کبیر اور اللآلی المصنوع فی الحدیث الموضوع

موضوعات کبیر محدث جلیل حضرت ملا علی قاری (۱۰۱۴ھ) کی تالیف ہے۔ یہ اس باب میں بہت جامع اور مرکزی کتاب ہے۔ اللآلی المصنوع اس کے بعد کے درجے میں ہے۔

⑦ الفوائد المجموعہ فی الاحادیث الموضوعہ

یہ علامہ شوکانیؒ (۱۲۵۰ھ) کی تالیف ہے۔ اس میں آپ ابن جوزی کی راہ پر چلے ہیں۔ اور بہت سختی کی ہے۔ کئی ضعیف اور حسن حدیثیں بھی موضوع ٹھہرا دی ہیں۔

⑧ الآثار المرفوعہ فی الاحادیث الموضوعہ

یہ حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی (۱۳۰۴ھ) کی تالیف ہے۔

ان تمام کوششوں کے باوجود اہل باطل موضوع حدیثوں کی روایت سے رُکے نہیں وہ اس کی برابر اشاعت کرتے رہتے ہیں۔ اپنے عقائدِ فاسدہ کو استناد مہیا کرنے کے لیئے وہ اپنے حلقوں میں ان کا برابر چرچا کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں اہل باطل کا یہ عمل بھی مذکور ہے۔

والذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ۔ پ۳ آل عمران ع۱

متشابہات کے الفاظ تو پھر بھی صحیح ہوتے ہیں، صرف مرادات میں تشابہ ہوتا ہے۔ اور موضوع روایات کا تو وجود ہی باطل ہے۔ جب متشابہات سے استدلال جائز نہیں ہے تو موضوع روایات سے اپنے مسلک کی گاڑی چلانا یہ کون سا جائز فعل ہوگا۔ ہم یہاں طلبہ کے فائدہ عام کے لیئے چند روایات بھی ذکر کرتے ہیں جن کی کوئی سند نہیں، نہ صحیح، نہ حسن نہ ضعیف ان سے آپ اندازہ کر سکیں گے۔ کہ حدیث کے باب میں کس قدر بے احتیاطی ہماری صفوں میں گھس آئی ہے۔

۱۔ اذا جاءکم الحدیث فاعرضوہ علیٰ کتاب اللہ جب تمہارے پاس کوئی حدیث آئے تو اسے قرآن کریم پر پیش کرو اس کے موافق ہو تو لے لو ورنہ رد کر دو۔

علامہ خطابی (۳۸۸ھ) فرماتے ہیں لا اصل لہ اس کی کوئی اصل نہیں امام یحیی بن معین کہتے ہیں وضعتہ الزنادقۃ[1] اسے زندیقوں نے وضع کیا ہے حضورؐ سے جب کوئی بات ثابت ہو جائے وہ خود سند ہے اور حجت ہے اسے قرآن کریم پر پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے حضورؐ سے قرآن کریم کے خلاف کوئی بات صادر ہو یہ ناممکن ہے

۲۔ علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل بنو اسرائیل میں جو نبی بھی آئے وہ سب غیر تشریعی نبی تھے اور ان کی شریعت تورات تھی (پ۶ المائدہ ع۷) اس روایت میں علماء امت کو ان سے تشبیہ دی گئی ہے یہ تبھی ہو سکتا ہے کہ اس آیت کے علماء میں کوئی غیر تشریعی نبی بھی نہ ہو کیونکہ مشبہ اور مشبہ بہ میں تغائر ضروری ہے۔ اس حدیث کے مضمون میں کلام نہیں لیکن من حیث الثبوت یہ

---

[1] معالم السنن للخطابی جلد ۴ ص ۲۹۹ لا حاجۃ بالحدیث ان یعرض علیٰ کتاب فانہ مہما ثبت عن رسول اللہ کان حجۃ بنفسہ

بے اصل ہے دسویں صدی کے مجدد ملاعلی قاری رح لکھتے ہیں۔

اما حدیث علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل فقد صرح الحفاظ کالزرکشی والعسقلانی والدمیری والسیوطی انہ لا اصل لہ[1]

ملاعلی قاری نے پہلے اس پر امام سیوطی کا سکوت نقل کیا تھا[2] اس پر بہت سے صوفی مزاج علماء اسے نقل کرتے رہے پھر ملاعلی قاری رح کو اس پر امام سیوطی کا بھی انکار مل گیا سو اب اسے کسی عقیدہ کے ثبوت میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ من تکلم بکلام الدنیا فی المسجد احبط اللہ اعمالہ اربعین سنۃ

جس نے مسجد میں دنیا کی کوئی بات کی اللہ اس کے چالیس سال کے اعمال ضائع کر دیتا ہے۔ علامہ صنعانی (۶۵۰ھ) فرماتے ہیں یہ موضوع ہے ملاعلی قاری فرماتے ہیں وھوکذلک لانہ باطل مبنیً و معنیً[3]

۴۔ حدیث لا نبی بعدی۔ کتنی مشہور متواتر اور واضح المعنی ہے مگر محمد بن سعید شامی کے لیے حضرت انس بن مالک کی روایت بنا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر یہ حدیث وضع کر دی۔

انا خاتم النبیین لا نبی بعدی الا ان یشاء اللہ میں آخری نبی ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں مگر یہ کہ جو اللہ چاہے۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رح لکھتے ہیں

فوضع ھذا الاستثناء لما کان یدعو الیہ من الالحاد والزندقۃ و یدعی النبوۃ[4]

۵۔ لو کان موسی وعیسی حیین ما وسعھما الا اتباعی حدیث میں صرف موسیٰ کا نام تھا (اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو انہیں بھی میری پیروی سے چارہ نہ ہوتا) حضرت عیسیٰ کو وفات شدہ ثابت کرنے کے لیے یہ نام بھی ساتھ بڑھا دیا گیا۔ شیخ الاسلام علامہ عثمانی لکھتے ہیں

اس کی اسناد کا کتب حدیث میں کہیں پتہ نہیں[5]

۶۔ سبائی کہتے ہیں حضور نے صحابہ کی موجودگی میں حضرت علی رض کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا تھا۔

---

[1] مرقات شرح مشکوٰۃ طبع قدیم جلد ۵ صہ ۵۶۴ مصر۔ [2] موضوعات کبیر صہ ۴۸ مطبوع دہلی
[3] ایضاً صہ ۶۹ [4] فتح الملہم جلد ۱ صہ ۶۵ [5] فوائد القرآن پ ۱۶ سورہ مریم صہ ۳۹۸

هٰذا وصیی واخی والخلیفة من بعدی فاسمعوا له واطیعوه

ملا علی قاری رح اس کے بارے میں صرف اس پر اکتفا کرتے ہیں فلعنة اللہ علی الکاذبین[1]
حافظ ابن کثیر (۷۷۴ھ) وانذر عشیرتک الاقربین کے تحت لکھتے ہیں[2] :۔
یہ روایت کہ اس آیت کے نازل ہونے پر حضور ؐ نے حضرت علی کی گردن پر ہاتھ رکھا اور فرمایا
یہ میرا بھائی ہے اسکی سنو اور اسکی اطاعت کرو اسمیں عبدالغفار بن قاسم کذاب تنہا ہے علی بن المدینی نے اسے وضع
حدیث سے متہم قرار دیا ہے ۔ متروک کذاب شیعی اتھمہ علی بن المدینی وغیرہ بوضع الحدیث ۔
۷ ۔ موتوا قبل ان تموتوا ۔ کتنی مشہور روایت ہے ملا علی قاری حافظ ابن حجر عسقلانی سے
نقل کرتے ہیں کہ یہ حدیث کہیں ثابت نہیں[3]
۸ ۔ حسن پرستوں نے اپنے ذوق کو تسکین دینے کے لیے یہ حدیث گھڑلی ہے ۔
النظر الی الوجہ الجمیل عبادۃ خوبصورت چہروں کو دیکھنا عبارت ہے ۔
حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں ھٰذا کذب باطل علی رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام
لم یروہ احد باسناد صحیح بل ھو من الموضوعات[4]
۹ ۔ فرض نمازوں کے بعد جو دعا مانگتے ہیں اسمیں یہ الفاظ والیک یرجع السلام حیّنا ربنا بالسلام
حدیث میں اضافہ کیے گئے ہیں معلوم نہیں کس نے یہ جملے حدیث میں ڈال دیئے ہیں ملا علی قاری لکھتے
ہیں فلا اصل لہ[5] اس حدیث کی کوئی اصل نہیں ۔ حدیث اپنی جگہ موجود ہو اور کچھ الفاظ
زیادہ کر دیئے جائیں یہ روایت ان کی مثال ہے بعض علماء نے الفاظ تبدیل کر رکھے ہیں حدیث میں
تھا اتقوا فراسة المومن فانہ ینظر بنور اللہ[6] انہوں نے بدل کر من نور اللہ بنا دیا[7]
حضور ؐ کی خدمت میں ایک شخص پیتل کی انگوٹھی پہنے حاضر ہوا آپ نے اسے کہا :۔
مالی اجد منک ریح الاصنام[8] میں تجھ میں بتوں کی ہوا کیا محسوس کر رہا ہوں اسے یوں بدلا ۔

---

[1] موضوعات کبیر صہ ۹ ۔ [2] تفسیر ابن کثیر جلد ۳ صہ ۳۵۰ وکذلک صرح المدراسی فی کشف الاحوال میزان الاعتدال جلد ۳ صہ ۱۳۵ [3] موضوعات صہ ۵ ، [4] ایضاً صہ ، [5] ایضاً صہ ۸۹
[6] جامع صغیر جلد ۱ صہ ۹ [7] ملفوظات ۱ صہ ۱۰۸ [8] سنن ابی داؤد جلد ۲ صہ ۲۴

مالی اری فی یدک حلیۃ الاصنام[1] تیرے ہاتھ میں بتوں کا زیور کیوں دیکھ رہا ہوں
اگر کوئی شخص کھانا شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو کھانے کے دوران بسم اللہ
فی اولہ وآخرہ پڑھ لے ان صاحب نے یہاں بھی لفظ فی کو علی سے بدل دیا۔ حالانکہ حدیث میں
یہ الفاظ نہ تھے۔ انہوں نے اُسے یوں بنا دیا۔ بسم اللہ علی اولہ وآخرہ[2] (استغفر اللہ)

وضع حدیث کا کام صدیوں سے رکا ہوا تھا مرزا غلام احمد نے پھر سے اسے زندہ کیا اور لکھا:۔
احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ مسیح موعود صدی کے سر پر آئے گا اور وہ چودھویں صدی کا مجدد ہوگا[3]
اس شخص سے منحرف مت جاؤ جس کا آنا اس صدی پر صدی کے مناسب حال ضروری تھا اور
جسکی ابتداء سے نبی کریم ﷺ نے خبر دی تھی[4]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندگی بھر چودھویں صدی کا لفظ اپنی زبان پر نہیں لائے نہ کبھی کہا کہ
قیامت چودھویں صدی کے ختم پر آئے گی مرزا غلام احمد نے خود ہی یہ بات تجویز کی اور خود ہی
اس کی علامات پورا کرنے کے لیے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کر دیا اور چودھویں صدی کی روایات گھڑی
اور اسے حضور اکرم ﷺ کے ذمہ لگا دیا اور پھر یہ روایات بھی گھڑی کہ مسیح موعود تمہارا امام تمہی میں سے ہوگا۔

بل ھو امامکم منکم ازالہ اوہام حصہ اصہ ۲۳۔

بل ھو کے الفاظ کتب حدیث میں کہیں نہیں ہیں مرزا غلام نے یہ خود گھڑے ہیں معلوم ہوا اہل
باطل وضع احادیث کا سلسلہ اب تک جاری ہے حدیث کے اصل الفاظ یہ تھے

کیف انتم اذا نزل ابن مریم فیکم وامامکم منکم[5]

(ترجمہ) تمہارا کیا حال ہوگا جب ابن مریم تم میں اتریں گے اور اس وقت تمہارا امام تم میں سے ہوگا

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حدیثیں وضع کرنے والے اعتراض کے تحت حدیثیں گھڑتے تھے۔ اور
باطل فرقوں کا یہ عام طریقہ رہا ہے۔

---

[1] ملفوظات ۳ صہ ۲ [2] ملفوظات ۲ صہ ۹۵۔
[3] ضمیمہ براھین احمدیہ حصہ پنجم صہ ۱۸۸ [4] واقع الوساوس صہ ۲۵۲۔ [5] صحیح مسلم جلد ۱ صہ ۸

متونِ حدیث

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ امابعد :-

متن عربی میں پشت Bone of contention کو کہتے ہیں متون اس کی جمع ہے۔
پشت پر بدن کا جملہ وزن آتا ہے اور یہی حصہ اس کا پوری طرح متحمل ہوتا ہے۔ حدیث کے جملہ اصول وفروع اور قواعد وکلیات بھی متن حدیث کے گرد ہی گھومتے ہیں۔ راویوں کی سند متن تک پہنچتی ہے۔ شروح اسی متن کو کھولتی ہیں اور ترجمے اسی کو دوسری زبان کا لباس پہناتے ہیں۔ جو کتابیں متونِ حدیث کو اپنے دامن میں لیئے ہوئے ہیں۔ آج کا موضوع ان کا تعارف ہے۔ ان میں وہ کتابیں بھی ہوں گی۔ جو متن کو سند کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ جیسے صحیح البخاری اور صحیح مسلم اور وہ بھی ہوں گی جو متن لاکر اس کی تخریج کر دیتی ہیں۔ جیسے مشکوٰۃ وغیرہ۔ ضرورت کے پیشِ نظر چند اُن کتابوں کا ذکر بھی ہو گا۔ جو راویوں کے حالات بتائیں اور آخر میں چند ان کتابوں کا ذکر بھی کیا جائے گا۔ جو مستقلاً بے سند اور موضوع روایات پر لکھی گئیں ——— جہاں تک اصل کتابوں کا تعلق ہے ان میں بھی اس سے بحث نہیں ہو گی۔ کہ یہ کب لکھی گئیں اور اس فن کی تدوین کیسے ہوئی ؟ یہ مباحث کچھ تاریخ حدیث میں اور کچھ تدوینِ حدیث میں آپ سُن چکے ہیں۔ اس وقت صرف یہ بتلانا ہے کہ ان دنوں متونِ حدیث کی کون کون سی کتابیں علماء اور طلبہ میں متداول ہیں، چھپی ہیں اور مل سکتی ہیں ——— اس فن کی جملہ مطبوعہ کتابوں کا احاطہ کرنا مقصود نہیں اس بات کے متلاشی حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی کتاب بستان المحدثین یا جرمن مستشرق بروکلمن کی کتاب کی مراجعت فرمائیں۔

صحیفہ حضرت ہمام بن منبہؒ (۱۱۰ھ)

حدیث کی قدیم ترین کتاب جو اس وقت ہماری رسائی میں ہے صحیفہ ہمام بن منبہ ہے۔ ہمام بن منبہؒ حافظ الامت سیدنا حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد تھے۔ صحیفہ ہمام بن منبہ (۱۱۰ھ) میں ۱۳۸ حدیثیں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھی ہیں ـــــــــ یہ نہ سمجھا جائے کہ حضرت ہمامؒ کو کل ۱۳۸ احادیث ہی یاد تھیں ـــــــــ نہیں آپ نے اور اساتذہ سے بھی بہت روایات سنیں۔ ان دوسرے اساتذہ سے سنی روایات اس میں شامل نہیں نہ حضرت ابوہریرہؓ سے سنی کل روایات کا اس میں احاطہ ہے۔ حضرت ہمامؒ نے جب یہ صحیفہ مرتب کیا۔ ان دنوں فن تدوین اپنی بالکل ابتدائی منزل میں تھا۔ یہ مجموعے محض یادداشت کے طور پر لکھے گئے تھے ـــــــــ صحیفہ ابن ہمام ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے تحقیقی کام کے ساتھ حیدرآباد دکن سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا ہے۔ مولانا حبیب اللہ صاحب حیدرآبادی نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے جو شائع ہو چکا ہے۔ تیرہ صدیوں تک یہ کتاب مخطوطات میں ہی رہی۔ اس سے بہت پہلے مسند امام احمد مصر میں چھپ چکی تھی۔ اس میں مرویات ابی ہریرۃؓ ایک مستقل مسند ہے۔ مسند امام احمد کی جلد دوم میں صحیفہ ہمام بن منبہ کی کل احادیث مرویات ابی ہریرۃؓ میں موجود ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قدماء نے حدیث کس احتیاط سے جمع کی۔ کہ تیرہ صدیوں بعد آنے والا مجموعہ صدیوں بعد شائع ہونے والی کتابوں سے ہو بہو اور حرف بحرف مطابق نکلا۔ اس وقت متن حدیث کی قدیم ترین کتاب جسے ہم دیکھ سکتے ہیں یہی ہے۔

حدیث کی دس پہلی کتابیں

پہلے ان دس کتابوں سے تعارف کیجئے جو صحاح ستہ کے وجود میں آنے سے پہلے لکھی جا چکی تھیں اور علماء متقدمین و متاخرین ان کے حوالوں سے ردًا یا قبولاً بحث کرتے آئے ہیں اور ان کی اصلیت authenticity کسی دور میں مخدوش نہیں سمجھی گئی۔

(۱) مسند امام ابی حنیفہؒ (۱۵۰ھ)

امام اعظم ابو حنیفہؒ کا موضوع زیادہ تر فقہ تھا حدیث نہیں۔ تاہم آپ ضمناً احادیث بھی روایت کرتے جاتے تھے۔ جنہیں آپ کے شاگرد آپ سے روایت کر دیتے تھے۔ مختلف علمائے نے آپ سے روایت شدہ احادیث کو جمع کیا ہے۔ علامہ خوارزمی (۶۶۵ھ) نے انکے پندرہ جمع شدہ مجموعے مسانید ابی حنیفہ کے نام سے مرتب کیے ہیں۔ ان مجموعوں کو امام صاحب سے براہِ راست نقل کرنے والے امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ امام صاحبؒ کے صاحبزادے حمادؒ اور امام حسن بن زیادؒ ہیں۔ ان میں سب سے بہتر مجموعہ محدث جلیل موسیٰ بن زکریا حصنفکی کا ہے۔ اسے ہی مسند ابی حنیفہ کہا جاتا ہے۔ یہ کتاب مصر، ہندوستان اور پاکستان میں بارہا چھپ چکی ہے۔

محدث کبیر ملا علی قاریؒ نے سند الانام فی شرح الامام کے نام سے اس کی شرح لکھی جو ۱۸۸۹ء میں مطبع محمدی لاہور نے شائع کی تھی۔ یہ کتاب مولانا محمد حسن سنبھلی کے حاشیہ کے ساتھ اصح المطابع لکھنؤ سے ۱۳۰۹ھ میں شائع ہوئی۔

(۲) مؤطا امام مالکؒ (۱۷۹ھ)

مؤطا لفظ توطیہ سے ہے۔ توطیہ کے معنی روندنے، تیار کرنے اور آسان کرنے کے ہیں۔ امام مالکؒ نے اسے مرتب کرکے ستر فقہاء کے سامنے پیش کیا۔ سب نے اس سے اتفاق کیا۔ اسی وجہ سے اس اتفاق شدہ مجموعہ کو مؤطا کہا گیا۔ امام مالکؒ نے اسے فقہاء کے سامنے کیوں پیش کیا؟ محدثین کے سامنے کیوں نہیں؟ ملحوظ رہے کہ ان دنوں فقہاء ہی حدیث کے اصل امین سمجھے جاتے تھے اور یہی لوگ مرادات حدیث کو زیادہ جاننے والے مانے جاتے تھے۔

امام مالکؒ کا موضوع چونکہ زیادہ تر فقہ تھا۔ اس لیے آپ نے اس میں سند کے اتصال کی بجائے تعامل امت کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ آپ اس میں اقوال صحابہؓ اور تابعینؒ بھی لے آئے ہیں۔ آپ کے ہاں سنت وہی ہے۔ جس پر امت میں تسلسل سے عمل ہوتا آیا ہو۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں:۔

مزجه بأقوال الصحابة وفتاوى التابعين ومن بعدهم۔[۱]

ترجمہ: آپ نے صحابہ کے اقوال اور تابعین اور انکے بعد کے لوگوں کے فتاوے اس میں شامل کیے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اسے فقہ کی کتاب شمار کرتے ہیں[۲] جہاں تک اس کی اسانید کا تعلق ہے۔ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

لیس فیه مرسل ولا منقطع الا وقد اتصل السند به من طرق اخرىٰ[۳]

ترجمہ: اس میں کوئی مرسل اور منقطع روایت ایسی نہیں جو دوسرے طرق سے متصل نہ ہو چکی ہو۔

موطا امام مالک میں ۸۲۲ روایات مرفوع ہیں۔ جو حضورؐ تک پہنچتی ہیں۔ ان میں سے بھی ۲۴۴ مرسل ہیں، جو تابعینؒ کی روایت سے حضورؐ تک پہنچی ہیں۔ انہیں محدثین کی اصطلاح میں مرسل کہتے ہیں۔ اس دور میں مرسل احادیث لائق قبول سمجھی جاتی تھیں۔ جب تک جھوٹ اور فتنوں کا دور شروع نہیں ہوا۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ جیسے اکابر مرسل روایات کو بلا تردد قبول کرتے رہے۔

امام مالکؒ سے موطا کے سولہ نسخے آگے چلے۔ جن میں صحیح ترین نسخہ امام یحییٰ بن یحییٰ مصموری الاندلسی کا ہے۔ موطا مالک ان دنوں اسے ہی کہتے ہیں۔ بڑے بڑے متبحر علماء نے اس کی شروح اور حواشی لکھے ہیں۔ ان کا کچھ ذکر آپ کو شروح حدیث کے ذیل میں ملے گا۔ حضرت امام شافعیؒ نے لکھا ہے:۔

ما على ظهر الارض كتاب بعد كتاب الله اصح من كتاب مالك۔[۴]

ترجمہ: تختہ زمین پر کوئی کتاب قرآن کریم کے بعد موطا سے زیادہ صحیح نہیں۔

یہ اس وقت کی بات ہے۔ جب صحیح بخاری اور صحیح مسلم وجود میں نہ آئی تھیں اور صحت سند کے لحاظ سے موطا مالک اپنی مثال آپ تھی۔ اس کی کوئی روایت جرح راوی کی وجہ سے ضعیف نہیں۔ امام مالک سے ایک ہزار کے قریب علماء نے موطا لکھی۔[۵]

---

[۱] مقدمہ فتح الباری ص۶ [۲] مسوی عربی شرح موطا ص۲ [۳] حجۃ اللہ البالغہ ص۱۳۳ جلد اول
[۴] تزئین الممالک ص۳۷ [۵] بستان المحدثین اردو ترجمہ ص۲۲ طبع کراچی۔

(۳) کتاب الآثار امام ابو یوسفؒ (۱۸۲ھ)

گو آپ حدیث کے امام تھے، مگر آپ کا موضوع بھی فقہ تھا۔ آپ نے احادیث بھی بہت روایت کی ہیں۔ زیادہ روایات امام ابو حنیفہؒ سے لیتے ہیں۔ کتاب الآثار فقہی طرز میں آپ کی روایات کا ایک مجموعہ ہے۔ امام یحییٰ بن معینؒ (۲۳۳ھ) لکھتے ہیں:-

کان ابو یوسف القاضی یمیل الی اصحاب الحدیث وکتبت عنہ[1]

ترجمہ۔ امام ابو یوسف محدثین کی طرف زیادہ مائل تھے اور آپکی روایات لکھی جاتی تھیں۔

امام ابو یوسفؒ کی اس کتاب کو مطبع احیاء المعارف النعمانیہ نے ۱۳۵۵ھ میں شائع کیا ہے۔

(۴) کتاب الآثار امام محمدؒ (۱۸۹ھ)

مصر اور ہندوستان میں بارہا چھپ چکی ہے۔ اس کی متعدد شرحیں بھی لکھی گئیں جن میں سے بہترین شرح مفتی دار العلوم دیوبند مفتی مہدی حسن صاحب کی ہے جو تین جلدوں میں ہے۔

کتاب الآثار امام محمد کا عربی متن پہلے مطبع اسلامیہ نے ۱۳۲۹ھ میں شائع کیا تھا۔

(۵) موطا امام محمدؒ (۱۸۹ھ)

امام محمدؒ نے امام ابو حنیفہؒ کی وفات کے بعد حضرت امام مالکؒ سے موطا سُنی۔ اور پھر آپ نے خود ایک موطا ترتیب دی۔ جس میں زیادہ روایات امام مالکؒ سے لی ہیں۔ موطا امام محمدؒ بھی درسی کتاب ہے۔ ہندوستان، پاکستان، ترکی اور افغانستان کے مدارس حدیث میں پڑھائی جاتی ہے اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ اس میں مرویات آپ کی ہیں۔ مگر تبویب آپ کے شاگردوں میں سے کسی نے کی ہے۔ ھکذا سمعت من بعض الثقات۔

---

[1] کتاب التاریخ لیحییٰ بن معین جلد ۲ صفحہ ۶۸۰ طبع ۱۳۹۹ھ مکۃ المکرمہ

(۶) مسند امام شافعیؒ (۲۰۴ھ)

آپ کا زیادہ تر موضوع فقہ تھا۔ مگر آپ اس کے ضمن میں احادیث بھی روایت کرتے تھے۔ آپ کے دور میں فتنے بہت اُبھر آئے تھے اور جھوٹ عام ہو چکا تھا۔ اس لیئے آپ نے راویوں کی جانچ پڑتال پر بہت زور دیا اور تعامل امت کی نسبت صحت سند کو اپنا مآخذ بنایا۔ آپ نے یہ مسند خود ترتیب نہیں دی۔ اس کے مرتب ابو العباس محمد بن یعقوب الاصم (۳۴۶ھ) ہیں۔ یہ مسند امام شافعیؒ سے امام مزنیؒ نے اور امام مزنیؒ سے امام طحاویؒ (۳۲۱ھ) نے بھی روایت کی ہے۔ اس کی بھی کئی شروح لکھی گئیں جن میں مجد الدین ابن اثیر الجزریؒ (۶۰۶ھ) اور امام سیوطیؒ کی شرحیں زیادہ معروف ہیں۔

(۷) المصنف لعبد الرزاق بن ہمام (۲۱۱ھ)

عبدالرزاقؒ امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد تھے۔ المصنف گیارہ جلدوں میں بیروت سے شائع ہوئی ہے۔ حاشیہ پر تحقیقی کام دیوبند کے مشہور محدث مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے کیا ہے۔ پہلے دور کی کتابوں کی طرح اس میں صحابہؓ اور تابعینؒ کے فتاوے بھی بہت ہیں اور مؤلف متصل و مرسل ہر طرح کی روایات لے آئے ہیں۔ ان دنوں محدثین تعامل امت پر فکری نظر رکھتے تھے۔

(۸) مسند ابی داؤد الطیالسی (۲۰۴ھ)

دائرہ المعارف حیدرآباد دکن نے ۱۳۲۱ھ میں اسے شائع کیا ہے۔ مسند کی ترتیب پر ہے۔ صحابہؓ کی مرویات علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اب ابواب فقہ کی ترتیب سے بھی چھپ گئی ہے۔ اس میں بعض ایسی احادیث ہیں۔ جو اور کتابوں میں نہیں ملتیں۔ اس پہلو سے یہ کتاب بہت اہمیت کی حامل ہے۔

(۹) المصنف لابن ابی شیبۃ (۲۳۵ھ)

پورا نام الکتاب المصنف فی الاحادیث والآثار ہے۔ مؤلف امام حافظ ابوبکر عبداللہ بن

محمد بن ابراہیم بن عثمان ابوشیبہ ہیں۔ مولانا عبدالخالق افغانی رئیس مجلس علمی بدائرۃ المعارف العثمانیہ کے تحقیقی کام کے ساتھ تیسری جلد تک چھپ چکی ہے۔ تیسری جلد کتاب الجنائز پر مکمل ہوئی۔ اور ۱۳۳۸ھ میں چھپی ـــــ پھر یہ سلسلہ رک گیا۔ اب نئے سرے سے حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی کے تحقیقی حاشیہ کے ساتھ کاملاً چھپ رہی ہے۔ اس کا اہتمام فضیلۃ الشیخ حضرت مولانا عبدالحفیظ صاحب خلیفہ مجاز حضرت الشیخ مولانا محمد زکریا محدث سہارنپوری کر رہے ہیں۔

(۱۰) مسند امام احمد بن حنبل الشیبانی (۲۴۱ھ)

مسند احمد کی موجودہ ترتیب آپ کے صاحبزادے عبداللہ کی ہے۔ قاضی شوکانی لکھتے ہیں۔ امام احمد نے جس روایت پر سکوت اختیار کیا ہے اور اس پر جرح نہیں کی وہ لائق احتجاج ہے[۱]۔ اس سے اس مسند کی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ مسند احمد کی شرط روایت ابوداؤد کی ان شرائط سے قوی ہے۔ جو انہوں نے اپنی سنن اختیار کی ہیں۔ امام ابوداؤدؒ (۲۷۵ھ) لکھتے ہیں:۔

وما لم اذکر فیہ شیاً فھو صالح وبعضھا اصح من بعض[۲]

ترجمہ۔ اور جس راوی کے بارے میں میں نے کچھ نہیں لکھا۔ وہ اس لائق ہے کہ اس سے حجت پکڑی جائے۔

علامہ ابن الجوزی اور حافظ عراقی نے مسند احمد کی ۳۸ روایات کو موضوع قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان میں ۹ روایات کا پورا دفاع کیا ہے اور اس پر ایک مستقل کتاب[۳] لکھی ہے۔ جو حیدرآباد دکن سے شائع ہو چکی ہے۔ چودہ روایات کا جواب حافظ جلال الدین سیوطی نے الذیل الممھد میں دیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے مسند امام احمد کو طبقہ ثانیہ کی کتابوں میں جگہ دی ہے۔ حافظ سراج الدین عمر بن علی ابن الملقن (۸۰۴ھ) نے مسند احمد کا ایک اختصار بھی کیا ہے اور علامہ ابوالحسن سندھی (۱۱۳۹ھ) نے مسند احمد کی ایک شرح بھی لکھی ہے۔ شیخ احمد بن عبدالرحمن البناء نے اسے فقہی ابواب پر مرتب کیا اور شیخ احمد شاکر نے اس پر تحقیقی کام کیا ہے۔ اس کا نام الفتح الربانی من مسند احمد بن حنبل شیبانی ہے۔ یہ ۲۲ جلدوں میں ہے۔ ۱۳۵۳ھ میں پہلی جلد شائع

---

[۱] نیل الاوطار جلد ۱ صفحہ ۱۳ [۲] مقدمہ سنن ابی داؤد ص ۶ [۳] القول المسدد فی الذب عن مسند احمد اس کا نام ہے۔

ہوئی ۱۳۱۷ھ میں آخری جلد مطبع غوریہ مصر سے شائع ہوئی۔

پہلے دور کے یہ دس نمونے مختلف قسموں پر جمع ہوئے ہیں۔ اس دور کی اور بھی بہت کتابیں تھیں۔ جو اس وقت ہماری رسائی میں نہیں۔ لیکن ان کے حوالے شروح حدیث میں عام ملتے ہیں۔ اور ان کے مخطوطات بھی کہیں کہیں موجود ہیں۔ ان کے تعارف کا عملاً کوئی فائدہ نہیں۔ صرف چند نام سُن لیجئے۔

سنن مکحول الدمشقی (۱۱۶ھ) سنن ابن جریج المکی (۱۵۰ھ) جامع معمر بن راشد (۱۵۳ھ) جامع سفیان الثوری (۱۶۱ھ) مسند احمد بن عمرو البزار (۱۶۷ھ) مسند وکیع بن الجراح (۱۹۷ھ) مسند ابن الجارود الطیالسی (۲۰۴ھ) مسند الفریابی (۲۱۲ھ) مسند ابی عبید قاسم بن سلام (۲۲۴ھ) مسند ابن المدینی (۲۳۴ھ) مسند اسحٰق بن راہویہ (۲۳۸ھ)۔ خدا کرے یہ مجموعے بھی شائع ہو جائیں ان سے باب حدیث میں نئی تحقیقات کا اضافہ ہوگا۔

یہ صحیح ہے کہ اس دور کے آخر میں تالیف حدیث اپنے فنی کمال کو پہنچ گئی اور محدثین نے وہ گراں قدر مجموعے مرتب کیے کہ خود فن ان پر ناز کرنے لگا۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم اسی دور آخر کی تالیفات ہیں۔

صحاح ستہ کا دورِ تدوین و تالیف

مسلمانوں میں حدیث کی چھ کتابیں انتہائی معتمد سمجھی گئی ہیں۔ انہیں صحاح ستہ کہتے ہیں۔ ان میں پہلی دو کتابیں تو کل کی کل صحیحین ہیں۔ اور دوسری چار کتابیں سنن کہلاتی ہیں۔ یہ سنن اربعہ بیشتر صحیح روایات پر مشتمل ہیں۔ فن حدیث میں یہ چھ کتابیں انتہائی لائق اعتماد سمجھی جاتی ہیں۔ مشہور مستشرق نکلسن انہیں اسلام کی canonical books لکھتا ہے۔ مسلم طلبہ کے لیئے ان چھ کتابوں کا تفصیلی تعارف ضروری ہے۔ یہ کتابیں تدوین حدیث کے دوسرے دور سے تعلق رکھتی ہیں۔

① صحیح البخاری

امام محمد بن اسماعیلؒ (۲۵۶ھ) کی اس کتاب کا پورا نام الجامع الصحیح المسند من حدیث رسول اللہ

دسننہ وایامہ ہے۔ اس نام میں مسند اپنے اصطلاحی معنوں میں نہیں۔ اسے الجامع الصحیح بھی کہتے ہیں۔ کیوں کہ فنِ حدیث کے آٹھوں ابواب (کتاب) اس میں جمع ہیں۔ امام بخاری نے صحتِ سند، فقہ حدیث اور تحریر تراجم میں حدیث کا وہ عدیم النظیر مجموعہ تیار کیا ہے کہ اسے بجا طور پر اسلام کا اعجاز سمجھنا چاہیئے۔ اہلِ فن اسے اصح الکتاب بعد کتاب اللہ قرار دیتے ہیں۔

امام بخاریؒ تقطیع حدیث (حدیث کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے اس کے اجزاء کو علیحدہ علیحدہ روایت کرنا) کے قائل تھے۔ وہ حدیث کے مختلف اجزاء کو مختلف ابواب میں لاتے ہیں۔ امام صاحب کا ترجمۃ الباب Chapter heading امام صاحب کا فقہی نظریہ ہوتا ہے۔ جو ان کے خیال میں اس حدیث میں لپٹا ہوتا ہے۔ جملہ فقہ البخاری فی تراجمہ علمائے حدیث میں بہت معروف ہے۔ ان فقہی تراجم کے باعث امام صاحب کو بعض روایات بار بار بھی روایت کرنی پڑی ہیں۔ صحیح بخاری کی کل مرویات ۷۲۷۵ ہیں۔ مکررات کو حذف کر کے چار ہزار کے قریب رہ جاتی ہیں۔ پھر ساری روایات مرفوع (جو حضورؐ تک پہنچتی ہوں) نہیں ہیں۔ موقوف روایات (صحابہ کی روایات) اور تابعین کبار کے بہت سے اقوال بھی اس میں ملتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام بخاریؒ حدیثِ رسول کے بعد اپنے آپ کو آزاد نہیں سمجھتے۔ بلکہ ان کی فکر انہیں اسلاف کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ وہ صحابہؓ اور تابعینؒ سے مستغنی رہ کر نہ چلتے تھے۔ صحابہؓ اور دیگر ائمہؒ کی طرف بھی رجوع کرتے ہیں علامہ سید محمد مرتضیٰ الحسینی زبیدی (۱۲۰۵ھ) نے صحیح بخاری کی اسانید اور مکررات حذف کر کے تجرید بخاری مرتب کی۔ یہ تجرید بھی اپنی جگہ بہت متداول ہے۔

(۲) صحیح مسلم

امام مسلم (۲۶۱ھ) نے فنِ حدیث میں صحتِ سند، حسنِ صناعت اور مسلک محدثین کے التزام سے ایسی کتاب ترتیب دی ہے کہ کتب حدیث میں اس کی نظیر نہیں۔ اس پہلو سے یہ صحیح بخاری سے بھی فائق ہے۔ ابواب امام مسلم کے لکھے ہوئے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ حدیث پوری روایت کرتے ہیں۔ جس میں کئی کئی مضامین منطوی ہوتے ہیں۔ آپ امام بخاریؒ کی طرح تقطیع حدیث (حدیث کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنے متعلقہ موضوعات میں لانا) نہیں کرتے۔ صحیح مسلم

کی احادیث مکررات حذف کرنے کے بعد چار ہزار رہ جاتی ہیں. حافظ ابو عوانہ الاسفرائنی (۳۱۶ھ) نے صحیح مسلم پر استخراج کرکے مسند ابی عوانہ مرتب کی ہے. جو صحیح مسلم کی شرطوں پر مزید احادیث ہیں حافظ منذری (۶۵۶ھ) نے تجرید الصحیح کے نام سے اس کی تجرید کی ہے. محمد بن احمد بن محمد الغرناطی (۷۴۱ھ) نے تہذیب الصحیح کے نام سے اس کا ایک اختصار کیا ہے. علمائے حدیث نے صحیح مسلم کی کئی شرحیں لکھی ہیں.

اس دور میں جس کے پیشرو حضرت امام بخاری اور امام مسلم ہوئے اور بھی کئی بلند پایہ اہلِ فن اُٹھے جنہوں نے اپنے گراں قدر مجموعہ ہائے حدیث سے اس فن کو تکمیل بخشی. ان میں یہ تین کتابیں چوٹی کی کتابیں ہیں اور بعض فنی اعتبارات سے ان کی بھی نظیر نہیں ملتی.

① سنن ابی داؤد (۲۷۵ھ) ② جامع ترمذی (۲۷۹ھ) ③ سنن نسائی (۳۰۳ھ)

① سنن ابی داؤد (۲۷۵ھ)

فقہی اعتبار سے بہت بلند پایہ کتاب ہے. ایک مجتہد تہذیب شریعت اور تدوین فقہ میں جن احادیث کا محتاج ہو سکتا ہے وہ سب اس سنن میں موجود ہیں اسے ادق الکتب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے. صحیح بخاری اصح ہونے میں اس سے اول ہے. مگر ادق ہونے میں اس کا نام آگے ہے. حافظ منذری نے اس کی بھی تلخیص کی ہے. کتبِ حدیث میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے جس کی شرح سب سے پہلے لکھی گئی. حافظ احمد بن محمد امام ابو سلیمان الخطابی (۳۸۸ھ) نے معالم السنن کے نام سے اس کی شرح لکھی جو بارہا چھپ چکی ہے.

امام ابو داؤد کی کتاب مراسیل ابی داؤد مرسلات پر پہلا مرتب مجموعہ ہے بعض اہل مطابع نے اسے سنن کے آخر میں شامل کر دیا ہے. امام ابو داؤد حنبلی المسلک تھے. امام احمد کی طرح احادیث صحابہ کو بہت اہمیت دیتے تھے اور مرفوع احادیث کے اختلاف میں عمل صحابہ کو حجیت سمجھتے تھے. امام ابو حنیفہ کو بھی امام تسلیم کرتے تھے. حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

قال ابو داؤد رحمہ اللہ ان ابا حنیفۃ کان اماماً[1]. ابو داؤد نے کہا. بے شک ابو حنیفہ امام تھے.

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ صفحہ ۱۶۰

سنن ابی داؤد کی مرویات ساڑھے چار ہزار کے قریب ہیں۔

(۲) جامع ترمذی (۲۷۹ھ)

اس کتاب کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ امام ترمذی ہر حدیث کے آخر میں اس کی سند کے بارے میں صحیح، حسن یا ضعیف ہونے کا حکم لگاتے ہیں اور طلبہ حدیث کو مدارج حدیث معلوم کرنے میں اس سے بہت مدد ملتی ہے۔ پھر آپ آخر ابواب میں مذاہب فقہاء بھی بیان کرتے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان دنوں فہم حدیث میں مذاہب فقہاء کو کس درجہ اہمیت حاصل تھی اور محدثین بیان حدیث میں فقہاء کی آراء بیان کرنے میں کوئی عار نہ سمجھتے تھے۔

آپ اس کتاب میں ہر مسلک کی روایات کو لاتے ہیں۔ اس سے شریعت کی وسعتِ نظر اور سنن کی وسعتِ عمل کا پورا نقشہ پوری حکمت سے کھچا نظر آتا ہے۔ آپ نے اس میں امام بخاری کی طرح جمیع ابوابِ حدیث کو روایت کیا ہے۔ اسی لیے سنن ترمذی کو جامع ترمذی کہا جاتا ہے ورنہ اپنی نوع میں یہ سنن کی طرز پر مرتب ہے۔ امام نجم الدین سلیمان بن عبدالقوی الطوفی (۷۱۰ھ) نے مختصر جامع ترمذی کے نام سے اس کا ایک اختصار کیا ہے۔ جامع ترمذی کی کئی شروح لکھی گئی ہیں۔ جو علماء میں متداول ہیں۔

(۳) سنن نسائی (۳۰۳ھ)

صحت سند میں صحیحین کے بعد اسی کا درجہ ہے۔ سند حدیث کی علل پر امام نسائی کی نظر امام ابوداؤد اور امام ترمذی سے بھی گہری ہے۔ آپ اس باب میں امام ابوزرعہ اور امام بخاری کے طبقہ کے معلوم ہوتے ہیں ــــــ سنن نسائی جو درسوں میں پڑھائی جاتی ہیں اس کا اصل نام المجتبیٰ من سنن النسائی ہے۔ امام نسائی نے سنن نسائی کا یہ خود اختصار کیا ہے۔ امام نسائی کی سنن کبریٰ مخطوطات کی شکل میں کئی کتب خانوں میں موجود ہے۔ بعض علماء دیوبند اس پر تحقیقی کام کر رہے ہیں اس کی اشاعت سے علمِ حدیث میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔ امام نسائی نے المجتبیٰ میں احادیث کی تبویب امام بخاری کی طرز پر کی ہے اور کوشش کی ہے کہ تراجم الابواب میں مضمونِ حدیث کی

طرف پورا اشارہ ہو جائے۔

نواب صدیق حسن خاں صاحب نے آپ کو شافعی المسلک لکھا ہے[1]۔ مگر مولانا انور شاہ صاحب محدث کشمیری آپ کو حنبلی المسلک بتاتے ہیں[2]۔ سنن نسائی پر بھی شرح و حواشی کا بہت کام ہوا ہے اور متونِ حدیث میں اسے بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے ساتھ مل کر یہ تین کتابیں صحاح ستہ کی اصل ہیں۔ موطا امام مالک یا سنن دارمی یا سنن ابن ماجہ کو ساتھ ملا کر انہیں صحاح ستہ کہتے ہیں۔

موطا امام مالک کا ذکر دورِ اوّل کی دس کتابوں میں ہو چکا ہے۔ سنن دارمی ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی سمرقندی (۲۵۵ھ) کی تالیف ہے۔ امام بخاری کے ہمعصر ہیں۔ آپ سے امام مسلم، ابو داؤد اور ترمذی نے بھی روایات لی ہیں۔ سنن دارمی پہلے ہندوستان میں مطبع نظامی کان پور میں ۱۲۹۳ھ میں چھپی۔ اب مصر میں بھی بار ہا چھپ چکی ہے۔ دو جلدوں میں ہے اور اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ سنن ابن ماجہ (۲۷۳ھ) ابو عبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ القزوینی کی تالیف ہے۔ آپ نے امام مالکؒ کے کئی شاگردوں سے حدیث سُنی۔ سنن ابن ماجہ اپنی وُسعت اور جامعیت سے اس لائق ہے کہ اسے صحاح ستہ کی چھٹی کتاب سمجھا جائے۔ علمائے حدیث نے اس پر بھی بہت کام کیا ہے اور اس کے بسیط حواشی لکھے ہیں۔ مولانا عبدالرشید نعمانی کی کتاب ما تمس الیہ الحاجہ لمن یطالع سنن ابن ماجہ اس باب میں ایک نہایت مفید مقدمہ علم حدیث ہے۔

صحاح ستہ کے بعد کے متداول مجموعے

صحاح ستہ کے بعد جن کتابوں کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی اور وہ علماء کو دستیاب ہیں یہ ہیں:-

(۱) شرح معانی الآثار امام طحاوی (۳۲۱ھ)

اپنے طرز کی نہایت عجیب کتاب ہے۔ کتبِ حدیث میں اس کی مثل نہیں درسی کتاب ہے

---

[1] ابجد العلوم صفحہ ۸۱ [2] العرف الشذی ص

دارالعلوم دیوبند میں دورہ حدیث میں پڑھائی جاتی ہے۔ افسوس کہ اس کی طباعت میں بہت کم محنت کی گئی ہے۔ موجودہ مطبوعہ نسخوں میں تقریباً ہر صفحے میں کوئی نہ کوئی غلطی موجود ملتی ہے مظاہر العلوم سہارنپور کے مولانا محمد ایوب صاحب نے اس سلسلہ میں بہت محنت کی ہے اور تصحیح الاغلاط الکتابیہ الواقعہ فی النسخ الطحاویہ دو ضخیم جلدوں میں شائع کی ہے۔ یہ کتاب مکتبہ اشاعت العلوم سہارنپور سے ملتی ہے۔ علامہ عینی جیسے بلند پایہ محدثین نے شرح معانی الآثار کی شروح کئی ضخیم جلدوں میں لکھی ہیں۔

② مشکل الآثار امام طحاوی (۳۲۱ھ)

امام طحاوی نے اس میں مشکل اور ظاہراً متعارض احادیث پر بہت فاضلانہ بحث کی ہے۔ افسوس کہ یہ پوری شائع نہیں ہوئی۔ حیدرآباد دکن سے اس کی چار جلدیں شائع ہوئی ہیں۔ اور یہ پوری کتاب کا تقریباً نصف ہیں۔ امام طحاوی نے اس کا ایک اختصار بھی کیا ہے۔ جسے قاضی جمال الدین یوسف بن موسیٰ نے المعتصر من المختصر من مشکل الآثار کے نام سے مرتب کیا ہے۔ یہ المعتصر ۱۳۱۲ھ میں حیدرآباد دکن سے پہلی مرتبہ شائع ہوئی ہے۔ پھر یہ مصر سے بھی شائع ہو چکی ہے۔

③ المعجم الکبیر للطبرانی (۳۶۰ھ)

حافظ ابوالقاسم سلیمان بن احمد بن ایوب الطبرانی (۳۶۰ھ) نے حدیث کے تین مجموعے قلمبند کیے۔ ان میں سے سب سے بڑا مجموعہ یہ ہے۔ المعجم الصغیر للطبرانی مطبع انصاری دہلی میں ۱۳۱۱ھ میں چھپی تھی۔ المعجم الکبیر کا ایک مخطوطہ کسی زمانہ میں جامعہ عباسیہ بہاولپور کی لائبریری میں موجود تھا۔

④ سنن دارقطنی (۳۸۵ھ)

ابوالحسن علی بن عمر الدارقطنی بغداد کے محلہ دارقطن کے رہنے والے تھے۔ علل احادیث میں اپنے وقت کے امام اور منتہی تھے۔ اسماء الرجال میں کہیں کہیں تعصب کی رَو میں بہہ نکلے ہیں۔ بہت سے علماء نے اس کتاب پر قابلِ قدر حواشی لکھے ہیں۔ کتاب میں بہت سی منکر شاذ ضعیف

اور موضوع روایات موجود ہیں. تاہم کئی پہلوؤں سے کتاب مفید ہے.

⑤ مستدرک حاکم (۴۰۵ھ)

چار ضخیم جلدوں میں حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی ہے. ساتھ ساتھ حافظ شمس الدین الذہبی (ھ) کی کتاب تلخیص المستدرک بھی ہے. حافظ ذہبی اسانید پر ساتھ ساتھ کلام کرتے جاتے ہیں حاکم نے اپنے زعم میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم پر اسی کتاب میں استدراک کیا ہے. اسی لیئے اسے مستدرک علی الصحیحین کہتے ہیں.

⑥ سنن کبریٰ للبیہقی (۴۵۸ھ)

ابوبکر احمد بن الحسین البیہقی کی کتاب سنن کبرلے دس ضخیم جلدوں میں حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی ہے. ساتھ ساتھ علامہ علاؤ الدین المارديني الترکمانی الحنفی کی کتاب الجوہر النقی فی الرد علی البیہقی بھی ہے. اس میں علامہ ترکمانی حنفیہ کی طرف سے امام بیہقی کو ساتھ ساتھ جواب دیتے جاتے ہیں امام پایہ بلند پایہ شافعی المذہب فقیہہ تھے.

⑦ معرفة السنن والآثار للبیہقی (۴۵۸ھ)

دو جلدوں میں مصر سے شائع ہوئی ہے. اپنے طرز کی نادر کتاب ہے. امام بیہقی نے اس میں کہیں کہیں امام طحاوی کے طرز پر چلنے کی کوشش کی ہے. لیکن اس میں وہ کامیاب نہیں ہوسکے ویسے یہ ایک بلند پایہ کتاب ہے. امام بیہقی کی شعب الایمان جس سے صاحب مشکوٰۃ نے روایات لی ہیں. اس کے علاوہ ہے.

⑧ کتاب التمہید لابن عبد البر المالکی (۴۶۳ھ)

امام ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں اور الاستیعاب میں اپنی سند سے بہت روایات کی ہیں. لیکن کتاب التمہید لما فی الموطا من المعانی والاسانید اپنے موضوع میں نہایت فاضلانہ

مجموعہ حدیث ہے۔ مراکش کے محکمہ شئوون اسلامی نے اسے تحقیقی کام کے ساتھ بیس جلدوں میں شائع کیا ہے۔ امام ابن عبدالبر نے تجرید التمہید کے نام سے اس کی ایک تلخیص کی ہے۔ جو دو جلدوں میں چھپ چکی ہے

⑨ نوادر الاصول فی معرفۃ اقوال الرسول

یہ ابوعبداللہ محمد الحکیم الترمذی (ھ) کی تالیف ہے۔ جو حاشیہ مرقات الوصول کے ساتھ بیروت سے شائع ہوئی ہے۔ حکیم ترمذی اپنے وقت کے قطب تھے۔
(فتوحات مکیہ جلد ۱ صہ ۱۸۴)

⑩ حلیۃ الاولیاء لابی نعیم الاصفہانی (۴۳۰ ھ) خطیب تبریزی اکمال میں لکھتے ہیں:

ھو من مشائخ الحدیث الثقات المعمول بحدیثھم المرجوع الی قولھم کبیرا لقدر

(ترجمہ) ثقہ مشائخ حدیث میں سے ہیں۔ جن کی روایت اور ان کے قول کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

نوٹ: ان کتابوں کے علاوہ اس دور کی کچھ اور کتابیں بھی ہیں جن کا شمار معتبر کتابوں میں ہوتا ہے۔ یہ چونکہ زیادہ متداول نہیں، اس لیئے ان کی روایات بدون تحقیق اسناد نہ لینی چاہییں ان میں یہ کتابیں زیادہ معروف ہیں:۔

مسند ابی یعلیٰ (۳۰۷ ھ) صحیح ابن خزیمہ (۳۱۱ ھ) صحیح ابن حبان (۳۵۴ ھ) عمل الیوم و اللیلۃ حافظ ابوبکر احمد بن اسحٰق المعروف بابن السنی (۳۶۳ ھ) تہذیب الآثار لابن جریر الطبری (۳۱۰ ھ) مسند ابی بکر عبداللہ بن الزبیر الحمیدی (۲۱۹ ھ) مسند ابن بزار (۲۹۲ ھ) منتقی ابن الجارود (۳۰۷ ھ) المحلی لابن حزم (۴۵۷ ھ)

بیان کتب حدیث

کتب حدیث مختلف وضع و ترتیب سے لکھی گئی ہیں۔ اس لیئے یہ مختلف الانواع ہیں۔ جو ترتیب سب سے زیادہ عمل میں آئی وہ سنن کی ترتیب ہے۔ اس کے بعد جس ترتیب نے راہ پائی وہ مسند ہے۔ جو جاذبیت اور مقبولیت نفظ صحیح میں ہے۔ اس پہلو سے یہ سب سے مقدم ہے۔

① مؤطا

جس کتاب کو مؤلف نے دوسرے علماء کے سامنے پیش کیا ہو اور انہوں نے اس پر اتفاق فرمایا ہو، اسے مؤطا کہتے ہیں۔ جیسے مؤطا ابن ابی ذئبؒ (۱۵۹ھ) مؤطا امام مالکؒ (۱۷۹ھ) مؤطا امام محمد (۱۸۹ھ) وغیرہ۔

② الصحیح

یہ وہ کتابیں ہیں جن میں اُن کے مؤلفین نے اپنے خیال میں صرف صحیح احادیث لانے کا التزام کیا ہو۔ جیسے صحیح بخاری۔ صحیح مسلم۔ صحیح ابن خزیمہ۔ صحیح ابن حبان وغیرہ۔

③ المصنف

جن میں روایات محض جمع کرنے کے ارادے سے لکھی گئی ہوں۔ جیسے المصنف لعبدالرزاق (۲۱۱ھ) المصنف لابن ابی شیبۃ (۲۳۵ھ) یہ دونوں مصنف چھپ چکے ہیں۔

④ الجامع

جامع وہ کتاب ہے جس میں تفسیر، عقائد، آداب، احکام، مناقب، سیر، فتن، علامات قیامت وغیرہ ہر قسم کے مسائل کی احادیث مندرج ہوں۔ جیسے صحیح البخاری، کتب سنن میں صرف سنن ترمذی ہے۔ جو ان ۹ تمام ابواب پر مشتمل ہے اور اسے جامع ترمذی کہا جاتا ہے۔

⑤ السنن

یہ وہ کتابیں ہیں جو فقہی ابواب یا احکام کی ترتیب سے لکھی گئیں۔ جیسے سنن دارمی (۲۵۵ھ) سنن ابی داؤد (۲۷۵ھ) سنن ترمذی (۲۷۹ھ) سنن نسائی (۳۰۳ھ) سنن ابن ماجہ (۲۷۳ھ) سنن دارقطنی (۳۸۵ھ) سنن بیہقی (۴۵۸ھ) وغیرہ

⑥ المسند

یہ وہ کتابیں ہیں جو صحابہ کرامؓ کی مرویات کی ترتیب سے لکھی گئیں۔ جیسے مسند امام اعظم (۱۵۰ھ) مسند امام شافعی (۲۰۴ھ) مسند امام احمد (۲۴۱ھ) مسند حمیدی (۲۱۹ھ) اور مسند ابی یعلیٰ (۳۰۷ھ) وغیرہ۔

⑦ المعجم

یہ وہ کتابیں ہیں جنہیں مؤلفین نے اپنے شیوخ کی ترتیب سے تالیف کیا۔ جیسے معجم طبرانی (۳۶۰ھ) معجم الحافظ ابی بکر احمد بن ابراہیم الجرجانی (۳۷۱ھ) وغیرہ۔

⑧ المستدرک

امام بخاری اور امام مسلم نے صحیح احادیث کے لیے جو شرطیں لگائی تھیں شیخین کے بعد ان شرطوں پر کچھ اور حدیثیں بھی ملیں۔ اس پہلو سے ان رہ گئی حدیثوں کی تلاش پچھلے کام پر ایک استدراک ہے۔ مستدرک حاکم (۴۰۵ھ) مستدرک الحافظ ابی ذر (۴۳۴ھ) اسی اصول پر مرتب ہوئیں۔

⑨ المستخرج

دوسرے محدثین کے جمع کردہ مجموعہ حدیث کو اپنی سندوں سے دریافت کرنا اور اس کے مطابق انہیں روایت کرنا تالیف حدیث کی ایک نئی محنت ہے۔ یہ عمل استخراج کہلاتا ہے۔ حافظ ابوعوانہ (۳۱۶ھ) نے صحیح مسلم پر مستخرج لکھی، اسی کا نام مسند ابی عوانہ ہے۔ جو حیدرآباد سے چھپ چکی ہے۔

اسی طرح اس عنوان اور طرز پر مستخرج ابن رجاء الاسفرائنی (۲۸۶ھ) مستخرج ابن حمدان (۳۱۱ھ) لکھی گئی۔ المنتقی لابن الجارود (۳۰۷ھ) صحیح ابن خزیمہ پر استخراج کی گئی ہے۔

⑩ جو کتابیں اپنے موضوع سے موسوم ہوئیں۔

ابن سلام (۲۲۴ھ) کی کتاب الاموال ـــــ امام احمد (۲۴۱ھ) کی کتاب الزہد ـــــ امام بخاری (۲۵۶ھ) کی جزء القراءۃ اور جزء رفع الیدین ـــــ امام ابوداؤد (۲۷۵ھ) کی مراسیل ـــــ ابن قتیبہ (۲۷۶ھ) کی کتاب تاویل مختلف الحدیث ـــــ امام ترمذی (۲۷۹ھ) کی شمائل ـــــ امام نسائی (۳۰۳ھ) کی مناقب علی، کتاب السنۃ لابی بکر الخلال البغدادی (۳۱۱ھ) ـــــ مشکل الآثار امام طحاوی (۳۲۱ھ) ـــــ عمل الیوم واللیلۃ للحافظ ابی بکر احمد بن اسحق المعروف بابن السنی (۳۶۳ھ) ـــــ کتاب الیقین للحافظ ابن ابی الدنیا (۲۸۱ھ) ـــــ کتاب السنۃ لابن حبان (۳۶۹ھ) ـــــ کتاب الاسخیاء للدارقطنی (۳۸۵ھ) ـــــ کتاب السنۃ ابن مندہ العبدی (۳۹۴ھ) ـــــ امام بیہقی (۴۵۸ھ) کی ـــــ کتاب الاسماء والصفات اور شعب الایمان اس نوع کی اہم کتابیں ہیں۔

ملحوظ رہے کہ کئی محدثین نے مختلف اصناف پر حدیثیں جمع کی ہیں۔ اس لیے ان کے نام اگر مختلف انواع کتب کے تحت بار بار آئیں تو تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ پھر ایسا بھی ہے کہ ایک کتاب مختلف اعتبارات سے مختلف ناموں سے موسوم ہو۔ جیسے صحیح بخاری اس نام سے بھی معروف ہے اور اسے جامع بخاری بھی کہا جاتا ہے۔ جامع ترمذی سنن ترمذی کے نام سے بھی معروف ہے ہم نے ان انواع کتب میں چند معروف کتابوں کا ذکر کر کے ان مختلف اقسام تالیف کا ایک مختصر اور اجمالی تعارف کرا دیا ہے۔

نوٹ: یہ صحیح نہیں کہ یہ کتابیں ان اقسام کے اصولی ناموں کے خلاف اب دوسرے ناموں سے موسوم کی جانے لگی ہیں۔ جیسے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے ناموں سے مثال لے کر کئی نادان سنن دارقطنی، سنن بیہقی کو صحیح دارقطنی اور صحیح بیہقی کہنے لگے ہیں یا کوئی شخص سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ کو مسند نسائی اور معجم ابن ماجہ کہنے لگے۔ اس فن کو جاننے والے کبھی ایسی بات نہیں کرتے۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے سنن دارقطنی کو کئی جگہ صحیح دارقطنی لکھا ہے۔ یہ مرزا صاحب کی فن حدیث میں علمی قابلیت ایک جلی نمونہ ہے۔

کتب حدیث کی مختلف قسموں کا ذکر یہاں ضمناً آیا ہے۔ ان مختلف ناموں کی تفصیل اس

لیئے ضروری تھی کہ مختلف محدثین کے ناموں کے ساتھ ان کے جمع کردہ ذخیرہ حدیث کا اصولی نام سامنے آجائے۔ یہ تفصیل اسی لیے کی گئی ہے۔ اصل موضوع کلام متونِ حدیث کا تعارف ہے۔

اب تک ہم پچپن کتبِ حدیث کا ذکر کر چکے ہیں۔ دس کتابیں پہلے دور کی اور پندرہ اس سنہری دور کی جس میں فنِ تالیف حدیث اپنے کمال کو پہنچ چکا تھا۔ اس دور کا آغاز امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ جیسے ائمہ فن سے ہوتا ہے۔ امام نسائیؒ (۳۰۳ھ) کے بعد صحتِ اسناد کی محنت پھر کمزور پڑ گئی تھی۔ صحاحِ ستہ کا نام چھ کتابوں تک محدود ہو کر رہ گیا تاہم اس سے انکار نہیں کہ بعد کے آنے والے ائمہ حدیث نے بھی وہ گرانقدر ضخیم مجموعہ ہائے حدیث مرتب کیے کہ انکے اعتبارات و متابعات اور شواہد و زوائد فن کی تحقیق و تنقیح میں مزید نکھار کا موجب ہوئے ہیں اور ان میں کئی ایسی صحاح (صحیح حدیثیں) بھی آگئیں جو پہلے مجموعوں میں نہ تھیں۔ ان کتابوں کی تالیف سے سلسلۂ تالیفِ حدیث مکمل ہوا۔ آئندہ کے لیئے صرف یہ محنت باقی رہی کہ ان کتابوں کی مدد سے استخراج اور انتخاب کا سلسلہ آگے چلے۔

محدث کبیر حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری نے اصول حدیث پر ایک مختصر رسالہ خیر الاصول کے نام سے لکھا ہے۔ اس میں آپ نے کتبِ حدیث کی تقسیم اس طرح کی ہے ــــــ

حدیث کی کتابیں وضع و ترتیب مسائل کے اعتبار سے نو قسم پر ہیں:۔

پہلی تقسیم

① جامع ② سنن ③ مسند ④ معجم ⑤ جزء ⑥ مفرد ⑦ غریب ⑧ مستخرج ⑨ مستدرک

① جامع

وہ کتاب ہے جس میں تفسیر، عقائد، آداب، احکام، مناقب، سیر، فتن، علاماتِ قیامت وغیرہا ہر قسم کے مسائل کی احادیث مندرج ہوں۔ کما قیل ؎

سیر آداب و تفسیر و عقائد ‏ ‏ ‏ فتن احکام و اشراط و مناقب

جیسے بخاری و ترمذی۔

② سُنن

وہ کتاب ہے جس میں احکام کی احادیث ابواب فقہ کی ترتیب کے موافق بیان ہوں۔ جیسے سنن ابی داؤد و سنن نسائی و سنن ابن ماجہ۔

③ مسند

وہ کتاب ہے جس میں صحابہ کرامؓ کی ترتیب رتبی یا ترتیب حروف ہجا یا تقدم و تأخر اسلامی کے لحاظ سے احادیث مذکور ہوں۔ جیسے مسند احمد و مسند دارمی۔

④ معجم

وہ کتاب ہے جس کے اندر وضع احادیث میں ترتیب اساتذہ کا لحاظ رکھا گیا ہو جیسے معجم طبرانی۔

⑤ جزء

وہ کتاب ہے جس میں صرف ایک مسئلہ کی احادیث یکجا جمع ہوں۔ جیسے جزء القراءۃ و جزء رفع الیدین للبخاری و جزء القراءۃ للبیہقی۔

⑥ مفرد

وہ کتاب ہے جس میں صرف ایک شخص کی کل مرویات ذکر ہوں۔

⑦ غریب

وہ کتاب ہے جس میں ایک محدث کے مفردات جو کسی شیخ سے ہوں وہ ذکر ہوں۔

(عجالہ نافعہ صـ۱۴ العرف الشذی)

⑧ مستخرج

وہ کتاب ہے جس میں دوسری کتاب کی حدیثوں کی زائد سندوں کا استخراج کیا گیا ہو جیسے مستخرج ابی عوانہ۔

⑨ مستدرک

وہ کتاب ہے جس میں دوسری کتاب کی شرط کے موافق اس کی رہی ہوئی حدیثوں کو پورا کر دیا گیا ہو۔ جیسے مستدرک حاکم (الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ)

دوسری تقسیم

کتب حدیث مقبول وغیر مقبول ہونے کے اعتبار سے پانچ قسم پر ہیں:۔

پہلی قسم وہ کتابیں ہیں جن میں سب حدیثیں صحیح ہیں۔ جیسے ① موطا امام مالک ② صحیح بخاری ③ صحیح مسلم ④ صحیح ابن حبان ⑤ صحیح حاکم ⑥ مختارہ ضیاء مقدسی ⑦ صحیح ابن خزیمہ ⑧ صحیح ابی عوانہ ⑨ صحیح ابن سکن ⑩ منتقی ابن جارود۔

دوسری قسم وہ کتابیں ہیں جن میں احادیث صحیح وحسن وضعیف ہر طرح کی ہیں مگر سب قابل احتجاج ہیں۔ کیوں کہ ان میں جو حدیثیں ضعیف ہیں، وہ بھی حسن کے قریب ہیں جیسے ① سنن ابوداؤد ② جامع ترمذی ③ سنن نسائی ④ مسند احمد۔

تیسری قسم وہ کتابیں ہیں جن میں حسن۔ صالح، منکر ہر نوع کی حدیثیں ہیں جیسے ① سنن ابن ماجہ ② مسند طیالسی ③ زیادات امام احمد بن حنبل ④ مسند عبد الرزاق ⑤ مسند سعید بن منصور ⑥ مسند ابی بکر بن ابی شیبہ ⑦ مسند ابی یعلیٰ موصلی ⑧ مسند بزار ⑨ مسند ابن جریر ⑩ تہذیب ابن جریر ⑪ تفسیر ابن جریر ⑫ تاریخ ابن مردویہ ⑬ تفسیر ابن مردویہ ⑭ طبرانی کے معجم کبیر ⑮ معجم صغیر ⑯ معجم اوسط ⑰ سنن دارقطنی ⑱ غرائب دارقطنی ⑲ حلیہ ابی نعیم ⑳ سنن بیہقی ㉑ شعب الایمان بیہقی۔

چوتھی قسم وہ کتابیں ہیں جن میں سب حدیثیں ضعیف ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ جیسے (۱) نوادر الاصول حکیم ترمذی (۲) تاریخ الخلفاء (۳) تاریخ ابن نجار (۴) مسند الفردوس دیلمی (۵) کتاب الضعفاء عقیلی (۶) کامل ابن عدی (۷) تاریخ خطیب بغدادی (۸) تاریخ ابن عساکر۔

پانچویں قسم وہ کتابیں ہیں جن سے موضوع حدیثیں معلوم ہوتی ہیں۔ جیسے موضوعات ابن جوزی، موضوعات شیخ محمد طاہر نہروانی وغیرہ۔ (رسالہ فیما یجب حفظہ للناظر مؤلفہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی)۔

تالیف کتب حدیث ایک اور عنوان سے

سند کے ساتھ حدیثیں جمع کرنا صرف اسی دور تک تھا کہ حدیث کے یہ مسانید (سند والے مجموعے) مرتب نہ ہوئے تھے یا کچھ مرتب ہو گئے تھے مگر کچھ احادیث رہ گئی تھیں۔ جو سند سے روایت ہوتی تھیں۔ مگر ان مجموعوں میں نہ آئی تھیں۔ پانچویں صدی ہجری تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اس کے بعد اپنی سند سے روایت کرنے کا سلسلہ بند ہو گیا اور آئندہ انہی مجموعہ ہائے حدیث کی سند چلنے لگی۔ اب اس نئے دور میں تخریج اور انتخاب ہی وہ دو موضوع تھے جن پر مزید جمع و تدوین کا کام ہو سکتا تھا یا سلسلہ شروح تھا جن پر محدثین قلم اٹھا سکتے تھے۔ تاہم یہ صحیح ہے کہ اب تالیف حدیث کی محنت آئندہ ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔

حدیث کی تخریج پر مبنی کتابیں

امام ترمذیؒ (۲۷۹ھ) کی کتاب جامع ترمذی نے محدثین کو پہلی دفعہ فن تخریج سے آشنا کیا۔ یہ کتاب ایسے نفیس طرز پر جمع کی گئی۔ کہ اس سے ایک نیا فن وجود میں آیا۔ امام ترمذیؒ ایک حدیث کو روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں:۔

وفی الباب عن ...... کہ اس موضوع پر فلاں فلاں صحابی سے بھی روایت موجود ہے۔ وہ روایات کہاں کہاں ہیں؟ امام ترمذی نے ان کی نشاندہی نہیں کی۔ ان روایات کو دوسری سند والی کتابوں سے ڈھونڈ نکالنا ان روایات کی تخریج کہلاتا ہے۔ امام بخاری نے بھی الصحیح میں

کئی روایات تعلیقاً بیان کی ہیں، انہیں پوری سند سے معلوم کرنا اور موصولاً لانا یہ بھی ایک قسم کی تخریج ہے جو محدثین شارحین نے کی ہے۔ صحیح بخاری کی نسبت جامع ترمذی کا موضوع و فی الباب .... ایک وسیع میدان تحقیق ہے اور اس تخریج پر مستقل کتابیں لکھی گئیں ہیں جیسے "لب الباب فیما یقول الترمذی وفی الباب"۔

کتب حدیث کے علاوہ دیگر فنون کی کتابوں میں بھی حدیثیں کچھ اس طرح مروی ملتی ہیں کہ ان کی سند یا ان کے مخرج (روایت کرنے والے محدث) کا نام وہاں مذکور نہیں۔ ان کتابوں کی اہمیت اور ان کے وسیع حلقہ اشاعت کے پیش نظر محدثین ان روایات کی تخریج کے بھی درپے ہوئے اور اس سلسلہ تخریج میں بعض ایسی نفیس کتابیں مرتب ہوئیں کہ فن ان پر خود بھی ناز کرنے لگا۔

پانچویں چھٹی صدی کی جن کتابوں پر تخریج کی یہ محنت ہوئی۔ حسب موضوع ان میں سے بعض کے نام سنیئے:۔

فن فقہ میں

علامہ برہان الدین المرغینانی (۵۹۳ھ) کی کتاب ہدایہ فقہ حنفی کی مرکزی کتاب ہے۔ اس میں بہت سی حدیثیں بھی مذکور ہوئیں مصنف نے انہیں محدثین کے طریق پر نہیں اپنے انداز میں ذکر کیا ہے۔ کہیں اشارہ ہے کہیں اختصار ہے کہیں روایت بالمعنی ہے۔ تاہم یہ صحیح ہے کہ کتاب کی اہمیت کے پیش نظر ان احادیث کی تخریج ضروری تھی۔

(۱) حافظ جمال الدین الزیلعی (۷۶۲ھ) نے نصب الرایہ لتخریج احادیث الہدایہ کے نام سے چار جلدوں میں ایک نہایت گرانقدر حدیثی تالیف پیش کی ہے۔ علمائے دیوبند نے اس پر حاشیہ بغیہ الالمعی فی تخریج الزیلعی کے نام سے لکھا ہے۔ یہ کتاب مصر سے بڑی آب وتاب سے شائع ہوئی ہے۔ پہلے مطبع علوی لکھنؤ سے ۱۳۱۰ھ میں شائع ہوئی تھی۔ کتاب کی عظمت شان کے لیئے یہی کافی ہے کہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ جیسے جلیل القدر محدث نے نصب الرایہ کی تلخیص الدرایہ کے نام سے کی ہے اور وہ بھی چھپ چکی ہے۔

② امام ابوالقاسم الرافعی (۶۲۳ھ) کی کتاب الوجیز کی تخریج حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے تلخیص الحبیر فی تخریج احادیث الرافعی الکبیر کے نام سے کی ہے۔ یہ چار جلدوں میں قاہرہ سے شائع ہوئی ہے

فن تفسیر میں

علامہ زمخشری (۵۳۸ھ) نے تفسیر کشاف میں جو حدیثیں لکھی ہیں انکی بھی محدثین نے تخریج کی ہے قاضی بیضاوی (۶۸۵ھ) کی نقل کردہ احادیث کی بھی تخریج کی گئی ہے۔

فن اخلاق میں

امام غزالی (۵۰۵ھ) کی کتاب احیاء علوم الدین میں ہزاروں روایات ہیں۔ سند یا حوالہ امام غزالی ذکر نہیں فرماتے۔ حافظ زین الدین العراقی (۸۰۶ھ) نے اس کتاب پر تحقیقی کام کیا ہے۔ اور ان روایات کی تخریج کی ہے۔ اس کا نام المغنی عن الاسفار فی تخریج ما فی الاحیاء من الاخبار ہے۔ احیاء العلوم کے حاشیہ پر چھپ چکی ہے۔

انتخاب پر مبنی حدیث کی کتابیں

محدثین نے سند والی کتابوں کے حوالہ سے انتخاب پر مبنی حدیث کے کچھ نئے مجموعے بھی تیار کیے۔ ان مجموعوں میں سند نہیں دی گئی۔ حدیث کے آخر میں تخریج کر دی گئی ہے۔ تاکہ بوقت اختلاف اس سند (سند والی) کتاب کی طرف رجوع کیا جا سکے۔ اس صنف میں مندرجہ ذیل کتابیں زیادہ معروف ہوں۔

① شرح السنّۃ للبغوی (۵۱۶ھ)

ابو محمد الحسین بن مسعود البغوی خراسان کے قریب ایک موضع بغ کے رہنے والے تھے۔ معالم التنزیل آپ کی ہی تفسیر ہے۔ آپ نے محدثین کے المصنف کے طرز پر احادیث جمع کی ہیں۔ آپ امام بخاریؒ کے عنادین الواب سے بہت اقتباس لیتے ہیں یہ آٹھ ضخیم جلدوں میں چھپی ہے۔

② مشارق الانوار قاضی عیاض (۵۴۴ھ)

مطبع مولویہ فلس نے ۱۳۲۸ھ میں دو جلدوں میں شائع کی ہے۔ اس کی علامہ عبداللطیف بن عبدالعزیز جو ابن الملک کے نام سے معروف ہیں۔ مبارق الازہار کے نام سے ایک شرح لکھی ہے۔ جسے مطبع خیریہ مصر نے شائع کیا ہے۔

③ جامع الاصول من احادیث الرسول

لابی السعادات مبارک بن محمد (۶۰۶ھ) ابن اثیر الجزری کی یہ کتاب بیروت سے ۱۲ ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

④ مشارق الانوار للشیخ حسن الصغانی (۶۵۰ھ)

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی احادیث کا ایک گرانقدر مجموعہ ہے۔ مؤلف نے موضوع روایات کی نشاندہی کے لیے بھی ایک مجموعہ موضوعات حسن صغانی نام سے بھی لکھا ہے۔ نقد احادیث میں آپ بہت سخت تھے۔ موضوعات ابن جوزی (۵۹۷ھ) آپ کے سامنے تھی۔ ملا علی قاری نے بھی موضوعات صغانی کے بہت حوالے دیئے ہیں۔

⑤ الترغیب والترہیب من الحدیث الشریف

للحافظ ابی محمد زکی الدین عبدالعظیم المنذری (۶۵۶ھ) بیروت میں چھپی ہے۔ پہلے از ہر مصر سے بھی شائع ہو چکی ہے۔ ترغیب وترہیب کی احادیث کو مؤلف نے بڑی محنت سے جمع کیا ہے۔

⑥ ریاض الصالحین للنووی (۶۷۶ھ)

ابو زکریا محی الدین یحییٰ بن شرف النووی شارح صحیح مسلم دمشق کے قریہ نوی کے رہنے والے تھے۔ شافعی المسلک تھے۔ آپ نے فقہ شافعی پر بھی کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ریاض الصالحین اصلاح معاشرہ اور تہذیب اخلاق کے لیے نہایت بلند پایہ کتاب ہے۔ بارہا چھپ چکی ہے۔

⑦ اربعین نووی

آپ نے اربعین کے نام سے بھی ایک مجموعہ حدیث لکھا ہے جسکی نامور علماء حدیث نے شروح لکھی ہیں۔ ابن دقیق العید (۷۰۲ھ) کی شرح مطبع منیریہ مصر نے ابن حجر ہیثمی کی شرح مطبع بولاق نے بڑی آب و تاب سے شائع کی ہے

⑧ احکام الاحکام شرح عمدۃ الاحکام

للحافظ تقی الدین المعروف بابن دقیق العید (۷۰۲ھ) چار ضخیم جلدوں میں ۱۳۴۲ھ میں شائع ہوئی۔

⑨ المنتقی الاخبار

مشہور محدث حافظ ابن تیمیہ (۷۲۸ھ) کے دادا احمد ابن تیمیہ ۶۲۱ھ کی تالیف ہے۔ قاضی شوکانی (۱۲۵۰ھ) کی نیل الاوطار اسی منتقی کی شرح ہے۔ جو آٹھ جلدوں میں مصر سے ۱۲۹۸ھ میں شائع ہوئی۔ موطا کی شرح المنتقی جو قاضی ابو الولید الباجی نے لکھی اور سات جلدوں میں چھپی۔ یہ اور کتاب ہے۔

⑩ مشکوۃ للخطیب التبریزی (۷۴۳ھ)

یہ امام بغوی کی کتاب مصابیح السنۃ کے اصول پر ایک عجیب اور بہت مفید گلدستۂ احادیث ہے۔ نامور علماء نے اس کی شروح لکھیں جیسے علامہ طیبی الشافعی، علامہ تور بشتی الحنفی۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی (لمعات التنقیح آٹھ جلدوں میں ہے) ملا علی قاری (مرقات المفاتیح۔ یہ دس ضخیم جلدوں میں ہے) اور شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس کاندھلوی (التعلیق الصبیح سات جلدوں میں ہے) کی شروح بہت معروف ہیں۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے اشعۃ اللمعات کے نام سے اس کی ایک فارسی شرح بھی لکھی ہے۔ حضرت شاہ محمد اسحق محدث دہلوی کے شاگرد علامہ قطب الدین نے مظاہر حق کے نام سے اس کی ایک مبسوط اردو شرح لکھی ہے۔ جو برصغیر پاک و ہند میں بہت متداول ہے۔

⑪ زاد المعاد للحافظ ابن قیم (۷۵۱ھ)

مکتبہ حسینیہ مصر نے چار جلدوں میں شائع کیا۔ اس میں احادیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کی سیرت وعادت کی ترتیب سے جمع کی گئی ہیں۔ وسیع ذخیرہ احادیث کا عجیب جامع اختصار ہے۔

(۱۲) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد

للحافظ علی بن ابی بکر بن سلیمان الہیثمی (۸۰۷ھ) مطبع انصار دہلی نے ۱۳۰۸ھ میں اور مطبع قدسی مصر نے ۱۳۵۲ھ میں دس ضخیم جلدوں میں شائع کی ہے۔

(۱۳) بلوغ المرام

للحافظ ابن حجر العسقلانی (۸۵۲ھ)۔ فقہ شافعی کی تائید میں احادیث احکام اس میں جمع کی گئی ہیں۔ بلوغ المرام کی آگے کئی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ جن میں سبل السلام سب سے زیادہ مشہور ہے حنفیہ کی آثار السنن اسی انداز پر فقہ حنفی کی تائید میں —— مرتب کی گئی ہے۔

(۱۴) الجامع الصغیر

امام جلال الدین السیوطی (۹۱۱ھ) سے حروف تہجی سے حدیث کے ابتدائی الفاظ پر مرتب کیا گیا ہے۔ حدیث تلاش کرنے میں بہت مفید کتاب ہے۔ یہ کنز الحقائق کے حاشیہ پر بھی شائع ہوئی ہے۔ علامہ علی بن شیخ احمد العزیزی نے ۱۰۴۰ھ میں السراج المنیر کے نام سے اسکی ایک مبسوط شرح لکھی ہے۔ جو ۱۳۱۲ھ میں مصر سے شائع ہوئی۔ ایک شرح فیض القدیر علامہ عبدالرؤف المناوی نے بھی لکھی ہے۔ جو ۱۳۵۶ھ میں مصر سے شائع ہوئی۔ یہ شروح ذخیرہ حدیث کی بہت مفید کلیدی کتابیں ہیں۔

(۱۵) تیسیر الوصول الی جامع الاصول من حدیث الرسول

مشہور محدث عبدالرحمٰن بن علی الشیبانی (۹۴۴ھ) جو ابن الربیع کے نام سے معروف ہیں یہ ان کی تالیف ہے۔ مطبع جمالیہ مصر نے ۱۳۳۰ھ میں اسے طبع کیا ہے۔

(۱۶) کنز العمال من سنن الاقوال والافعال

للشیخ علی المتقی (۹۷۵ھ) آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے۔ حیدر آباد دکن سے ۱۳۱۲ھ میں طبع ہوئی۔

(۱۷) فتح الرحمٰن فی اثبات مذہب النعمان

المعروف انوار السنۃ لردوا الجنۃ للشیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۰۵۲ھ) مکتبہ حسامیہ دیوبند سے مفتی نظام الدین صاحب نے اسے چار جلدوں میں طبع کیا ہے۔

(۱۸) جمع الفوائد من جامع الاصول ومجمع الزوائد

للامام محمد بن محمد بن سلیمان الرودانی المغربی (۱۰۹۴ھ) دو ضخیم جلدوں میں ہے۔ مطبع خیریہ میرٹھ نے ۱۳۴۵ھ میں اسے شائع کیا پھر مصر میں بھی طبع ہوئی ہے۔

(۱۹) عقود الجواہر المنیفہ

للسید محمد مرتضیٰ الحسینی الزبیدی (۱۲۰۵ھ) اسے مطبع وطنیہ بثغر الاسکندریہ نے دو جلدوں میں ۱۲۹۲ھ میں شائع کیا۔

(۲۰) آثار السنن مع التعلیق الحسن

للمحدث محمد بن علی النیموی (۱۳۲۲ھ) آپ مولانا عبدالحی (۱۳۰۷ھ) کے شاگرد تھے۔ عظیم آباد کے مطبع احسن المطابع نے ۱۳۱۹ھ میں اسے شائع کیا ہے

(۲۱) التاج الجامع للاصول من احادیث الرسول

ازہر کے ممتاز محدث شیخ منصور علی ناصف کی پانچ ضخیم جلدوں میں نہایت بلند پایہ تالیف ہے۔ مطبع عیسی البابی (مصر) نے ۱۳۴۷ھ میں اسے شائع کیا ہے۔

(۲۲) زجاجۃ المصابیح

مولانا السید منظر حسین حیدرآبادی نے چار جلدوں میں تالیف کی تاج پریس حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ جلد اوّل ص۵۹۰ باب الاعتکاف تک، جلد دوم باب النذور ص۶۰۹ تک، جلد سوم کتاب الرؤیا ص۶۲۷ تک، جلد چہارم آخر کتاب ص۶۱۴ تک۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ مشکوٰۃ کا بدل ہو سکے۔

(۲۳) اعلاء السنن

للشیخ ظفر احمد العثمانی (ھ) بیس ضخیم جلدوں میں ہے۔ مذہب احناف کی احادیث اس میں بہت تحقیق سے جمع کی گئی ہیں۔ یہ کتاب حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی سرپرستی میں لکھی گئی ہے۔ اور علم حدیث میں عصر حاضر کا شاہکار ہے۔

(۲۴) ترجمان السنۃ للمحدث الکبیر بدر عالم میرٹھی ثم المدنی (ھ)

کتاب باعتبار متن عربی میں ہے ہر حدیث کی تخریج موجود ہے اُردو ترجمہ اور تشریحی نوٹ ساتھ ساتھ ہیں پہلے ۲۷۰ صفحات کا مبسوط مقدمہ ہے جو حدیث افتراقِ امت کی صحت و دلالت، اختلاف کی توضیح اسباب اختلاف و تفریق، فرقہ ناجیہ کی تحقیق، حجیت حدیث، اسوۂ رسول اور کتاب اللہ، احادیث رسول کے بیان قرآن ہونے اور ظن و علم کے مفہوم پر ایک نہایت گرانقدر علمی ذخیرہ ہے مولف نے ترتیب مسند احمد کی تبویب جدید (الفتح الربانی) سے لی ہے یہ کتاب دس جلدوں تک جاتی مگر افسوس کہ ابھی چار ضخیم جلدیں مکمل ہوئیں تھیں کہ مؤلف اپنے خالق حقیقی سے جاملے رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

(۲۵) معارف الحدیث مولانا محمد منظور نعمانی دامت برکاتہم

احادیث کا نیا اور نرالا انتخاب ہے متون احادیث اصل عربی میں ہیں ترجمہ اُردو میں ہے سات ضخیم جلدوں میں یہ عظیم ذخیرہ مرتب ہوا ہے زیادہ تر احادیث وہ ہیں جو عام زندگی اور اس کے حالات سے تعلق رکھتی ہیں اس وجہ سے جدید تعلیمیافتہ طبقے پر اس کے گہرے اثرات ہیں غیر مستند روایات سے محفوظ ہے

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ جس نے جان بوجھ کر مجھ پر کوئی جھوٹ باندھا یا میرے نام پر کوئی ایسی بات کہی جو میں نے نہ کہی ہو۔ تو اسے چاہیئے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔

موضوع احادیث کی نشاندہی پر مستند کتابیں

علمائے اسلام نے اس باب میں بھی کافی محنت کی ہے اور نقل وضبط اور نقد وتبصرہ سے بہت سی وضعی روایات کی نشاندہی کی ہے علامہ ابوالفضل محمد بن طاہر بن علی بن احمد المقدسی (۵۰۷ھ) کی تذکرۃ الموضوعات علامہ ابوالفرج عبدالرحمٰن بن الجوزی (۵۹۷ھ) کی موضوعات ــــ علامہ حسن الصغانی (۶۵۰ھ) کی موضوعات حسن الصغانی ـ شیخ سراج الدین عمر بن علی القزوینی (۸۰۴ھ) کی موضوعات المصابیح ــــ علامہ سیوطی (۹۱۱ھ) کی اللآلی المصنوعہ ــ علامہ محمد طاہر الفتنی (۹۸۶ھ) کی تذکرۃ الموضوعات اور قانون الموضوعات ــ ملا علی قاری (۱۰۱۴ھ) کی موضوعات کبیر اور اللآلی المصنوع علامہ شوکانی (۱۲۵۰ھ) کی الفوائد المجموعہ ــ امین الحسنات علامہ عبدالحی لکھنوی کی الآثار المرفوعہ فی الاحادیث الموضوعہ کے ساتھ ساتھ آپ کو احیاء العلوم کی حافظ زین الدین عراقی ۸۰۶ھ کی تخریج اور منار السبیل کی شیخ البانی کی تخریج ارواء الغلیل فی تخریج احادیث منار السبیل جیسی کتابوں سے بھی اس سلسلہ میں بہت مواد ملے گا شیخ البانی کی یہ تالیف ۱۳۹۹ھ میں دس جلدوں میں طبع ہے

افسوس کہ اس علمی چھان بین اور جانچ پڑتال کے باوجود ایسے قصہ گو واعظین اور ذاکرین کی کمی نہیں جو اپنی خطابت اور تقریر کو وضعی ڈراموں میں پیش کرکے اپنے سامعین سے خراج تحسین لیتے ہیں اور وہ عوام بھی اس طرف اس لیے لپکتے ہیں کہ انہیں اس کاروائی میں ڈرامے کا سا لطف آتا ہے ــــ ہاں اس پر ہم مطمئن ہیں کہ اہل علم نے ان وضعی روایات پر مستقل کتابیں لکھ کر اپنی ذمہ داری ادا کردی ہے

شیعہ کتب حدیث

شیعہ کتب حدیث ایک بالکل جدا سلسلہ ہے اہل سنت محدثین انہیں بالکل وزن نہیں دیتے شیعہ علماء کے نزدیک ائمہ کے اصحاب انکی احادیث قلمبند کرتے رہے اور چارسو کے قریب مجموعے پہلے دور میں لکھے گئے ـ پھر ان کی مدد سے اصول اربعہ کافی کلینی مَن لایحضرہ الفقیہ تہذیب الاحکام اور استبصار مرتب ہوئے ـ معانی الاخبار شیخ صدوق، نہج البلاغہ شریف رضی وغیرہ بھی ان کے ہاں مستند روایات ہیں متاخرین میں علامہ باقر مجلسی کی کتاب بحار الانوار شیعہ احادیث کا انسائیکلوپیڈیا سمجھی جاتی ہے ـ

شروح حدیث

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔ امابعد:

آج کا عنوان حدیث کے شروح و حواشی کا بیان ہے۔ اس وقت یہ احاطہ پیش نظر نہیں کہ آج تک کتب حدیث پر کون کون سی شروح لکھی گئیں اور کن کن نامور علماء نے لکھیں اور کون کون سے حواشی قلمبند ہوئے اور وہ کس کس کے رہین احسان تھے۔ بلکہ صرف یہ بتانا ہے کہ اس باب میں کون کون سی کتابیں ان دنوں عام متداول ہیں ــــــ مل سکتی ہیں اور علماء، اور طلبہ ان شروح و حواشی سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ زمانے نے اپنے انقلابات و اسباب میں کن کن کتابوں کو شہرت عام بخشی اور انہوں نے عوام و خواص میں نقطہ اعتماد پایا۔ واللہ ہو الموفق۔

شرح احادیث کی ضرورت

جس طرح قرآن پاک کے لیے تفسیر کی ضرورت ہے۔ اسی طرح حدیث کی کتابوں کے لیے شرح کی ضرورت ہوتی ہے۔ طلبہ کو ہر وقت احوال رواۃ کا استحضار نہیں ہوتا۔ نہ ایک کتاب کے مطالعہ کے وقت یہ مستحضر ہوتا ہے کہ دوسری کتابوں میں یہ روایت بس اتنی ہے یا اس سے کم و بیش ــــــ اور یہ کہ اس موضوع پر اور کون کون سی روایات ہیں ــــــ شارح اپنی شرح میں جہاں ضرورت سمجھتا ہے کسی راوی کے حالات بتا دیتا ہے۔ اسی طرح کسی موضوع پر مختلف احادیث وارد ہوں تو جہاں صاحب کتاب نے ایک حدیث پیش کی۔ شارح اس میں اس موضوع کی دوسری احادیث کو بھی زیر بحث لے آتا ہے۔ اس میں صحابہ کا عمل کیا تھا۔ یا ان کے مسالک کیا کیا تھے۔ وہ ان کی طرف بھی اشارہ کر جاتا ہے۔ پھر ان احادیث سے جو احکام نکلتے ہیں۔ شارح ان پر بھی بحث کرتا ہے اور ائمہ کے مختلف مذاہب اس میں زیر بحث آجاتے

ہیں ــــــ شارح بالغ نظر ہے تو شرح حدیث میں عصری تقاضوں پر بھی بات کرتا جاتا ہے
غرض شرح حدیث ایک ایسا فن ہے جس میں جملہ اسلامی علوم زیر بحث آتے ہیں۔

متون حدیث میں شرحی جملے

محدثین حدیث کی کتابوں میں حدیث روایت کر کے کبھی شرحی جملے بھی ساتھ کہہ جاتے ہیں۔ مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا

و اذا قرأ فانصتوا۔

ترجمہ: اور جب امام قرآن شریف پڑھے تو تم (مقتدی) چپ ہو جاؤ۔

اس پر ابوالنضر کے بھانجے ابو بکر نے کچھ بات کی۔ غالباً اس طرف اشارہ ہوگا کہ اس میں سلیمان تیمی ایک راوی ہے۔ تو امام مسلمؒ (۲۶۱ھ) نے اسے کہا کہ کیا سلیمان تیمی سے بھی زیادہ کوئی یاد رکھنے والا ہوگا؟ صحیح مسلم میں ہے:۔

فقال مسلم اتريد احفظ من سليمان فقال له ابو بكر فحديث ابوهريرة قال هو صحيح يعني واذا قرأ فانصتوا فقال هو عندي صحيح فقال لم لم تضعه هاهنا فقال ليس كل شئ عندي صحيح وضعته ههنا انما وضعت ههنا ما اجمعوا عليه۔[1]

ترجمہ: مسلم نے کہا تم سلیمان سے زیادہ یاد رکھنے والا چاہتے ہو۔ ابوبکر نے پوچھا تو ابوہریرہؓ کی حدیث کیسی ہے؟ (امام) مسلم نے کہا وہ بھی صحیح ہے۔ اس پر ابوبکر نے کہا کہ آپ نے اسے اس موقع پر کیوں روایت نہیں کیا۔ آپ نے کہا ہر وہ چیز جو میرے ہاں صحیح ہو میں نے اس میں نہیں لکھی۔ میں نے اس میں صرف وہی کچھ لکھا ہے جس پر سب کا اتفاق ہو۔

دیکھئے یہ متن کے ساتھ شرحی جملے چلے آ رہے ہیں ــــــ جامع ترمذی کو دیکھئے اس

---

[1] صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۱۷۴ ابوہریرہؓ کی حدیث جس میں واذا قرأ فانصتوا مروی ہے مسلم میں نہیں اور کتابوں میں موجود ہے۔ مسلم کی یہ روایت حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے۔

میں بھی جگہ جگہ شرحی جملے ملتے ہیں۔ بلکہ جامع ترمذی متن کی کتاب ہونے کے باوجود شرح حدیث کا ایک بڑا علمی ذخیرہ ہے ــــــ ایک مثال لیجئے۔ امام ترمذی ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

اما احمد بن حنبل فقال معنی قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب اذا کان وحدہ و احتج بحدیث جابر بن عبد اللہ حیث قال من صلی رکعۃ لم یقرأ فیھا بام القرآن فلم یصل الا ان یکون وراء الامام قال احمد فھذا رجل من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم تاوّل قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب ان ھذا اذا کان وحدہ۔[1]

ترجمہ۔ امام احمد بن حنبلؒ کہتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب (جس نے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی کوئی نماز نہیں ہوتی)، کا معنی یہ ہے کہ جب وہ اکیلا ہو (جماعت والی نماز یہاں مراد نہیں)، اور امام احمدؒ نے اس سلسلہ میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ آپ نے فرمایا جس نے ایک رکعت پڑھی اور اس میں ام القرآن نہ پڑھی اس کی نماز نہ ہوئی مگر جب کہ وہ امام کے پیچھے ہو (یعنی اس وقت اس کی نماز خود فاتحہ پڑھے بغیر بھی ہو جاتی ہے۔ امام احمد کہتے ہیں کہ یہ شخص (حضرت جابرؓ) اصحاب رسول میں سے ہے۔ آپ اس حدیث لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب کا یہی معنی سمجھ رہے ہیں کہ یہ حدیث اکیلے سے متعلق ہے (نماز باجماعت کے لیے نہیں)

امام ابوداؤد (۲۷۵ھ) نے بھی سنن میں مشہور محدث سفیان بن عیینہ (۱۹۸ھ) کا یہ شرحی جملہ نقل کیا ہے کہ حدیث لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب اسی شخص کے بارے میں ہے جو اکیلا نماز پڑھے۔[2] یہ حدیث جماعت سے نماز پڑھنے والے کے بارے میں نہیں ہے

محدثین کے ہاں یہ شرحی جملے عام ملتے ہیں۔ امام ابوداؤد جگہ جگہ قال ابوداؤد کہہ کر متون احادیث

---

[1] جامع ترمذی جلد ا صفحہ ۴۲ دہلی [2] سنن ابی داؤد جلد ا صفحہ ۱۱۹

پر تشریحی نوٹ لکھے جاتے ہیں. علمائے حدیث نے قال ابوداؤد کے ان جملوں پر مستقل کتابیں لکھی اور مستقل بحثیں کی ہیں.

اس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں کہ کون سا تشریحی نوٹ اور کون سا شرحی جملہ صحیح ہے اور کس جملے سے ہم رائے کا اختلاف رکھتے ہیں. اس وقت صرف یہ بتانا ہے کہ طلبہ کو شرح احادیث کی ضرورت ابتدار سے ہی رہی ہے. حتیٰ کہ متن کی کتابوں (کتب متون) میں بھی جگہ جگہ احادیث کے ساتھ شرحی جملے ملتے ہیں ——— امام زہری (م ۱۲۴ھ) تو متن حدیث روایت کرتے ہوئے یہ شرحی جملے کہہ جاتے تھے اور بعض علمائے حدیث انہیں متن حدیث میں سے سمجھ لیتے. محدثین کے ہاں اسے ادراج بھی کہتے ہیں. امام زہری کے ہاں یہ عام ملتا ہے.

متون احادیث پر تشریحی ابواب و تراجم

امام بخاری (۲۵۶ھ) نے الجامع الصحیح المسند میں اپنی خاص شرطوں سے نہایت صحیح روایات اس کتاب میں جمع کی ہیں. ان روایات پر آپ نے جو ابواب و تراجم باندھے ہیں. وہ ان روایات کے بارے میں جو ان ابواب میں مروی ہوں امام بخاری کی فقہی رائے سمجھے جاتے ہیں. اس وقت ہمیں یہ بحث نہیں کہ امام بخاریؒ کی کون کون سی رائے قیاس پر مبنی ہے اور کس کس باب میں ان کے پاس نص حدیث ہے. اس وقت صرف یہ بتلانا ہے کہ صحیح بخاری میں بھی مؤلف تشریحی جملوں سے مستغنی نہیں رہے.

امام نسائیؒ (۳۰۳ھ) بھی سنن (مجتبیٰ) میں باب باندھ کر حدیث کی مراد واضح کرتے ہیں یہ گویا آپ کی طرف سے شرح حدیث ہے. مثلاً آپ نے جب یہ حدیث روایت کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے. واذا قرأ فانصتوا. (جب امام قرآن پڑھے تو تم چپ ہو جایا کرو) تو آپ نے اس پر یہ باب باندھا ہے[1]:

واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلكم ترحمون.[2]

ترجمہ. اور جب قرآن پڑھا جائے تو تم اس کی طرف کان لگاؤ اور چپ رہو تاکہ تم فلاح پاؤ.

---

[1] سنن نسائی جلد ۱ صفحہ ۱۰۱ [2] پ ۹ الاعراف

اس ترجمۃ الباب سے یہ بھی پتہ چلا کہ محدثین کے ہاں یہ آیت نماز کے بارے میں ہی ہے اور ان کے ہاں مسلمان ہی اس حکم کے مخاطب ہیں، سو اس وہم میں نہ جانا چاہیئے کہ یہ آیت کفار کے بارے میں ہے. گو وہ بھی اس حکم کے مخاطب ہوں کہ جب قرآن پڑھا جائے. تو تم شور و شغب نہ کرو۔

صحیح ابن خزیمہ (۳۱۱ھ) کو دیکھئے. متونِ احادیث پر کس قدر نفیس تبویب ہے. یُوں معلوم ہوتا ہے جیسے حدیث ہر باب باندھنے میں امام ابن خزیمہ سب پر سبقت لے گئے ہیں. یہ کتاب چار جلدوں میں دیوبند کے ایک فاضل مولانا مصطفیٰ کے حاشیہ کے ساتھ مصر سے چھپ چکی ہے. منتقی ابن الجارود اسی پر (صحیح ابن خزیمہ) مستخرج کتاب ہے۔

شرح حدیث کا آغاز

یُوں تو حدیث کے شرحی جملے اور تشریحی الباب و تراجم کتب متون میں بہت پہلے آ رہے تھے. لیکن مستقل فن کی حیثیت سے امام ابو جعفر الطحاوی (۳۲۱ھ) پہلے امام ہیں جنہوں نے متون احادیث کو شرح کا موضوع بنایا اور شرح معانی الآثار جیسی عظیم کتاب لکھ کر اس باب میں حجت تمام کر دی. آپ نے پھر مشکل الآثار بھی لکھی، جو متقابل روایات اور مشکل روایات تطبیق و تفہیم میں نہایت نفیس کتاب ہے اور اپنے باب میں بے مثل ہے. مطبوعہ مشکل الآثار جو چار جلدوں میں ہے. اصل کتاب کے نصف کے برابر ہے۔

امام طحاویؒ کی یہ کتابیں کسی دوسرے متن پر شرح نہیں، متون احادیث کو آپ خود اپنی سند سے روایت کرتے ہیں اور ان پر اثر اور نظر ہر پہلو سے کلام کرتے ہیں. آپ پہلے امام ہیں جنہوں نے اس انداز سے شرح حدیث کا آغاز کیا. اس کے بعد مؤطا امام مالک اور سنن ابی داؤد پر تحقیقی کام شروع ہوا اور متن پر شرح کے پیرایہ ہیں. کتب حدیث کی شرحیں ہونے لگیں اور یہ سلسلہ میں پھر اتنی وسعت سے چلا کہ آج اسلامی کتب خانوں میں سب سے زیادہ کتابوں کا ذخیرہ شروح حدیث کا ہی ہے۔

ابو سلیمان الخطابی (۳۸۸ھ) نے سنن ابی داؤد پر معالم السنن لکھی. یہ چھپ چکی ہے۔

ابن حزم اندلسی (۴۵۷ھ) نے المحلی کے نام سے موطا کی نہایت جامع شرح آٹھ جلدوں میں لکھی۔ یہ بھی چھپ چکی ہے۔ اندلس کے ہی مایہ ناز عالم علامہ عبدالبر القرطبی (۴۶۳ھ) نے التمہید لما فی الموطا من المعانی والاسانید لکھی جس کی بارہ جلدیں وزارت اوقاف اور شئون اسلامی مراکش کی طرف سے چھپ چکی ہیں۔ کتاب تقریباً بیس جلدوں میں مکمل ہوگی۔ مؤلف نے اس کتاب کا ایک اختصار تجرید التمہید کے نام سے خود کیا ہے۔ جو چھپ چکا ہے۔

یہ شروح بہت پہلے دور کی ہیں۔ ان میں زیادہ تر حل الفاظ اور مشکلات اسانید پر زور دیا گیا ہے۔ بعد میں آنے والے شارحین اور طلبہ کے لیے یہ علمی مباحث شرح حدیث کا ابتدائی سرمایہ ہیں۔ ویسے لغات حدیث پر اس امت میں مستقل کام بھی ہوا ہے۔

شرح لغاتِ حدیث

ائمہ حدیث کی نظر جمع حدیث کے ساتھ ساتھ اس کے الفاظ غریبہ پر بھی بہت رہی ہے۔ الفاظِ غریبہ سے مراد وہ الفاظ ہیں جو قلیل الاستعمال ہوں۔ اگر عام استعمال بھی ہوتے ہوں، تو اس خاص معنی کی رو سے وہ قلیل الاستعمال ہوں۔ علماء حدیث نے ان کی تشریح و توضیح کے لیے خصوصی قلم اٹھایا ہے اور حق یہ ہے کہ اس باب میں محنت کا حق ادا کر دیا۔

سب سے پہلے ابوعبیدہ معمر بن المثنی تیمی (۲۱۰ھ) نے الفاظ غریبہ پر قلم اٹھایا پھر ابوالحسن مازنی (ھ) ابوسعید عبدالملک اصمعی (۲۱۶ھ) ابوعبید قاسم بن سلام (۲۲۴ھ) ابوالعباس ثعلب (ھ) اور علامہ المبرد (ھ) نے الکامل کی چار جلدوں میں غرائب الفاظ پر بحث کی ہے۔

اس باب میں شیخ مجدالدین بن المبارک بن عبدالکریم بن اثیر الجزری (۶۰۶ھ) کی کتاب النہایہ فی غریب الحدیث والاثر احادیث و آثار کی لغات پر نہایت مفید اور جامع کتاب ہے۔ اس کے بعد محدث جلیل شیخ طاہر فتنی (۹۸۶ھ) کی مجمع البحار سب کتابوں کی جامع اور گویا اس فن کی آخری کتاب ہے۔ یہ کتاب ہندوستان میں تین ضخیم جلدوں میں چھپی ہے۔

مفصل شروح حدیث کا ذکر

چھٹی صدی ہجری میں کتب حدیث کی مفصل اور طویل شرحوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔
ساتویں صدی میں شیخ محی الدین ابو زکریا یحییٰ بن شرف النووی الشامی (۶۷۶ھ) نے صحیح مسلم کی بہت عمدہ شرح لکھی جو بہت ہی مقبول ہوئی اور بارہا ہندوستان اور مصر و شام میں چھپ چکی ہے۔
اس وقت اس دور کی سب شروح کا تعارف کرانا پیش نظر نہیں۔ جو شرحیں لائبریریوں اور کتبخانوں میں ملتی ہیں اور طلبہ کو آسانی سے میسر آ سکتی ہیں۔ صرف انہی کا تعارف پیش کرنا ہے تاکہ وہ ان کی طرف مراجعت کر سکیں۔

① صحیح بخاری

صحت اور جامعیت میں اوّل درجے کی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس کی مشکلات حل کرنے کے لیے ان شروح کی طرف مراجعت کی جا سکتی ہے۔

① بہجۃ النفوس

اندلس کے مشہور محدث ابو محمد عبداللہ بن ابی جمرہ (۶۹۹ھ) کی شرح بخاری ہے سنہ ۱۳۵۷ھ میں مصر سے چار ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی۔

② شرح البخاری للزرکشی

شیخ ابو عبداللہ بدر الدین زرکشی مصری (۷۹۴ھ) کی تالیف ہے۔ چھ ضخیم جلدوں میں سنہ ۱۳۵۱ھ میں مصر سے شائع ہوئی۔

③ شرح البخاری للکرمانی

(ھ) کی یہ تالیف ۲۵ جلدوں میں ہے سنہ ۱۳۵۱ھ میں مصر سے شائع ہوئی۔

④ فتح الباری

للحافظ ابن حجر العسقلانی (۸۵۲ھ) صحیح بخاری کی بہترین شرح ہے۔ ہندوستان اور مصر

وغیرہ میں چھپ چکی ہے۔ بارہ ضخیم جلدوں میں ہے۔

⑤ عمدۃ القاری

للحافظ بدرالدین العینی (۸۵۵ھ) بہت دقیق اور محققانہ شرح ہے۔ مصر اور بیروت میں بارہا چھپ چکی ہے۔ ۲۶ جلدوں میں ہے۔ مصنف حنفی المسلک ہیں۔

⑥ ارشاد الساری

شہاب الدین القسطلانی (۹۲۳ھ) یہ گویا پہلی دو بڑی شرحوں کا ملخص ہے۔ مؤلف شافعی المسلک ہیں۔

⑦ تحفۃ الباری

شیخ الاسلام ابویحییٰ زکریا انصاری الخزرجی (۹۲۶ھ)

⑧ تیسیر القاری

شیخ نورالحق محدث دہلوی (۱۰۷۳ھ) یہ فارسی شرح شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۰۵۲ھ) کے بیٹے کی تالیف ہے۔ خاصی مقبول ہے۔

⑨ منح الباری شرح جامع صحیح بخاری

حافظ دراز (۱۲۶۳ھ) یہ فارسی شرح حافظ محمد احسن بن محمد صدیق المعروف بہ حافظ دراز کی ہے۔ آپ خوشاب کے رہنے والے تھے۔

⑩ عون الباری لحل ادلۃ البخاری

نواب صدیق حسن خاں نے تجرید بخاری للزبیدی کی دو جلدوں میں شرح کی ہے مطبع صدیقی بھوپال سے ۱۲۹۹ھ میں شائع ہوئی۔

⑪ لامع الدراری

شیخ رشید احمد گنگوہیؒ (۱۳۲۳ھ) حضرت گنگوہی کی تقریر بخاری کی شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ نے تفصیل کی ہے۔

⑫ فیض الباری

علامہ انور شاہ کشمیری (۱۳۵۱ھ) حضرت انور شاہ صاحبؒ کی یہ تقریر بخاری محدث کبیر

مولانا السید بدر عالم مدنی نے جمع کی ہے۔

⑬ فضل الباری

علامہ شبیر احمد العثمانی (۱۳۶۹ھ) یہ حضرت علامہ عثمانیؒ کی بخاری شریف کی تقریر ہے جس پر حضرت علامہ عثمانی نے خود نظر ثانی کی ہے۔ یہ اردو میں ہے اور اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو رہا ہے۔ دو اُردو جلدیں اور ایک انگریزی جلد چھپ چکی ہیں۔

⑭ ہدایۃ الباری الی ترتیب احادیث البخاری

سید عبدالرحیم الطہطاوی نے دو جلدوں میں لکھی۔ مطبع رغائب مصر نے ۱۳۴۰ھ میں اسے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔

⑮ نبراس الساری فی اطراف البخاری

محدث پنجاب حضرت مولانا عبدالعزیزؒ (گوجرانوالہ) کی عربی تالیف ہے۔ مطبع کریمی دہلی نے ۱۳۵۰ھ میں شائع کی۔ علماء میں بے حد مقبول ہوئی۔

⑯ امداد القاری لشرح صحیح البخاری

مراد آباد کے مشہور محدث مولانا عبدالجبار اعظمی یہ اردو شرح لکھ رہے ہیں۔ دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

علمائے حدیث نے صحیح بخاری کے کچھ حواشی بھی لکھے ہیں، جو طلبہ کے لیے بہت مفید ہیں صحیح بخاری ان حواشی کے ساتھ بارہا چھپ چکی ہے۔

① حاشیہ مولانا شیخ ابوالحسن السندھیؒ (۱۱۳۹ھ)

بلادِ عربی میں یہ حاشیہ بہت رائج ہے۔

② حاشیہ مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ (۱۲۹۷ھ)

آخری پانچ پارے کے حواشی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (۱۲۹۷ھ) کے قلم سے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں صحیح بخاری کا یہ نسخہ اور حاشیہ مقبول ترین حدیثی کتاب ہے۔ یہ اکابر علمائے دیوبند کی نہایت وقیع اور مقبول علمی خدمت ہے۔ دونوں شارح ایک ہی سال (۱۲۹۷ھ) میں فوت ہوئے۔

نوٹ: صحیح بخاری سے حدیث تلاش کرنے کے باب میں شیخ مصطفےٰ بیومی المصری کی کتاب

دلیل فہارس البخاری مطبع صاوی مصر نے ۱۳۵۲ھ میں شائع کی ہے۔ مفتاح کنوز السنۃ حدیث کی ۱۴ کتابوں کی کلید ہے۔ یہ مصر سے ۱۳۵۳ھ میں شائع ہوئی ہے۔ تراجم صحیح بخاری کی شرح میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی شرح تراجم اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ کی کتاب الابواب والتراجم بہت مفید کتابیں ہیں۔

حدیث کی جن دوسری کتابوں پر علمائے حدیث نے شرح حدیث کی محنت کی ہے۔ ان میں موطا امام مالک۔ صحیح مسلم۔ سنن ابی داؤد۔ موطا امام محمد۔ جامع ترمذی۔ طحاوی شریف اور مشکوٰۃ شریف سرفہرست ہیں۔ ان کے بعد کتب حدیث کے کچھ اور مفید حاشیوں کا ذکر ہوگا۔ جن پر طلبہ حدیث اعتماد کر سکتے ہیں۔

② صحیح مسلم

صناعت حدیث میں اول درجے کی کتاب ہے۔ بعض علماء نے اسے اس پہلو سے صحیح بخاری پر بھی ترجیح دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تدوین حدیث اور مطالعہ حدیث میں جو عظمت اور اہمیت صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو حاصل ہوئی اور کسی کتاب کو حاصل نہیں ہے۔ یہ الٰہی مقبولیت کا ایک کھلا نشان ہے۔ کوئی اور کتاب صحیحین کے اس مقام کو نہیں پا سکی۔ صحیح مسلم کی جو شرحیں متداول ہیں ان میں یہ زیادہ معروف ہیں:۔

① اکمال المعلم شرح صحیح مسلم

ابو عبداللہ محمد بن محمد بن یوسف السنوسی الحسنی (۸۹۵ھ) کی تالیف ہے۔ مؤلف اسے مکمل نہ کر سکے۔ شیخ ابی نے اسے مکمل کیا۔

②

القرطبی (۶۷۱ھ) عربی۔

③ شرح صحیح مسلم

امام محی الدین نووی (۶۷۶ھ) عربی۔

④ اکمال اکمال المعلم

علامہ اُبّی (۸۲۸ھ) نے سات جلدوں میں مکمل کی۔ مطبع سعادت مصر سے ۱۳۲۷ھ میں چھپ چکی ہے۔

⑤ فتح الملہم

نواب صدیق حسن خاں (بھوپال) کی تالیف ہے۔

⑥ فتح الملہم

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی (۱۳۶۹ھ) عربی

⑦ تفہیم المسلم

مولانا ہلال عثمانی دامت برکاتہم کی یہ شرح اردو میں ہے۔ حضرت مولانا عثمانی، حضرت علامہ بلیاوی، حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا سید بدر عالم مدنی کی مسلم شریف کی تقاریر کا مجموعہ ہے۔

③ سنن ابی داؤد السجستانی

حدیث کے فقہی سرمائے پر بے مثل تالیف ہے۔ علمائے حدیث نے ہر دور میں اس کتاب پر محنت کی اور اس پر شروح و حواشی لکھے ہیں۔

① معالم السنن

للعلامۃ الخطابی (۳۸۸ھ)

② عون المعبود

مولانا شمس الحق عظیم آبادی (ھ) چار جلدوں میں ہے۔ مطبع مجتبائی دہلی نے ۱۳۲۸ھ میں اسے شائع کیا۔

③ حاشیہ تصحیح کردہ

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ (۱۹۲۰ء)

④ بذل المجہود

مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری (۱۳۴۶ھ) پہلے میرٹھ (مطبع نامی) سے ۱۳۲۴ھ میں

پانچ ضخیم جلدوں میں چھپی تھی۔ اب مصر سے بیس جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

⑤ انوار المحمود

جمع کردہ مولانا الشیخ صدیق احمد۔ یہ حضرت مولانا انور شاہ صاحب۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری کی ابوداؤد پر کی گئی تقریرات کا مجموعہ ہے۔

⑥ حل ما قال ابوداؤد (اردو)

مولانا محمد حنیف گنگوہی کی تصنیف ہے۔ کئی جلدوں میں ہے اور بہت مفید اور بہت جامع کتاب ہے۔

⑦ کشف الودود لحل ما فی سنن ابی داؤد (عربی)

قاضی شمس الدین صاحب (گوجرانوالہ) کی نہایت مفید تالیف ہے۔

④ جامع ترمذی

متن کتاب خود حدیث کی ایک بڑی شرح ہے۔ سند حدیث پر کلام اس کے درجات کی نشاندہی اسانید کے اتصال و ارسال پر تنبیہ صحابہ کے عمل اور فقہاء کے مختلف مسالک پر محققانہ تبصرے اور ان کے تذکرے اس کتاب کی جان ہیں۔ تاہم علمائے حدیث نے اس پر بھی گرانقدر علمی اضافے فرمائے ہیں۔ اس کی گراں قدر شرحیں لکھی ہیں۔

① شرح الترمذی

لابن عربی المالکی (۵۴۶ھ) یہ شرح ۱۳ جلدوں میں ہے اور مصر سے ۱۳۵۰ھ میں شائع ہوئی۔

② الکوکب الدری امالی حضرت گنگوہی

شیخ رشید احمد گنگوہیؒ (۱۳۲۳ھ) حضرت گنگوہی کی تقریر ترمذی کو شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کے والد مرحوم مولانا محمد یحییٰ نے ضبط کیا ہے۔

③ العرف الشذی

للعلامہ انور شاہ (۱۳۵۱ھ) یہ حضرت شاہ صاحب کی جامع ترمذی پر ایک تقریر ہے۔

④ الطیب الشذی بشرح جامع الترمذی

یہ مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی (ھ) کی تالیف ہے افسوس کہ مؤلف اسے مکمل نہ کر سکے۔

⑤ تحفۃ الاحوذی

مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری (۱۳۵۲ھ) مؤلف ترکِ تقلید کا مسلک رکھتے ہیں۔

⑥ معارف السنن

مولانا محمد یوسف بنوریؒ (۱۳۹۵ھ) چھ جلدیں چھپ چکی ہیں۔ دسویں جلد بھی مکمل ہے۔ مگر افسوس کہ درمیانی تین جلدیں مکمل نہ ہو سکیں۔

⑦ شرح ترمذی

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق (اکوڑہ خٹک) کی نہایت مفصل اور مفید شرح ہے اس کا نام حقائق السنن ہے حضرت الشیخ کے امالی آپ کے بعض تلامذہ نے جمع کیے ہیں۔

⑤ موطا امام مالکؒ (۱۷۹ھ)

① المحلی بشرح الموطا

لابن حزم الاندلسیؒ (۴۵۶ھ)

② التمہید لما فی الموطا من المعانی والاسانید

لابن عبدالبر مالکیؒ (۴۶۳ھ)

③ المنتقی بشرح الموطا

قاضی ابو الولید المعروف بابن الباجی کی تالیف ہے۔ مطبع سعادت مصر سے ۱۳۳۱ھ میں سات جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

④ زرقانی شرح موطا

محمد بن عبدالباقی الزرقانی کی یہ شرح آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے۔

⑤ تنویر الحوالک بشرح موطا مالک

امام جلال الدین سیوطیؒ (۹۱۱ھ)

⑥ المصفیٰ والمسوّیٰ کلاہما

للشیخ ولی اللہ المحدث والدہلویؒ (ھ)

⑦ اوجز المسالک بشرح موطا مالک

لشیخ الحدیث مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم

⑥ موطا امام محمدؒ (۱۸۹ھ)

① شرح

ملا علی قاریؒ (۱۰۱۴ھ)

② التعلیق الممجد

حاشیہ مولانا عبدالحی لکھنویؒ (ھ)

⑦ کتاب الآثار امام محمد

① شرح

ملا علی قاری (ھ)

② شرح

مفتی مہدی حسنؒ

③ حاشیہ

مولانا عبدالباریؒ (فرنگی محل)

⑧ شرح معانی الآثار للطحاوی (۳۲۱ھ)

① شرح حافظ بدرالدین العینیؒ (۸۵۵ھ)

② امانی الاحبار

مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ

⑨ مشکوٰۃ شریف للخطیب التبریزی (۷۴۲ھ)

① ۔ الکاشف عن حقائق السنن

علامہ حسن بن محمد الطیبی (۷۴۳ھ) الاستاذ لصاحب المشکوٰۃ۔ افسوس کہ یہ شرح عظیم ابھی تک منت پذیر طباعت نہیں ہو سکی۔

② ۔ الکاشف کی تلخیص علامہ سید شریف نے کی جو بعد کے بہت سے شارحین مشکوٰۃ کا ماخذ ہے

③ مرقات المفاتیح

ملا علی القاری (۱۰۱۴ھ)

④ لمعات التنقیح

شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۰۵۲ھ)

⑤ اشعۃ اللمعات

شرح فارسی للشیخ الدہلوی (۱۰۵۲ھ)

⑥ مظاہر حق (اردو)

نواب قطب الدین دہلوی (۱۲۸۹ھ)

⑦ التعلیق الصبیح

مولانا محمد ادریس کاندھلوی (ھ)

⑧ مرعاۃ المفاتیح ۔ مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری۔

⑩ شرح جامع صغیر للسیوطی (۹۱۱ھ)

① سراج المنیر

تالیف ۱۰۴۵ھ علامہ علی بن شیخ احمد العزیزی

② فیض القدیر

للعلامہ عبدالرؤف المناوی۔ چھ جلدوں میں ہے۔

جامع ترمذی (۲۷۹ھ) کے حواشی

۱۔ امام سیوطی کی شرح قوت المغتذی کی تلخیص نفع قوت المغتذی بصورت حاشیہ کتاب کے ساتھ مطبوع ہے اور عام ملتی ہے

۲۔ علامہ ابوالحسن السندھی کا حاشیہ۔ ۳۔ شیخ احمد بن محمد شاکر کی تعلیقات ، علی جامع الترمذی۔

۴۔ حواشی از تقریر حضرت شیخ الہند رح

سنن نسائی (۳۰۳ھ) کے حواشی

۱۔ تعلیق زہر الربی علی المجتبی للامام السیوطی (۹۱۱ھ)

۲۔ حاشیہ شیخ عبدالہادی السندھی (۱۱۳۸ھ)

۳۔ حاشیہ مولوی وصی احمد کانپوری ۴۔ حاشیہ مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی رح

سنن ابن ماجہ (۲۷۳ھ) کے حواشی

۱۔ شرح حافظ مغلطائی الحنفی (۷۶۴ھ) ۲۔ شرح ابن رجب حنبلی (۷۹۵ھ)

۳۔ نور مصباح الزجاجہ للشیخ المغربی۔ امام سیوطی کی شرح مصباح الزجاجہ کی تلخیص ہے۔

۴۔ انجاح الحاجہ للشیخ عبدالغنی بن ابی سعید المجددی (۱۲۹۵ھ)

۵۔ حاشیہ حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی۔ یہ عام ملتا ہے

اب کچھ دیگر کتب حدیث کے حواشی کا ذکر بھی سن لیجئے :۔

① المصنف لعبد الرزاق المحدث (۲۱۱ھ)

حاشیہ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی۔ گیارہ جلدوں میں کتاب ہے۔

② المصنف لابن ابی شیبۃ (۲۳۵ھ)

حاشیہ ۳ جلد از مولانا عبدالخالق الافغانی ——— مکمل تحقیق از مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی۔

③ سنن دارمی (۲۵۵ھ) حاشیہ از

④ سنن دارقطنی (۳۸۵ھ) حاشیہ از مولانا شمس الحق عظیم آبادی۔

⑤ مستدرک حاکم

حاشیہ پر علامہ ذہبی کی تلخیص ہے جس کا نام تلخیص المستدرک ہے۔

⑨ سنن کبریٰ بیہقی

حاشیہ پر علامہ ابن ترکمانی کی کتاب الجوہر النقی ہے۔ علامہ ترکمانی حنفی مسلک کے ہیں جگہ جگہ امام بیہقی پر تنقید کرتے ہیں۔

حدیث کی فارسی شروح

صحیح بخاری کی شروح میں شیخ نورالحق محدث دہلوی (۱۰۷۳ھ) کی شرح تیسیر القاری کا ذکر آچکا ہے۔ مشکوٰۃ کی شروح میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۰۵۲ھ) کی شرح اشعۃ اللمعات کا ذکر آچکا ہے شیعہ کی کافی کلینی کا فارسی ترجمہ خلیل قزوینی نے کیا ہے اور من لایحضرہ الفقیہ کا ترجمہ ملاتقی مجلسی اوّل نے کیا ہے۔

مذکورہ بالا شروح و حواشی کے ذکر میں گو بہت سی اردو شروح کا ذکر بھی آچکا ہے۔ لیکن اردو دان طبقہ کو خصوصی طور پر ادھر متوجہ کرتے ہوئے حدیث کی اردو شرح کا علیحدہ ذکر بھی کیا جاتا ہے۔

حدیث کی اردو شروح

① صحیح بخاری

① تیسیر الباری ——— مولانا وحید الزمان کے ترجمہ کے ساتھ اس کی مفصل اردو شرح ہے۔ مؤلف ترک تقلید کا مسلک رکھتے ہیں۔

② فضل الباری بشرح صحیح البخاری ——— یہ شرح شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی بخاری شریف کی تقریرات کا مجموعہ ہے۔ جو حضرت کی نظر ثانی سے گزر چکا ہے۔ یہ کتاب کراچی میں چھپ رہی ہے۔ تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

② صحیح مسلم

مولانا فضل الرحمٰن بلال عثمانی فاضل دیوبند و مدینہ یونیورسٹی تفہیم المسلم کے نام سے مسلم شریف کی جامع اردو شرح لکھ رہے ہیں۔

③ شرح ماقال ابو داؤد

مولانا محمد حنیف گنگوہی کی تالیف ہے اور بہت مفید کتاب ہے۔

④ تقریر ترمذی

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی ترمذی شریف کی تقریرات کا مجموعہ ہے۔

⑤ شمائل الترمذی

خصائل نبویؐ اردو شرح شمائل ترمذی از شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ۔

⑥ شرح معانی الآثار للطحاوی

ہم تراجم میں اس کا ذکر کر آئے ہیں۔ یہ صرف ترجمہ نہیں، ساتھ ساتھ ایک مختصر شرح بھی ہے۔ مطبع اسلامیہ لاہور نے ۱۹۱۳ء میں اسے چار جلدوں میں شائع کیا ہے۔

⑦ مشکوٰۃ شریف

نواب قطب الدین دہلویؒ نے حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ کے اردو ترجمہ مشکوٰۃ کو ساتھ لے کر یہ اردو شرح مشکوٰۃ مظاہر حق کے نام سے مرتب اور شائع کی ہے۔ پانچ ضخیم جلدوں میں ہے۔

⑧ فقہ السنن والآثار

کے نام سے مفتی محمد عمیم الاحسان المجددی نے ایک ذخیرہ حدیث مرتب کیا ہے۔ جو مطبع مجیدیہ کانپور سے ۱۳۷۳ھ میں شائع ہو چکا ہے۔ علم حدیث پر ایک مفید کام ہے۔

یہ کتابیں ان کتابوں کے علاوہ ہیں۔ جو اردو میں مستقل کتابوں کی حیثیت سے حدیث پر لکھی گئیں۔ ان کا ذکر کتب حدیث کی بحث میں پہلے آ چکا ہے۔ جیسے ترجمان السنۃ للشیخ بدر عالم المدنیؒ اور معارف الحدیث للشیخ محمد منظور نعمانی دامت برکاتہم

حدیث کی انگریزی شروح

حدیث کے انگلش لٹریچر میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کی کتاب فضل الباری کا انگریزی ترجمہ سر فہرست ہے پہلی جلد صفحات پر مشتمل ہے اور شائع ہو چکی ہے اسکا مقدمہ حکیم الاسلام قاری محمد طیب قدس اللہ سرہ العزیز نے لکھا ہے اور وہ بھی انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے صحیح مسلم کا انگریزی ترجمہ جناب عبدالحمید صاحب نے کیا ہے اور جگہ جگہ تشریحی نوٹ لکھے ہیں اس کا ذکر ہم تراجم میں بھی کریں گے۔

تراجمِ حدیث

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ۔ اما بعد :-

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر بڑا احسان فرمایا کہ ملکِ عرب میں ایک پیغمبر انہی میں سے مبعوث فرمایا جس نے انہیں اللہ کی آیات سنائیں۔ اپنے فیضِ صحبت سے ان کے دلوں کو پاکیزگی بخشی اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دی۔ واقعی وہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں گھرے ہوتے تھے۔

آپ کے اصحاب آپ کے فیضِ صحبت سے تزکیہ کی دولت پا گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیئے کلمہ تقوےٰ اور پرہیزگاری لازمی کر دی اور بے شک وہی اس کے زیادہ حقدار اور اہل تھے اور اللہ تعالیٰ ہر آئندہ چیز کو بھی جاننے والے ہیں۔

قرآن کریم حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر عربی میں نازل ہوا حضورؐ کی اپنی زبان عربی تھی۔ آپ کی احادیث اور تعلیمات سب عربی میں ہوتی تھیں۔ لیکن چونکہ آپ کا دین عالمگیر تھا اور آپ کی دعوت کل اطرافِ عالم اور جملہ اقوام و اُمم کو شامل تھی۔ اس لیئے ضروری تھا کہ غیر عرب قوموں کو دین کی دعوت ان کی اپنی زبان میں دی جائے۔ انہیں دین کو اپنی زبان میں سمجھنے کی جملہ سہولتیں مہیا کی جائیں جو لوگ اس دعوتِ حق کو قبول کر لیں۔ انہیں پھر عربی قرآن پڑھایا جائے۔ عربی نماز سکھائی جائے۔ کیوں کہ عربی اسلام کی سرکاری زبان ہے۔ لیکن اس کے علاوہ انہیں دین سیکھنے کے جملہ مواقع ان کی اپنی زبانوں میں بہم پہنچائے جانے چاہئیں۔ اس غرض سے ترجموں کی ضرورت محسوس ہوئی اور دین کی دعوت اور تعلیم ان قوموں کی اپنی زبانوں میں اُترنی شروع ہوئی۔ یہ غلط ہے کہ علماء کرام ابتداء

میں ترجمہ کرنے کی اجازت کے خلاف تھے۔ علم سیکھنا ایک فطری طلب ہے اور علماء اسلام طلب کے فطری تقاضوں سے آنکھیں بند نہ کر سکتے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام کی سرکاری زبان عربی ہے۔ ہر عربی، عجمی، زنگی، افرنگی اسلام کا کلمہ، نماز وغیرہ سب عربی میں ہی سیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ لیکن جہاں تک دین کی عام تعلیمات کا تعلق ہے انہیں کسی بھی زبان میں جانا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ اور یہ صحیح ہے کہ علم کی اپنی کوئی زبان نہیں، علم ہر زبان کا لباس پہن سکتا ہے۔ اسلام کی تعلیمات ہر زبان اور ہر ماحول میں ڈھل سکتی ہیں۔ اور اسے ہر خطۂ ارضی کی ضرورت کے مطابق کسی زبان میں بھی ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔ اسلام میں اس کی پوری گنجائش موجود ہے۔

مدینہ کے مضافات میں رہنے والے یہود گو عربی زبان بولتے تھے۔ لیکن اپنی اسرائیلی زبان (عبرانی) کا بھی پورا تحفظ کرتے تھے۔ جب لکھتے تو عبرانی میں ہی لکھتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انہیں کوئی خط لکھنا ہوتا تو اسے عبرانی میں ہی لکھواتے۔ آپ نے حضرت زید بن ثابتؓ کو عبرانی سیکھنے کا حکم دیا۔ اور انہوں نے پندرہ دن میں مہارت پیدا کر لی تھی۔ آپ کہتے ہیں:۔

امرنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتعلمت لہ کتاب یہود وقال انی واللہ ما امن یہود علی کتابی فلم یمر بی نصف شہر حتی حذقتہ فکنت اکتب لہ اذا کتب واقرأ لہ اذا کتب الیہ[1]

ترجمہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں آپ کے لئے یہود کی کتابت سیکھوں۔ اور فرمایا مجھے اپنے خطوط کے سلسلہ میں یہودیوں کی کتابت پر اعتماد نہیں۔ پس میں نے سیکھنا شروع کیا۔ نصف مہینہ گزرنے نہ پایا تھا کہ میں نے اس میں مہارت پیدا کر لی۔ چنانچہ میں آپ کی طرف سے یہود کو لکھا کرتا تھا اور جب آپ کی طرف خط آتے تو میں آپ کو پڑھ کر سنا دیتا تھا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ دوسری زبانوں میں ترجموں کا آغاز خود عہدِ رسالت میں ہی ہو

---

[1] سنن ابی داؤد جلد ۲ صہ ۱۵۳

گیا تھا اور آپ نے خود اس کی تعلیم دی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت عبداللہ بن عباسؓ جب حدیث کا درس دیتے تو ابوجمرہ نصر بن عمرانؒ تابعی کو اپنے ساتھ تخت پر بٹھلاتے۔ ابوجمرہ مترجم کے فرائض سرانجام دیتے اور عربی سے فارسی میں ترجمہ کرتے تھے[1] حضرت عبداللہ بن عباسؓ بصرہ میں مقیم تھے۔ بصرہ کی سرحدیں ایران سے ملتی ہیں ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں ترجمہ کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہو گی اور صحابہ کرامؓ اس اصولی ضرورت سے بے خبر نہ تھے حضرت ابن عباسؓ نے اسی لیئے اپنے ساتھ مترجم بٹھایا تھا۔

غیر عرب ملکوں میں ایران پہلا ملک ہے جو اسلام کے جھنڈے تلے آیا۔ اور فارسی پہلی زبان ہے جس میں قرآن و حدیث کے پہلے ترجمے ہوئے۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے سورۂ فاتحہ کا پہلا فارسی ترجمہ کیا ___ جسے ایرانی لوگ اس وقت تک جب تک کہ ان کی زبانیں عربی آشنا نہ (مانوس) ہو گئیں نماز میں پڑھتے تھے۔ علامہ سرخسی لکھتے ہیں:۔

فکانوا یقرأون ذلك فی الصلوٰة حتی لانت السنتهم للعربیة[2]

ترجمہ۔ سورہ اس فارسی ترجمے کو نماز میں پڑھتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی زبانیں عربی سے مانوس ہو گئیں۔

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ بھی فارسی زبان جانتے تھے[3]۔

حدیث کے پہلے فارسی ترجمے

(۱) ترجمہ مشکوٰۃ

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (۱۰۵۲ھ) نے مشکوٰۃ کا ترجمہ اشعۃ اللمعات کے نام سے چار ضخیم جلدوں میں تحریر فرمایا۔ ساتھ ساتھ تشریحی نوٹ بھی لکھے۔ ہندوستان اور افغانستان میں اس کے ذریعہ حدیث کی بڑی خدمت ہوئی۔ حضرت شیخ عبدالحقؒ سندھ کے مشہور بزرگ شیخ عبدالوہاب متقی کے شاگرد تھے اور وہ شیخ علاؤالدین علی المتقی (۹۷۱ھ) مؤلف کنز العمال کے شاگرد تھے۔

---

[1] فضل الباری جلد ۱ ص ۴۹۵ [2] المبسوط جلد ۱ ص ۳۷ [3] دیکھئے مسند امام احمد جلد ۵ ص ۱۸۲

۲) ترجمہ صحیح بخاری

شیخ نورالحق محدث دہلویؒ بن شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (۱۰۷۳ھ) نے تیسیرالقاری کے نام سے صحیح بخاری کا فارسی میں بہت عمدہ ترجمہ کیا۔ ساتھ ساتھ ضروری شرح بھی کی ہے۔ اس کتاب سے ہندوستان میں علم حدیث کی بڑی اشاعت ہوئی۔ پاک و ہند کے اساتذۂ حدیث ترجمہ صحیح بخاری کے لیئے اس پر بڑا اعتماد کرتے رہے ہیں۔

۳) ترجمہ صحیح مسلم

شیخ نورالحق محدث دہلویؒ (۱۰۷۳ھ) نے منبع العلم کے نام سے صحیح مسلم کا پہلا فارسی ترجمہ کیا۔ افسوس کہ اس ترجمے کی ہندوستان میں زیادہ اشاعت نہ ہوسکی۔

۴) ترجمہ مؤطا امام مالک

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۱۷۶ھ) نے المصفیٰ کے نام سے موطا امام مالک کا پہلا فارسی ترجمہ کیا۔ ساتھ ساتھ شرح بھی تحریر فرمائی۔ مدرسہ رحیمیہ دہلی کی علم حدیث میں یہ ممتاز خدمت ہے۔ المصفیٰ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی عربی شرح موطا المسویٰ کے ساتھ ہندوستان میں بارہا چھپا ہے۔

۵) شیعہ کتب حدیث کے فارسی ترجمے

۱) ملا قزوینی نے علامہ محمد بن یعقوب الکلینی (۳۲۹ھ) کی کتاب الکافی (ایران سے آٹھ جلدوں میں شائع ہوئی ہے) کا ترجمہ الصافی کے نام سے لکھا ہے۔ جسے ہندوستان میں مطبع منشی نولکشور نے اصول کافی تک چار ضخیم جلدوں میں شائع کیا ہے مترجم کا نام ملا محمد خلیل ہے۔

۲) من لایحضرہ الفقیہ مؤلفہ شیخ صدوق ابن بابویہ القمی (۳۸۱ھ) کا ترجمہ ملا محمد تقی المجلسی (۱۰۷۰ھ) نے شرح الفقیہ کے نام سے کیا ہے۔ ساتھ ساتھ شرح بھی ہے۔ مترجم مشہور شیعہ مصنف ملا باقر مجلسی کے والد تھے۔ یہ فارسی شرح چار ضخیم جلدوں میں ایران سے شائع ہوئی ہے۔

حدیث کے اردو تراجم

۱) **ترجمہ مشکوٰۃ** یہ حدیث کا پہلا اردو ترجمہ ہے جو ہندوستان میں کیا گیا۔

حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ جو حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کے نواسے اور جانشین تھے۔ انہوں نے مشکوٰۃ کا ترجمہ سادہ اردو میں کیا۔ یہ اردو زبان کی وضع و نشر کا پہلا دور تھا۔ ساتھ ساتھ حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب کے نامور شاگرد حضرت نواب قطب الدینؒ محدث دہلوی (۱۸۶۷ء) نے اس کی اردو شرح لکھی۔ مشکوٰۃ کی یہ فاضلانہ مکمل شرح مظاہر حق پانچ ضخیم جلدوں میں ہے اور عام ملتی ہے۔

مظاہر حق کو زیادہ مفید بنانے کے لئے علماء فرنگی محل کے ایک مستند عالم مفتی عنایت اللہ صاحب مرحوم نے مشکوٰۃ کے راویوں کے حالات الھدیۃ المزجاۃ لقراء المشکوٰۃ کے نام سے اردو میں قلمبند کیے ہیں۔ یہ مظاہر حق کے چوتھے ایڈیشن کے ساتھ چھپے ہیں۔

مظاہر حق کی اردو بہت ابتدائی دور کی تھی۔ دیوبند کے مولانا عبد اللہ جاوید غازی پوری نے زبان پر نظرثانی کرتے ہوئے مظاہر حق کا ایک جدید اڈیشن تیار کیا ہے۔ جو مطبع سے جلدوں میں چھپ چکا ہے۔

(۲) ترجمہ صحیح بخاری

(۱) ترجمہ مولانا وحید الزمان حیدر آبادی۔ یہ ترجمہ عربی متن کے ساتھ بارہا شائع ہوا ہے۔

(۲) ترجمہ مرزا حیرت دہلوی۔

(۳) ترجمہ سید تائب حسین نقوی۔ یہ ترجمہ عربی متن کے ساتھ شیخ غلام علی اینڈ سنز نے تین ضخیم جلدوں میں ۱۹۶۲ء میں شائع کیا۔ تعارف مولانا غلام رسول مہر نے لکھا ہے اور ترجمے پر نظرثانی کی تصدیق مولانا محمد علی صاحب سابق خطیب سنہری مسجد لاہور کی ہے۔

(۴) ترجمہ مولانا امیر علی صاحب۔ مترجم نے ہدایہ اور فتاوے عالمگیری کے بھی اردو ترجمے کیے۔ جو بہت مشہور رہیں۔ مگر افسوس کہ ان کا ترجمہ صحیح بخاری زیادہ شہرت حاصل نہیں کر سکا۔

(۵) ترجمہ قاری عادل خاں۔ قمر سعید پبلشرز نے تین جلدوں میں شائع کیا ہے۔

(۶) ترجمہ مولانا عبد الرزاق صاحب۔ مترجم حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کے خاص شاگرد ہیں۔ آپ کے اس ترجمہ کو ناشران قرآن اردو بازار لاہور نے شائع کیا ہے۔

سنن دارمی کا اردو ترجمہ

محمد سعید اینڈ سنز قرآن محل کراچی نے اسے شائع کیا ہے۔ مترجم کا نام مذکور نہیں۔ ایک جلد میں مکمل ہے۔

صحیح مسلم کے اردو تراجم

① مولانا وحید الزمان صاحب نے صحیح مسلم کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ ساتھ ساتھ کچھ شرح بھی ہے۔ متوسط تقطیع کی چھ جلدوں میں ۱۳۰۶ھ میں مطبع صدیقی لاہور سے شائع ہوا۔

② مولانا عابد الرحمٰن صدیقی کاندھلوی نے کہیں کہیں مختصر فوائد بھی لکھے ہیں۔ قرآن محل بالمقابل مولوی مسافر خانہ کراچی نے اسے تین ضخیم جلدوں میں شائع کیا ہے۔

③ تجرید صحیح مسلم کا ترجمہ مولانا محمد مالک کاندھلوی نے کیا ہے۔ جسے ملک دین محمد نے لاہور سے شائع کیا ہے۔

④ مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی۔ یہ اردو ترجمہ مسلم شریف کی اردو شرح کے ضمن میں ہے علیحدہ نہیں چھپا۔ بہت مفید ترجمہ ہے۔

سنن ابی داؤد اردو

مولانا وحید الزمان نے ترجمہ کیا ہے۔ مولانا سبحان محمود نے کہیں کہیں حواشی لکھے ہیں قرآن محل کراچی نے سعیدی پریس سے تین جلدوں میں چھپوا کر شائع کیا ہے۔

جامع ترمذی کا اردو ترجمہ

① مولانا فضل احمد انصاری دلاوری نے حامل المتن ترجمہ دو جلدوں میں مکمل کیا۔ سرِ لوح عربی متن ہے اور ذیل میں اردو ترجمہ ہے۔ ۱۳۰۹ھ میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ ۱۳۲۹ھ میں چوتھا اڈیشن نکلا۔ مطبع منشی نولکشور لکھنؤ نے اسے شائع کیا۔ بار بار چھپتا رہا ہے۔

② مولانا بدیع الزمان نے جائزۃ الشعوذی کے نام سے یہ ترجمہ لکھا ہے۔ جناب محمد علی صاحب مالک کارخانہ اسلامی کتب خان محل کراچی نے اسے تین جلدوں میں شائع کیا ہے۔

شمائل ترمذی

① مولانا نور احمد صاحب پسروری ثم امرتسری نے شمائل ترمذی کا پہلا اردو ترجمہ کیا۔ جو ۱۳۴۰ھ میں الیکٹرک پریس امرتسر سے شائع ہوا۔ مولانا نور احمد حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب بانی جامعہ اشرفیہ لاہور کے استاد تھے۔

(۲) شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم نے خصائل نبوی شرح شمائل ترمذی کے ضمن میں اس کا دوسرا ترجمہ لکھا ہے۔ بہت مفید اور دلکش ہے۔

سنن نسائی کا اردو ترجمہ

یہ ترجمہ حافظ عبدالستار صاحب اور دوست محمد شاکر نے مل کر کیا ہے۔ دو جلدوں میں ہے اور اسے فرید بک سٹال لاہور نے شائع کیا ہے۔

موطا امام مالک کے اردو تراجم

بہترین ترجمہ میر محمد کتب خانہ مرکز علم و ادب نے دو جلدوں میں کراچی سے شائع کیا ہے۔ عربی متن ساتھ ہے۔

موطا امام محمد کا اردو ترجمہ

یہ ترجمہ قرآن محل کراچی نے شائع کیا ہے۔ عربی متن ساتھ ہے۔ مترجم کا نام مذکور نہیں۔

کتاب الآثار امام محمد کا اردو ترجمہ

یہ ترجمہ بھی قرآن محل نے شائع کیا ہے۔ مترجم کا نام مذکور نہیں۔

طحاوی شریف اردو

مطبع اسلامیہ لاہور نے ۱۹۱۳ء میں اسے چار جلدوں میں شائع کیا ہے۔ مترجم کا نام مذکور نہیں۔ تصحیح مولوی حکیم عبدالرشید لاہوری نے کی ہے۔ اچھا ترجمہ ہے۔

سنن ابن ماجہ اردو

مولانا وحیدالزمان کا یہ ترجمہ اہل حدیث اکیڈمی لاہور نے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔

ریاض الصالحین اردو

امام نووی کی اس شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ مولانا خلیل الرحمٰن نعمانی نے کیا ہے۔

کتاب الاذکار

امام نووی کی اس کتاب کا ترجمہ مولانا حبیب الرحمٰن صدیقی نے کیا ہے اور قرآن محل کراچی نے اسے شائع کیا ہے۔

زاد المعاد اردو

امام ابن قیم کی اس کتاب کا ترجمہ نفیس اکیڈمی کراچی نے چار جلدوں میں شائع کیا ہے

ترجمہ رئیس احمد جعفری نے کیا ہے۔

درر فوائد اردو ترجمہ جمع الفوائد

مولانا عاشق الٰہی نے یہ ترجمہ کیا ہے۔ جمع الفوائد جیسی عظیم کتاب کو اُردو میں لے آنا ایک بڑا کام ہے۔

کتاب الکبائر اردو

حافظ ذہبی کی اس کتاب کا ترجمہ حکیم محمد نواز ملتانی نے عمدۃ الذخائر کے نام سے کیا ہے۔ جسے جمیل بک ڈپو سرگودھا نے شائع کیا ہے۔

انتخاب صحاح ستّہ

یہ ترجمہ مولانا امجد علی نے کیا ہے۔ جسے قرآن محل کراچی نے شائع کیا ہے۔

کنز الآثار مترجم اردو

یہ ترجمہ حکیم محمد نذیر صاحب عرشی نقشبندی نے کیا ہے۔ کریمی پریس لاہور نے ۱۹۲۷ء میں اسے طبع کیا ہے۔

ترجمہ اعلاء السنن

حدیث کی مشہور کتاب اعلاء السنن کی احادیث متن کا اردو ترجمہ مولانا ظفر احمد عثمانی نے کیا ہے۔ جو اعلاء السنن کی پہلی اشاعت میں عربی متن کے ساتھ شائع ہوتا رہا ہے۔

ان تراجم کے علاوہ یہاں وہ اردو کتابیں بھی قابل ذکر ہیں۔ جو اردو میں نئی ترتیب سے لکھی گئیں اور ان کے ذریعہ ہزارہا احادیث اردو میں ترجمہ ہوئیں۔ پہلے کچھ ان کا ذکر ہو چکا ہے

ترجمان السنّہ مولانا بدر عالم میرٹھی

چار ضخیم جلدوں میں ہے۔ دار المصنفین دہلی نے اسے شائع کیا۔ پھر یہ متعدد بار چھپ چکی ہے۔

معارف الحدیث مولانا محمد منظور نعمانی

بہت جامع کتاب ہے۔ سات جلدیں چھپ چکی ہیں۔ اس میں عظیم ذخیرۂ حدیث آگیا ہے۔

اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو رہا ہے۔

علم حدیث کی یہ اردو تصنیفات زیادہ تر حنفی مسلک کے مطابق ہیں۔ اور ان کی اس ترتیب میں جدید تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یہ بات بھی لائق ذکر ہے۔ کہ مسند امام اعظم بھی اردو میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ قرآن محل کراچی نے اسے شائع کیا ہے۔

حدیث کے انگریزی ترجمے

① ترجمہ صحیح بخاری

ڈاکٹر محمد محسن خاں (اسلامیہ یونیورسٹی مدینہ منورہ) کا یہ ترجمہ رابطہ عالم اسلامی کے اہتمام سے نو جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ یورپ میں صحیح بخاری سب سے پہلے فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوئی تھی اور مستشرقین اسی سے استفادہ حاصل کرتے رہے۔ یہ انگریزی ترجمہ بہت بعد کا ہے۔ اور سب سے پہلے ـــــــ میں شائع ہوا۔

② فضل الباری شرح صحیح بخاری

صحیح بخاری کے امالی للشیخ شبیر احمد عثمانی ر کا انگریزی میں ترجمہ ہو رہا ہے۔ پہلی جلد چھپ چکی ہے اور صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے ضمن میں صحیح بخاری کا نیا انگریزی ترجمہ ساتھ ساتھ ہے حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کا علم حدیث پر بسیط مقدمہ بھی اس میں آ گیا ہے۔

③ ترجمہ صحیح مسلم

جناب عبدالحمید صاحب صدیقی نے اسے چار جلدوں میں مکمل کیا ہے کہیں کہیں ضروری حواشی بھی لکھے ہیں۔ اشرف پبلیکیشنز لاہور نے اسے شائع کیا ہے۔ انگریزی میں صحیح مسلم کا یہ پہلا ترجمہ ہے۔

④ ترجمہ مشکوٰۃ

① مانچسٹر یونیورسٹی کے پروفیسر جیمز رابسن نے مکمل مشکوٰۃ کا انگریزی ترجمہ کیا ہے اور جسے اشرف پبلیکیشنز لاہور نے چار جلدوں میں بارہا شائع کیا ہے۔

② مولانا فضل کریم کا یہ انگریزی ترجمہ حیدر آباد سے ۵ جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ افسوس کہ مترجم نے مشکوٰۃ کی ترتیب قائم نہیں رکھی، اس ترجمہ کو نئی ترتیب دی ہے۔

برصغیر پاک وہند میں کتب حدیث کے تراجم صرف اردو میں ہی نہیں ۔ بنگلہ پشتو سندھی برمی گجراتی اور بلوچی کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں متعلقہ علاقوں میں ان تراجم کی خاصی اشاعت ہے ۔

مولانا شمس الحق فرید پوری علمائے دیوبند میں ممتاز شہرت کے مالک تھے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے خلیفہ ہونے کی جہت سے آپ روحانی عقیدتمندوں کا مرکز رہے ہیں آپ نے صحاح ستہ کی چند کتابوں کا ترجمہ بنگلہ میں بڑے اہتمام سے کیا ہے یہ تراجم چھپ چکے ہیں اور ان سے پورا بنگال علم نبوت سے مستفید ہو رہا ہے ۔

پشتو میں مشکوٰۃ کا ترجمہ ہو چکا ہے سندھی میں تفسیر وحدیث کا خاصا مواد موجود ہے ۔

ترجمہ اربعین نووی :

افغانستان کے صوبہ ننگرہار (جلال آباد) کے مولانا عزیز الرحمٰن نے اربعین امام نووی کا ترجمہ فصیح پشتو میں کیا ہے ۔

(نوٹ) افغانستان میں علمی کام زیادہ تر فارسی اور عربی میں ہے ۔ پشتو بول چال میں زیادہ ہے ، لیکن لکھنے میں اور سرکاری دستاویزات میں فارسی کا زیادہ استعمال ہے حکومت افغانستان نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے ترجمہ قرآن اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کی تفسیر کو آرٹ پیپر پر فارسی میں تین ضخیم جلدوں میں شائع کیا ہے ۔ بدخشاں کے علامہ کوثری جو افغانستان میں ترکئی کے برسر اقتدار آنے کے بعد شہید کئے گئے ۔ انہوں نے صحیح بخاری کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے ۔ جو بہت نفیس اور صحیح ہے ۔ علامہ کوثری نے تفسیر بیضاوی کی بھی نہایت عمدہ شرح لکھی ہے لیکن وہ فارسی یا پشتو میں نہیں عربی میں ہے ۔ کابل کے اس دور کے عظیم مؤلف صلاح الدین سلجوقی ہیں ۔ انہوں نے فارسی اور پشتو دونوں زبانوں میں دین کی بہت خدمت کی ہے ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ائمہ حدیث

مقدمہ

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ۔

بآں گروہے کہ از ساغر وفا مستند ؎ سلام برسانید ہر کجا ہستند

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیماتِ قدسیہ میں فطرت اور عقیدت کی وہ جاذبیت پائی گئی کہ اُن کے گرد اہلِ علم کا ایک عظیم گروہ پُوری عقیدت سے حق وحفاظت کا پہرہ دینے لگا اور علُوم دینی کی یہ جاذبیت دن بدن بڑھتی رہی اور ہر دَور میں قائم رہی۔ کوئی دور ایسا نہ آیا جب سُننِ نبوی پر لوگ پروانہ وار نچھاور نہ ہوتے ہوں۔

خدمتِ حدیث کے مختلف دائرے

چند اہلِ علم اُٹھے اور اُنہوں نے روایت Tradition اور فنِ روایت Science of transmission کو اپنی محنت کا موضوع بنایا اور کچھ لوگ اُس کے رجال Chain of transmitters کی تحقیق میں لگ گئے اور ہر کھرے کھوٹے کا کھوج لگایا۔ پھر ایسے اہلِ علم بھی اُٹھے جو احادیث کے معانی ومطالب کی گہرائی میں اُترے جن مسائل وحوادث میں قرآن وسنت کی صریح نص موجود نہ تھی اُن کے حکم قرآن

وسنت کی روشنی میں دریافت کیے. ان کی جزئیات قرآن وحدیث کے اصولوں سے استنباط[1] کیں ان کے لیئے بھی حدیث کا وسیع علم درکار تھا اور اس بحرِ ناپید کنار میں کامیاب تیرنے کے بغیر کوئی ان چھپے موتیوں کو نہ چن سکتا تھا. ان حضرات کی کاوش رہی کہ نہ صرف مسائل غیر منصوصہ کا استنباط کرتے جائیں بلکہ مزید استنباط و استخراج کے لیئے قواعد بھی وضع کرتے رہیں یہ ائمہ حدیث اس پہلو سے اسلام کے مقنن Theorist قرار پائے اور غیر مجتہدین کے لیئے امام ٹھہرے. پھر کچھ اور محدثین اُٹھے اور جن راویوں نے احادیث روایت کی تھیں ان کی جانچ پڑتال اور جرح وتعدیل میں لگ گئے. وہ اس تحقیق میں یہاں تک آگے گئے کہ ان راویوں کی روایات اُن کے دیگر ہمعصر راویوں سے لے کر ان کی مرویات کو پرکھا کہ یہ اور کہاں کہاں نقل ہوئی ہیں. یہ حضرات اس لائن سے آگے بڑھے اور انہوں نے تحقیق وتنقید کے اس پہلو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی خدمت اور حفاظت کی. پھر کچھ ائمہؒ حدیث نے فنی طور پر حدیث جمع کرنے میں اپنے کمالات تالیف دکھائے اور کچھ علماء حدیث نے اسماء الرجال کا فن ترتیب دے کر تاریخ شرائع میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا. یہ سب حضرات اپنے اپنے دائرہ کار میں حدیث کی خدمت کرتے رہے اور حق یہ ہے کہ ان دوائر علم میں ہر دائرہ خدمت کے اکابر اپنے اپنے موضوع کے ائمہ حدیث تھے. پھر جن بزرگوں نے حدیث کی شرح میں ان تمام موضوعات پر فنی گفتگو کی. وہ حضرات بھی اپنی جگہ ائمہ حدیث تھے. آج کی مجلس میں علم حدیث کے کچھ انہی وفاداروں کا تذکرہ ہے جو اپنی محنتوں اور ریاضتوں سے علم حدیث کے وہ چراغ روشن کر گئے جن کی تابانی رہتی دنیا تک طالبان علم کو روشنی بخشتی رہے گی.

---

[1] استنباط، نبط سے ہے. نبط کنویں کی تہہ میں سے پانی نکالنے کو کہتے ہیں. کنواں کھودنے میں جو پانی پہلی مرتبہ نکلتا ہے اسے ماء مستنبط کہا جاتا ہے. یہاں مراد کسی بات کی تہہ تک پہنچ کر اس کی صحیح حقیقت معلوم کر لینا ہے. اسی طرح فقہاء کا کسی دبی بات کو نکال لینا استنباط کہلاتا ہے. فقہاء کرامؒ موجدِ احکام نہیں ہوتے صرف مظہرِ احکام ہوتے ہیں کہ جو بات گہرائی میں دبی تھی اُسے ظاہر کر دیا شریعت کی ایجاد پیغمبر کی طرف سے ہوتی ہے اور وہ بھی اپنی طرف سے نہیں خدا کی طرف سے شریعت کی بات کہتے ہیں.

ائمہ حدیث کی مختلف انواع

ائمہ حدیث کا عنوان بہت وسیع ہے۔ اس سے ائمہ اجتہاد Theorist بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ جن کے پاس حدیث پہنچ کر اپنے تمام پہلوؤں میں سے پھیلتی ہے اور اس میں وہ ائمہ جرح وتعدیل Critics بھی آجاتے ہیں جن کی کسوٹی حدیث کے راویوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ وہ ائمہ کرامؒ جنہوں نے احادیث کو مختلف ترتیبوں سے منضبط کیا۔ وہ مدونین Compilers کہلائے اور اللہ تعالیٰ نے اُن کی تالیفات کو زندگی اور قبولیت بخشی۔ یہ بھی ائمہ حدیث ٹھہرے۔ اور جن حفاظِ رجال نے اسماء الرجال کو منضبط کیا اور اس دائرہ کار میں حدیث کی خدمت کی وہ بھی اس فن کے امام ٹھہرے جس نے کسی بھی جہت سے حدیث کی کوئی خدمت کی اور اہل علم نے اس فن میں اس پر اعتماد کیا ایسے تمام حضرات ائمہ حدیث کے ذیل میں ذکر کیے جاتے ہیں۔

ہم آج کے اس موضوع کو اس تفصیل کے پیش نظر ان عنوانات سے پیش کریں گے۔

(۱) علماء حدیث (۲) ائمہ روایت (۳) ائمہ جرح وتعدیل (۴) ائمہ تدوین (۵) ائمہ رجال۔

یہ ان پاک لوگوں کا تذکرہ ہے جن کی علمی خدمات عام احاد امت اور حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم میں وجہ اتصال اور رابطہ بنیں اور انہی کی کوشش سے علم اسلام زندہ رہا۔ طلبہ حدیث کو چاہیئے کہ محدثین کے نام یاد رکھتے ہوئے ہر محدث کے بارے میں ذہن میں رکھیں کہ وہ کس دائرہ اور کس طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ جب تک ہر محدث کا دائرہ کار ہمہ وقت ذہن میں نہ رہے۔ طلبہ اس کی خدمت سے کما حقہا فائدہ نہیں اٹھا سکتے شام، حجاز اور عراق کے رواۃ حدیث اپنے اپنے ہاں کس کس انداز میں حدیث کی خدمت کرتے رہے۔ انشاء اللہ اس کا ایک اجمالی نقشہ آپ کے سامنے آجائے گا کہ محدثین کس جذبۂ وفا کے ساتھ قرآن کریم کے گرد حفاظت کا پہرہ دیتے رہے ہیں۔

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

ائمہ حدیث

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی. اما بعد:

علمائے حدیث

علماء حدیث سے وہ علماء فن مراد ہیں جو حدیث کے معنی و مضمون، منطوق و مفہوم، اس کے عموم و خصوص اور اس کے مناطِ حکم کو پوری طرح سمجھتے ہوں۔ انہیں فقہاء حدیث بھی کہا جاتا ہے۔ یہ حضرات فقہ حدیث کے غواص تھے اس کے سوا جو کچھ ہے وہ صرف متونِ حدیث کی نقل و روایات اور ان کے اسانید و رجال کی معرفت ہے۔ حافظ ذہبیؒ تذہیب التہذیب کے مقدمہ میں امام علی بن المدینی (۲۳۴ھ) سے نقل کرتے ہیں:

الفقه فی معانی الحدیث نصف العلم و معرفة الرجال نصف العلم۔[1]

(ترجمہ) حدیث کے معانی میں غور و فکر کرنا اس موضوع کا نصف علم ہے اور نصف ثانی حدیث کے رجال کی معرفت ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فقہ حدیث کے معانی کو سمجھنے کا ہی نام ہے۔ یہ حدیث کے متبادل کسی اور ماخذ کا نام نہیں۔ بلکہ حق یہ ہے کہ فقہاء دین ہی علم حدیث کے صحیح وارث ہیں حضرت امام ترمذیؒ (۲۷۹ھ) جنائز funerals کی ایک بحث میں لکھتے ہیں:

وکذلک قال الفقهاء وهم اعلم بمعانی الحدیث۔[2]

(ترجمہ) اور فقہاء نے ایسا ہی کہا ہے اور یہی لوگ حدیث کے معانی کو اچھی طرح سمجھنے والے ہیں۔

---

[1] مقدمہ خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص للحافظ صفی الدین الخزرجی (المتوفی ۹۲۳ھ) مطبع کبریٰ بولاق طبع ۱۳۰۱ھ [2] جامع ترمذی جلد ۱ ص ۱۱۸

فقہاء کرام حدیث کو صرف سمجھتے ہی نہیں اس سے احکام غیر منصوصہ (وہ احکام جن کے بارے میں نص injunction موجود نہ ہو) ان کا استنباط بھی کرتے ہیں۔ اجتہادی امور میں یہی حضرات اولی الامر ہیں فہم حدیث میں انہی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور علم کی دنیا میں انہی کا فیصلہ چلتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منہم لعلمہ الذین یستنبطونہ منہم۔[1]

(ترجمہ) اور اگر وہ پہنچا دیتے اُسے رسول تک اور اپنے اُولی الامر تک تو اسے وہ لوگ جو ان میں تحقیق استنباط کرنے والے ہیں معلوم کر لیتے۔

امام ابوبکر جصاص رازی (۳۷۰ھ) لکھتے ہیں۔ حضرت جابرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حسن بصریؒ، حضرت عطاءؒ اور مجاہدؒ اولی الامر کی تفسیر اولوا الفقہ والعلم[2] سے کرتے ہیں۔ امام تفسیر حضرت قتادہؒ کہتے ہیں۔ ھم اولوا العلم والفقہ۔[3]

حضرت ابوہریرہؓ اس سے حکام مراد لیتے ہیں۔ الفاظ فقہاء اور امراء دونوں کو شامل ہیں۔ امراء تدبیر جیوش کرتے ہیں اور علماء حفظ شریعت کرتے ہیں اور جائز و ناجائز بتلاتے ہیں۔ سو لوگ ان کی اطاعت پر مامور ہوں گے اور انہیں ان کی پیروی کا حکم ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اولی الامر حکام کو کہتے ہیں جس دائرہ کار میں جس کا حکم چلے وہی اس دائرہ میں اُولی الامر میں سے ہے۔ حافظ جصاص رازی لکھتے ہیں:۔

جائز ان یسمی الفقہاء اولی الامر لانہم یعرفون اوامر اللہ و نواھیہ ویلزم غیرھم قبول قولھم فجائز ان یسموا اولی الامر من ھذا الوجہ کما قال فی ایۃ اخریٰ (لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون) فاوجب الحذر بانذارھم والزم المنذرین قبول قولھم۔[4]

صحیح تفسیر یہی ہے کہ اولی الامر سے مراد فقہاء حدیث ہی ہیں علماء کے ہی حکم کو واجب الاطاعت سمجھتے ہیں اور از رُوئے شرع اُن پر ان کے احکام کی اطاعت واجب ہے۔

---

[1] پ۵ سورۃ النساء ع ۱۱۔ [2] احکام القرآن جلد ۲ صـ [3] ایضاً [4] ایضاً صـ ۲۱۳۔

لہٰذا اس وجہ سے اُن پر بھی اولی الامر کا اطلاق[۱] درست ہے۔ اولی الامر حکام کو کہتے ہیں جس دائرہ کار میں جن کا حکم چلے وہی اس دائرہ عمل کے اولی الامر ہوں گے یہ الفاظ اپنے عموم میں ان فقہاء کو یقیناً شامل ہیں جن کا فیصلہ مسلمانوں میں عملاً چلتا ہے۔ گو وہ اسے اپنے اختیار سے اپنے اوپر نافذ ٹھہراتے ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی علماء حدیث Scholars اور رواۃِ حدیث Transmitters میں فرق کیا ہے۔ آپ نے راوی حدیث کو فقط حامل فقہ bearer of knowledge کہا اور عالم حدیث کو فقیہ jurist کے نام سے ذکر فرمایا۔ تاریخ حدیث میں راوی حدیث اور عالم حدیث کا یہ فرق ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (۳۲ھ) کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

نضر اللہ عبداً سمع مقالتی فحفظها و دعاها و اداها فرب حامل فقہٍ غیر فقیہٍ ورب حامل فقہ الیٰ من ھو افقہ منہ[۲]۔

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ اس شخص کو سرسبز کرے جس نے میری بات سُنی اسے یاد کیا اور محفوظ رکھا اور اُسے آگے پہنچایا۔ کیونکہ کئی ایسے بھی حاملین علم bearevr of knowledge ہوتے ہیں جو خود عالم scholar (فقیہ) نہیں ہوتے اور کئی ایسے بھی حامل علم ہوتے ہیں جو اپنے سے زیادہ سمجھنے والے کو بات پہنچا دیتے ہیں (یہاں تک کہ وہ بات کی لم اور حقیقت کو پالیں۔

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں علماء حدیث فقہاء ہی تھے اور محض راوی حدیث ہونا آپ کے نزدیک اس کی ایک ابتدائی منزل تھی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی عالم حدیث کا راوی حدیث نہ بننا اس کے علم حدیث میں ہرگز کوئی کمی کی وجہ نہیں صحابہؓ میں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی روایات اگر کم ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ابوہریرہؓ ان سے علم میں آگے تھے۔

---

[۱] احکام القرآن جلد ۲ صفحہ ۲۱۱ [۲] مشکوٰۃ شریف صفحہ ۳۵ رواہ الشافعی واحمد والدارمی وابوداؤد والترمذی وابن ماجہ والبیہقی۔

اسلام میں علم و حکمت کا مرتبہ

قرآن کریم میں علم کے اس اُونچے درجے کو جس میں گہرائی اور گیرائی دونوں درکار ہوں۔ حکمت jurisprudence کہا گیا ہے اور یہی وہ خیر کثیر ہے جو اس امت میں نبوت کے قائم مقام رکھی گئی تھی۔ قرآن کریم میں ہے:۔

من یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرًا کثیرا۔[1]

(ترجمہ) جسے حکمت و دانائی ملی پس تحقیق اسے بہت بڑی خیر ملی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیر کے حامل کو فقیہہ jurist ارشاد فرمایا ہے اور حق یہ ہے کہ فقہاء ہی شریعت کے حکماء ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔

من یرد اللہ بہ خیرًا یفقھہ فی الدین۔[2]

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ جس کے بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین میں فقہ عطا فرما دیتا ہے

وہ حاملین حدیث نبوی جو اس درجے میں شریعت کا مغز پا گئے کہ مسائل منصوصہ کے اصولوں میں تمام مسائل غیر منصوصہ کا حکم دریافت کر سکیں وہ اس دریافت اور استخراج کے اصول بھی انہی نصوص میں پا گئے اور انہوں نے انہیں بھی پوری دقت نظری سے استنباط کیا یہ وہ مجتہدین کرام ہیں جن سے مسائل کے باب میں معلوم کرنا ضروری ٹھہرا حقیقت میں یہی اہل علم ہیں جن کی طرف ان مسائل میں جو قرآن و حدیث میں صریحاً نہ ملتے ہوں رجوع کیا جا سکتا ہے۔ حضورؐ نے حضرت عقبہ بن عامر کو اس صورت میں اسی قاعدہ کی تعلیم دی تھی۔

فاباح لہ النبی الاجتہاد بحضرتہ علی الوجہ الذی ذکرنا۔[3]

اپنے سامنے اس طریق کے مطابق جو ہم نے ذکر کیا پس آپ نے ان کے لیے اجتہاد کرنا جائز ٹھہرا دیا۔ اسی طرح حضرت معاذ بن جبلؓ بھی آپ سے اجتہاد کرنے کی اجازت پا چکے تھے۔

فقہاء حدیث کی کاوش رہی کہ احادیث سے زیادہ سے زیادہ احکام استنباط کریں

---

[1] پ ۳ البقرۃ ع ۳۷ [2] مشکوٰۃ صـ ۳۲ متفق علیہ [3] احکام القرآن صـ ۲۱۳ ج ۲

اور شریعتِ اسلامی آنے والی ہر ضرورت پر قابو پاسکے اور حق یہ ہے کہ اسی سے اسلام کی شان جامعیت ہر دور میں اپنی وسعت سے نکھرتی رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حضرات کو دن رات حدیث سے واسطہ پڑتا تھا اور اس کے رد و قبول اور تحقیق و تنقیح میں انہیں پوری گہرائی میں جانا ہوتا تھا اس سے انہیں اس فن کی پوری بصیرت حاصل ہو جاتی تھی اور وہ اس کے درجات اور احکام سے پوری طرح باخبر ہوتے تھے۔ تاہم یہ صحیح ہے کہ ان کی محنتیں زیادہ تر حدیث کی روایت پر نہیں اس کے فہم و درایت پر صرف ہوتی تھیں۔ حدیث ان کے پاس آکر اس بحرِ بے کراں کی طرح اچھلتی تھی جس کے نیچے بے شمار موتی دبے ہوں۔ یہ فقہاء حدیث کبھی اپنے تلامذہ و احباب میں حدیث کی سند بھی روایت کر دیتے۔ لیکن تحدیث زیادہ تر ان کا موضوع نہ تھا۔ وہ احادیث کے معانی میں غوطے لگاتے تھے اور فہم حدیث کے پہلو سے ائمہ حدیث اور حفاظ حدیث میں شمار ہوتے تھے۔ یہ بات اپنی جگہ محتاج دلیل نہیں کہ حدیث میں کامل دست گاہ کے بغیر کوئی شخص مجتہد نہ ہو سکتا تھا۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ نادان لوگ ان کی مرویات کو کم دیکھ کر ان کی صحیح قدر کرنے سے محروم رہے اور خود اپنے آپ کو ہی کاٹتے رہے

اس طبقے میں ہم امام ابو حنیفہؒ (۱۵۰ھ)، امام اوزاعیؒ (۱۵۷ھ) سفیان ثوریؒ (۱۶۱ھ) امام مالکؒ (۱۷۹ھ) امام ابو یوسفؒ (۱۸۲ھ) امام محمدؒ (۱۸۹ھ) امام شافعیؒ (۲۰۴ھ) اسحٰق بن راہویہ (۲۳۸ھ) اور امام احمد بن حنبلؒ (۲۴۱ھ) کا تذکرہ کریں گے۔ امام احمد سے گو روایتِ حدیث کا سلسلہ بھی خوب چلا تاہم ایک مجتہد کی حیثیت سے ان کا تذکرہ اسی باب میں ہوگا۔

علماء جرح و تعدیل

پھر محدثین کا وہ طبقہ سامنے آتا ہے جن کا موضوع زیادہ تر رواۃِ حدیث کی جانچ پڑتال رہا۔ وہ جرح و تعدیل کے امام تھے۔ ان کی توجہ تحقیق رواۃ پر اس درجہ مبذول رہی کہ ایک نیا مستقل فن وجود میں آیا جسے علمِ اسماء الرجال کہا جاتا ہے۔ جس طرح معانی حدیث میں تفقہ و تعمق اس موضوع کا ایک اہم حصہ ہے معرفتِ رجال بھی اس موضوع کا نصف علم ہے۔ امام علی بن المدینیؒ (۲۳۴ھ) کی یہ رائے آپ پہلے سن آئے ہیں۔ الفقہ فی معانی

الحدیث نصف العلم و معرفۃ الرجال نصف العلم۔ سوعلم دو ہی ہیں۔ (۱) فقہ، اور (۲) فن اسماء الرجال۔ ایک علم متن حدیث سے متعلق ہے تو دوسرا سند حدیث سے۔

علماء جرح و تعدیل نے رواتِ حدیث کے مختلف درجات معلوم کیے۔ ان کا فنی تجزیہ کیا۔ باہمی اختلاف کی صورت میں نتیجہ خیزی کی راہیں قائم کیں۔ یہ حضرات اس جہت سے ائمہ حدیث قرار پائے۔ بعد کے آنے والے محققین ان کی کاوشوں سے ہی فیصلوں کی راہیں تلاش کرتے ہیں اور اس گروہ کو جتنا خراج تحسین ادا کیا جائے کم ہے۔ مولانا حالی لکھتے ہیں :-

گروہ ایک جویا تھا علم نبی کا — لگایا پتہ اس نے ہر مفتری کا
نہ چھوڑا کوئی رخنہ کذب خفی کا — کیا قافیہ تنگ ہر مدعی کا

کیے جرح و تعدیل کے وضع قانون
نہ چلنے دیا کوئی باطل کا افسون

اس طبقے میں ہم امیر المؤمنین فی الحدیث عبد اللہ بن مبارک (۱۵۶ھ) امیر المؤمنین فی الحدیث شعبہ (۱۶۰ھ) وکیع بن الجراح (۱۹۷ھ) یحیی بن سعید القطان (۱۹۸ھ) عبد الرحمٰن بن مہدی (۱۹۸ھ) سفیان بن عیینہ (۱۹۸ھ) علی بن المدینی (۲۳۴ھ) اور یحیی بن معین (۲۳۳ھ) کا تذکرہ کریں گے۔ پھر ان کے بعد ائمہ تالیف کا ذکر ہوگا جنہوں نے کتابیں لکھیں۔

جامعینِ حدیث

محدثین کا وہ طبقہ سب سے آگے ہے جن کا موضوع زیادہ تر روایت و تحدیث رہا۔ فقہ و تفریع پر صاحبِ نظر ہونے کے باوجود وہ فقہی استنباط میں زیادہ مصروف نہ ہوئے پھر ان حضرات کے مختلف طبقے ہوئے۔ کچھ ایسے تھے جو صحتِ اسناد سے احادیث جمع کرتے رہے اور کچھ وہ تھے جو ہر طرح کی اسناد سے احادیث آگے لاتے رہے اور نقد و جرح بھی کرتے رہے اور کبھی اسے پڑھنے والوں پر بھی چھوڑ دیتے تھے یہ سب حضرات حدیث کے ائمہ تالیف ہیں پھر ان حفاظ حدیث میں کئی ایسے بھی ہوئے جو حدیث کے تو حامل رہے مگر اس کے معنی کی گہرائی میں جانا ان کا موضوع مشق نہ تھا۔ ان کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی خبر دے چکے

اور بے شک ان حضرات کی مساعی اور خدمات بھی اپنی جگہ بہت ممتاز ہیں۔ امت اسلامی کو اپنے ان ائمہ حدیث پر بجا طور پر ناز ہے جنہوں نے تدوین کے دورِ ثانی میں حدیث کو کتابی صورت میں جمع کیا اور وہ کمالات دکھائے کہ تاریخ ان کی مثال پیش کرنے سے قاصر رہی۔ اور حق یہ ہے کہ اس باب میں وہ تمام متقدمین پر بھی سبقت لے گئے اور آج زیادہ تر انہی کے ذخائرِ حدیث علماء کے مصادر و مراجع ہیں یہی حضرات ائمہ تالیف ہیں۔

ائمہ تالیف حدیث

جہاں تک مطلق تالیف کا تعلق ہے حدیث حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی معرضِ تحریر documentary records میں آنے لگی تھی اور صحابہ کے جمع کردہ صحیفے آئندہ کے اہلِ علم کے پاس موجود رہے۔ خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے امام زہری اور صالح بن کیسان جیسے تابعین حضرات نے حدیث خاصی تعداد میں جمع کرلی تھی تاہم زمانے کو انتظار تھا کہ محدثین فنِ تدوین کو ترقی دے کر حدیث کی ایسی تالیفات سامنے لائیں کہ فنِ اعتماد اور ضرورت کے اعتبار سے یہ مجموعہ ہائے حدیث دیرپا قبولیت پائیں۔ اس دائرہ اور دَور میں محدثین کی پوری کاوش رہی کہ یہ علمی ذخیرے اس طرح ترتیب پائیں کہ مختلف پہلوؤں سے تعلیم و تدریس کا مرکز بن جائیں اور آئندہ امت پر حفظ و ضبط اور جمع و تدوین کا وہ بوجھ نہ رہے جو اب تک صحابہ و تابعین اور تبع تابعین اُٹھاتے چلے آرہے تھے۔

قدماء بے شک قدماء ہیں اور بنیادی فضیلت پہلوں کو ہی جاتی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فنِ تالیف تیسری صدی ہجری میں جس پایۂ تکمیل کو پہنچا اس کی نظیر پہلے علمی ذخیروں میں نہیں ملتی۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کا علمِ حدیث مسلّم۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حدیث کے باب میں درایت ہو یا روایت امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فنِ حدیث میں پورے مجتہد تھے۔ امام سفیان ثوریؒ ۱۶۱ھ اور امام محمدؒ ۱۸۹ھ اور عبدالرزاق ابن ہمامؒ ۲۱۱ھ کی کتابوں میں سینکڑوں

حدیثیں مروی ملتی ہیں۔ لیکن تالیف حدیث میں جو کمال امام بخاری اور امام مسلم نے دکھایا اس کی نظیر نہ صرف یہ کہ اسلامی تاریخ میں نہیں ملتی بلکہ مذاہب عالم کی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ولقد جاء فی المثل السائر کم ترک الاول للآخر۔

یہی وجہ ہے کہ ان تالیفات کے سامنے آنے پر امت نے پچھلے ذخائر حدیث کو جو بے شک اولیت کی شان رکھتے تھے۔ علم حدیث کا مرکز نہ بنایا اور دورۂ حدیث آج انہی کتابوں کے گرد گھوم رہا ہے۔ یہ جلیل القدر تالیفات پچھلی تالیفات حدیث کی بجا طور پر وارث اور آئندہ کی حدیثی کاوشوں کا صحیح معنوں میں متن Texts ہیں یہی کتابیں ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے باب میں اساسی کتابیں canonical books کہلاتی ہیں۔ اور حدیث کی سند و روایت اور رد و قبول میں انہی کتابوں کو مرکز قرار دیا جاتا رہا ہے۔ فن تالیف میں جو ائمہ زیادہ معروف ہوئے اور جن کے علمی ذخائر اپنے اپنے رنگ میں اب تک مرکز سمجھے جاتے ہیں یہاں انہی کا ذکر ہوگا۔

ان ائمہ تالیف میں حضرت امام بخاریؒ (۲۵۶ھ) اور امام ابن خزیمہؒ (۳۱۱ھ) تو ترجمۃ الباب میں بالکل مجتہد نظر آتے ہیں۔ اسانید کی ترتیب اور ضبط متن میں حضرت امام مسلمؒ (۲۶۱ھ) کا ثانی نہیں ملتا۔ ترتیب روایت پر حیرت انگیز دسترس کے مالک ہیں مجتہدانہ بصیرت میں امام ابوداؤدؒ سجستانی (۲۷۵ھ) اور امام طحاویؒ (۳۲۱ھ) اپنی مثال آپ ہیں۔ امام ترمذیؒ (۲۷۹ھ) نے نقل مذاہب میں جو اچھوتا انداز اختیار کیا ہے اس میں وہ پہلے اور پچھلے سب مؤلفین کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں اور اس خاص طرز میں کوئی ان کا ہمسر نہیں۔

ان ائمہ تالیف میں ہم عبدالرزاق بن ہمام (۲۱۱ھ) اور ابوداؤد طیالسی (۲۲۴ھ) ابن ابی شیبہ (۲۳۵ھ) دارمی (۲۵۵ھ) بخاری (۲۵۶ھ) مسلم (۲۶۱ھ) ابوداؤد (۲۷۵ھ) ترمذی (۲۷۹ھ) نسائی (۳۰۳ھ) ابن ماجہ قزوینی (۲۷۳ھ) ابن خزیمہ (۳۱۱ھ) ابوعوانہ (۳۱۲ھ) طحاوی (۳۲۱ھ) ابن حبان (۳۵۴ھ) طبرانی (۳۶۰ھ) دارقطنی (۳۸۵ھ) خطابی (۳۸۸ھ) حاکم نیشاپوری (۴۰۵ھ) امام بیہقی (۴۵۸ھ) اور ابن عبدالبر مالکی (۴۶۳ھ) کا ذکر کریں گے۔

حدیث کے ائمہ تخریج

پھر ان کے بعد ایک ایسا دور آیا جب مستقل راویوں سے حدیث روایت کرنے کی ضرورت نہ رہی، حدیث کی کتابیں مدون ہو چکی تھیں اور انہی کتب کی سند آگے جاری ہوتی تھی۔ اب نئے مجموعہ ہائے حدیث میں سند ساتھ ساتھ نقل کرنے کی چنداں ضرورت نہ رہی۔ تاہم تخریج و تالیف کے دروازے کھلے تھے اور اس فن میں محنت کرنے والوں کا ایک طبقہ پھر بھی اس راہ میں پوری توانائی سے مصروفِ عمل تھا ان جامعین حدیث نے ان پچھلے علمی ذخیروں کے حوالوں سے کتابیں اور اجزاء مرتب کیے ان سے روایت کیں اور نئے نئے مجموعے ترتیب دیئے اور حدیث کی یہ خدمت آج تک جاری ہے۔ جن حضرات کے مجموعے علماء حدیث میں مستند، مفید اور معتمد سمجھے گئے، وہ اس دور کے ائمہ حدیث تھے۔ اس طبقے میں ہم امام بغویؒ صاحب شرح السنۃ (۵۱۶ھ) علامہ صغانیؒ (۶۱۰ھ) ابن عساکرؒ (۵۷۱ھ) ابن تیمیہؒ (۷۲۸ھ) ابن قیمؒ (۷۵۱ھ) خطیب تبریزیؒ صاحب مشکوٰۃ (۷۴۲ھ) زیلعیؒ (۷۶۲ھ) ابن کثیرؒ (۷۷۴ھ) نورالدین ہیثمی (۸۰۷ھ) حافظ ذہبیؒ (۷۴۸ھ) ابن ہمام اسکندریؒ (۸۶۱ھ) عسقلانیؒ (۸۵۲ھ) طاہر فتنیؒ صاحب مجمع البحار (۹۸۶ھ) اور علی المتقی صاحب کنز العمال (۹۷۵ھ) کا ذکر کریں گے۔

علماء تراجم رجال

جہاں تک فن اسماء الرجال کا تعلق ہے اس کا اصل سہرا ان قدماء کے سر ہے جن کا ذکر ہم ائمہ جرح و تعدیل میں کر آئے ہیں۔ لیکن ان کے اقوال و تحقیقات کو باقاعدہ کتابی صورت میں لانے کی خدمت جن حضرات نے سرانجام دی۔ انہیں ہم یہاں علماء تراجم رجال کے عنوان سے ذکر کریں گے۔ یہ صحیح ہے کہ ان سے پہلے وہ قدماء جن کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں اس سلسلہ میں قدم اُٹھا چکے تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے کتاب العلل و معرفۃ الرجال لکھ کر اس کا آغاز کر دیا تھا۔ امام بخاریؒ بھی تاریخِ کبیر لکھ چکے تھے۔ امام ترمذیؒ اپنی جامع میں جگہ جگہ رواۃ

پر بحث کر آئے تھے۔ لیکن حق یہ ہے کہ جس طرح متونِ احادیث پہلے دورِ تدوین میں اس عمدگی سے تالیف نہ ہو سکے جو تیسرے دور کی تدوین میں ہمیں نظر آتی ہے۔ اس طرح اسماء الرجال میں بھی جو شانِ تالیف پچھلے دور کی کتابوں میں ملتی ہے وہ پہلے ادوار کی تالیفات سے بہت مختلف اور کامل ہے۔ سو علماء تراجم کے عنوان سے ہم اُن ائمہ اسماء الرجال کا ذکر کریں گے۔ جن کی کتابیں اس وقت اس باب میں علماء کی مراجع ومصادر ہیں۔ ان ائمہ حدیث میں ابن ابی حاتمؒ، علامہ مزیؒ، حافظ شمس الدین ذہبیؒ، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، علامہ بدرالدین عینیؒ زیادہ قابل ذکر ہیں۔

ائمہ حدیث کی مختلف الانواع خدمات

یہ حدیث کی مختلف پہلوؤں سے خدمت تھی جس کا یہ ایک مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ علمی اور فنی پہلو سے یہ تمام ضروری اُمور تھے جو ان حضرات کی توجہ کا موضوع بنے۔ اور حق یہ ہے۔ کہ ہر ایک نے اپنے اپنے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ ائمہ حدیث کی مختلف الانواع خدمات سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ باب حدیث میں خود نئی راہیں بناتے تھے ہرگز نہیں۔ خدمتِ حدیث عہد صحابہؓ میں ہی مختلف پیمانوں میں ڈھل گئی تھی۔ پھر تابعین کرام ان مختلف راہوں سے حدیث کی خدمت کرتے رہے تھے۔ ائمہ حدیث نے اپنے انہی اکابر سے حدیث کی خدمت مختلف پہلوؤں سے کرنے کا فن سیکھا۔

صحابہؓ میں خدمت حدیث کے مختلف انداز

تدوینِ حدیث کے عنوان میں آپ دیکھ آئے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے ہی روایت حدیث کا آغاز ہو چکا تھا۔ آپ کے بعد آپ کی تعلیماتِ قدسیہ کی مزید نشر و اشاعت ہوئی۔ صحابہؓ ہر خدمت حدیث میں آگے بڑھتے گئے اور ہر پہلو سے انہوں نے اُس کے گرد حفاظت کے پہرے بٹھائے۔ مثال کے طور پر ہم دونوں پہلوؤں سے بعض اکابر کے نام یہاں ذکر کرتے ہیں۔ پوری فہرست آگے آئے گی۔ جہاں ان حضرات کے تراجم پیش کیے جائیں گے۔

صحابہؓ میں فقہائے حدیث

ان میں فقہائے حدیث بھی تھے جیسے حضرت معاذ بن جبلؓ (۱۸ھ) حضرت اُبی بن کعبؓ (۱۹ھ) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (۳۲ھ) حضرت ابوالدرداءؓ (۳۲ھ) حضرت علیؓ (۴۰ھ) حضرت زید بن ثابتؓ (۴۵ھ) ام المومنین حضرت عائشہؓ (۵۷ھ) حضرت عبداللہ بن عباسؓ (۶۸ھ) حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ (۷۴ھ) حضرت عبداللہ بن عمرؓ (۷۴ھ) وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین۔

روایت میں سبقت لے جانیوالے

حضرت ابوذر غفاریؓ (۳۲ھ) حضرت حذیفہ بن الیمانؓ (۳۵ھ) حضرت عمران بن حصینؓ (۵۲ھ) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ (۵۵ھ) حضرت ابوہریرہؓ (۵۷ھ) حضرت سمرہ بن جندبؓ (۵۹ھ) حضرت عبداللہ بن عمروؓ (۶۵ھ) حضرت براء بن عازبؓ (۷۲ھ) حضرت ابوسعید الخدریؓ (۷۴ھ) حضرت انس بن مالکؓ (۹۳ھ) وغیرہم من الاکابر روایت حدیث میں بہت آگے نکلے اور یہاں تک آگے بڑھے کہ فقہائے حدیث بھی ان کے خوشہ چین ہوئے۔ صرف ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہیں جو کثرتِ روایت میں بھی ان اکابر کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔

تابعین کرامؒ میں فقہائے حدیث

حضرت علقمہ بن قیس (۶۲ھ) مسروق بن اجدع (۶۳ھ) حضرت سعید بن المسیب (۹۳ھ) سعید بن جبیر (۹۵ھ) ابراہیم نخعی (۹۶ھ) مکحول (۱۰۱ھ) علامہ شعبی (۱۰۳ھ) حضرت سالم (۱۰۶ھ) قاسم بن محمد (۱۰۷ھ) حضرت حسن بصری (۱۱۰ھ) ابن سیرین (۱۱۰ھ) قتادہ بن دعامہ (۱۱۸ھ) حماد بن ابی سلمان (۱۲۰ھ) فقہاءِ حدیث میں اس دور کی معروف شخصیتیں تھیں۔

تابعین کرامؒ میں اساتذہ روایت

حضرت طاؤس بن کیسان (۱۰۶ھ) امام زہریؒ (۱۲۴ھ) ابوالزنادؒ (۱۳۱ھ) سلیمان تیمیؒ

(۱۴۳ھ) اعمش (۱۴۸ھ) عمرو بن دینارؒ وغیرہم اساتذہ کبار روایت حدیث کے نہایت درخشندہ تارے تھے۔ ان حضرات کے پاس صحابہؓ کی جمع کردہ تحریریں بھی تھیں۔ ان کی خدماتِ حدیث کا کچھ تذکرہ تدوینِ حدیث کی بحث میں آچکا ہے۔ اس بحث میں ائمہ حدیث کے صرف تراجم پیش نظر ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ حدیث کے باب میں درایۃً ہو یا روایۃً فقہ کے عنوان سے ہو یا نقلِ روایت کے عنوان سے عمومی اقتدار ان متقدمین سے نہیں۔ بلکہ بعد کے بزرگوں سے جاری ہوئی۔ یہ اس لیئے کہ ہر فن اپنی بہت سی منازل طے کرنے کے بعد ہی اس درجے میں قائم ہوتا ہے کہ اس پر آئندہ باقاعدہ اصول وفروع کی بنیاد رکھی جاسکے۔ سو ہم ائمہ حدیث کے عنوان سے انہی اکابر حضرات کا تذکرہ کریں گے۔ جن کی اقتدار امت میں جاری ہوئی۔ وہ فقہار حدیث ہوں یا ائمہ نقاد، ائمہ تالیف ہوں یا علمار تراجم رجال۔ جو جو حضرات اپنے اپنے فن کے امام ٹھہرے ہم انہیں ہی ائمہ حدیث کے مختلف طبقوں کے تحت ذکر کریں گے۔ ہر ایک نے اپنے اپنے دائرہ میں حدیث کی خدمت اور قوم کی امامت کی اور حق یہ ہے کہ یہ حضرات خدمتِ حدیث میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ اب تاریخ اس باب میں انہی کے سر پر سیادت کا تاج رکھتی ہے۔ ہاں صحابہ کرامؓ جو اپنے کسی فنی کمال کی بنا پر نہیں۔ اپنے شرفِ صحابیت کی وجہ سے امت کے مقتدار اور پیشوا ہیں۔ ان کی پیروی واجب ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ جیسے ائمہ اصول ان حضرات کے آگے سر اٹھانے کی جرأت نہ کرتے تھے اور ان کے ارشادات کو اپنے لیئے سند سمجھتے تھے۔

اب ہم ان مختلف الانواع ائمہ حدیث کا تذکرہ کرتے ہیں۔ مجموعی اعتبار سے یہ سب ائمہ حدیث ہیں۔ فقہار حدیث ہوں یا ائمہ جرح وتعدیل، جامعین حدیث ہوں یا ائمہ تخریج، علمار تراجم رجال ہوں یا عہدِ اول کے شراحِ حدیث۔ یہ سب حضرات اس فن کے محسنین میں سے ہیں۔ اور حق ہے کہ ہم ان سب کو ائمہ حدیث میں جگہ دیں۔ فجزاهم الله احسن الجزاء۔

تراجم ائمہ حدیث

یہ بات تفصیل سے آپ کے سامنے آچکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علم دین کا اعلیٰ درجہ خیر علم فقہ کو قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس سے خیر کا ارادہ کریں اُسے فقہ سے حصۂ وافر عطا فرما دیتے ہیں. دوسرے درجہ میں رواتِ حدیث ہیں. جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو آگے نقل کرتے ہیں. یہاں تک کہ یہ حدیث آگے کسی ایسے شخص کو پہنچ جائے جو اس سے پُورا پورا فائدہ پالے اور اس کے معلوم کی حفاظت کرے۔

جہاں تک صحابہ کرامؓ کا تعلق ہے وہ فقہائے حدیث بھی تھے اور رواۃِ حدیث بھی. تاہم جن کا فقہ ان کی روایت پر غالب رہا انہیں فقہائے حدیث کے عنوان سے اور جو روایت میں زیادہ معروف ہوئے ہم انہیں رواۃِ حدیث کے عنوان سے ذکر کریں گے. اس کا یہ مطلب ہرگز نہ لیا جائے کہ روایت میں سبقت لے جانے والے صحابہؓ فقہ پر دسترس نہ رکھتے تھے۔

فقہائے کرام

صحابہؓ میں فقہائے حدیث

صحابہ کرامؓ میں فقہائے حدیث بڑی تعداد میں تھے لیکن بطور نمونہ ہم یہاں دسؓ بزرگوں کا تذکرہ کرتے ہیں. فقہ حدیث کی ریاست اُن پر تمام تھی. یہی قمر رسالت کا علمی ہالہ اور علم رسالت کا عملی اُجالا تھے. حضرت معاذ بن جبلؓ (م ۱۸ھ) حضرت ابی بن کعبؓ (م ۱۹ھ) فقیہ عراق حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (م ۳۲ھ) فقیہ شام حضرت ابوالدرداءؓ (م ۳۲ھ) فقیہ عراق حضرت علیؓ (م ۴۰ھ) حضرت زید بن ثابتؓ (م ۴۵ھ) حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ (م ۵۲ھ) فقیہ مکہ ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ (م ۶۸ھ) فقیہ مدینہ حبرُ الاُمّۃ حضرت عبداللہ بن عمرؓ (م ۷۴ھ) اور حضرت جابر بن عبداللہ الانصاریؓ (م ۷۸ھ)

نوٹ بیشتر اس کے کہ ہم ان فقہائے حدیث کا علیحدہ علیحدہ ذکر کریں ناانصافی ہوگی، اگر اس شخصیت کریمہ کا ذکر نہ کیا جائے جن کی طرف کل فقہائے صحابہؓ اپنی مشکلات میں رجوع

کرتے تھے اور انہیں بلا تامل فقہائے صحابہؓ کا علمی مرکز سمجھا جاتا تھا۔ ہماری مراد یہاں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ ہیں جو اہلبیتِ رسالت میں اس نو عمری میں لائی گئیں کہ معارف رسالت کو اس عمر میں پوری طرح حفظ کرنے کی ان سے بجا طور پر امید کی جا سکے۔ اس عمر میں آپؓ نے علم رسالت کو اپنے پاس اس طرح محفوظ کر لیا کہ حضور اکرمؐ کے بعد دنیائے اسلام نصف صدی تک ان کے علوم سے منور ہوتی رہی۔ ہم نے دوسرے فقہائے صحابہؓ کی فہرست میں اُن کا ذکر نہیں کیا کہ ماں ہر جہت سے بچوں میں ممتاز رہے اور یہ مرکزِ علم اپنے تمام اطراف میں برابر کا ضیا بار رہے۔

حافظ شمس الدین الذہبیؒ (م ۷۴۸ھ) حفاظِ حدیث کے تذکرہ میں حضرت امّ المؤمنینؓ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> اُمّ عبد اللّٰہ حبیبۃُ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بنت خلیفۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ابی بکر الصدیقؓ من اکبر فقہاء الصحابۃ وکان فقہاء اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یرجعون الیہا[1]

(ترجمہ) ام عبد اللہ حضور پاکؐ کی حبیبہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ کی بیٹی بڑے فقہائے صحابہؓ میں سے تھیں. فقہائے صحابہؓ (اپنے مسائل میں) اُن کی طرف رجوع کرتے تھے۔

اب ہم فقہائے صحابہؓ کا مندرجہ بالا ترتیب سے ذکر کریں گے۔ یہ ترتیب ان کے مراتب کی نہیں سنینِ وفات سے لی گئی ہے۔

(۱) حضرت معاذ بن جبلؓ (م ۱۸ھ) ابو عبدالرحمٰن الانصاری

آپؓ ان ستّر صحابہؓ میں سے ہیں جو بیعتِ عقبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں۔ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے[2] صحابہؓ کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ اعلمهم بالحلال والحرام معاذ بن جبلؓ

(ترجمہ) ان میں حلال وحرام کا سب سے زیادہ علم رکھنے والے معاذ بن جبل ہیں۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۲۶ [2] مشکوٰۃ صفحہ ۵۲۶ رواہ احمد والترمذی وقال ہذا حدیث حسن صحیح۔

آپ کی فقہی شان کی ایک یہ بھی شہادت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا اور انہیں مسائل غیر منصوصہ میں اجتہاد کرنے کی اجازت دی. آپ کی نظر میں حضرت معاذ بن جبلؓ ایک مجتہد کی پوری اہلیت رکھتے تھے اور بجا طور پر ایک حاذق مجتہد تھے. حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلہ میں آپؓ کو رسولِ رسول اللہ کے عنوان سے ذکر کیا ہے. آپؐ نے فرمایا:۔

الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یرضی بہ رسول اللہ[1]

(ترجمہ) سب تعریف اُس خدا کی جس نے اپنے رسول کے رسول کو اس بات کی توفیق دی جس سے اللہ کا رسول راضی ہو.

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جابیہ میں جو تاریخی خطبہ دیا تھا اُس میں فرمایا تھا کہ:۔

من اراد ان یسأل عن الفقہ فلیأت معاذاً و من اراد ان یسأل عن المال فلیأتنی فان اللہ جعلنی لہ خازنا و قاسما[2]

(ترجمہ) جو شخص فقہ کا کوئی مسئلہ جاننا چاہے وہ معاذؓ کے پاس آئے اور جو شخص مال کے بارے میں سوال کرنا چاہے وہ میرے پاس آئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اُن کا خازن اور تقسیم کنندہ بنایا ہے.

حضرت عمرؓ کے اس ارشاد سے پتہ چلتا ہے کہ عہدِ صحابہؓ میں علم فقہ کی کیا عظمت تھی اور مجتہد صحابہؓ کی اجتہادی شان کے کیا چرچے ہوتے تھے.

حافظ ذہبیؒ حضرت معاذؓ کے ذکر میں لکھتے ہیں:۔

کان من نجباء الصحابۃ وفقہائہم[3] آپ بلند شان صحابہ اور ان کے فقہاء میں سے تھے.

(۲) حضرت اُبی بن کعبؓ (م ۱۹ھ) ابو المنذر الانصاری

حضرت ابوبکر الصدیقؓ سید المہاجرین ہیں تو حضرت ابی بن کعب سید الانصار تھے. آپ سے بڑے جلیل القدر صحابہؓ نے روایات لی ہیں. اور حضرت ابو ایوب انصاری، عبداللہ بن عباس، سوید بن غفلۃ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین جیسے اکابر نے آپ سے کتاب و سنت کی

---

[1] مشکوٰۃ ص ۳۲۴ رواہ الترمذی و ابوداؤد و الدارمی [2] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۲۰ [3] ایضاً ص ۱۸

تعلیم پائی۔ حافظ ذہبیؒ لکھتے ہیں:۔ حملوا عنہ الکتاب والسنۃ۔[1]

(ترجمہ) آپ سے ان صحابہ نے کتاب وسنت کا علم حاصل کیا ہے۔

آپؓ کی شخصیت اتنی اُونچی تھی کہ حضرت عمرؓ بھی بعض دفعہ علمی مسائل میں آپ کی طرف رجوع فرماتے۔ آپؓ صحابہ میں سب سے زیادہ قرآن پڑھنے والے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اقرءهم ابی بن کعب۔[2]

(ترجمہ) صحابہؓ میں سب سے زیادہ قرآن پڑھے ہوئے ابی بن کعبؓ ہیں۔

حضرت مسروقؒ تابعی (م ۶۲ھ) نے جن چھ بزرگوں کو مرکزِ فتوے تسلیم کیا ہے اُن میں حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں۔[3]

حافظ ذہبیؒ آپ کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:۔

اقرء الصحابۃ وسید القراء شھد بدرًا وجمع بین العلم والعمل۔[4]

(ترجمہ) صحابہؓ میں سب سے بڑے قاری، قاریوں کے سردار، جنگ بدر میں شامل ہونے والے اور علم وعمل کے جامع تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان شریف میں صرف تین راتیں تراویح کی نماز پڑھائی اور پھر تراویح کے لئے مسجد میں تشریف نہ لائے کہ آپؐ کی مواظبت سے یہ نماز امت پر واجب نہ ٹھہرے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عدم موجودگی میں صحابہؓ مسجد میں تراویح کی نماز علیحدہ علیحدہ جماعتوں میں ادا کرتے رہے۔ ایک رات حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتفاقاً وہاں آنکلے تو دیکھا کہ حضرت اُبی بن کعبؓ مسجد کی ایک طرف تراویح پڑھا رہے ہیں۔ آپؐ نے پوچھا اور جواب ملنے پر اُن کے عمل کی تصویب فرمائی۔ ارشاد فرمایا:۔ اصابوا ونعم ما صنعوا۔[5]

انہوں نے درست کیا اور اچھا ہے جو انہوں نے کیا۔

اس سے پتہ چلا کہ تراویح کی نماز ان دنوں بھی جماعت سے جاری تھی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ بات جب حضورؐ کے نوٹس میں آئی تو آپؐ نے اسے صحیح عمل قرار دیا۔ اس سے منع نہیں کیا۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صـ۱۶ [2] مشکوٰۃ صـ۵۵۶ رواہ احمد والترمذی [3] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صـ۳۰
[4] ایضاً صـ۱۶ [5] سنن ابی داؤد جلد ۱ صـ۱۳۸

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مسجد میں تراویح نہ پڑھانے کو نسخِ تراویح نہ سمجھنا اور اُمت میں اس عمل کو پُورا مہینہ باقی رکھنا یہ حضرت ابی بن کعبؓ کا ہی اجتہاد تھا جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شرفِ تائید پایا اور امت میں یہ عمل آج تک جاری ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جن دو صحابہؓ کو تراویح پڑھانے پر مامور کیا تھا۔ وہ حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت تمیم داریؓ ہی تھے۔

خطیب تبریزیؒ لکھتے ہیں:۔

احد الفقهاء الذين كانوا يفتون على عهد رسول الله۔[1]

(ترجمہ) آپؓ اُن فقہائے صحابہؓ میں سے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں بھی فتوے دیتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ آپؓ سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم پہ قرآن پڑھوں۔ حضرت ابیؓ نے پُوچھا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام لے کر کہا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ ہاں۔ حضرت ابیؓ پر رقت طاری ہوئی اور رونے لگے۔ جس دن آپؓ کی وفات ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

اليوم مات سيد المسلمين۔[2] آج مسلمانوں کے سردار چل بسے۔

(۳) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (م ۳۲ھ)

خلفائے راشدینؓ کے بعد افضل ترین صحابی سمجھے جاتے ہیں۔ سابقین اوّلین اور کبار بدریینؓ سے تھے۔ جنگِ بدر میں ابُوجہل آپؓ کی تلوار سے ہی واصلِ جہنم ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب کوفہ کی چھاؤنی قائم کی اور وہاں بڑے بڑے رؤسائے عرب آباد کیے تو اُن کی دینی تعلیم کے لیے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو وہاں مبعوث فرمایا اور اُنہیں لکھا۔ اے اہلِ کوفہ میں نے تمہیں اپنے اُوپر ترجیح دی ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ کو تمہارے پاس بھیج دیا ہے ورنہ میں اُنہیں اپنے لیے رکھتا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمرؓ جیسے بزرگ بھی اپنے آپ کو عبداللہ بن مسعودؓ کے علم سے مستغنی نہ سمجھتے تھے۔ حضرت عمار بن یاسرؓ جب کوفہ کے امیر بنائے گئے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کوفہ والوں کو لکھا:۔

---

[1] الاکمال صفحہ ۵۹ [2] تذکرہ جلد ا صفحہ ۱۶

قد بعثت الیکم عمار بن یاسر امیرًا و عبد اللہ بن مسعودؓ معلمًا و وزیرًا و ھما من النجباء من اصحاب محمد من اھل بدرٍ فاقتدوا بھما واسمعوا وقد اثرتکم بعبد اللہ علٰی نفسی۔[1]

(ترجمہ) میں نے تمہاری طرف عمار بن یاسرؓ کو امیر اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو معلّم اور وزیر بنا کر بھیجا ہے اور دونوں حضورؐ کے اعلیٰ درجہ کے صحابہؓ میں سے ہیں اور اہلِ بدر میں سے ہیں تم ان دونوں کی پیروی کرنا اور بات ماننا۔ اور عبداللہ بن مسعودؓ کو بھیج کر میں نے تمہیں اپنے آپ پر ترجیح دی ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُن دنوں بھی مجتہد صحابہؓ کی پیروی جاری تھی۔ جو صحابہؓ اس اجتہادی شان پر نہ سمجھے جاتے تھے انہیں ان مجتہدین صحابہؓ کی پیروی کا حکم تھا اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی علمی شہرت تو اس قدر اونچی تھی کہ آپؓ کے شاگرد کسی صحابی کو بھی علم میں ان سے آگے نہ سمجھتے تھے۔ بلکہ بڑے بڑے صحابہؓ مشکلات مسائل میں آپؓ کے تلامذہ کی طرف رجوع کرتے تھے آپ حدیث کم روایت کرتے تھے۔ حضورؐ کی طرف الفاظ کی نسبت کرنے میں بہت احتیاط سے کام لیتے۔ امام ابوحنیفہؒ کوفہ میں آپؓ کی ہی مسندِ علمی کے وارث ہوئے اور آپؒ نے آپؓ کی مسند کو اپنے فیضِ علم سے اور شہرت بخشی۔ امام ابوحنیفہؒ کے مشہور فقہی مختارات مثلاً نماز میں رکوع کرتے وقت رفع یدین نہ کرنا، امام کے پیچھے سُورۂ فاتحہ نہ پڑھنا، نماز میں آمین آہستہ آواز سے کہنا وغیرہ یہ سب سُنن حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ہی مختارات ہیں اور حق یہ ہے کہ آپؓ کی ہی ذاتِ کریمہ تحقیق کی دُنیا میں حنفی مذہب کی اصل قرار پاتی ہے۔ آپؓ کے صاحبزادہ عبدالرحمٰنؒ کے پاس ایک کتاب دیکھی گئی جس کے بارہ میں وہ قسم کھا کر کہتے تھے کہ یہ اُن کے والد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔[2]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؓ حدیث لکھنے کے خلاف نہ تھے اور وہ روایات جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ کو روایتِ حدیث سے روکنا اور قید کرنا مذکور ہے وہ روایۃً ہرگز صحیح نہیں۔ اُن کے راوی ابراہیم

---

[1] تذکرہ جلد ۱ ص۱۴ [2] جامع بیان العلم لابن عبدالبر جلد ۱ ص۱۷

بن عبدالرحمٰن (ولادت ۲۰ھ) نے حضرت عمرؓ کا زمانہ نہیں پایا۔ کوفہ صرف حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ہی مرکزِ علمی نہ تھا۔ حضرت عمرؓ کے حکم سے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت حذیفہ بن الیمانؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ بھی یہاں تشریف لاچکے تھے اور جن صحابہؓ نے وہاں سکونت اختیار کی وہ بھی ایک ہزار پچیس کے قریب تھے۔ جن میں چوبیس حضراتؓ بدری بھی تھے۔ ابوالحسن احمدؒ عجلی کی روایت میں وہاں بسنے والے صحابہؓ کی تعداد ڈیڑھ ہزار کے قریب تھی۔

(۴) حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ (م ۳۲ھ) عویمر بن زید الانصاری

حافظ ذہبیؒ انہیں الامام الربانی اور حکیم الأمت کہتے ہیں۔ آپؓ اہلِ شام کے عالم فقیہ اور قاضی تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں چار انصار صحابہؓ کو قرآن کریم یاد تھا۔

۱. ابوالدرداءؓ ۲. معاذ بن جبلؓ ۳. زید بن ثابتؓ ۴. ابی زیدؓ۔

حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں:۔ ——— مات النبیؐ

ولم یجمع القرآن غیر اربعة ابی الدرداء ومعاذ بن جبل وزید بن ثابت وابی زید۔[۱]

حضرت مسروقؒ تابعی کہتے ہیں:۔

وجدت علم اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم انتھی الی ستة الی عمر وعلی وعبد اللہ ومعاذ وابی الدرداء وزید بن ثابت رضی اللہ عنہم۔[۲]

(ترجمہ) میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کے علم کو ان چھ میں تمام ہوتے پایا۔
۱. حضرت عمر ۲. حضرت علی ۳. حضرت عبداللہ بن مسعود ۴. حضرت معاذ ۵. حضرت ابوالدرداء ۶. حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم اجمعین۔

حدیث میں آپؓ کی علمی عظمت کا اندازہ کیجئے کہ ایک شخص ایک لمبے سفر سے آپؓ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اُسے دمشق آنے میں سوائے آپؓ سے حدیث سُننے کے اور کوئی غرض نہ تھی۔ وہ حدیث سنتا ہے اور واپس چل دیتا ہے۔ آپؓ یقیناً اپنے وقت میں اپنے پورے حلقہ کے مرجع اور معلم تھے۔ کثیر بن قیسؒ اس وقت حضرت ابوالدرداءؓ کے پاس بیٹھے تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں:۔

---

[۱] تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۲۴ [۲] ایضاً

كنت جالسًا مع ابي الدرداء في مسجد دمشق فجاء رجل فقال يا ابا الدرداء اني جئتك من مدينة الرسول لحديث بلغني انك تحدثه عن رسول الله صلى الله عليه وسلم ما جئت لحاجة[1]

(ترجمہ) میں دمشق کی مسجد میں حضرت ابُوالدرداءؓ کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک شخص نے آپؓ کے پاس آیا اس نے کہا اے ابوالدرداءؓ میں مدینہ شریف سے آپؓ کے پاس صرف ایک حدیث کے لیئے آیا ہوں مجھے اطلاع ملی تھی کہ آپؓ اسے حضورؐ سے روایت کرتے ہیں، میں اور کسی غرض کے لیئے آپؓ کے پاس نہیں آیا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپؓ کی شخصیتِ کریمہ اس وقت اکنافِ عالم مرجعِ علم تھی حضرت علقمہ بن قیسؒ، سعید بن المسیبؒ، خالد بن معدانؒ، ابوادریس خولانیؒ جیسے اکابر تابعین اور آپؓ کے بیٹے حضرت بلالؓ نے آپؓ سے روایات لی ہیں اور انہیں روایت کیا ہے۔ امام اوزاعیؒ آپؓ کی ہی علمی مسند کے وارث تھے۔ آپؓ کی اہلیہ اُم الدرداء بھی علم فقہ میں بہت اُونچا مقام رکھتی تھیں۔

⑤ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ (م ۴۰ ھ)

آپؓ بلاشبہ شہرِ علم کا دروازہ تھے۔ کوفہ آپؓ کی مسندِ علمی تھا اور وہیں آپؓ کی مسندِ خلافت تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (۳۲ ھ) پہلے سے ہی کوفہ میں فقہ و حدیث کا درس دے رہے تھے۔ اُن کی وفات سے کوفہ میں جو علمی خلا پیدا ہو گیا تھا، حضرت علیؓ کے وہاں جانے سے کسی حد تک پُورا ہو گیا۔ لیکن حضرت علیؓ کے گرد کچھ ایسے لوگ بھی جمع تھے جو عبداللہ بن سبا یہودی کے ایجنٹ تھے اور سبائی سازش کے پروگرام کے تحت مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اُنہوں نے حضرت علیؓ کے نام سے اتنی روایات بنائیں کہ اُن کی ہر روایت مشتبہ ہونے لگی کہ حضرت علیؓ نے ایسا کہا ہو گا یا نہ کہا ہو گا۔ سو احتیاط اسی میں سمجھی جاتی رہی کہ حضرت علیؓ کی وہی روایات سبائی سازش سے محفوظ سمجھی جائیں۔ جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کریں۔ کوفہ کا یہی علمی حلقہ قابلِ اعتماد رہ گیا تھا۔ اس علمی حلقہ کو حضرت

---

[1] مشکوٰۃ صہ۳۴ وہ حدیث کونسی تھی اسکے لیئے اس کتاب کا صہ۲۴۰ دیکھئے۔

عبداللہ بن مسعودؓ کے علاوہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت حذیفہ بن الیمانؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ اور حضرت موسیٰ اشعریؓ نے بھی جلا بخشی تھی اور وہاں کے لوگوں کو ان حضرات سے علمی استفادہ کا پورا موقع مل چکا تھا۔ حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں :۔

کان اھل الکوفۃ قبل ان یأتیھم (علی) قد اخذوا الدین عن سعد بن ابی وقاص وابن مسعود وحذیفۃ وعمار وابی موسیٰ وغیرھم ممن ارسلہ عمر الی الکوفۃ۔[1]

یہ وہ نابغۂ روزگار ہستیاں تھیں جو حضرت عمرؓ کے حکم سے اس سرزمین میں اتری تھیں۔ اور کوفہ کو دارالفضل ومحل الفضلا[2] بنا دیا تھا۔ افسوس کہ یہ سرزمین حضرت علیؓ کے علوم کو اچھی طرح محفوظ نہ رکھ سکی اور حضرت علیؓ کے نام سے بہت سی روایات یونہی وضع کر لی گئیں۔ سبائیوں نے اپنی مذکورہ سازش سے مسلمانوں کو جو سب سے بڑا نقصان پہنچایا وہ یہ تھا کہ حضرت علیؓ کے نام سے روایات گھڑ کر ان کی اصل روایات کو بھی بہت حد تک مشتبہ کر دیا۔ اور اس طرح امت علم کے ایک بہت بڑے ذخیرے سے محروم ہو گئی۔ محققین کے نزدیک فقہ جعفری حضرت علیؓ یا حضرت امام جعفر صادقؒ کی تعلیمات نہیں ہیں۔ بلکہ یہ وہ ذخیرہ ہے جو سوادِ اعظم سے اختلاف کرنے کے لیئے ان حضرات کے نام سے وضع کیا گیا ہے۔ تاہم یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ حضرت علیؓ کی مرویات اور ان کے اپنے فقہی فیصلے اہلسنت کی کتب فقہ وحدیث میں بھی بڑی مقدار میں موجود ہیں اور ان کے ہاں حضرت سیدنا علی مرتضیٰؓ فقہائے صحابہؓ میں ایک عظیم مرتبہ رکھتے تھے۔

حضرت علیؓ جب کسی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث سنتے تو اسے قسم دیتے بغیر قسم اسے قبول نہ کرتے تھے۔ لیکن قسم لینا محض مزید اطمینان کے لیئے ہوتا تھا نہ اس لیئے کہ ان کے نزدیک اخبار احاد قابل قبول نہیں تھیں۔ ہاں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ایسی شخصیت ہیں کہ ان کی روایت کو حضرت علیؓ ان کے شہرۂ آفاق صدق کے باعث فوراً قبول کر لیتے۔[3] حضرت مقدادؓ کی ایک روایت بھی آپؓ نے ایک دفعہ بغیر قسم لیئے قبول کر لی تھی۔ آپؓ کی قوت فیصلہ خدا تعالیٰ کا ایک بڑا عطیہ تھا کہ کسی امت میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد

---

[1] منہاج السنۃ جلد ۴ صفحہ ۱۵۷ [2] شرح صحیح مسلم للنواوی جلد ۱ صفحہ ۱۸۵ [3] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۱۰

فرمایا۔ اقضٰی ھم علی[1]۔ کہ صحابہؓ میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے علیؓ ہیں۔ آپؐ نے انہیں ایک مرتبہ یمن کا قاضی بھی بنایا تھا[2]۔ علامۃ التابعین عامر بن شرحبیل شعبیؒ (۱۰۳ھ) کہتے ہیں کہ اس عہد میں علم ان چھ حضرات سے لیا جاتا تھا۔ ۱۔ حضرت عمرؓ ۲۔ حضرت علیؓ ۳۔ حضرت ابی بن کعبؓ ۴۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ۵۔ حضرت زید بن ثابتؓ ۶۔ حضرت موسیٰ اشعریؓ۔ یاد رکھیے کہ حضرت علیؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انتظامیہ (خلافت) کی بجائے عدلیہ (قضاء) کے زیادہ مناسب ٹھہرایا ہے۔

⑥ کاتبِ وحی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ (۴۵ھ) الانصاری

آپؓ کی علمی شخصیت کے تعارف میں یہ جاننا ہی کافی ہے کہ ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے قرآن کریم ان سے پڑھا تھا اور حضرت انس بن مالکؓ نے احادیث آپؓ سے روایت کیں۔
آپؓ کی وفات پر حضرت ابوہریرہؓ نے کہا تھا:۔

مات حبر الامۃ ولعل اللہ یجعل فی ابن عباسؓ منہ خلفاً[3]۔

(ترجمہ) امت کے بہت بڑے عالم (حبر الامۃ) زید بن ثابتؓ چل بسے اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ابن عباسؓ کو اُن کا جانشین بنا دیں گے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ کو اُن کی شخصیت کریمہ پر اتنا اعتماد تھا کہ دونوں حضرات نے اپنے اپنے عہد میں جمع قرآن کی خدمت اُن سے لی۔ حضرت عمرؓ کی رائے حضرت سلیمان بن یسارؒ نے (۱۰۷ھ) جو بہت بڑے فقیہ اور فاضل تھے اس طرح نقل کی ہے:۔

ماکان عمر وعثمان یقدمان علی زید احداً فی الفتوی والفرائض والقرأۃ[4]۔

(ترجمہ) حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ فقہ، علم وراثت، اور قرأت میں حضرت زید بن ثابتؓ پر کسی کو فوقیت نہ دیتے تھے۔

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

افرضھم زید بن ثابت[5]۔ ان میں علم دفرائض کے سب سے بڑے ماہر زید بن ثابتؓ ہیں۔

جب یہ سوار ہوتے یا سواری سے اُترتے تو حضرت ابن عباسؓ ان کی رکاب پکڑنے کو

---

[1] مشکوٰۃ صفحہ ۳۶۵ [2] مشکوٰۃ صفحہ ۳۶۶ [3] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۳ [4] ایضاً مشکوٰۃ صفحہ ۵۶۶ عن احمد والترمذی [5] تذکرہ صفحہ ۳

اپنے لیے بڑی عزت سمجھتے تھے۔ حضرت مسروقؒ تابعی (۶۲ھ) کہتے ہیں:۔

کان اصحٰب الفتوی من الصحابۃ عمر وعلی وعبد اللہ وزید و ابی وابو موسٰی۔[1]

خطیب تبریزیؒ لکھتے ہیں:۔

کان احد فقہاء الصحابۃ۔[2] آپؓ فقہائے صحابہ میں سے ایک تھے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہؓ وتابعینؒ کے دور میں مدارِ شہرت وفضل علم فقہ تھا۔ روایتِ حدیث فقہاء کے بعد دوسرے درجے میں آتے تھے۔

قرأت خلف الامام جیسے معرکۃ الآراء مسئلے میں امام مسلمؒ نے آپؓ کا یہ فتویٰ نقل کیا ہے:۔

عن عطاء بن یسار انہ اخبرہ انہ سأل زید بن ثابت عن القرأۃ مع الامام فقال لا قرأۃ مع الامام فی شیء۔[3]

ترجمہ: عطاء بن یسار نے حضرت زید بن ثابت سے پوچھا کہ امام کے پیچھے قرآن پڑھا جا سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا امام کے ساتھ کسی حصے میں قرآن پڑھنے کی اجازت نہیں۔

(۷) حضرت ابو موسٰی اشعریؓ (۴۴ھ) ذہبی۔ خطیب تبریزی نے سن وفات ۵۲ھ لکھا ہے۔

مکہ مکرمہ میں اسلام لائے۔ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ حضورؐ نے انہیں یمن کا والی بنایا۔ حضرت عمرؓ نے انہیں بصرہ کا والی بنایا اور آپؓ کی اور دیگر صحابہؓ جن میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت حذیفہؓ بن الیمان اور حضرت ابو موسٰی اشعریؓ بھی تھے کی آمد سے عراق مرکزِ علم بن چکا تھا۔ ان دنوں علم سے مراد حدیث اور فقہ تھے۔ حضرت علیؓ نے معرکہ تحکیم میں آپؓ (حضرت ابو موسٰی اشعریؓ) کو اپنا نمائندہ بنایا تھا۔ یہ مسلسل واقعات آپؓ کی عظمتِ شخصی اور آپؓ کی فقہ وفضیلت کے تاریخی شواہد ہیں۔ قرآن کریم بہترین آواز سے پڑھنا آپؓ پر ختم تھا۔ تاہم آپؓ امام کے پیچھے قرآن پڑھنے کے قائل نہ تھے۔ آپؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت کی

اذا قرء فانصتوا۔[4] امام جب قرآن پڑھے تو تم چپ رہو۔

حضورؐ کے عہد میں جو چار صحابہؓ فتوے دینے کے مجاز تھے۔ آپؓ بھی اُن میں تھے۔

---

[1] تذکرہ ج ۱ صـ [2] الاکمال صـ ۵۹۹ [3] صحیح مسلم جلد ۱ صـ ۲۱۵ [4] صحیح مسلم جلد ۱ صـ ۱۷۴

صفوان بن سلیمؒ (د ۱۳۲ھ) کہتے ہیں:-

لم یکن یفتی فی زمن النبیؐ غیر عمر و معاذ و علی و ابی موسیٰ۔[1]

حافظ ذہبیؒ آپ کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

کان عالماً، عاملاً، صالحاً، تالیاً لکتاب اللہ الیہ المنتہیٰ فی حسن الصوت بالقرآن روی علماً طیباً مبارکاً۔[2]

(ترجمہ) آپ عالم تھے عامل تھے نیک تھے اللہ کی کتاب کو پڑھنے والے تھے قرآن کو اچھی آواز سے پڑھنے میں چوٹی کے تھے آپ نے علم پاکیزہ اور بابرکت روایت کیا ہے۔

آپؓ نے ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو یہ حدیث سنائی۔ اذا اسلم احدکم ثلثاً فلم یجب فلیرجع۔ جب تم میں سے کوئی (کسی کے دروازے پر) تین دفعہ سلام کہے اور اسے جواب نہ ملے تو اُسے واپس لوٹ جانا چاہیئے۔ تو حضرت عمرؓ نے اس پر مزید شہادت طلب کی حضرت ابوموسیٰؓ بہت گھبرائے۔ یہاں تک کہ آپؓ کو ایک انصاری کے ہاں اس کی تائید ملی۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپؓ میں اپنے اکابر کی تعمیل حکم کا جذبہ کس درجہ کارفرما تھا۔ حضرت عمرؓ بھی آپؓ پر معاذ اللہ کوئی الزام نہ لگا رہے تھے۔ صرف دوسرے صحابہؓ کو احتیاط فی الروایۃ کا سبق دینا مقصود تھا۔ نہ آپؓ کی غرض یہ تھی کہ خبر واحد کا اعتبار نہ کیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے خود فرمایا:-

اما انی لم اتھمک ولکنی خشیت ان یتقول الناس علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔[3]

(ترجمہ) میں آپؓ کو متہم نہیں کر رہا تھا میں صرف اس سے ڈرا ہوا تھا کہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی طرف سے باتیں نہ لگانے لگیں۔

یاد رکھئے کسی صحابی پر جھوٹ کا الزام نہیں لگتا صحابہ سب عادل ہیں۔

⑧ فقیہ مکہ ترجمان القرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ (۶۸ھ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباسؓ کے لئے دعا فرمائی تھی کہ اللہ انہیں علم و فقہ سے مالامال کرے اور فہم قرآن کی شان بخشے۔ حضورؐ کی وفات کے وقت آپؓ کی عمر تیرہ سال تھی حضورؐ کے بعد

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۲۳ [2] ایضاً صفحہ ۲۲ [3] موطا امام مالک صفحہ ۳۸۰

حضرت زید بن ثابتؓ سے تعلیم حاصل کی اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے آپؓ کو ترجمان القرآن کا عظیم لقب دیا۔[1] اعمشؒ سے روایت ہے کہ جب حضرت علیؓ نے حضرت ابن عباسؓ کو امیر حج کی ذمہ داری سپرد کی۔ تو آپؓ نے ایسا خطبۂ حج دیا کہ اگر اسے ترک اور اہلِ روم سُن لیتے تو سب کے سب مسلمان ہو جاتے۔ نعیم بن حفصؒ کہتے ہیں کہ جب حضرت ابن عباسؓ ہمارے ہاں بصرہ میں آئے۔ تو عرب میں علم وفضل میں اُن کا ثانی نہ تھا۔

وما فی العرب مثلہ جسماً و علماً و بیاناً و جمالاً و کمالاً۔[2]

امام ترمذیؒ کی ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ آپؓ نے بھی حضورؐ کی احادیث آپ کے بعد جمع کرنی شروع کر دی تھیں اور وہ تحریریں لوگوں تک پہنچی ہوئی تھیں۔ ایک مرتبہ طائف سے کچھ لوگ آپؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُن کے پاس آپؓ کی کچھ تحریرات تھیں اور انہوں نے انہیں آپؓ کے سامنے پڑھا۔[3]

(۹) حبر الامۃ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ (۷۴ھ) ابو عبدالرحمٰن العدوی المدنی

حضرت علیؓ کے صاحبزادے محمد بن الحنیفہؒ انہیں حبر ھٰذہ الامۃ (اس اُمت کے بڑے عالم) کہا کرتے تھے۔ امام زہریؒ فرماتے ہیں:۔

لا تعدلن برای ابن عمر فانہ اقام ستین سنۃ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم فلم یخف علیہ شئی من امرہ ولا من امر اصحابہ۔[4]

(ترجمہ) نہ برابر سمجھ ابن عمرؓ کے ساتھ کسی کی رائے اس لیے کہ وہ حضورؐ کے وصال کے بعد ساٹھ سال تک زندہ رہے اس لیے نہیں مخفی رہا آپؓ پر حضورؐ کے امر سے اور نہ ہی آپ کے صحابہ کے امر سے

اہل الرای ہونا کوئی عیب نہیں جو امام زہریؒ عبداللہ بن عمرؓ کی طرف منسوب کر رہے ہیں یہ علم کا وہ درجہ ہے جو مجتہد کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ آپؓ سے کثیر تعداد احادیث منقول ہیں لیکن علامہ ذہبیؒ نے انہیں الفقیہ کے پُر اعزاز لقب سے ذکر کیا ہے۔ جن دنوں حضرت علی مرتضیٰ رضؓ اور حضرت امیر معاویہؓ میں اختلاف جاری تھا اور اچھی خاصی تعداد اس بات کی حامی ہو گئی تھی۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صـ ۳۸ [2] ایضاً صـ ۳۶ [3] کتاب العلل للامام الترمذی صـ [4] تذکرہ جلد ۱ صـ ۳۸

کہ یہ دونوں بزرگ قیادت سے کنارہ کش ہو جائیں تو جو شخصیت ان دنوں لوگوں کی نظر میں اس لائق تھی کہ اس پر امت جمع ہو جائے اور اس میں علم و عمل کی پوری استعداد ہو تو وہ آپؓ ہی تھے۔ لیکن آپؓ اس میدان میں آگے آنے کے لئے قطعاً تیار نہ ہوئے۔

حضرت سفیان ثوریؒ (۱۶۱ھ) کہا کرتے تھے:۔

یقتدی بعمر فی الجماعۃ وبابنہ فی الفرقۃ۔[۱]

(ترجمہ) لوگوں سے مل کر چلنے میں عمرؓ کی پیروی کی جائے اور لوگوں سے کنارہ کشی میں اُن کے بیٹے کو نمونہ بنایا جائے۔

⑩ حضرت جابر بن عبداللہ الانصاری رضی اللہ عنہ (۷۸ھ)

ستر انصاریؓ جو بیعتِ عقبہ میں شامل ہوئے آپؓ اُن میں سے تھے۔ حافظ ذہبیؒ نے انہیں فقیہ اور مفتی مدینہ کے نام سے ذکر کیا ہے اور لکھا ہے:۔

حمل عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم علماً کثیراً نافعاً۔[۲]

ترجمہ:۔ آپؓ نے آنحضرتؐ سے بہت سا نافع علم پایا۔

حدیث کے اتنے شیدائی تھے کہ ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن انیسؓ کے بارے میں سُنا کہ اُن کے پاس ایک حدیث ہے جو انہوں (عبداللہ بن انیسؓ) نے خود حضورؐ سے سُنی ہے۔ وہ اُن دنوں ملکِ شام میں مقیم تھے۔ اس پر آپؓ نے ایک اُونٹ خریدا اور اس پر ایک ماہ تک سفر کرتے کرتے ملکِ شام پہنچے۔ پیغام بھیجا کہ جابرؓ دروازے پر کھڑا ہے: انہوں نے پُوچھا جابر بن عبداللہ ہیں؟ فوراً باہر آئے۔ حضرت جابرؓ نے اُن سے حدیث پوچھی۔ انہوں نے سنائی۔[۳] انہوں نے سُنی اور چلدیئے۔ علامہ عینیؒ فرماتے ہیں وہ حدیث غالباً یہ تھی:۔

عن جابرؓ عن عبداللہ بن انیسؓ سمعت النبیؐ یقول یحشر اللہ العباد فینادیھم بصوت یسمعہ من بعد کما یسمعہ من قرب انا الملک الدیان۔[۴]

ترجمہ۔ حضرت جابر عبداللہ بن انیسؓ سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں میں نے

---

[۱] تذکرہ جلد ۱ ص ۳۸ [۲] ایضاً [۳] الادب المفرد امام بخاری ص ۲۵۱ صحیح بخاری ص ۱۷ تذکرہ جلد ۱ ص ۳۸
[۴] صحیح بخاری جلد ۲ ص ۱۱۱۴

حضورؐ کو فرماتے سنا۔ اللہ بندوں کو حشر میں ایسی آواز سے بلائے گا جس کو
قریب اور بعید والے سب یکساں سنیں گے۔ فرمائیگا میں ہوں بادشاہ انصاف والا۔
اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپؓ کی شخصیت کریمہ کس طرح جمع حدیث اور طلب علم میں منہمک
تھی۔ آپؓ مجتہد صحابہؓ میں سے تھے اور حدیث کے مناط کلام پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ مثلاً حضور اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لاصلوٰۃ لمن لم یقرء بفاتحۃ الکتاب۔ کہ اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو
سورہ فاتحہ نہ پڑھے۔ آپؓ نے فرمایا یہ اس شخص سے متعلق ہے جو اکیلے نماز پڑھے۔ جو امام کے
پیچھے نماز پڑھے اس پر سورۂ فاتحہ پڑھنا لازم نہیں۔ حدیث میں مراد رسول کو پہنچنا انتہائی گہرا علم
ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ جو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ دونوں کے استاد تھے۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ
کی اس شرح حدیث سے بہت متاثر تھے۔ آپؒ فاتحہ خلف الامام کے قائل تھے۔ مگر یہ صاف
فرماتے کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھے بغیر نماز ہو جاتی ہے۔ امام ترمذیؒ لکھتے ہیں:۔

واما احمد بن حنبل فقال معنی قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ
الکتاب اذا کان وحدہ واحتج بحدیث جابر بن عبداللہ قال من صلی رکعۃ لم یقرأ فیھا بام القران
فلم یصل الا ان یکون وراء الامام قال احمد فھذا رجل من اصحاب النبیؐ تاول قول النبیؐ
لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب ان ھذا اذا کان وحدہ۔ **جامع ترمذی جلد ۱ ص۴۲**

ترجمہ۔ امام احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ حضورؐ کی حدیث۔ لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب کا
معنی یہ ہے کہ نمازی جب اکیلا نماز پڑھے تو فاتحہ پڑھے بغیر نماز نہیں ہوتی اور آپ نے
حضرت جابرؓ کی حدیث سے دلیل پکڑی ہے آپ فرماتے ہیں جس نے ایک رکعت پڑھی
اور اس میں سورہ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہ ہوئی مگر جبکہ وہ امام کے پیچھے ہو۔ امام احمدؒ
کہتے ہیں کہ حضرت جابرؓ حضورؐ کے صحابی ہیں وہ حضورؐ کے ارشاد کا مطلب یہ بیان کر
رہے ہیں کہ حدیث لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ سے مراد یہ ہے کہ نمازی جب اکیلا ہو۔

یہ دس مشاہیر کا تذکرہ ہے جو فقہاء صحابہؓ میں بہت ممتاز تھے۔ ان کے علاوہ بھی کئی مجتہد صحابہؓ
تھے جنہیں فقیہ تسلیم کیا گیا ہے۔ جیسے عمران بن حصینؓ (۵۲ھ) حضرت ابوہریرۃؓ (۵۸ھ) اور حضرت
امیر معاویہؓ (۶۰ھ) ان کے علم پر حضرت حسنؓ کو پورا اعتماد نہ ہوتا تو کبھی خلافت انکے سپرد نہ کرتے۔

صحابہؓ میں رواۃِ حدیث

ویسے تو ہر صحابیؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی بات کو آگے پہنچانے کا مکلف تھا لیکن جو صحابہؓ کثرتِ روایت میں معروف ہوئے ان میں سے دس زیادہ ممتاز رواۃِ حدیث کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے یہ حضرات گو اپنی جگہ فقہ میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ لیکن ان کی شہرت فقہ حدیث کی بجائے روایتِ حدیث میں زیادہ رہی ہے۔ رواۃ حدیث میں کچھ صحابہ مکثرین روایت تھے اور کچھ مقلین روایت۔

مقلّین روایت (کم روایت والے)

حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت زبیر بن العوامؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زید بن ارقمؓ، عمران بن حصینؓ اور دوسرے کئی صحابہؓ تھے جن کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی دولت بے پایاں تھی لیکن وہ روایتِ حدیث میں زیادہ محتاط رہے اور بہت کم حدیثیں انہوں نے روایت کیں۔ اُن کی قلتِ روایت سے اُن کے قلتِ علم پر استدلال کرنا اسی طرح ایک نادانی ہے جیسے کوئی احمق امام ابوحنیفہؒ کی قلتِ روایت پر نظر کرتے ہوئے ان کے قلتِ علم کا دعوٰے کرنے لگے امام صاحب کی شروطِ روایت بھی تو بہت سخت تھیں یہی وجہ ہے کہ آپؒ نے روایتِ حدیث کی بجائے فقہ حدیث کو اپنا موضوع بنایا اور اسی پر ہی اپنی ساری عمر صرف کر دی۔ گو اس ضمن میں بھی آپ کو ہزاروں احادیث روایت کرنی پڑیں۔

عبداللہ بن زبیرؓ کہتے ہیں میں نے اپنے والد زبیرؓ سے پوچھا آپؓ حضورؐ سے اس طرح احادیث روایت کیوں نہیں کرتے جس طرح فلاں فلاں صحابہؓ کرتے ہیں۔ آپؓ نے فرمایا۔

اما انی لم افارقہ ولکن سمعتہ یقول من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار۔

(ترجمہ) میں حضورؐ سے جدا تو کبھی نہیں ہوا لیکن میں نے حضورؐ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جس نے جان بُوجھ کر مجھ پر جھُوٹ باندھا اسے جہنم میں ٹھکانہ کرنا ہے۔ صحیح بخاری جلد ۱ صہ۲۱

آپ کا احتیاط کا منشا یہ تھا کہ حضورؐ کی بات روایت بالمعنی میں بدلتے ہوئے کوئی بے احتیاطی نہ ہو جائے۔ سو آپ کی قلت روایت قلت علم کی وجہ سے نہ تھی۔

جن حضرات نے نسبتہً کثرت سے احادیث روایت کیں ان میں سے ہم دس مشاہیر کا یہاں ذکر کرتے ہیں۔ گو ان کے علاوہ بھی ایک کثیر تعداد ان صحابہؓ کی ہے جن سے بہت سی احادیث مروی ہیں اور کتب صحاح اُن کی مرویات سے پُر ہیں۔ تاہم یہاں صحابہؓ میں سے صرف چند رواۃِ حدیث کا تعارف پیش کیا جاتا ہے

صحابہؓ میں رواۃِ حدیث (محدّثین کرام)

حضرت ابوذر غفاریؓ (۳۲ھ) حضرت حذیفہ بن الیمانؓ (۳۵ھ) حضرت عمران بن حصینؓ (۵۲ھ) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ (۵۵ھ) حضرت ابوہریرہؓ (۵۷ھ) حضرت سمرہ بن جندبؓ (۵۹ھ) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ (۶۵ھ) حضرت براء بن عازبؓ (۷۲ھ) حضرت ابوسعید الخدریؓ (۷۴ھ) حضرت انس بن مالکؓ (۹۳ھ) رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

(۱) حضرت ابوذر غفاریؓ (۳۲ھ)

سابقین اوّلین میں سے ہیں۔ آپؓ سے حضرت انس بن مالکؓ، زید بن وہبؓ، جبیر بن نفیرؒ، احنف بن قیسؒ اور قدمائے تابعین میں سے ایک کثیر تعداد نے روایات لی ہیں۔ حافظ ذہبیؒ لکھتے ہیں۔ وکان یوازی ابن مسعود فی العلم۔ علم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے برابر اُترتے تھے۔ حدیث روایت کرنا سب سے بڑا فرض جانتے تھے۔ خود فرماتے ہیں:۔

> قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر تم تلوار میری گردن پر رکھ دو اور مجھے گمان ہو کہ پیشتر اس کے کہ تم اس تلوار کو چلادو میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بات جو میں نے آپؐ سے سُنی روایت کرسکتا ہوں تو میں ضرور اُسے روایت کر گزروں گا۔[۱]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہؓ کس طرح حضورؐ کی احادیث کو ایک علمی امانت سمجھتے تھے اور انہیں آگے پہنچانے کی ان حضراتؓ کو کتنی فکر تھی۔ اتفاق دیکھیے کہ آپؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۱۸

ایک ہی سال فوت ہوئے۔

(۲) حضرت حذیفہ بن الیمانؓ (۳۵ھ) ابوعبداللہ العبسی

آپؓ سِرِّ رسول اللہ (حضورؐ کے راز داں صحابیؓ) کے طور پر معروف تھے۔ آپؓ سے حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابوالدرداءؓ جیسے اکابر صحابہؓ نے احادیث روایت کی ہیں اور تابعینؒ کی تو ایک بڑی تعداد نے آپؓ سے احادیث روایت کی ہیں۔

(۳) حضرت عمران حصینؓ (۵۲ھ) ابونجید الخزاعی

خیبر کے سال اسلام لائے۔ آپؓ کا اور حضرت ابوہریرہؓ کا اسلام لانے کا ایک ہی سال ہے۔ کان من فضلاء الصحابۃ وفقہائھم[1] حضرت عمرؓ نے آپؓ کو بصرہ روانہ فرمایا تاکہ وہاں کے لوگوں کو فقہ کی تعلیم دیں[2]۔ آپؓ نے پھر پوری زندگی وہیں بسر کر دی۔ آپؓ سے حسن بصریؒ، امام محمد بن سیرینؒ اور علامہ شعبیؒ جیسے اکابر تابعینؒ نے روایات لی ہیں۔ حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں:

ولہ احادیث عدۃ فی الکتب وکان من الباء الصحابۃ وفضلائھم[3]

آپؓ ان پانچ ممتاز صحابہؓ میں سے ہیں جو صفین کے معرکہ میں اہلِ شام اور اہلِ عراق میں سے کسی کے ساتھ شامل نہیں ہوئے۔

(۴) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ (۵۵ھ)

آپؓ عشرہ مبشرہ صحابہؓ میں سے ہیں۔ جنگِ بدر میں شامل ہوئے۔ پہلے فرد ہیں جنہوں نے اللہ کی راہ میں تیر چلایا۔ آپؓ سے حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ نے بھی روایات لی ہیں۔ حضرت سعید بن المسیبؒ، حضرت علقمہؒ، ابوعثمان النہدیؒ اور حضرت مجاہدؒ جیسے اکابر تابعینؒ آپؓ کے شاگرد تھے۔

آپؓ معرکہ صفین میں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں سے کنارہ کش رہے۔ حضرت علیؓ

---

[1] الاکمال ص ۶۱۱ [2] تذکرہ جلد ۱ ص ۲۸ [3] ایضاً

آپؓ کے اس موقف میں آپؓ پر رشک کرتے تھے۔

⑤ حضرت ابو ہریرہؓ الدوسی الیمانی (۵۸ھ)

جاہلیت میں نام عبدالشمس تھا۔ والد نے کنیت ابوہریرہ رکھی۔ اسلام لانے کے بعد عبدالرحمٰن سے موسوم ہوئے۔ خیبر کے سال اسلام لائے۔ مدینہ ہجرت کی۔ اصحابِ صفہؓ میں سے تھے حضورؐ سے علم کثیر پایا۔ حضورؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت ابی بن کعبؓ اور دوسرے کئی اور صحابہؓ سے روایات لیں۔

امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ آپؓ سے آٹھ سو کے قریب لوگوں نے روایات لیں۔ ممتاز شاگردوں میں ہمام بن منبہ (۱۱۰ھ) سعید بن المسیب (۹۳ھ) مجاہد (۱۰۰ھ) علامہ شعبی (۱۰۳ھ) ابن سیرینؒ (۱۱۰ھ) عطاء بن ابی رباح (۱۱۵ھ) عروہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اسماء خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ابو صالح السمان کہتے ہیں۔ كان ابو هريرة من احفظ اصحاب محمد صلى الله عليه وسلم اور وہ خود فرماتے ہیں:۔

لا اعرف احدًا من اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم احفظ لحديثه مني۔[1]

(ترجمہ) حضورؐ کے صحابہؓ میں سے کسی کو نہیں جانتا کہ وہ مجھ سے حضورؐ کی احادیث کا زیادہ یاد کرنے والا ہو۔

جہاں تک روایت کا تعلق آپؓ سوائے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کے باقی سب صحابہؓ سے آگے تھے اور وجہ یہ تھی کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ حضورؐ سے حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے۔ اور حضرت ابوہریرہؓ لکھتے نہ تھے۔[2]

آنحضرتؐ نے آپؓ کو قوتِ حافظہ کا دم کیا تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ اس کے بعد کبھی نہ بھولے آپؓ سے ساڑھے پانچ ہزار کے قریب حدیثیں مروی ہیں۔ ان میں سے صحیح بخاری میں ۴۴۸ اور صحیح مسلم میں ۵۴۵ حدیثیں مروی ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوہریرہؓ نے بھی احادیث لکھنی شروع کر دی تھیں۔ آپؓ اپنے تلامذہ کو یہ تحریرات گاہے بگاہے دکھا بھی دیتے تھے۔[3] آپؓ کے شاگردوں

---

[1] تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۳۴ [2] صحیح البخاری جلد ۱ صفحہ ۲۲ المصنف لعبدالرزاق جلد ۱۱ صفحہ ۲۵۹ [3] جامع بیان العلم جلد ۱ صفحہ ۴۴

نے جو حدیثی مجموعے تیار کیے اُن میں ہمام بن منبہؒ کا صحیفہ بہت معروف ہے اور چھپ بھی چکا ہے۔

اس درجہ کے عظیم محدث ہونے کے ساتھ ساتھ آپؓ بلند پایہ فقیہ بھی تھے۔ امام ذہبیؒ نے "الفقیہ صاحب رسول اللہ" کہہ کر آپؓ کا تعارف کرایا ہے اور لکھا ہے:۔

كان من اوعية العلم ومن كبار ائمة الفتوى مع الجلالة والعبادة والتواضع[1]

(ترجمہ) علم کا محفوظ خزانہ تھے فتوے دینے والے بڑے ائمہ میں سے تھے جلالۃ عبادت اور تواضع والے تھے۔

⑥ حضرت سمرہ بن جُندبؓ (۵۹ھ) الفزاری

خطیب تبریزیؒ آپؓ کے تعارف میں لکھتے ہیں:۔

كان من الحفاظ المكثرين عن رسول صلى الله عليه وسلم وروى عنه جماعة[2]

(ترجمہ) آپؓ ان حفاظِ حدیث میں سے تھے جنہوں نے حضورؐ سے کثرت سے روایت کی ہے اور اُن سے (تابعین کی) ایک جماعت روایت کرتی ہے۔

آپؓ نے خود بھی ایک مجموعہ حدیث جمع کر رکھا تھا۔ ابن سیرینؒ کہتے ہیں اس میں علم کثیر موجود ہے[3]۔ حضرت حسن بصریؒ نے بھی اُسے روایت کیا ہے[4]۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (۸۵۲ھ) نے اس مجموعہ حدیث کو نسخہ کبیرہ کہہ کر ذکر کیا ہے[5]۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں کثیر حدیثی مواد موجود تھا۔

⑦ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ (۶۵ھ)

ان خواص صحابہؓ میں سے ہیں جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث لکھنے کی اجازت دے رکھی تھی آپؓ نے خود ایک مجموعہ حدیث لکھا تھا جسے الصادقہ کہتے ہیں۔ اُن کے والد اُن سے عمر میں صرف تیرہ سال بڑے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اُن کے والد عمرو بن العاصؓ فاتح مصر پر بھی فضیلت دیتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے صرف اُن کے بارے میں اعتراف کیا ہے کہ اُن کی روایت کردہ احادیث میری مرویات سے زیادہ ہیں۔

---

[1] تذکرہ صہ۳۱ [2] الاکمال صفحہ۲۰ [3] تہذیب التہذیب جلد۴ صہ۲۳۶ [4] ایضاً جلد۲ صفحہ۲۶۹ [5] ایضاً جلد۴ صہ۱۹۸

سعید بن المسیبؒ، عروہ بن الزبیرؒ، وہب بن منبہؒ، عکرمہؒ وغیرہم سب آپؓ کے شاگرد تھے۔ تابعی کبیر حضرت مجاہدؒ (۱۰۰ھ) ذکر کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک صحیفہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے تکیے کے نیچے رکھا دیکھا تھا۔[۱]

حضرت ابوہریرہؓ کی کل مرویات ۵۳۷۴ ہیں اور وہ تسلیم کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمروؓ کی مرویات مجھ سے زیادہ ہیں اس لیئے کہ وہ حضورؐ سے حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا۔

(۸) حضرت براء بن عازبؓ (۷۲ھ) ابوعمارۃ الانصاری

عبداللہ بن حنش کہتے ہیں کہ میں نے حضرت براءؓ کے پاس لوگوں کو کلکیں ہاتھ میں لیئے (حدیثیں) لکھتے پایا۔[۲] آپؓ کوفہ میں رہتے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کوفہ ان دنوں کس طرح علم حدیث کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ آپؓ جنگ جمل، صفین اور نہروان تینوں میں حضرت علیؓ کے ساتھ رہے۔

خطیب تبریزیؒ لکھتے ہیں:۔

روی عن خلق کثیر۔[۳] آپؓ سے بہت لوگوں نے احادیث روایت کیں۔

(۹) حضرت ابوسعید سعد بن مالکؓ الخدری (۷۴ھ) الانصاری الخزرجی

بیعت الرضوان کے شاملین میں سے تھے، اہل صفہ میں سے تھے آپؓ نے حدیث کثرت سے روایت کی۔ حافظ ذہبیؒ لکھتے ہیں:۔

روی حدیثاً کثیراً وافتی مدۃ وابوہ من شہداء احد عاش ابوسعید ستاً وثمانین سنۃ وحدث عنہ ابن عمر وجابر بن عبد اللہ وغیرہما من الصحابۃ[۴] ـــــ آپ نے بہت احادیث روایت کی ہیں اور مدتوں فتوے دیتے رہے۔ آپ کے والد شہداء احد میں سے تھے ابوسعید ۸۶ سال زندہ رہے۔ آپ سے حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت جابر بن عبداللہ اور دوسرے کئی صحابہ نے روایت کی ہے۔

---

[۱] جامع بیان العلم جلد ۱ صـ۷۲، اسد الغابہ جلد ۳ صـ۲۳۴ [۲] سنن دارمی جلد ۱ صـ۱۲۸ جامع بیان العلم جلد ۱ صـ۷۳ [۳] الاکمال صـ۵۹۱ [۴] ایضاً صـ۵۸۹

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں آپؓ کی متفق علیہ تینتالیس[۴۳] حدیثیں ہیں اور علی الانفراد دونوں کتابوں میں سولہ[۱۶] اور باون[۵۲] حدیثیں ملتی ہیں خطیب تبریزیؒ لکھتے ہیں:۔

کان من الحفاظ المکثرین والعلماء الفضلاء العقلاء روی عنہ جماعۃ من الصحابۃ والتابعین[۱] (ترجمہ) آپ کثرت سے احادیث بیان کرنیوالے حفاظ میں سے تھے اور علماء وعقلاء میں سے تھے۔ آپ سے کئی صحابہ وتابعین نے روایت کی ہے۔

⑩ حضرت انس بن مالکؓ (۹۳ھ) ابو حمزۃ الانصاری الخزرجی

آپؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نو (۹) سال کے قریب خادم رہے اور سفر وحضر میں حضورؐ کی احادیث سنیں، حضورؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، اور کئی دوسرے اکابر صحابہؓ سے فیض علم پایا۔ آپؓ بعض اوقات حضورؐ سے حدیثیں لکھ بھی لیتے تھے بلکہ حضورؐ کو سنا بھی دیتے تھے۔ آپؓ کے شاگرد سعید بن ہلال کہتے ہیں:۔

کنا اذا اکثرنا علی انس بن مالکؓ فاخرج الینا مجال عندہ فقال ھذہ سمعتھا من النبیؐ فکتبتھا وعرضتھا[۳]۔

(ترجمہ) ہم جب حضرت انسؓ سے زیادہ روایات پوچھتے تو آپؓ اپنے مجلات (بیاضیں) نکال لیتے اور فرماتے یہ وہ روایات ہیں جو میں نے حضورؐ سے سنیں میں نے انہیں لکھا اور انہیں آپؐ کو پڑھ کر بھی سنا تا رہا۔

حافظ ذہبیؒ لکھتے ہیں۔ ولہ صحبۃ طویلۃ وحدیث کثیر وملازمۃ للنبیؐ۔ آپؓ نے حضورؐ کی لمبی صحبت پائی، بہت حدیث سنی اور آپؐ کی مجلس کو لازم پکڑا ..... آپؓ صحابہؓ میں سب سے آخر میں فوت ہوئے۔

---

[۱] الاکمال ص۶۰۲ [۲] تذکرہ جلد ۱ ص۴۲ [۳] مستدرک جلد ۱ ص

آپؓ کے شاگردوں میں حضرت حسن بصریؒ، امام زہریؒ، قتادہؒ، ثابت بنانی، حمید الطویل زیادہ معروف ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ نے بھی آپؓ کو دیکھا ہے۔ حضرت امامؒ نے آپؓ سے روایات لی ہیں یا نہ اس میں اختلاف ہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں انہیں بصرہ بھیج دیا[۱] تاکہ وہاں لوگوں کو فقہ کی تعلیم دیں۔ اس صورتِ حال سے پتہ چلتا ہے کہ عراق کی درسگاہیں کس طرح علم حدیث و فقہ سے مالامال ہو رہی تھیں۔

امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے حضرت انسؓ کی ۱۲۸ حدیثیں بالاتفاق روایت کی ہیں اور ہر دو اماموں نے آپؓ کی ۸۰ اور ۷۰ دیگر روایات علی الانفراد روایت کی ہیں۔ حضرت انسؓ کے شاگردوں میں سے ابان بن یزید نے آپؓ کے سامنے ہی آپؓ کی مرویات لکھنی شروع کر دی تھیں۔

نوٹ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ روایتِ حدیث میں بھی امتیازی شان رکھتی ہیں۔ آپؓ سے دو ہزار دو سو دس ۲۲۱۰ حدیثیں مروی ہیں۔ جن میں سے ۲۲۸ صحیح بخاری میں ۲۴۲ صحیح مسلم میں مروی ہیں اور ان میں سے ۱۷۴ روایات پر شیخین کا اتفاق ہے۔ جس طرح دس فقہائے حدیث میں ہم نے حضرت عائشہؓ کو ذکر نہیں کیا کہ ماں امتیازی شان رکھتی ہے۔ اس طرح ہم نے ان دس رواۃِ حدیث میں حضرت ام المؤمنینؓ کا ذکر نہیں کیا۔ تاکہ یہاں بھی ان کی امتیازی حیثیت قائم رہے۔

ان دس ممتاز رواتِ حدیث کے ساتھ ساتھ جو اور صحابہؓ روایتِ حدیث میں پیش پیش رہے۔ ان میں حضرت اسید بن حضیرؓ (۲۰ھ) حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ (۳۲ھ) حضرت عبادہ بن صامتؓ (۳۴ھ) حضرت سلمان فارسیؓ (۳۵ھ) حضرت عبداللہ بن سلامؓ (۴۳ھ) حضرت عمرو بن حزمؓ (۵۳ھ) مولودِ کعبہ حضرت حکیم بن حزامؓ (۵۴ھ) حضرت عقبہ بن عامر الجہنی (۵۸ھ) زیادہ روایات کے راوی ہیں اور حق یہ ہے کہ ہر ایک صحابیؓ نے اپنی اپنی بساط اور اپنی اپنی یاد کے مطابق حضورؐ سے احادیث سنیں اور آپؐ سے دیکھی ہر بات کو آگے پہنچانے اور پھیلانے میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ یہاں تک کہ علمِ پیغمبرؐ ان مقدس راویانِ حدیث (صحابہ کرامؓ) سے آگے تابعینؒ کو منتقل ہوا ——— جس طرح صحابہ کرامؓ میں فقہاءِ حدیث اور رواۃِ

---

[۱] الاکمال ص۶۰۰

حدیث امتیازی صورتوں میں علم حدیث کی خدمت کرتے رہے تھے۔ تابعین کرامؒ میں بھی خدمتِ حدیث کا وہی رنگ اُبھرا۔ کچھ بزرگ فقہاءِ حدیث کی حیثیت سے زیادہ نمایاں ہوئے تو کچھ حضرات نے رواتِ حدیث کی حیثیت سے اس فن کی زیادہ خدمت کی اور یہ بھی صحیح ہے کہ بیشتر حضرات ان میں سے بھی فقہ اور حدیث دونوں کے جامع تھے۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

تابعین کرامؒ میں فقہاءِ حدیث

حضرت علقمہ بن قیسؒ (۶۲ھ) مسروق بن اجدعؒ (۶۳ھ) سعید بن المسیبؒ (۹۳ھ) حضرت سعید بن جبیرؒ (۹۵ھ) ابراہیم نخعیؒ (۹۶ھ) مکحولؒ (۱۰۱ھ) علامہ شعبیؒ (۱۰۳ھ) حضرت سالمؒ (۱۰۶ھ) حضرت قاسم بن محمدؒ (۱۰۷ھ) حماد بن ابی سلیمانؒ (۱۲۰ھ) کا ہم یہاں ذکر کریں گے۔

(۱) حضرت علقمہ بن قیسؒ النخعی الکوفی (۶۲ھ)

حافظ ذہبیؒ تذکرۃ الحفاظ میں صحابہ کرامؓ کے تذکروں کے بعد کبرائے تابعینؒ کا آغاز آپؒ سے کرتے ہیں۔ آپؒ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں پیدا ہوئے اور آپؐ کے بعد نصف صدی تک زندہ رہے۔ آپؒ فقیہِ عراق ابراہیم نخعیؒ کے ماموں اور مرکزِ علم کوفہ ابوعمر و اسود بن یزیدؒ کے چچا تھے۔ علقمہ اور اسود دونوں حضرات فقہ حنفی کی اساس سمجھے جاتے ہیں۔ آپؒ کے علم و فضل کا اندازہ امام ربانی عبداللہ بن مسعودؓ کے اس ارشاد سے دیکھئے:۔

ما اقرأ شیئاً وما اعلم شیئاً الا وعلقمۃ یقرؤہ ویعلمہ[1]

(ترجمہ) جو کچھ میں پڑھتا اور جانتا ہوں علقمہ بھی اُسے پڑھ چکے اور جان چکے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اس کہنے کا اثر تھا کہ حضرت علقمہ باوجودیکہ صحابیؓ نہ تھے۔ صحابہ کرامؓ آپؒ سے مسائل پوچھنے آتے تھے۔ اُن کی زبان سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا علم بولتا تھا۔ قابوس بن ابی ظبیانؒ کہتے ہیں:۔

ادرکت ناساً من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھم یسألون علقمۃ ویستفتونہ[2]

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۴۵ [2] ایضاً

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے علاوہ آپؒ نے حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابوالدرداءؓ سے بھی حدیث پڑھی۔ فقہ کی تعلیم حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے پائی۔

(۲) حضرت مسروق بن اجدعؒ (۶۳ھ) ابوعائشہ الہمدانی الکوفی الفقیہ

آپؒ نے حضرت ابن مسعودؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت اُبی بن کعبؓ سے علم حاصل کیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پیچھے نماز پڑھی۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے آپؒ کو متبنّٰی بنایا ہوا تھا۔ فقیہ عراق ابراہیم نخعیؒ، علامہ شعبیؒ، ابوالضحیؒ، ابواسحٰقؒ اور ایک کثیر تعداد لوگ آپؒ سے فیضیاب ہوئے۔ فقہ میں قاضی شریحؒ (حضرت عمرؓ کے زمانے کے مشہور قاضی) سے فائق سمجھے جاتے ہیں۔ حافظ ذہبیؒ لکھتے ہیں:[۱]

وکان اعلم بالفتوی من شریح وکان شریح یستشیرہ وکان مسروق لا یحتاج الی شریح۔
ترجمہ: آپ فقہ میں شریح سے فائق تھے شریح آپ سے پوچھتے تھے لیکن آپ شریح کے محتاج نہ تھے۔

(۳) حضرت سعید بن المسیبؒ (۹۴ھ) الفقیہ الکوفی

حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں پیدا ہوئے۔ حضرت عثمانؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت ابوہریرہؓ، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور کئی دوسرے صحابہؓ سے حدیث پڑھی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے آپؒ کو مفتی ہونے کی سند دی۔ حضرت قتادہ بن دعامہؒ (۱۱۸ھ) کہتے ہیں میں نے سعید بن المسیبؒ سے بڑا عالم کسی کو نہیں دیکھا۔ امام علی بن المدینیؒ (۲۳۴ھ) کہتے ہیں لا علم فی التابعین اوسع علماً من سعید و ھو عندی اجل التابعین۔ آپؒ خود کہتے ہیں میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے فیصلوں کو جاننے والا اپنے سے زیادہ کسی کو نہیں پایا۔ امام زہریؒ (۱۲۴ھ) کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے عدالتی فیصلوں کا بھی زیادہ علم انہی کو تھا۔

طلب حدیث کا یہاں تک شوق تھا کہ ایک ایک حدیث کے لیے کئی کئی دنوں اور

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صـ۴۷

راتوں کا سفر اختیار فرماتے۔ سو یہ گمان نہ کیا جائے کہ فقہاء حدیث کے مخالف ہوتے ہیں علم فقہ حدیث کے بغیر کیسے چل سکتا ہے۔

④ حضرت سعید بن جبیرؒ (۹۵ھ) الفقیہ الکوفی

آپؒ کے علم کا اندازہ اس سے کیجئے کہ موسم حج میں اہل کوفہ حضرت ابن عباسؓ سے اگر کوئی مسئلہ پوچھتے تو آپؓ کہتے۔ الیس فیکم سعید بن جبیر؟ کیا تم میں سعید بن جبیر نہیں ہیں؟ عبادت میں یہ سعادت ملی کہ کعبہ میں داخل ہو کر جوفِ کعبہ میں ایک قرآن ختم کیا[1] یہ سعادت کسی اور کو نہیں ملی۔

⑤ حضرت ابراہیم نخعیؒ (۹۶ھ) فقیہ کوفہ

حضرت علقمہ بن قیسؒ، مسروقؒ، اسود بن یزیدؒ سے تعلیم پائی اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی مسندِ علمی کے وارث ٹھہرے۔ بچپن میں حضرت ام المؤمنینؓ کی بھی زیارت کی۔ مشہور محدث اعمشؒ فرماتے ہیں۔ کان ابراھیم صیرفیا فی الحدیث وکان یتوقی الشھرۃ ولا یجلس الی اسطوانۃ[2]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ کوفہ کس طرح علم حدیث کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ابراہیم نخعیؒ اگر دیگر محدثین کی طرح مرکز روایت بن کر نہ بیٹھے تو اس کی وجہ ان کی عزلت گزینی تھی۔ ورنہ علم میں تو یہ حال تھا کہ جب فوت ہوئے علامہ شعبیؒ نے کہا۔

ما خلف بعدہ مثلہ۔ آپؒ نے اپنے بعد کوئی اپنا مثل نہیں چھوڑا۔

سعید بن جبیرؒ (۹۵ھ) کے بارے میں کوفہ والوں کو حضرت ابن عباسؓ کہتے تھے کیا تم میں سعید بن جبیرؒ نہیں ہیں؟ یعنی ان کے ہوتے ہوئے تم مجھ سے مسائل پوچھتے ہو؟ حضرت ابراہیم نخعیؒ کے علم کا یہ حال تھا کہ حضرت سعید بن جبیرؒ لوگوں کو کہتے۔

تستفتونی وفیکم ابراھیم النخعی۔

(ترجمہ) تم مجھ سے مسائل پوچھتے ہو؟ اور تم میں ابراہیم نخعیؒ موجود ہیں۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صہ ۷۲ عن حماد بن ابی سلیمان [2] ایضاً صہ ۶۹

⑥ حضرت ابوعبداللہ مکحول الہذلی (۱۰۱ھ) الحافظ فقیہ الشام

ابوامامۃ الباہلیؓ، واثلہ بن الاسقعؓ، انس بن مالکؓ، محمود بن الربیع، عبدالرحمن بن غنم، ابوادریس الخولانی سے حدیث پڑھی۔ حدیث کو مرسل بھی روایت کرتے اور ابی بن کعبؓ، عبادہ بن الصامتؓ اور حضرت ام المومنینؓ سے بھی درمیانے راوی کو ذکر کیے بغیر روایت کر دیتے تھے۔ آپؒ سے ایوب بن موسیٰؒ، علاء بن حارثؒ، زید بن واقدؒ، ثعد بن یزیدؒ، حجاج بن ارطاۃؒ، امام اوزاعیؒ اور سعید بن عبدالعزیزؒ نے روایات لی ہیں۔ آپؒ نے مصر، عراق اور حجاز ہر جگہ طلب علم میں سفر کیا۔

امام زہریؒ فرمایا کرتے تھے علماء تین ہی ہیں۔ ان میں آپؒ مکحولؒ کو بھی ذکر کرتے۔[۱]

ابوحاتمؒ کہتے ہیں۔ ما اعلم بالشام افقه من مکحول۔[۲] شام میں ان سے بڑا فقیہ میں نے نہیں دیکھا۔ خطیب تبریزیؒ کہتے ہیں :۔

لم یکن فی زمان مکحول ابصر بالفتیا منه وکان لا یفتی حتی یقول لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ هذا رأی والرأی یخطیٔ ویصیب[۳] ۔ حضرت مکحول کے زمانہ میں فتویٰ دینے کی بصیرت سب سے زیادہ آپ ہی کی تھی اور آپ فتویٰ نہ دیتے جب تک لاحول ولا قوۃ الا باللہ نہ پڑھ لیتے اور فرماتے یہ میری رائے ہے اور رائے خطا بھی کرتی ہے اور درست بھی ہوتی ہے۔

نوٹ:۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لفظ رائے ان دنوں کسی پہلو سے معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔

⑦ ابوعمرو علامہ شعبیؒ (۱۰۳ھ) الہمدانی الکوفی

آپؒ علامۃ التابعین کے لقب سے معروف تھے۔ علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں :۔

کان اماماً حافظاً فقیهاً متقناً۔

آپؒ نے حضرت عمران بن حصین، جریر بن عبداللہ، حضرت ابوہریرہ، ابن عباس، عبداللہ بن عمر، عدی بن حاتم، مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے احادیث لی ہیں۔ آپ امام ابوحنیفہؒ کے سب سے بڑے استاد تھے۔[۴]

---

[۱] دوسرے دو سعید بن المسیب اور علامہ شعبی ہیں [۲] ایضاً ص ۱۰۲ [۳] الاکمال ص ۶۲۳ [۴] تذکرہ جلد ۱ ص ۷۵

علامہ شعبیؒ سے اسماعیل بن ابی خالد، اشعث بن سوار، داؤد بن ابی ہند، زکریا بن ابی زائدہ، مجالد بن سعید اعمش، امام ابوحنیفہ، ابن عون، یونس بن ابی اسحٰق، سری بن یحییٰ نے احادیث روایت کی ہیں۔ کوفہ کے قاضی بھی رہے۔ پانچ سو کے قریب صحابہ کرامؓ کو پایا۔ امام ابن سیرینؒ فرماتے ہیں:-

الزم الشعبی فلقد رأیته یستفتی والصحابة متوافرون۔[1]

(ترجمہ) تم شعبی کی مجلس کو لازم پکڑو۔ میں نے لوگوں کو ان سے مسائل پوچھتے دیکھا حالانکہ صحابہ بڑی تعداد میں موجود ہوتے تھے۔

پھر ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:-

قدمت الکوفة وللشعبی حلقة واصحاب رسول اللہ یومئذ کثیر۔

(ترجمہ) میں کوفہ آیا اور وہاں علامہ شعبی کا ایک بڑا حلقہ دیکھا حالانکہ ان دنوں صحابہ کثیر تعداد میں موجود تھے۔

ابومجلز (   ) کہتے ہیں:-

ما رایت افقه من الشعبی لا سعید بن المسیب ولا طاؤس ولا عطاء ولا الحسن ولا ابن سیرین۔[2]

(ترجمہ) میں نے علامہ شعبی سے بڑا فقیہ کسی کو نہیں پایا نہ حضرت سعید بن المسیب کو نہ طاؤس کو نہ عطا بن ابی رباح کو نہ حسن بصری کو اور نہ امام ابن سیرین کو۔

مگر آپؒ کے ذہن میں علم فقہ کی اتنی عظمت تھی کہ کھلے بندوں فرماتے ہم فقیہ نہیں ہم تو محدث ہیں جو روایت ملے اسے آگے پہنچا دیتے ہیں۔

قال الشعبی انا لسنا بالفقهاء ولکنا سمعنا الحدیث فرویناہ الفقهاء۔[3]

(ترجمہ) شعبیؒ کہتے ہیں ہم فقہاء نہیں ہیں بات صرف یہ ہے کہ ہم نے حدیث سنی اور اسے فقہاء تک پہنچا دیا۔

وہ کون سے فقہاء کرام ہیں جن تک آپ نے حدیثیں پہنچا دیں اور ان کے سامنے اپنے آپ کو فقیہ نہ جان سکے؟ ان میں سرفہرست امام ابوحنیفہؒ ہیں۔ آپ نے اگر امام ابوحنیفہ کو نہ دیکھا

---

[1] تذکرہ جلد ۱ صـ۷۶ [2] ایضاً صـ۷۹ [3]

ہوتا تو شاید اتنی بات نہ کہتے۔

⑧ سالم بن عبداللہ بن عمرؒ (۱۰۶ھ) فقیہ مدینہ

حضرت سالمؒ حضرت عمرؓ کے پوتے، علم وعمل کے جامع اور اپنے زمانہ کے الفقیہ اور الحجہ تھے اپنے والد حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت ام المومنینؓ، حضرت ابوہریرہؓ، رافع بن خدیجؓ، حضرت سفینہؓ اور افضل التابعین حضرت سعید بن المسیبؒ سے علم حاصل کیا اور حدیث پڑھی آپؒ سے عمرو بن دینارؒ، امام زہریؒ، صالح بن کیسانؒ، موسیٰ بن عقبہؒ اور حضرت حنظلہ بن ابی سفیانؒ نے تعلیم پائی خطیب تبریزیؒ لکھتے ہیں:۔

احد فقہاء المدینۃ من سادات التابعین وعلمائہم وثقاتہم[1]

(ترجمہ) مدینہ کے فقہا میں سے ایک تھے سادات تابعین میں سے تھے ان کے علماء اور ثقہ لوگوں میں سے تھے۔

⑨ قاسم بن محمدؒ (۱۰۷ھ) فقیہ مدینہ

حضرت قاسمؒ حضرت ابوبکرؓ کے پوتے، علم وعمل کے جامع اور مدینہ کے فقہاء سبعہ میں سے ایک تھے۔ اپنی پھوپھی حضرت ام المومنینؓ، حضرت ابن عباسؓ حضرت امیر معاویہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت فاطمہ بنت قیسؓ سے حدیث پڑھی اور تعلیم حاصل کی۔ اور آپؒ سے آپؒ کے بیٹے عبدالرحمٰنؒ، امام زہریؒ، ابن المنکدرؒ، ربیعہ الرائیؒ، افلح بن حمیدؒ، حنظلہ بن ابی سفیانؒ، ایوب السختیانیؒ جیسے ائمہ علم نے روایات لیں اور اکتساب علم کیا۔ آپؒ سے دو سو کے قریب حدیثیں مروی ہیں۔ ابوالزناد عبدالرحمٰن (۱۳۱ھ) کہتے ہیں:۔

ما رأیت فقیہا اعلم من القاسم وما رأیت احدا اعلم بالسنۃ منہ[2]۔

(ترجمہ) میں نے قاسم سے بڑا فقیہ کسی کو نہیں دیکھا اور نہ کسی کو دیکھا جو ان سے زیادہ سنت جاننے والا ہو۔

ابن سعد کہتے ہیں:۔ کان اماما فقیہا ثقۃ رفیعا ورعا کثیر الحدیث۔

---

[1] الاکمال ص۶۰۳ [2] تذکرہ ص۹۱

یحییٰ بن سعیدؒ کہتے ہیں :-

ما ادرکنا بالمدینۃ احداً نفضلہ علی القاسم بن محمدؒ۔[1]

(ترجمہ) ہم نے مدینہ شریف میں کسی کو نہ پایا جسے قاسم بن محمد پر فضیلت دے سکیں۔

(۱۰) حماد بن ابی سلیمان (۱۲۰ھ)

حضورؐ کے خادم خاص حضرت انس بن مالکؓ کے شاگرد تھے۔ امیرالمومنین فی الحدیث شعبہ (۱۶۰ھ) اور حضرت سفیان ثوریؒ نے آپ سے حدیث روایت کی ہے۔[2] آپ ابراہیم نخعیؒ کے فیصلوں اور ان کی فقہی آراء کے سب سے بڑے عالم تھے۔ امام ابوحنیفہؒ کے استاد تھے۔ حضرت حمادؒ کے بعد آپ ہی سیدنا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی اس مسند علمی کے وارث ہوئے۔ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے بھی آپ سے روایات لی ہیں۔

نوٹ تابعین میں فقہاء حدیث صرف یہی دس حضرات نہیں۔ ان کے علاوہ بھی اس طبقہ میں بہت سے فقہاء اعلام ہوئے جو فقہ اور حدیث کے جامع تھے۔ ان میں حضرت حسن بصریؒ (۱۱۰ھ) امام ابن سیرینؒ (۱۱۰ھ) قتادہ بن دعامہؒ (۱۱۸ھ) بھی بے شک فقہ حدیث اور استنباط مسائل میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے۔

اب ہم یہاں تابعین کے ان اساتذہ روایت کا ذکر کرتے ہیں جو صحابہؓ کے علم کو لے کر بحر و بر میں پھیلے اور ان کی محنتوں سے روایات حدیث آگے تبع تابعین تک پہنچیں۔ علم حدیث کو آج بیشک ان شخصیات کریمہ پر ناز ہے۔ تابعین کے فقہاء حدیث بے شک ائمہ روایت بھی ہیں اور ان کا ذکر پہلے آچکا ہے لیکن یہ اساتذہ روایت اس فن میں زیادہ معروف اور ممتاز ہوئے ہیں۔

تابعین کرام میں اساتذہ روایت

ابوبردہ (۱۰۴ھ) طاؤس بن کیسان (۱۰۵ھ) عکرمہ (۱۰۷ھ) حسن بصری (۱۱۰ھ) ابن سیرین (۱۱۰ھ) عطا بن ابی رباح (۱۱۵ھ) امام نافع (۱۱۷ھ) میمون بن مہران (۱۱۷ھ) امام زہری (۱۲۴ھ) عمرو بن

---

[1] الاکمال ص ۶۱۸ [2] الاکمال ص ۵۹۶

دینار (۱۲۶ھ) ابو اسحٰق السبیعی (۱۲۷ھ) عبد الرحمٰن ابو الزناد (۱۳۱ھ) سلیمان التیمی (۱۴۳ھ) ہشام بن عروہ (۱۴۶ھ) اعمش (۱۴۷ھ) رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین۔

(۱) ابو بردہ بن ابی موسیٰ الاشعریؒ (۱۰۴ھ)

اپنے والد حضرت موسیٰ اشعریؓ، حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت حذیفہؓ، حضرت عبد اللہ بن سلامؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے حدیث پڑھی۔ قاضی شریح کے بعد کوفہ کے قاضی مقرر ہوئے۔ آپؒ سے آپ کے بیٹے بلال الامیرؒ، پوتے برید بن عبد اللہؒ، حضرت ثابت بنانیؒ، قتادہ بن دعامہؒ، بکیر بن الاشج، ابو اسحٰق شیبانیؒ اور کئی دوسرے حضرات نے روایت کی ہے۔ حافظ ذہبیؒ لکھتے ہیں۔

کان علامۃ کثیر الحدیث[1] آپ بڑے عالم تھے اور کثیر الحدیث تھے۔

(۲) طاؤس بن کیسانؒ (۱۰۵ھ) ابو عبد الرحمٰن الیمانی

حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت زیدہ بن ارقمؓ اور حضرت ام المومنین سے حدیث پڑھی اور ان سے ان کے بیٹے عبد اللہ، امام زہری، ابراہیم بن میسرہ، ابو الزبیر مکی، عبد اللہ بن ابی نجیح اور حنظلہ بن ابی سفیان نے حدیث سنی۔ عمرو بن دینار کہتے ہیں:۔

ما رایت احدا مثل طاؤس۔ میں نے طاؤس جیسا کسی کو نہیں پایا۔

آپ اہل یمن کے شیخ اور مفتی تھے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ آپ فن حدیث میں اس جلالت شان کے ساتھ ساتھ فقیہ بھی تھے۔

(۳) عکرمہؒ (۱۰۷ھ)

حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، عقبہ بن عامر الجہنی، حضرت ابو سعید الخدریؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ام المومنینؓ سے روایات لی ہیں۔ آپ سے کثیر تعداد لوگوں نے احادیث روایت کی ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کی زندگی میں فتوے دینے لگے۔ سعید بن جبیرؒ سے پوچھا گیا آپ نے کسی کو اپنے سے بڑا عالم پایا۔ آپ نے کہا ہاں عکرمہ کو۔ علامہ شعبیؒ بھی ان کے علم قرآن کے معترف تھے۔ آپ پر یہ الزام

بھی ہے کہ کچھ خارجیت کا ذہن تھا۔ اس لیئے امام مالکؒ اور امام مسلم نے اُن سے روایت نہیں لی۔ لیکن اس میں شک نہیں ان ھذا الامام من بحور العلم۔ کہ یہ امام علم کا ایک سمندر ہے۔

④ ابُوسعید حسن بن ابی الحسنؒ (۱۱۰ھ) یسار البصری

حافظ ذہبیؒ نے امام حسن بصریؒ کا الامام اور شیخ الاسلام کہہ کر تعارف کرایا ہے۔ آپؒ نے حضرت عثمانؓ، عمران بن حصینؓ، مغیرہ بن شعبہؓ، عبدالرحمن بن سمرہؓ، سمرہ بن جندبؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت جابرؓ اور دیگر کئی صحابہؓ سے احادیث سُنی ہیں۔ آپؒ سے قتادہ بن دعامہؒ، ایوبؒ، ابن عونؒ، یونسؒ، خالد الحذاء ہشام بن حسان، حمید الطویل، جریر بن حازم، ربیع بن الصبیح اور ابان بن یزید وغیرہم نے روایات لی ہیں۔ امام حسن بصری ثقہ، حجۃ، مامون، عابد و زاہد اور کثیر العلم ہیں۔ خطیب تبریزی لکھتے ہیں :-

ھو امام وقتہ فی کل فن وعلم و زھد و ورع وعبادۃ۔[1]

ترجمہ۔ آپ اپنے وقت میں ہر فن ہر علم کے امام تھے زہد پرہیزگاری اور عبادت میں بھی۔

حافظ ذہبیؒ لکھتے ہیں :-

حافظ، علامہ، من بحور العلم، فقیہ النفس، کبیر الشان عدیم النظیر ملیح التذکیر بلیغ الموعظۃ رأس فی انواع الخیر۔[2]

ترجمہ۔ حافظ تھے، علامہ تھے علم کے سمندر تھے فقیہ النفس تھے بڑی شان تھی ان کی نظیر نہ تھی وعظ بہت اچھا کہتے نصیحت مؤثر ہوتی انواع خیر کا مرکز تھے۔

البتہ آپ کی مرسل روایات کو محدثین نے قبول نہیں کیا۔

وما ارسلہ فلیس ھو بحجۃ۔ مشہور بات چلی آتی ہے کہ آپ کی مرسل روایت حجت نہیں۔

⑤ امام ربّانی محمد بن سیرین (۱۱۰ھ)

حضرت عثمانؓ کے آخر عہد خلافت میں پیدا ہوئے۔ علم تعبیر کے بے مثل عالم تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عمران بن حصینؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ سے حدیث پڑھی۔ آپ

---

[1] تذکرہ جلد ۱ ص ۶۷ الاکمال ص ۔ [2] تذکرہ جلد ۱ ص ۶۷

سے ایک خلقِ کثیر نے فیضِ علم پایا۔ انہیں حدیث میں حضرت حسن بصریؒ سے اثبت مانا گیا ہے۔ حافظ ذہبیؒ لکھتے ہیں:۔

کان فقیهاً اماماً غزیر العلم ثقه ثبتاً علامةً فی التعبیر راساً فی الورع و امه صفیه مولاة لابی بکر الصدیقؓ۔[1]

(ترجمہ) آپ فقیہ تھے امام تھے ماہر علم تھے ثقہ تھے اچھے ضبط والے تھے علم تعبیر کے ماہر تھے پرہیزگاری میں بہت اونچے تھے آپ کی والدہ صفیہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی آزاد کردہ باندی تھیں۔

(۶) عطا بن ابی رباحؒ (۱۱۴ھ)

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ، ام المومنین حضرت ام سلمہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ سے حدیث پڑھی۔ آپؒ سے ایوبؒ، ابن جریجؒ، امام اوزاعیؒ، امام ابوحنیفہؒ، ہمام بن یحییٰ، جریر بن حازمؒ اور بہت سے ائمہ علم نے روایات لی ہیں۔ حافظ ذہبیؒ لکھتے ہیں:۔

قال ابو حنیفة ما رأیت احداً افضل من عطاء۔[2]

(ترجمہ) امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں میں نے عطا سے کسی کو بہتر راوی نہیں پایا۔

یہاں مطلق دیکھنا مراد نہیں۔ آپ صرف اپنے اساتذہ میں انہیں سب سے افضل کہہ رہے ہیں۔ حضرت امام باقرؒ بھی فرماتے ہیں:۔

ما بقی علی وجه الارض اعلم بمناسك الحج من عطاء۔ مناسک حج جاننے والا کوئی روئے زمین پر عطاء سے بڑھ کر نہ تھا ــــ آپ کی بعض علمی اور فقہی آراء، امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں بھی نقل کی ہیں۔ آپ کی وجاہت علمی دنیائے اسلام میں ہر جگہ مسلم رہی ہے۔ مکہ کے لوگ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے جب کوئی مسئلہ پوچھتے تو آپ فرماتے۔ تجمعون علی وعندکم عطاء ــــ تم میرے پاس چلے آتے ہو حالانکہ عطاء تمہارے پاس موجود ہیں۔

---

[1] ایضاً صہ۹۳ [2] ایضاً صہ۹۲

⑦ امام نافع المدنیؒ (۱۱۷ھ)

حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت رافع بن خدیجؓ، حضرت ابولبابہؓ، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے حدیث پڑھی، آپؒ سے امام اہل مکہ ابن جریجؒ، امام اہل شام امام اوزاعیؒ، امام اہل مدینہ امام مالکؒ، امام مصر لیث مصریؒ عقیل بن خالدؒ، ایوبؒ اور ابن عونؒ نے احادیث روایت کی ہیں۔

جس طرح صحیح بخاری کو اصح الکتب کہا گیا ہے عام محدثین کے ہاں مالک عن نافع عن ابن عمر کو اصح الاسانید کہا گیا ہے۔ حضرت نافع کہتے ہیں میں حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں تیس سال رہا۔ اس سے ان کی علمی عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ روایت حدیث میں آپ ایک مرکزی شخصیت ہیں۔

⑧ میمون بن معدانؒ (۱۱۷ھ) عالم اہل الجزیرہ

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ اور دوسرے کئی صحابہؓ سے احادیث روایت کی ہیں۔ حضرت عمرؓ اور حضرت زبیرؓ سے بھی مرسل روایات لی ہیں۔ آپ سے ابوبشر، خصیف، جعفر بن برقان، حجاج بن ارطاۃ، سالم بن ابی المہاجر، امام اوزاعی، ابوالملیح، معقل بن عبیداللہ اور ایک خلق کثیر نے حدیث روایت کی ہے ——— مشہور فقیہ سلیمان بن موسیٰ کہتے ہیں خلافت ہشام میں چار ہی عالم تھے۔ حسن بصری، مکحول، میمون بن معدان اور زہری ——— امام احمد کہتے ہیں آپ عکرمہ سے زیادہ ثقہ ہیں۔ امام نسائی بھی آپ کو ثقہ قرار دیتے ہیں۔

⑨ امام زہریؒ (۱۲۴ھ)

اعلم الحفاظ ابن شہاب زہری حدیث اور تاریخ کے بڑے امام تھے۔ آپ نے حدیث صحابہؓ میں سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ، سہل بن سعدؓ، حضرت انس بن مالکؓ سے اور تابعین میں سے حضرت سعید بن المسیبؒ، ابوامامہؒ اور ابوسہلؒ وغیرہم من الائمہ الاعلام سے پڑھی۔ آپ سے صالح بن کیسانؒ معمرؒ، شعیب بن ابی حمزہؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام اوزاعیؒ، ابن ابی ذئبؒ، لیث مصریؒ،

سفیان بن عیینہؒ اور دیگر کئی ائمہ علم نے روایت لی ہے۔ ابن المسیبؒ کے پاس آٹھ سال کے قریب رہے
لیث مصریؒ کہتے ہیں میں نے زہری سے جامع علم کسی کو نہیں دیکھا، ترغیب و ترہیب کی احادیث ہوں
انساب عرب کی، قرآن و سنت کی بات ہو یا حلال و حرام کی، ہر موضوع میں سبقت لے گئے ہیں۔
ابُوالزنادؒ کہتے ہیں :۔

کنا نطوف مع الزهری علی العلماء ومعه الالواح والصحف یکتب کلما سمع۔[1]

(ترجمہ) ہم امام زہری کے ساتھ علماء حدیث کے ہاں گھوما کرتے تھے۔ آپ کے
پاس کاغذات اور تختیاں ہوتیں آپ جو کچھ سنتے تھے لکھتے جایا کرتے تھے ۔

ابن المدینیؒ کہتے ہیں ثقہ راویوں کا علم حجاز میں زہریؒ اور عمرو بن دینارؒ پر، بصرہ میں قتادہؒ اور یحییٰ
بن کثیرؒ پر، کوفہ میں ابواسحٰق السبیعیؒ اور اعمشؒ پر گردش کرتا ہے۔ اکثر صحیح حدیثیں ان چھ رواۃِ حدیث
سے باہر نہیں۔ محدثین امام زہریؒ کی مرسل روایات کا اعتبار نہیں کرتے۔ آپ کہیں کہیں روایت
حدیث کے دوران شرح الفاظ بھی کر دیتے تھے۔ علماء بعض اوقات ان کے ادراج کو حدیث کا جزو
سمجھ لیتے اور اُسے حدیث کے طور پر آگے روایت کر دیتے۔ تاہم اُن کی علمی عظمت اور حدیثی ثقاہت
ہر دائرہ علم میں مسلم رہی ہے۔ آپ جب اپنے شیخ کا نام نہ لیں اور اس سے اُوپر کے شیخ سے صیغہ
عن سے روایت کریں تو اس سے آپ کی ثقاہت مجروح نہیں ہوتی۔ البتہ اس روایت کی صحت
مشکوک ہو گی۔ شیعہ علماء نے اس تدلیس کو تقیہ سمجھ کر انہیں اپنے ہاں شیعہ شمار کر لیا تھا۔ سو جب کبھی
وہ اُن کی روایت پیش کریں تو یہ استدلال ان کے ہاں بر سبیل مناظرہ نہیں بر سبیل مجادلہ ایک الزامی
دلیل سمجھا جائے گا۔

⑩ امام حرم عمرو بن دینار الحافظ (۱۲۶ھ)

صحابہ میں سے حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت جابرؓ، حضرت انس بن مالکؓ کے
اور تابعین میں سے ابوالشعثاء، اور طاؤس، کریب، مجاہد کے شاگرد تھے۔ امیر المؤمنین فی الحدیث شعبہ،
ابن جریج، سفیان الثوری، حضرت حماد بن سلمہ، سفیان بن عیینہ اور حماد بن ابی سلیمان آپ کے شاگرد

---

[1] الفیا صفحہ ۱۰۲ [2]

تھے۔ شعبہؒ کہتے ہیں میں نے حدیث میں عمرو بن دینارؒ سے اثبت کسی کو نہیں پایا۔ آپ صرف محدث نہیں فقیہ بھی تھے۔ عبداللہ بن ابی نجیحؒ کہتے ہیں میں نے عمرو بن دینارؒ، عطا بن ابی رباحؒ، مجاہدؒ اور طاؤسؒ سے کسی کو فقہ میں زیادہ نہیں پایا۔

ان ائمہ روایت میں پانچ اور حضرات کا بھی ترجمہ شامل کر لیجئے۔ اس دور میں روایت پر توجہ زیادہ تھی۔ اس لیئے اس طبقہ میں ہم یہ نام بھی اضافہ کیئے دیتے ہیں۔

① ابو اسحٰق السبیعیؒ (۱۲۷ھ) عمرو بن عبداللہ

کثرت روایت میں امام زہریؒ کے اقران میں سے ہیں۔ حضرت علیؓ کو دیکھا ہے۔ حضرت زید بن ارقمؓ، عبداللہ بن عمروؓ، عدی بن حاتمؓ، براء بن عازبؓ، جریر بجلیؓ، جابر بن سمرۃؓ سے حدیث پڑھی۔ تین سو کے قریب اساتذہ سے روایت لی۔ آپ سے قتادہ، سلیمان التیمی، اعمش، شعبہ، سفیان الثوری، ابو الاحوص، زائدہ، شریک اور سفیان بن عیینہ اور آپ کے بیٹے یونس اور پوتے اسرائیل نے روایت کی ہے ——— ابوداؤد الطیالسی کہتے ہیں چار شخصوں میں علم حدیث نمایاں رہا ہے۔ زہری، قتادہ، ابواسحاق اور اعمش میں ——— قتادہ اختلافِ رواۃ میں زہری اسناد میں ابو اسحٰقؒ، حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کی مرویات میں اور اعمش ان میں سے ہر ایک باب میں آگے تھے۔

② ابُو عبدالرحمٰن ابوالزناد (۱۳۱ھ) عبداللہ بن ذکوانؒ فقیہ المدینہ

حضرت انس بن مالکؓ سے حدیث پڑھی۔ تابعین میں سے حضرت سعید بن المسیبؒ جیسے اکابر سے علم حاصل کیا۔ آپ سے امام مالکؒ، سفیان ثوریؒ، لیث مصریؒ، سفیان بن عیینہؒ اور دوسرے کئی اکابر نے روایت لی ہے۔ لیث بن سعدؒ کہتے ہیں میں نے آپ کے پیچھے تین سو کے قریب فقہ کے طالب علم چلتے دیکھے۔ امام ابو حنیفہؒ جیسے فقیہ فرماتے ہیں میں نے ربیعۃ الرای اور ابوالزناد دونوں کو دیکھا ہے اور ابوالزناد کو افقہ (علم فقہ میں زیادہ ماہر) پایا ہے۔

قال ابوحنیفۃ رأیت ربیعۃ وابو الزناد افقہ الرجلین۔[1]

---

[1] تذکرہ جلد ۱ ص ۱۲۷

حضرت امام جیسے نادرہ روزگار فقیہ کا ان کی فقاہت پر شہادت دینا پتہ دیتا ہے کہ آپ کس درجہ کے عالم تھے۔ اگر ہم انہیں فقہاء تابعین میں ذکر کرتے تو زیادہ مناسب تھا لیکن چونکہ سفیان بن عیینہؒ آپ کو امیر المومنین فی الحدیث کہتے ہیں، اس لیئے ہم نے انہیں رواۃ حدیث میں ذکر کیا ہے۔

③ سلیمان بن طرفان التیمیؒ (۱۴۳ھ) البصری

حافظ ذہبیؒ انہیں الحافظ، الامام، اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں حضرت انس بن مالکؓ اور دیگر محدثین کبار سے حدیث پڑھی، آپ سے شعبہ، حضرت عبداللہ بن مبارک، حضرت سفیان الثوری، یزید بن ہارون، سفیان بن عیینہ اور دیگر کئی ائمہ کبار نے روایت لی۔ حدیث بڑے ادب سے روایت کرتے۔ کان اذا احدث عن رسول اللہ تغیر لونہ[1] سفیان کسی بصری محدث کو سلیمان تیمی پر ترجیح نہ دیتے تھے۔ شعبہ کہتے ہیں میں نے ان سے زیادہ راست گو کسی کو نہیں دیکھا۔

④ ہشام بن عروہؒ (۱۴۶ھ)

حضرت زبیرؓ کے پوتے تھے۔ حافظ ذہبیؒ آپ کو الامام، الحافظ، الحجہ اور الفقیہ کے القاب سے ذکر کرتے ہیں۔ ان دنوں حدیث اور فقہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ بہت سے حفاظ حدیث فقیہ بھی ہوتے تھے۔ ہشام بن عروہ بھی انہی میں سے تھے۔ ابن سعد آپ کے بارے میں کہتے ہیں۔ کان ھشام ثقۃ، ثبتاً، کثیر الحدیث، حجۃ ـــــ ابو حاتم الرازی آپ کو امام فی الحدیث لکھتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے آپ کے سر پر ہاتھ رکھا تھا اور بچپن میں آپ کے لیئے برکت کی دعا کی تھی۔ شعبہ، ایوب، امام مالک، سفیان الثوری، سفیان بن عیینہ، حماد بن سلمہ، حماد بن ابی سلیمان، یحییٰ بن سعید القطان جیسے اکابر آپ کے شاگرد تھے۔ امام یحییٰ بن معین سے پوچھا گیا آپ ہشام کو بہتر جانتے ہیں یا زہری کو؟ آپ نے کہا دونوں کو۔ اور کسی کو کسی پر ترجیح نہ دی۔ آپ حضرت حسن بصری اور امام ابن سیرین کے اقران میں سے تھے۔

---

[1] تذکرہ جلد ۱ صـ ۱۴۲

⑤ ابو محمد سلیمان الاعمش الکوفیؒ (۱۴۷ھ) الحافظ والثقہ

حضرت انس بن مالکؓ کے شاگرد تھے۔ مشہور تابعی حضرت ابراہیم نخعیؒ سے بھی حدیث سنی۔ آپ سے امیر المومنین فی الحدیث شعبہ، سفیان الثوری، سفیان بن عیینہ، وکیع بن الجراح، زائدہ، ابو نعیم اور بہت سے لوگوں نے روایت لی ہے۔ امام ابو حنیفہ کے بھی استاد تھے۔ ابن المدینی کہتے ہیں آپ سے تیرہ سو کے قریب احادیث مروی ہیں۔ صدق مقال کا یہ حال تھا کہ لوگ آپ کو مصحف (قرآن) کہتے تھے۔ یحییٰ بن سعید القطان آپ کو علامۃ الاسلام کہتے تھے۔ ستر سال تک آپ کی تکبیر اولیٰ فوت نہ ہوئی۔ سفیان بن عیینہ نے آپ کے بارے میں لکھا:

اقرأهم لكتاب الله واحفظهم للحديث واعلمهم بالفرائض[1]

(ترجمہ) سب سے زیادہ قرآن پڑھنے والے سب سے زیادہ حدیث یاد رکھنے والے اور علم وراثت کے سب سے بڑے عالم تھے۔

نوٹ اس درجہ کے عالی مرتبت محدثین کوفہ میں بہت ہوئے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کوفہ ان دنوں کس طرح علم وفضل کا مرکز تھا۔ سو یہ کہنا کسی طرح درست نہیں کہ عراق علم حدیث میں حجاز سے پیچھے تھا۔ عراق نے علم حدیث کے وہ جلیل القدر اور جہابذہ روزگار محدث پیدا کیے کہ چشم فلک نے ان کی نظیر نہ دیکھی۔ تذکرۃ الحفاظ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کوفہ علم حدیث کا گہوارہ تھا۔ یہ تابعین کے اساتذہ روایت کا ذکر تھا۔ اب ہم ان ائمہ اصول کا ذکر کرتے ہیں جن کی علمی بلندی انہیں درجہ اجتہاد پر لے آئی اور امت میں ان کی پیروی جاری ہوئی یا وہ اس مرتبہ پر ٹھہرے کہ ان کی پیروی کی جا سکے۔

فقہاءِ حدیث ائمہ مجتہدین

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفی اما بعد

صحابہؓ و تابعینؒ کے بعد ائمہ مجتہدین کی باری آتی ہے۔ یہ حضرات علم اصول کے امام اور فقہ و احادیث کے جامع تھے۔ موضوع ان کا زیادہ تر فقہ رہا۔ اس لیئے ان کی شہرت مجتہد Theorist کے طور پر زیادہ رہی۔ محدثین انہیں حفاظِ حدیث میں بھی ذکر کرتے ہیں اور فقہاء انہیں اپنے میں سے مجتہد قرار دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض کی امت میں پیروی جاری ہوئی اور بعض کی نہیں۔ بعض ان میں سے اپنے اساتذہ سے نسبت برقرار رکھنے کے باعث مجتہد منتسب سمجھے گئے۔ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ یہ حضرات سب حدیث و فقہ کے جامع اور اپنے اپنے درجہ میں مجتہد مطلق کا مقام رکھتے تھے ـــــــ ان میں ہم حضرت امام ابوحنیفہؒ (۱۵۰ھ) امام اوزاعیؒ (۱۵۷ھ) سفیان الثوریؒ (۱۶۱ھ) امام لیث بن سعد مصریؒ (۱۷۵ھ) امام مالکؒ (۱۷۹ھ) امام ابو یوسفؒ (۱۸۲ھ) امام محمدؒ (۱۸۹ھ) امام شافعیؒ (۲۰۴ھ) اسحٰق بن راہویہؒ (۲۳۸ھ) اور امام احمد بن حنبلؒ (۲۴۱ھ) کا ذکر کریں گے۔ حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ان حضرات کو مجتہد تسلیم کیا ہے۔ ائمہ اربعہ، امام اوزاعی، سفیان الثوریؒ، لیث مصریؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ اور اسحٰق بن راہویہؒ یہ دس حضرات ہوتے ہیں۔ جو مجتہدین کہلاتے یہ حضرات اپنے اپنے وقت کے فقہائے حدیث تھے۔ اب ان کا فرداً فرداً ذکر ہوتا ہے۔

تراجم ائمہ میں پہلے صحابہ کے فقہائے حدیث پھر صحابہ کے رواۃ حدیث پھر تابعین کے فقہاء حدیث اور پھر تابعین کے اساتذہ روایت کا ذکر ہوا۔ اب ائمہ اربعہ کے تراجم پیش کیئے جاتے ہیں۔ ان کے بعد ائمہ جرح و تعدیل کا تذکرہ ہوگا اور ان کے بعد انشاء اللہ ائمہ تالیف کی باری آئے گی۔

تراجم فقہائے حدیث

حضرت امام ابو حنیفہؒ

امام ابو حنیفہؒ (پیدائش ۸۰ھ) کی شہرت زیادہ تر امام مجتہد کی حیثیت سے ہے لیکن علمائے حدیث نے آپ کو محدثین میں بھی ذکر کیا ہے۔ محدثین کا ذکر اس عنوان سے کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فلاں فلاں سے احادیث سنیں اور ان سے آگے فلاں فلاں نے روایات لیں۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں بھی یہ پیرایہ تعارف موجود ہے۔ حافظ ابن عبد البر مالکی رح (۴۶۳ھ) لکھتے ہیں:۔

قد قال الامام علی بن المدینی ابو حنیفه روی عنه الثوری و ابن المبارك وحماد بن زید و هشام و وکیع وعباد بن العوام و جعفر بن عون و هو ثقه لا بأس به وکان شعبه حسن الرای فیه۔[1]

(ترجمہ) امام علی بن المدینی کہتے ہیں کہ سفیان ثوری، عبد اللہ بن مبارک، حماد بن زید، ہشام، وکیع، عباد بن عوام، جعفر بن عون نے امام ابو حنیفہ سے حدیث روایت کی ہے ابو حنیفہ ثقہ تھے ان سے روایت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور شعبہ امام ابو حنیفہ کے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے۔

حافظ شمس الدین ذہبی لکھتے ہیں:۔

حدث عن عطاء ونافع وعبد الرحمٰن بن هرمز الاعرج وسلمة بن کهیل وابی جعفر محمد بن علی وقتادة وعمرو بن دینار وابی اسحٰق وخلق کثیر...... وحدث عنه وکیع ویزید بن هارون وسعد بن الصلت وابو عاصم وعبد الرزاق وعبید الله بن موسیٰ وابو نعیم

---

[1] روی حماد بن زید عن ابی حنیفة احادیث کثیرة۔ الانتقاء صفحہ ۱۳۰

وابو عبد الرحمٰن المقری و بشر کثیر وکان اماماً ورعاً۔[1]

(ترجمہ) امام ابوحنیفہ نے عطاء، نافع، عبدالرحمٰن بن ہرمز الاعرج، سلمہ بن کہیل، ابی جعفر، محمد بن علی، قتادہ، عمرو بن دینار، ابی اسحٰق اور بہت سے لوگوں سے حدیث روایت کی ہے۔ اور ابوحنیفہ سے وکیع، یزید بن ہارون، سعد بن صلت، ابوعاصم، عبدالرزاق، عبیداللہ بن موسیٰ، ابونعیم، ابوعبدالرحمٰن المقری اور خلق کثیر نے روایت لی ہے۔ اور ابوحنیفہ امام تھے اور زاہد پرہیزگار تھے۔

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ اہل مکہ کے محدث اور مفتی عطاء بن ابی رباح سے کس کس نے حدیث روایت کی ہے؟

وعنه ایوب وحسین المعلم وابن جریج وابن اسحٰق والاوزاعی وابوحنیفہ وهمام بن یحیٰی وجریر بن حازم۔[2]

خطیب تبریزی صاحب مشکوٰۃ لکھتے ہیں:۔

سمع عطاء بن ابی رباح وابا اسحٰق السبیعی ومحمد بن المنکدر ونافعاً وهشام بن عروة وسماك بن حرب وغیرهم وروی عنه عبدالله بن المبارك ووکیع بن الجراح ویزید بن هارون والقاضی ابویوسف ومحمد بن الحسن الشیبانی وغیرهم۔[3]

(ترجمہ) ابوحنیفہؒ نے عطا بن رباح اور ابا اسحٰق السبیعی اور محمد بن المنکدر اور ہشام بن عروہ اور سماک بن حرب وغیرہ حضرات سے روایت لی اور ابوحنیفہؒ سے عبداللہ بن مبارک اور وکیع بن الجراح اور یزید بن ہارون اور قاضی ابو یوسف اور محمد بن حسن الشیبانی وغیرہ حضرات نے روایات لی ہیں۔

حضرت عبدالرحمٰن المقریؒ (۲۱۳ھ) جب آپ سے روایت کرتے تو فرماتے مجھ سے اس شخص نے یہ حدیث بیان کی جو (فن حدیث میں) بادشاہوں کا بادشاہ تھا۔ خطیب بغدادی لکھتے ہیں:۔

کان اذا حدث عن ابی حنیفة قال حدثنا شاهنشاه۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۱۶۸ [2] ایضاً صفحہ ۹۲ [3] الاکمال صفحہ ۶۲۴

آپ کے اساتذہ و تلامذہ ان کے علاوہ بھی بہت سے تھے۔ آپ نے بلند پایہ محدثین سے محدثین کے طور پر روایات لیں اور آگے محدثین کے طرز پر انہیں محدثین سے روایت کیا۔ آپ کے تلامذہ میں سے عبداللہ بن مبارک اور وکیع بن الجراح کے تذکرے کتب رجال میں دیکھیں۔

یہ حضرات فن حدیث میں اپنے وقت کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ ان جیسے اکابر محدثین کا حدیث میں آپ کی شاگردی کرنا اس فن میں آپ کی عظمت شان کی کھلی شہادت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آپ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی طرح مکثرین روایت میں سے نہ تھے لیکن اس سے آپ کے علم حدیث میں کمزور ہونے کا شبہ کسی جاہل کو بھی نہ ہو سکے گا۔ محدثین آپ کے ذکر کے بغیر آگے نہ چلتے تھے۔ مشکوٰۃ شریف حدیث کی کتاب ہے جس میں ایک روایت بھی آپ سے منقول نہیں۔ مگر خطیب تبریزی الاکمال فی اسماء الرجال میں آپ کے ذکر کے بغیر آگے نہیں چل سکے۔ آپ کے وفور علم کی شہادت آپ کو دینی پڑی اور ظاہر ہے کہ ان دنوں علم سے مراد علم حدیث ہی لیا جاتا تھا۔

مصنف مذکور لکھتے ہیں :۔

والغرض بایراد ذکرہ فی ھذا الکتاب وان لم نرو عنہ حدیثا فی المشکوٰۃ للتبرک بہ لعلو مرتبتہ و وفور علمہ۔[1]

(ترجمہ) اور غرض اس کتاب میں آپ کا ذکر لانے سے یہ ہے کہ اگرچہ ہم مشکوٰۃ میں اُن سے کوئی حدیث نہیں لائے ہیں کہ آپ کے ذکر سے برکت حاصل ہو جائے۔ یہ آپ کے علوِ مرتبہ اور وفور علم کی وجہ سے ہے۔

وفور علم سے مراد حدیث کا علم وافر نہیں تو اور کیا ہے؟ رہا فقہ تو یہ علم اسی وقت بنتا ہے جب یہ حدیث پر مرتب ہو اسے علم حدیث لازم ہے۔ یہی نہیں کہ آپ نے محدثین کے طرز پر روایات لیں اور آگے روایت کیں۔ بلکہ روایتِ حدیث اور راویوں کے صدق و کذب پر بھی آپ کی پوری نظر تھی۔ امام اوزاعیؒ سے ایک مسئلے پر گفتگو ہوئی اور دونوں طرف سے احادیث سند کے ساتھ پڑھی گئیں تو آپ نے دونوں طرف کے راویوں پر تبصرہ فرمایا اور باوجودیکہ دونوں طرف کے رواۃ ثقہ تھے۔ آپ نے راویوں کے علو فہم پر بحث شروع کر دی[2] اور دونوں

---

[1] الاکمال فی اسماء الرجال صہ ۶۲۴ [2] سند الانام فی شرح مسند الامام صہ ۲۰

طرف کے راویوں کا نام لے لے کر بتایا کہ حماد بن ابی سلیمان زہری سے افقہ ہیں اور فلاں فلاں سے افقہ ہے، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے مقابلے میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ آپ راویوں پر تنقیدی نظر رکھتے تھے۔ ایک دوسری جگہ راویوں کے صدق و کذب پر آپ گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ما رأیت احداً افضل من عطاء۔[1]

میں نے عطاء بن ابی رباح سے زیادہ اچھا (راوی) کسی کو نہیں دیکھا ــــــــ اور یہ بھی فرمایا۔

ما لقیت فیمن لقیت اکذب من جابر الجعفی۔[2]

میں جن لوگوں کو ملا ہوں ان میں جابر جعفی سے زیادہ جھوٹا کسی کو نہیں پایا۔

حافظ ابن حجر نے زید بن عیاش کے بارے میں آپ کی رائے نقل کی ہے۔ انہ مجھول۔[3]

طلق بن حبیب پر آپ نے اس کے عقیدہ کی رو سے جرح کی ہے کان یری القدر۔[4]

محدثین ہی راویوں پر اس درجہ تنقیدی نظر رکھتے ہیں۔ حافظ شمس الدین الذہبی لکھتے ہیں:۔

قال ابوحنیفۃ رایت ربیعۃ وابا الزناد وابو الزناد افقہ الرجلین۔[5]

ترجمہ: ابوحنیفہ کہتے ہیں میں نے ربیعہ اور ابوالزناد دونوں کو دیکھا۔ ابوالزناد زیادہ فقیہ تھے۔

محدثین کا آپ سے اس قسم کی آراء نقل کرنا اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ آپ رواۃ حدیث کے فہم و درایت پر کتنی گہری نظر رکھتے تھے۔

حضرت سفیان الثوریؒ کے علمی مرتبہ اور شانِ علم حدیث سے کون واقف نہیں اتنے بڑے محدث کے بارے میں آپ سے رائے لی گئی کہ ان سے حدیث لی جائے یا نہ؟ امام بیہقی لکھتے ہیں:۔

عبدالحمید الحمانی قال سمعت ابا سعد الصاغانی یقول جاء رجل الی ابی حنیفۃ فقال ما تری فی الاخذ عن الثوری فقال اکتب عنہ ما خلا حدیث ابی اسحق عن الحارث عن علی وحدیث جابر الجعفی۔[6]

ترجمہ۔ عبدالحمید الحمانی کہتے ہیں میں نے ابوسعد صاغانی کو کہتے ہوئے سنا کہ ایک شخص امام ابوحنیفہ کے پاس آیا اور پوچھا سفیان ثوری سے روایت لینے میں آپ کی رائے کیا

---

[1] تذکرہ جلد ۱ ص ۹۲ [2] تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۴۸ [3] تہذیب جلد ۳ ص ۴۲۴ [4] الجواہر المضیۃ جلد ۱ ص ۳۰ [5] تذکرہ جلد ۱ ص ۱۲۷ [6] کتاب القراۃ للبیہقی ص ۱۳۴

ہے؟ آپ نے فرمایا ان سے حدیث لے لو۔ ماسوائے ان حدیثوں کے جنہیں وہ ابو اسحٰق عن الحارث کی سند سے روایت کریں یا جنہیں وہ جابر جعفی سے نقل کریں۔

غور کیجئے جب حضرت امام سفیان ثوری جیسے محدث کے بارے میں بھی آپ سے رائے لی جارہی ہے۔ تو آپ کا اپنا مقام حدیث میں کیا ہوگا؟ اجتہاد دو استنباط یا تطبیق و ترجیح میں تو مجتہدین آپ سے اختلاف کرسکتے ہیں لیکن کسی مقام پر یہ کہہ دینا کہ یہ حدیث حضرت امام کو نہ پہنچی ہوگی ہرگز درست نہیں۔ اس دور میں یہ بعض الظن اثم کے قبیل میں سے ہے۔ محدث جلیل ملا علی قاری احیاء العلوم کی ایک عبارت پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

فالظن بابي حنيفة ان هٰذه الاحاديث لم تبلغه ولو بلغته لقال بها هـذا من بعض الظن فان حسن الظن بابي حنيفة انه احاط بالاحاديث الشريفة من الصحيحة والضعيفة ولكنه ما رجح الحديث الدال على الحرمة او حمله على الكراهة جمعاً بين الاحاديث وعملاً بالرواية والدراية[1]

الحافظ اور الحجۃ کے درجے کے محدثین تو بہت ہوئے لیکن بہت کم ہوئے جن کا علم تمام احادیث کو محیط مانا گیا ہو۔ حضرت امام ان کبار محدثین میں سے ہیں جن کا علم تمام احادیث صحیحہ اور ضعیفہ کو محیط مانا گیا۔ ایک مرتبہ یحیٰی بن معینؒ سے امام ابو حنیفہؒ کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا کہ ثقہ ہیں ثقہ ہیں۔ ایک مرتبہ فرمایا حدیث فقہ میں او سچے ہیں اور دین کے بارے میں قابل اعتماد ہیں[2] امام ابو داؤد فرماتے ہیں:۔

ان اباحنيفة كان اماما۔ بے شک ابو حنیفہؒ امام تھے۔[3]

حضرت سفیان بن عینیہ (۱۹۸ھ) کس پائے کے محدث تھے یہ اہل علم سے مخفی نہیں آپ کوفہ آئے تو علماء حدیث تب آپ سے حدیث سننے کے لیئے تیار ہوئے جب حضرت امام ابو حنیفہؒ نے آپ کے محدث ہونے کی تصدیق کی۔ آپ نے فرمایا۔ یہ شخص

---

[1] سند الانام صد ۵۲ [2] تاریخ بغداد خطیب جلد ۱۳ صفحہ ۴۱۹، ۴۲۰ [3] تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۱۶۰

عمرو بن دینار کی روایات کا سب سے بڑا عالم ہے اس پر علماء سفیان بن عیینہ کے گرد جمع ہو گئے۔ حضرت سفیان رحؒ کہتے ہیں :-

قدمت الکوفۃ فقال ابو حنیفۃ ھذا اعلم الناس بحدیث عمرو بن دینار فاجتمعوا علی فحدثتھم[1]

سفیان بن عیینہ کو محدث بنانے میں بڑے بڑے محدثین کی محنتیں ہوئیں۔ مگر اس میں سبقت حضرت امام ابو حنیفہ کی ہے۔ حضرت سفیان خود کہتے ہیں :-

اوّل من صیرنی محدثا ابو حنیفۃ۔[2]

ترجمہ۔ جس نے سب سے پہلے مجھے محدث بنایا ابو حنیفہ تھے۔

حافظ ذہبی فرماتے ہیں محدث حرم حضرت سفیان کوفی تھے اب آپ خود سمجھ لیں کہ آپ نے حضرت امام سے کس قدر استفادہ کیا ہو گا۔ آپ مسلکاً بھی حنفی تھے[3]

یحییٰ بن زکریا ابی زائدہ (ھ) کی جلالتِ علم سے کون واقف نہیں۔ حافظ ذہبی انہیں الحافظ الثبت المتقن الفقیہ[4] لکھتے ہیں۔ آپ حضرت امام کے شاگرد تھے اور بقول حضرت امام طحاوی حضرت امام کے اُن پہلے دس اصحاب میں سے تھے جو تدوین علم میں آپ کے ساتھ بیٹھے۔

فن حدیث کے ان جیسے اکابر کا حضرت امام سے یہ قریبی رابطہ بتلاتا ہے کہ حضرت امام فن روایت میں بھی ان جبال علم کے شیخ تھے اور اکابر محدثین نہ صرف ان کے علم حدیث کے قائل تھے بلکہ ان سے اپنے محدث ہونے کی سند لیتے تھے۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ کا نظریۂ حدیث

حضرت امام حدیثِ منقول پر عمل کرنے سے پہلے یہ دیکھتے تھے کہ کثیر تعداد متقی لوگ اس حدیث کو اس صحابیؓ سے روایت کرتے ہوں۔ یہ روایت کرنا لفظاً ضروری نہیں خبرِ واحد اپنی جگہ معتبر ہے لیکن اُن

---

[1] الجواہر المضیۃ جلد ۱ صفحہ ۳۰ [2] الجواہر نقلاً عن ابن خلکان جلد ۱ صفحہ ۱۰۳ [3] الجواہر جلد ۱ صفحہ ۲۵ [4] تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۲۴۶

کے ہاں اس کا عمل میں آیا ہوا ہونا ضروری تھا. جو حدیث معمول بہ نہ رہی ہو، اس سے ان کے ہاں سنت ثابت نہیں ہوتی. سنت کے ثابت ہونے کے لیئے ضروری ہے کہ اس پر عمل بھی ہوتا آیا ہو امام مالکؒ کا نظریۂ حدیث بھی تقریباً یہی تھا. وہ حدیث کی بجائے سنت پر زیادہ زور دیتے تھے. موطا میں بار بار سنت کا لفظ لاتے ہیں اور اس سے صحابہؓ و تابعینؒ کا تواتر عمل مراد ہوتا ہے جب فتنے پھیلے اور جھوٹ کا بازار گرم ہوا تو محدثین روایت اور اسناد کے گرد پہرہ دینے لگے. ان بدلے ہوئے حالات میں حدیث سے تمسک بذریعہ اسناد ہونے لگا اور تواتر عمل کی اس طرح تلاش نہ رہی جس طرح پہلے دور میں ہوتی تھی. اس نئے دور کے مجدد حضرت امام شافعیؒ ہیں. لیکن اس میں شک نہیں کہ پہلے دور میں حدیث کی بجائے سنت کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی. حافظ شمس الدین الذہبیؒ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا نظریۂ حدیث اُن کے اپنے الفاظ میں اس طرح نقل کرتے ہیں:-

اٰخذ بکتاب اللہ فما لم اجد فبسنۃ رسول اللہ و الاثار الصحاح عنہ التی فشت فی ایدی الثقات عن الثقات فان لم اجد فبقول صحابہ اٰخذ بقول من شئت ــــــ واما اذا انتھی الامر الی ابراھیم والشعبی والحسن والعطاء فاجتھد کما اجتھدوا[1]

(ترجمہ) میں فیصلہ کتاب اللہ سے لیتا ہوں جو اس میں نہ ملے اسے حضورؐ کی سنت اور ان صحیح آثار سے لیتا ہوں جو حضورؐ سے ثقہ لوگوں کے ہاں ثقات کی روایت سے پھیل چکے ہوں۔ ان میں بھی نہ ملے تو میں صحابہ کرامؓ سے لیتا ہوں اور جس کا فیصلہ مجھے اچھا (قوی) لگے لے لیتا ہوں ــــ اور جب معاملہ ابراہیم نخعیؒ، علامہ شعبیؒ، حضرت حسن بصریؒ اور عطاء بن ابی رباحؒ تک پہنچے تو میں بھی اس طرح اجتہاد کرتا ہوں جس طرح ان پہلوں نے اجتہاد کیا تھا.

حضرت امام یہاں آثار صحیحہ کے عملاً پھیلے ہوئے ہونے پر زور دے رہے ہیں اور یہی اُن کا نظریہ حدیث تھا. حضرت علامہ عبدالوہاب الشعرانیؒ (۹۷۳ھ) لکھتے ہیں:-

وقد کان الامام ابوحنیفۃ یشترط فی الحدیث المنقول عن رسول اللہ قبل العمل بہ ان یرویہ عن ذلک الصحابی جمع اتقیاء عن مثلھم[2]

---

[1] مناقب ابی حنیفہ للذہبی صہ ۲۱ [2] المیزان الکبرےٰ للشعرانی جلد ۱ صہ ۶۲

(ترجمہ) امام ابو حنیفہؒ حضورؐ سے نقل شدہ حدیث کو معمول بہ ٹھہرانے سے پہلے یہ ضروری ٹھہراتے تھے کہ اسے اس صحابیؓ سے ان جیسے نیک لوگوں کی ایک جماعت نے روایت کیا ہو۔

محقق ابن الہمامؒ (۸۶۱ھ) کی حضرت امام کے اس اصل پر گہری نظر تھی. آپؒ تصریح کرتے ہیں. کہ جب کوئی صحابیؓ اپنی روایت کردہ حدیث پر عمل نہ کرے اس کے خلاف فتوے دے تو وہ روایت از خود حجت نہ رہے گی. کیونکہ اس کے ساتھ تواترِ عمل ثابت نہیں ہو سکا حضرت امام کا یہ نظریہ بیشک نہایت سخت ہے روایت کے ساتھ راوی کا عمل ساتھ ساتھ چلے۔ ایسے راوی تو صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بھی بہت کم ملیں گے. حضرت امامؒ تواترِ عمل کے اس حد تک قائل تھے. کہ وہ اس کی تائید میں ان روایات و آثار سے مدد لیتے تھے جو اپنی جگہ مرسل ہوں. مگر عملاً اتصال رکھتے ہوں. آپؒ کی املاء کردہ کتاب الآثار اور امام مالکؒ کے موطا میں آپؒ اسی نظریہ کو جگہ جگہ کارفرما پائیں گے.

حافظ ابن عبدالبر مالکیؒ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

انه كان يذهب فى ذالك الى عرضها على ما اجتمع عليه من الاحاديث و معانى القران فما شذ من ذالك رده وسماه شاذاً[1]

(ترجمہ) امام صاحبؒ ایسے موقع پر اس روایت کو اس موضوع کی دوسری احادیث اور قرآنی مطالب سے ملا کر دیکھتے جو روایت اس مجموعی موقف سے علیحدہ رہتی آپؒ اسے (عمل میں) قبول نہ کرتے اور اس کا نام شاذ isolated رکھتے.

حضرت امام کے نظریہ حدیث میں اصول بھی کارفرما ہے کہ آثار صحابہ اور ضعیف حدیث کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے. اُن کے ہاں آثار صحابہ اور ضعیف حدیث کے ہوتے ہوئے اجتہاد اور قیاس سے کام نہ لینا چاہیئے. اپنی رائے پر ضعیف حدیث اور آثار صحابہ کو ترجیح دینی چاہیئے. یہ یہ صرف حضرت امام کی ہی رائے نہ تھی بکل فقہاء عراق اسی نظریہ کے تھے. علامہ ابن حزمؒ نے اس پر فقہاء عراق کا اجماع نقل کیا ہے

نوٹ ضعیف حدیث سے یہاں وہ روایت مراد نہیں جس کا ضعف انتہائی شدید قسم کا ہو یا وہ موضوع ہونے کے بالکل قریب جا چکی ہو۔

---

[1] الموافقات للشاطبی جلد ۳ صـ۲۶

متکلمین کا جو طبقہ مسائل ذات وصفات میں تاویل کی راہ چلا حضرت امام اس مسلک کے نہ تھے۔ اس باب میں آپ محدثین کی روش پر تھے اور آیات صفات پر بلا تاویل ایمان رکھتے تھے۔ حافظ ابن کثیر (۷۷۴ھ) آپ کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں:۔

الامام، فقیہ العراق، احد ائمۃ الاسلام والسادۃ الاعلام، احد ارکان العلماء احد الائمۃ الاربعۃ اصحاب المذاہب المتبوعۃ۔[۱]

علامہ ذہبیؒ (۷۴۸ھ) آپ کے لیے امام اعظم کا لقب اختیار کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:۔

...... کان اماماً ورعاً عالماً عاملاً متعبداً کبیر الشان۔[۲]

الامام اعظم، فقیہ العراق حضرت امام متورع، عالم، عامل، متقی اور کبیر الشان تھے۔

امام مکی بن ابراہیمؒ فرماتے ہیں کہ ابو حنیفہؒ اعلم اہل الارض تھے[۳] یعنی کرۂ ارضی کے اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم تھے۔ علم ان دنوں علم حدیث کو ہی کہا جاتا تھا۔

علامہ ابن خلدونؒ فرماتے ہیں کہ ابو حنیفہؒ علم حدیث کے بڑے مجتہدین میں سے تھے۔[۴] اور لکھتے ہیں کہ فقہ میں آپ کا مقام اتنا بلند تھا کہ کوئی دوسرا ان کی نظیر نہ تھا اور ان کے تمام ہمعصر علماء نے ان کی اس فضیلت کا اقرار کیا ہے خاص طور پر امام مالکؒ اور امام شافعی نے۔[۵]

امام الجرح والتعدیل یحییٰ بن سعید القطان (۱۹۸ھ) فرماتے ہیں کہ ہم خدائے قدوس کی تکذیب نہیں کرتے۔ ہم نے امام ابو حنیفہؒ سے بہتر رائے اور بات کسی سے نہیں دیکھی۔[۶]

آپ بھی حضرت امام کے قول پر فتویٰ دیتے تھے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں:۔

کان یحیی القطان یفتی بقول ابی حنیفہ ایضاً۔[۷]

یہ اس درجہ کے امام تھے کہ امام احمدؒ فرماتے ہیں:۔

ما رأیت بعینی مثل یحیی بن سعید القطان۔[۸]

میں نے اپنی آنکھوں یحییٰ بن سعید کی مثل کسی کو نہ دیکھا۔

اس درجے کے عظیم القدر محدث کا فقہی مسائل میں امام ابو حنیفہؒ کی پیروی کرنا اور ان کے

---

[۱] البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ صفحہ ۱۰۷ [۲] تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۱۵۸ [۳] مقدمہ اوجز المسالک صفحہ ۶۲ [۴] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۴۴۵
[۵] مقدمہ صفحہ ۴۴۸ [۶] تہذیب التہذیب جلد ۱۰ صفحہ ۴۴۹ [۷] تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۲۸۲ [۸] ایضاً صفحہ ۲۷۵

قول پر فتوے دینا اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ حضرت امامؒ حدیث و فقہ میں کتنا اونچا مقام رکھتے تھے۔

عبداللہ بن داؤدؒ کہتے ہیں :۔

جب کوئی آثار یا حدیث کا قصد کرے تو (اس کے لیے) سفیانؒ ہیں اور جب آثار یا حدیث کی باریکیوں کو معلوم کرنا چاہے تو امام ابوحنیفہؒ ہیں[1]

امام مسعر بن کدامؒ (۱۵۵ھ) کی جلالت قدر سے کون واقف نہیں، شعبہ کہتے ہیں ہم نے ان کا نام مصحف (قرآن) رکھا ہوا تھا۔ یحییٰ بن سعید القطانؒ کہتے ہیں میں نے حدیث میں ان سے زیادہ ثابت کسی کو نہیں پایا۔ محمد بن بشرؒ کہتے ہیں میں نے ان سے دس کم ایک ہزار احادیث لکھیں۔ یہ مسعر بن کدامؒ حضرت امامؒ کے ہم سبق تھے۔ آپؒ کہتے ہیں :۔

طلبت مع ابی حنیفة الحدیث فغلبنا واخذنا فی الزھد فبرع علینا وطلبنا معه الفقه فجاء منه ما ترون[2]

(ترجمہ) میں نے اور ابوحنیفہؒ نے اکٹھے حدیث پڑھنی شروع کی وہ ہم پر غالب رہے علم حدیث میں ہم سب طلبہ سے بڑھ گئے ہم زہد و سلوک میں پڑے تو اس میں بھی وہ کمال پر پہنچے اور ہم نے ان کے ساتھ فقہ پڑھنا شروع کیا تو اس میں بھی وہ اس مقام پر آپہنچے جو تم دیکھ رہے ہو۔

مسعر بن کدامؒ جیسے محدث کی یہ شہادت حضرت امام کے علم حدیث میں اسبق ہونے کی ایک کھلی دلیل ہے۔ کم از کم پانچ لاکھ احادیث بیک نظر آپ کے سامنے ہوتی تھیں آپ نے اپنے بیٹے حماد کو جن پانچ حدیثوں پر عمل کرنے کی وصیت کی ان کے بارے میں فرمایا کہ میں نے یہ پانچ لاکھ احادیث سے انتخاب کی ہیں وصیت ۱۹ کے تحت لکھتے ہیں۔

ان تعمل بخمسة احادیث جمعتها من خمس مائة الف حدیث[3]

ترجمہ۔ ان پانچ احادیث[4] کو خاص طور پر معمول بہ بنانا میں نے انہیں پانچ لاکھ احادیث سے چنا ہے

---

[1] سیر الاحناف ص۲۹ [2] مناقب ابی حنیفہ للذہبی ص۲۷ [3] وصیۃ الامام الاعظم لابنہ حماد ص۶۵ [4] ۱۔ لکل امرئ ما نوی۔ ۲۔ من حسن اسلام امرأ ترکه مالا یعنیه۔ ۳۔ لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیه ما یحب لنفسه۔ ۴۔ ان الحلال بیّن والحرام بیّن وبینهما مشتبهات۔ ۵۔ المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده۔

حضرت امام اعظمؒ کی تابعیت

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت جو عمر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تھی حضرت امامؒ تقریباً اسی عمر کے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی صحابہؓ موجود تھے۔ حضرت عبداللہ بن ابی اوفیؓ (۸۷ھ) سہل بن سعد ساعدیؓ (۹۱ھ) حضرت انس بن مالکؓ (۹۳ھ) حضرت عبداللہ بن بُسرؓ المازنی (۹۶ھ) حضرت عامر بن واثلہ الاسقعؓ (۱۰۲ھ) اس وقت زندہ تھے۔ حضرت عامرؓ کی وفات کے وقت حضرت امامؒ کی عمر ۲۲ سال کی تھی اور حضرت عبداللہ بن ابی اوفیؓ تو رہتے ہی کوفہ میں تھے۔ حافظ ذہبیؒ لکھتے ہیں:۔

مولدہ سنة ثمانين رای انس بن مالكؓ غير مرة لما قدم عليهم الكوفة۔[1]

(ترجمہ) حضرت امامؒ کی پیدائش ۸۰ھ میں ہوئی آپؒ نے حضرت انس بن مالکؓ (۹۳ھ) کو جب وہ کوفہ گئے تو کئی دفعہ دیکھا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضورؐ سے گیارہ برس کی عمر میں روایت لے سکتے ہیں تو حضرت امامؒ حضرت انسؓ سے حدیث کیوں نہ سن سکتے تھے۔ یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی۔ کہ آپؒ نے حضرت انسؓ کی بارہا زیارت کی ہو اور اُن سے احادیث نہ سُنی ہوں۔ نہ حضرت انسؓ کے بارے میں تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی مجالس میں احادیث نہ پڑھتے ہوں یہ علیحدہ بات ہے کہ امام نے انہیں روایت نہ کیا ہو۔

اہل کوفہ کی ایک منفرد عادت

اہل کوفہ حدیث کے بارے میں کچھ زیادہ ہی محتاط ہوئے ہیں۔ خطیب بغدادی لکھتے ہیں:۔

ان اهل الكوفة لم يكن الواحد منهم يسمع الحديث الا بعد استكمال عشرين سنة۔[2]

ترجمہ۔ اہل کوفہ میں سے کوئی بیس سال کی عمر سے پہلے حدیث کا باقاعدہ سماع نہ کرتا تھا۔

اس صورتِ حال میں بہت ممکن ہے کہ آپؒ نے اُن سے احادیث سُنی تو ہوں لیکن بیس سال سے کم ہونے کے باعث اُنہیں آگے عام روایت نہ کیا ہو۔ دارقطنی کا یہ کہنا کہ آپؒ نے حضرت انس بن مالکؓ کو دیکھا تو ضرور ہے لیکن اُن سے احادیث نہیں سنیں۔ اس معنی پر محمول ہوگا کہ بیس سال سے کم عمر کے سماع کو اہل کوفہ سماع شمار نہ کرتے تھے اور جہاں کہیں حضرت امامؒ نے ان سے روایت کر دی وہ محض تبرک کے طور پر ہوگی اور عام عادت سے ایک استثناء ہوگا۔ حافظ بدرالدین عینیؒ اور ملا علی قاریؒ

---

[1] تذکرہ جلد ۱ صـ ۱۵۸ [2] الکفایہ صـ ۵۴

نے حضرت امامؒ کا صحابہؓ سے روایت لینا تسلیم کیا ہے۔

یحییٰ بن معینؒ کہتے ہیں کہ حضرت امامؒ نے حضرت عائشہ بنت عجردؓ سے بھی حدیث سنی ہے۔ اور وہ براہ راست حضورؐ سے اپنا سماع پیش کرتی ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں :-

ان اباحنیفة صاحب الرای سمع عائشه بنت عجرد وتقول سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم[1]

الحاصل حضرت امامؒ تابعین میں سے تھے اور یہ وہ فضیلت ہے جو ائمہ اربعہؒ سے اور کسی کو حاصل نہیں ہے۔ ملا علی قاریؒ نے سند الامام میں حضرت امام کی عائشہ بنت عجرد سے روایت نقل کی ہے۔

حضرت امام اعظمؒ کی ثقاہت

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں :-

قال محمد بن سعد العوفی قال سمعت یحیی بن معین یقول کان ابوحنیفة ثقة لا یحدث بالحدیث الا بما یحفظ ولا یحدث بما لا یحفظ[2]

(ترجمہ) محمد بن سعدؒ عوفی نے یحییٰ بن معینؒ سے سنا وہ کہتے تھے ابوحنیفہؒ ثقہ ہیں وہی حدیث روایت فرماتے جو آپؒ کو یاد ہوتی اور جو یاد نہ رہتی اُسے بیان نہ کرتے تھے۔

جن لوگوں نے حضرت امام کی اس ثقاہت کو مجروح کرنے کی کوشش کی ہے اُن کے پاس سوائے تعصب اور دشمنی کے اور کوئی وجہ جرح نہیں ملتی ——— یہ یحییٰ بن معین کون ہیں اور کس درجے کے ہیں؟ حضرت امام احمدؒ فرماتے ہیں۔ علم رجال میں یہ ہم میں سے سب سے آگے ہیں[3] اب ان کی توثیق کے مقابلے میں بھلا کس کی بات سنی جا سکتی ہے۔ آپؒ سے اگر روایات کم ہیں تو اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ آپؒ کی شروط روایت بہت سخت تھیں۔

خطیب بغدادی یحییٰ بن معین سے نقل کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک حدیث نقل کرنے کے لیے یہ شرط تھی کہ وہ سننے کے بعد سے اسے برابر یاد رہنی چاہیئے۔ اگر یاد نہ رہے تو اس کو روایت کرنا آپ کے نزدیک درست نہ تھا۔

---

[1] لسان المیزان جلد ص [2] تہذیب التہذیب جلد ص [3] تذکرہ جلد ۲ ص۱۲

حضرت امام کے اقران

جو لوگ حضرت امام کو اپنے وقت کے دیگر اہل علم سے جدا رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ یہ نہیں دیکھتے کہ حضرت امام قرون وسطیٰ تک صحابہ و تابعین کے علم کے اسی طرح وارث شمار ہوتے رہے ہیں، جس طرح حضرت سفیان الثوری، امام اوزاعی، اور امام مالک وغیرہم من جبال اہل العلم اور آپ کا علم اسی درجہ میں سند سمجھا جاتا رہا ہے جس طرح ان حضرات کا ـــــ حافظ شمس الدین الذہبی (۷۴۸ھ) ایک جگہ علم منطق جدل اور حکمت یونان پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

لم تکن واللہ من علم الصحابة والتابعین ولا من علم الاوزاعی والثوری ومالك وابی حنیفة وابن ابی ذئب وشعبة ولا واللہ عرفها ابن المبارك ولا ابو یوسف ولا وکیع ولا ابن المهدی ولا ابن وهب ولا الشافعی ولا ولا عفان ولا ابو عبید ولا ابن المدینی واحمد وابو ثور والمزنی والبخاری والاثرم ومسلم والنسائی وابن خزیمة وابن شریح وابن المنذر وامثالهم بل کانت علومهم القرآن والحدیث والفقه والنحو وشبه ذلك۔[1]

(ترجمہ) یہ علم بخدا صحابہ اور تابعین کے علوم میں سے نہیں نہ یہ اوزاعی، سفیان ثوری امام مالک، امام ابوحنیفہ، ابن ابی ذئب اور امام شعبہ کے علوم میں سے ہیں۔ بخدا انہیں نہ عبداللہ بن مبارک نے جانا نہ امام ابو یوسف نے نہ امام وکیع نے نہ عبدالرحمٰن بن المہدی نے نہ ابن وہب نے اور نہ امام شافعی نے الخ

کچھ انصاف کیجئے اور دیکھئے کہ امت اسلامیہ نے جن جبال علم کو جنم دیا اور جن کے علم و فن پر یہ امت اب تک نازاں ہے۔ کیا ان میں بلا کسی استثناء امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کا ذکر نہیں کیا جا رہا۔ ان حضرات نے اگر حدیث کم روایت کی ہے تو اس کی وجہ یہ تھی صالحین اولین کا ایک طبقہ یہ مسلک رکھتا تھا کہ زیادہ حدیث روایت نہ کی جائے۔ علامہ شعبی فرماتے ہیں:۔

کرہ الصالحون الاولون الاکثار من الحدیث۔[2]

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صـ۱۹۲ [2] ایضاً صـ۷۷

علامہ ذہبیؒ نے مذکورہ بالا عبارت میں امام ابوحنیفہؒ کو کن ائمہ علم کے ساتھ برابر کا شریک کیا ہے سفیان الثوریؒ، امام مالکؒ اور اوزاعیؒ کے ساتھ اور یہ وہ حضرات ہیں کہ اگر کسی بات پر متفق ہو جائیں تو اس کا سنت ہونا از خود ثابت ہو جاتا ہے۔ گو اس کی سنیت پر کوئی نص موجود نہ ہو۔

اسحٰق بن ابراہیمؒ کہتے ہیں:۔

اذا اجتمع الثوری و مالك والاوزاعی علی امر فھو سنۃ وان لم یکن فیہ نص۔ تذکرہ ص۱۹۵

اب آپ ہی اندازہ کریں کہ حضرت امامؒ کس درجہ کے ائمہ علم کے ساتھ برابر کی نسبت رکھتے تھے اور یہ کہ آپ کے اقران میں کون کون سے جبال علم تھے۔

محدثین میں اہل الرائے

ائمہ حدیث میں اہل الرائے صرف وہی حضرات ہوئے جو مجتہد کے درجہ تک پہنچے تھے نص صریح نہ ہونے کی صورت میں کسی مسئلہ میں رائے دینا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ ابن قتیبہؒ نے معارف میں اصحاب الرائے کا عنوان قائم کر کے ان میں سفیان الثوریؒ، امام مالکؒ اور امام اوزاعیؒ کو بھی ذکر کیا ہے۔ سو اگر کسی نے امام ابوحنیفہؒ کو اہل الرائے میں لکھ دیا تو یہ ان کے مجتہدانہ مقام کا ایک علمی اعتراف ہے محدث ہونے کا انکار نہیں پھر صرف حنفیہ کرام ہی تو اہل الرائے نہیں حافظ محمد بن الحارث الخشنی نے قضاۃ قرطبہ میں مالکیہ کو بھی اصحاب الرائے میں ذکر کیا ہے۔ علامہ سلیمان بن عبد القوی الطوفی الحنبلی نے اصول حنابلہ پر مختصر الروضہ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں ہے:۔

اعلم ان اصحاب الرای بحسب الاضافۃ ھم کل من تصرف فی الاحکام بالرای فیتناول جمیع علماء الاسلام لان کل واحد من المجتہدین لا یستغنی فی اجتہادہ عن نظر و رای ولو بتحقیق المناط و تنقیحہ الذی لا نزاع فیہ۔

جان لو کہ اصحاب الرائے باعتبار اضافت تمام وہ علماء ہیں جو احکام میں فکر کو راہ دیتے ہیں سو یہ لفظ تمام علماء اسلام کو شامل ہوگا کیوں کہ مجتہدین میں سے کوئی بھی اپنے اجتہاد میں نظر و رای سے مستغنی نہیں گو وہ تحقیق مناط سے ہو اور اس تنقیح سے جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

تدوین فقہ کے کام کو سر انجام دینے کے باعث حضرت امام نے حدیث کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں کیا لیکن فقہی مباحث کے ضمن میں بہت سی احادیث آپ نے اپنے تلامذہ کے سامنے روایت

کیں۔ آپ کی جو روایات آپ سے آگے آپ کے تلامذہ میں چلتی رہیں انہیں حصنفکیؒ نے جمع کیا ہے پھر ابو المؤید محمد بن محمود الخوارزمی نے تمام مسانید کو ۶۶۵ھ میں یکجا جمع کیا۔ اسی مجموعہ کو مسند امام اعظمؒ کہا جاتا ہے۔ اس کے لائق اعتماد ہونے کے لیے موسیٰ بن زکریا حصکفی کی ثقہ شخصیت کے علاوہ یہ بات بھی لائق غور ہے کہ عمدۃ المحدثین ملا علی قاریؒ جیسے اکابر نے اس مسند امام کی شرح لکھی ہے۔ جو سند الانام کے نام سے معروف ہے اور علماء میں بے حد مقبول ہے۔

امام وکیع بن الجراح کی علمی منزلت اور فن حدیث میں مرکزی حیثیت اہل علم سے مخفی نہیں ہے صحیح بخاری اور صحیح مسلم آپ کی مرویات سے بھری پڑی ہیں۔ علم حدیث کے ایسے بالغ نظر علماء کا امام ابو حنیفہؒ سے حدیث سننا اور پھر ان کے اس قدر گرویدہ ہو جانا کہ انہی کے قول پر فتوے دینا حضرت امام کی علمی منزلت کی ناقابل انکار تاریخی شہادت ہے۔ حافظ ابن عبد البر مالکیؒ امام الجرح والتعدیل یحییٰ بن معین سے نقل کرتے ہیں:۔

وکان (وکیع) یفتی برأی ابی حنیفة وکان یحفظ حدیثه کله وکان قد سمع من ابی حنیفة حدیثا کثیرا۔[1]

(ترجمہ) حضرت وکیع حضرت امام ابو حنیفہ کی فقہ کے مطابق فتوے دیتے تھے اور آپ کی روایت کردہ تمام احادیث یاد رکھتے تھے اور انہوں نے آپ سے بہت سی احادیث سنی تھیں۔

حافظ شمس الدین الذہبی (۷۴۸ھ) بھی وکیع کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:۔

قال یحیی ما رأیت افضل منه یقوم اللیل ویسرد الصوم ویفتی بقول ابی حنیفة۔[2]

وکیع جیسے حافظ الحدیث اور عظیم محدث کا آپ کی تقلید کرنا اور فقہ حنفی پر فتوے دینا حضرت امام کے مقام حدیث کی ایک کھلی شہادت ہے۔ پھر چند نہیں آپ نے ان سے کثیر احادیث سنیں۔

علم حدیث اور علم فقہ کے علاوہ آپ کی کلام پر بھی گہری نظر تھی۔ عراق کے کوفی اور بصری اعتقادی فتنوں نے حضرت امام کو اس طرف بھی متوجہ کر دیا تھا۔ آپ نے محدثین کے مسلک پر رہتے ہوئے ان الحادی تحریکات کا خوب مقابلہ کیا۔ خطیب بغدادی (۴۶۳ھ) لکھتے ہیں:۔

"علم عقائد اور علم کلام میں لوگ ابو حنیفہ کے عیال اور خوشہ چیں ہیں"[3]

---

[1] کتاب الانتقاء جلد ۲ صفحہ ۱۵، جامع بیان العلم جلد ۲ صفحہ ۱۴۹ [2] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۲۸۲ [3] بغدادی جلد ۱۳ صفحہ ۱۶۱

علامہ ابن خلدونؒ لکھتے ہیں:۔ والامام ابوحنیفۃ انما قلت روایتہ لما شدد فی الروایۃ والتحمل[1]۔
ترجمہ۔ اور امام ابوحنیفہ کی روایات قلیل اسیلئے ہیں کہ آپ نے روایت اور تحمل روایت کی شرطوں میں سختی کی ہے۔
بایں ہمہ آپ کثیر الروایۃ تھے وکیع نے آپ سے کثیر احادیث سنی ہیں۔

حضرت امام اوزاعیؒ (۱۵۷ھ)

آپؒ محدث تھے اور حدیث کے بہت بڑے عالم تھے۔ علامہ ذہبیؒ آپؒ کو شیخ الاسلام اور الحافظ لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آپؒ اس قابل تھے کہ آپؒ کو خلیفہ وقت بنایا جائے[2]۔ امام ابوزرعہؒ (۲۸۱ھ) فرماتے ہیں کہ امام اوزاعیؒ سے دین اور فقہ کا بڑا ذخیرہ منقول ہے۔ آپؒ اہل شام کے مرجع اور مفتی اعظم تھے۔ مدتوں اہلِ شام میں آپؒ کی پیروی جاری رہی۔ امام ابن مہدیؒ کا بیان ہے کہ حدیث کے مرکزی امام چار ہیں جن میں امام اوزاعیؒ بھی شامل ہیں اور فرمایا کہ اہلِ شام میں اُن سے بڑا سنت کا کوئی عالم نہ تھا[3]۔ امام ابواسحٰق فزاریؒ کا بیان ہے کہ اگر تمام امت کے لیئے خلیفہ انتخاب کرنے کا مجھے اختیار دیا جائے تو میں امام اوزاعیؒ کا انتخاب کروں گا۔ اہلِ شام کے ساتھ اہل اُندلس میں بھی ایک عرصہ تک آپؒ کی تقلید جاری رہی[4]۔ ائمہ اربعہؒ کی طرح آپؒ بھی اس وقت کے امام متبوع رہے۔ عبدالرحمٰن بن مہدیؒ اسی جہت سے کہا کرتے تھے کہ آپؒ امام فی السنۃ ہیں[5] امام فی الحدیث نہیں۔ اس سے مراد اُن کے محدث ہونے کا انکار نہ تھا مطلب یہ تھا کہ آپؒ سنت قائمہ میں منسلک ہوئے اور امت کے ایک طبقہ میں آپؒ کی پیروی جاری ہوئی۔

حافظ ابن کثیرؒ آپؒ کو الامام الجلیل علامۃ الوقت اور فقیہ اہل الشام لکھتے ہیں۔ امام عبیداللہ بن عبدالکریمؒ نے فرمایا کہ میں نے امام اوزاعیؒ سے بڑا عقلمند، پرہیزگار، عالم، فصیح، باوقار، حلیم اور خاموش طبع کوئی دوسرا نہیں دیکھا[6]۔

امام سفیان الثوریؒ (۱۶۱ھ)

آپؒ کوفہ کے رہنے والے تھے۔ کوفہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت علیؓ کی آمد کے باعث علم کا

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص [2] تذکرۃ الحفاظ [3] تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۲۳۹ [4] تذکرہ جلد ۱ ص ۱۶۸
[5] البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۱۱۵ [6] الاکمال ص ۶۲۸

گہوارہ بنا ہوا تھا۔ گو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مسند نشین حضرت امام ابو حنیفہؒ ہوئے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اختلاف ائمہ میں اہل کوفہ کے الفاظ ان کو بھی شامل سمجھے جاتے ہیں۔ صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں:

سفیان الثوری امام فی الحدیث ولیس بامام فی السنۃ والاوزاعی امام فی السنۃ ولیس بامام فی الحدیث ومالک بن انسؒ امام فی جمیعھا۔[1]

آپؒ نے ایک مجموعہ حدیث بھی مرتب فرمایا تھا جس کا نام جامع سفیان ثوری تھا۔ یہ مجموعہ آپ نے کوفہ میں تحریر کیا تھا۔ فتح الباری وغیرہ میں جامع سفیان الثوری کا ذکر کئی جگہ ملتا ہے۔[2]

عن ثابت الزاھد قال کان اذا اشکل علی الثوری مسئلۃ قال ما یحسن جوابھا الا من حسدناہ ثم یسأل عن اصحابہ ویقول ما قال فیہ صاحبکم فیحفظ الجواب ثم یفتی بہ۔[3]

ثابت زاہدؒ جو کہ امام سفیان ثوریؒ کے تلامذہ اور امام بخاریؒ اور امام ترمذیؒ کے اساتذہ میں ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب امام سفیان ثوریؒ کو کسی مسئلہ میں کوئی اشکال پیش آتا تو فرماتے کہ اس کا جواب بہتر طور پر وہی دے سکتا ہے جس پر ہم لوگ (یعنی تم لوگ) حسد کرتے ہیں یعنی امام ابو حنیفہؒ۔ پھر امام ابو حنیفہؒ کے تلامذہ سے پوچھتے کہ بتلاؤ تمہارے استاد اس بارہ میں کیا فرماتے ہیں اور پھر اس کو یاد رکھتے اور اسی کے مطابق فتوے دیتے تھے۔

اس سے بھی یہی معلوم ہوا کہ حدیث کا عالم فقط وہی نہیں جسے کہ حدیث کے الفاظ زیادہ یاد ہوں بلکہ حدیث کا اصل عالم اور امام وہی ہے۔ جو حدیث کے معانی اور اس کے حقائق و دقائق کو بخوبی سمجھتا ہو۔ اور حدیث کی حفاظت و خدمت کا جذبہ رکھتا ہو۔ امام ابو حنیفہؒ حدیث کے اس قدر قائل تھے کہ حدیث ضعیف کو بھی قیاس پر مقدم رکھتے۔ الحدیث الضعیف احب الی من رای الرجال ان کا مشہور قول ہے کوفہ کے محدثین حدیث کے بغیر فقیہ بننا جرم سمجھتے تھے۔

وکان سفیان الثوری وابن عیینۃ وعبد اللہ بن سنان یقولون لو کان احدنا قاضیاً لضربنا بالجرید فقیھاً لا یتعلم الحدیث ومحدثاً لا یتعلم الفقہ۔ لواقح الانوار ص ۳۶

(ترجمہ) سفیان ثوریؒ اور سفیان بن عیینہؒ اور عبداللہ بن سنان کہا کرتے تھے کہ اگر ہم

---

[1] الاکمال ص ۶۲۸ [2] دیکھئے فتح الباری کتاب الجہاد جلد ۶ ص ۵۳ [3] کتاب المناقب للموفق جلد ۱ ص ۲۲۸

میں سے کوئی قاضی ہو جائے تو دو شخصوں کو ضرور کوڑے لگائیں۔ ایک وہ کہ جو فقہ سیکھتا ہو اور حدیث کا علم حاصل نہ کرتا ہو اور ایک وہ جو حدیث پڑھتا ہو اور فقہ حاصل نہ کرتا ہو۔[۱]

علامہ ذہبیؒ نے امام ثوریؒ کو الامام شیخ الاسلام، سید الحفاظ اور الفقیہ لکھا ہے۔[۲] امام شعبہؒ و ابن معینؒ اور ایک کثیر تعداد جماعت کہتی ہے کہ سفیانؒ فن حدیث میں امیر المؤمنین تھے۔ ابن مبارکؒ نے کہا کہ میں نے گیارہ سو شیوخ سے احادیث کی سماعت کی ہے۔ جن میں سفیان ثوریؒ سے افضل کسی کو نہ پایا۔ امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ اس سر زمین پر کوئی بھی ایسا نہیں رہا کہ جس پر تمام امت متفق ہو۔ ہاں مگر حضرت سفیان ثوریؒ ایسے ضرور تھے۔[۳] حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ سفیان ثوریؒ احد ائمۃ الاسلام اور عابد و متقدی اور احد التابعین تھے۔[۴] علامہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ وہ ائمہ مسلمین میں سے تھے۔ اور بڑے امام اور اعلام دین کے بہت بڑے علم تھے۔ سب کا ان کی امامت پر اتفاق ہے۔[۵]
امام سیوطیؒ لکھتے ہیں آپ کے مقلد پانچویں صدی کے بعد تک پائے جاتے رہے ہیں۔[۶]

حضرت امام مالکؒ (د ۱۷۹ھ)

حضرت امام مالکؒ امام دار الہجرۃ کے نام سے معروف ہیں۔ حدیث کی خدمت میں آپؒ نے حدیث کی مشہور کتاب مؤطا تالیف کی۔ اس کتاب کو مرتب کرنے کے بعد ستر علماء کے سامنے پیش کیا گیا۔ تو سب نے مؤاطات (موافقت) ظاہر کی۔ اسی لیے اس کا نام مؤطا رکھا گیا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے قول کے مطابق مؤطا میں سترہ سو کے قریب روایات ہیں جن میں سے ۶۰۰ مسند اور ۳۰۰ مرسل ہیں۔ بقایا فتاوی صحابہؓ اور اقوال تابعین ہیں۔ حضرت امام مالکؒ سے مؤطا پڑھنے والے حضرات میں امام شافعیؒ، یحیی اللیثیؒ اور امام محمدؒ کے اسماء سر فہرست ہیں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اصح الکتاب بعد کتاب اللہ الموطا۔ مگر یہ بات اس وقت کی ہے جب صحیح بخاری اور صحیح مسلم تالیف نہ ہوئی تھیں۔

---

[۱] لوا قح الانوار ص۳۶ [۲] تذکرہ جلد ۱ ص۱۹۰ [۳] ایضاً ص۱۹۱ [۴] البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص۱۳۴ [۵] بغدادی جلد ۹ ص۱۵۲ تہذیب التہذیب جلد ۴ ص۱۱۴ [۶] تدریب الراوی ص۳۶

محدث نے الفاظِ حدیث کی خدمت کی تو اس کا نام حافظِ حدیث ہوا اور مجتہد نے معانی حدیث کی خدمت کی تو اس کا لقب عالم حدیث اور فقیہ ہوا. امام مالکؒ میں اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں خصوصیات ودیعت فرمائی تھیں کہ احادیث کا ذخیرہ بھی جمع کیا اور فقہ کے بھی امام ٹھہرے۔

اخرج ابن ابی حاتم من طریق مالك بن انسؒ عن ربیعة قال ان الله تبارك و تعالیٰ انزل الیکم الکتاب مفصلا وترك فیه موضعا للسنة وسن رسول الله صلی الله علیه وسلم وترك فیهما موضعا للرأی۔[1]

(ترجمہ) امام مالکؒ امام ربیعہؒ سے نقل کرتے ہیں کہ ربیعہؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مفصل کتاب نازل فرمائی اور اس میں حدیث کے لیئے جگہ چھوڑی اور آنحضرتؐ نے بہت سی باتیں حدیث میں بیان فرمائیں. اور قیاس کے لیئے جگہ رکھی۔

الفاظ مقصود بالذات نہیں، مقصود اطاعت اور اتباع شریعت ہے اور یہ مقصد معانی کے سمجھنے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے. مقصود بالذات معنی ہیں الفاظ نہیں الفاظ مقصود بالعرض ہیں۔

امام مالکؒ تبع تابعینؒ کے طبقہ میں تھے. آپؒ کے شیوخ و اساتذہ کی تعداد نو سو تھی جن میں تین سو تابعینؒ اور چھ سو تبع تابعینؒ تھے[2] امام شافعیؒ کا فرمان ہے کہ آپؒ کو اگر حدیث کے ایک ٹکڑے پر بھی شک پڑجاتا تو پوری کی پوری ترک کر دیتے تھے. محدثینؒ کے نزدیک اصح الاسانید میں بحث ہے. مشہور ہے کہ جس کے راوی مالکؒ نافعؒ سے اور نافعؒ ابن عمرؓ سے ہوں وہ اسناد سب سے صحیح ہے.[3] لیثؒ، ابن مبارکؒ، امام شافعیؒ اور امام محمدؒ جیسے مشاہیر امت آپؒ کے تلامذہ میں سے ہیں. اور ابن وہبؒ فرماتے ہیں کہ میں نے مدینہ میں منادی سُنی. کہ مدینہ میں ایک مالک بن انسؓ اور ابن ابی ذئبؒ کے سوا کوئی فتوے نہ دیا کرے[4]. امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ میں نے امام اسحٰق بن ابراہیمؒ سے سنا وہ فرماتے ہیں کہ اگر امام مالکؒ امام اوزاعیؒ اور امام ثوریؒ کسی مسئلہ پر متفق ہوجائیں تو وہی مسئلہ حق اور سنت ہوگا اگرچہ اس میں نص نہ موجود ہو.[5] ابن سعدؒ فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ ثقہ، مامون، ثبت، متورع، فقیہ، عالم اور حجت ہیں[6] علامہ ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ امام مالکؒ الامام

---

[1] درمنثور للسیوطی صہ [2] تہذیب الاسماء للنووی صہ [3] ترجمان السنۃ جلد ۱ ص۲۴۲ [4] مشاہیر امت ص۲۹ از قاری محمد طیبؒ [5] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص۱۹۵ [6] تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص۸

الحافظ فقیہ الامت شیخ الاسلام اور امام دار الہجرت تھے۔[۱] آپ کا مسلک زیادہ تر اندلس و مغرب پہنچا۔[۲] افریقی ممالک خصوصاً مغربی افریقہ میں زیادہ تر انہی کے مقلد ہیں۔ اس جلالت علم کے باوجود وہ امام ابوحنیفہ کے معتقد تھے۔ نظر مالک فی کتب ابی حنیفة وانتفاعہ بہا کما رواہ الدراوردی وغیرہ۔[۳] سو یہ حقیقت ہے۔ کہ امام مالک کا امام ابوحنیفہ کی کتابوں کو دیکھنا اور ان سے نفع حاصل کرنا ثابت ہے۔

حضرت امام ابو یوسفؒ (۱۸۲ھ)

الامام القاضی یعقوب ابو یوسفؒ کوفہ میں پیدا ہوئے۔ حدیث کے بہت بڑے عالم اور امام تھے علامہ ذہبیؒ نے آپؒ کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ اور یحییٰ بن معینؒ آپؒ کے تلامذہ میں سے تھے۔ آپؒ اپنے دورِ قضا میں ہر روز دو دو سو رکعت ادا فرمایا کرتے تھے۔ ابن خلکانؒ کہتے ہیں کہ یہ پہلے شخص ہیں جنہیں قاضی القضاۃ کا لقب دیا گیا۔ آپؒ امام ابوحنیفہؒ کے معروف تلامذہ میں سے تھے۔ سترہ سال آپؒ کے ساتھ رہے۔ سب سے پہلے اصولِ فقہ آپؒ نے ہی مرتب کیے۔ ابن خلکانؒ لکھتے ہیں۔

ولم یختلف یحییٰ بن معین واحمد بن حنبل وعلی ابن المدینی فی ثقتہ فی النقل۔[۴]

(ترجمہ) نقل کے بارے میں یحییٰ بن معینؒ اور احمد حنبلؒ اور علی بن المدینیؒ کو آپؒ کی ثقاہت میں کوئی اختلاف نہ تھا۔

امام ابن عبد البرؒ امام طبریؒ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ امام ابو یوسفؒ فقیہ، عالم اور حافظ تھے۔ پچاس ساٹھ تک احادیث وہ ایک ہی مجلس میں یاد کر لیا کرتے تھے اور وہ کثیر الحدیث تھے۔[۵] علامہ ذہبیؒ کا کہنا ہے کہ ابو یوسفؒ حسن الحدیث ہیں۔[۶] امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ جب مجھے حدیث کا شوق پیدا ہوا تو سب سے پہلے امام ابو یوسفؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔[۷] اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپؒ کس درجہ کے محدث تھے۔ علامہ عبد القادرؒ (۶۹۲ھ) کہتے ہیں کہ مشرق و مغرب تک کی قضا ان کے سپرد تھی۔[۸] امام نسائیؒ آپؒ کو ثقہ لکھتے ہیں۔[۹] امام بیہقیؒ نے بھی آپؒ کو ثقہ فرمایا ہے۔[۱۰] امام مزنیؒ کا بیان

---

[۱] تذکرہ جلد ا صفحہ ۱۹۳ [۲] بستان المحدثین صفحہ ۲۶ [۳] انتصار صفحہ ۱۴۲ [۴] ترجمان السنۃ جلد ا صفحہ ۲۵ [۵] انتصار صفحہ ۱۷۲
[۶] تلخیص المستدرک جلد ا صفحہ ۲۷ [۷] بغدادی جلد ۱۴ صفحہ ۲۵۵ [۸] الجواہر المضیہ جلد ۲ صفحہ ۲۲۱
[۹] کتاب الضعفاء الصغیر صفحہ ۸۷ [۱۰] السنن الکبریٰ جلد ا صفحہ ۲۴۷

ہے کہ فقہاء اور اصحاب الرائے میں ابو یوسفؒ سب سے زیادہ حدیث کی اتباع کرنے والے تھے[1]
امام ابن معینؒ آپؒ کو صاحبِ حدیث اور صاحبِ سنّت کہتے ہیں۔[2] اور اُن سے یہ بھی منقول ہے
کہ اصحاب الرائے میں آپؒ سب سے زیادہ حدیثیں روایت کرنے والے تھے اور اثبت فی
الحدیث تھے۔ علامہ ذہبیؒ نے آپؒ کو الامام العلامہ اور فقیہ العراقین لکھا ہے۔[3] امام ابن قتیبہؒ (۲۷۶ھ)
بھی آپؒ کو صاحبِ سنّت اور حافظ لکھتے ہیں۔[4] ہلال بن یحییٰؒ نے فرمایا کہ تفسیر، مغازی اور تاریخِ عرب
کے حافظ تھے اور فقہ تو آپؒ کے علوم کا ادنیٰ جزء تھا۔[5] آپؒ نے اعمشؒ، ہشام بن عروہؒ، سلیمان تیمیؒ،
ابو اسحاق شیبانیؒ، یحییٰ بن سعید الانصاری سے بھی احادیث روایت کیں۔ آپؒ نے مختلف علوم میں تصانیف
کیں۔ ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں اُن کی مفصل فہرست لکھی ہے۔ کتاب الخراج آپؒ کی مشہور
تصنیف ہے جو خلیفہ ہارون الرشید کے نام آپؒ کی چند تحریروں کا مجموعہ ہے۔[6] آپ کا ارشاد ہے۔

"وکنت ربما ملت الی الحدیث فکان هو البصر بالحدیث الصحیح منی"[7]

حضرت امام محمدؒ (۱۸۹ھ)

آپؒ امام ابوحنیفہؒ کے نہایت قابلِ اعتماد شاگرد تھے۔ بلکہ یُوں کہیئے کہ حضرت امامؒ کے علوم زیادہ تر
آپؒ ہی کے ذریعہ پھیلے۔ آپؒ نے حضرت امامؒ کی وفات کے بعد مزید تکمیل امام ابو یوسفؒ سے کی اور
اس کے بعد امام مالکؒ سے بھی مؤطا سُنا۔ مگر جو عقیدت حضرت امامؒ سے ہو چکی تھی اس کے نقوش کسی دائرہ علم
میں مٹ نہ سکے۔ اُبو عبیدہؒ کہتے ہیں کہ میں نے امام محمدؒ سے بڑھ کر قرآن کا عالم اور کوئی نہیں دیکھا۔ مشہور
ہے کہ آپؒ نے علومِ دینیہ میں ۹۹۰ کتب تصنیف کیں۔[8] امام شافعیؒ بھی آپؒ کے تلامذہ میں سے تھے
حدیث کی مشہور کتاب "موطا امام محمد" آپؒ ہی کے نام سے معنون ہے۔ اس کی محدثِ کبیر ملا علی قاریؒ
نے مبسوط شرح لکھی ہے۔ حضرت مولانا عبدالحی لکھنویؒ نے التعلیق الممجد کے نام سے اس پر ایک مبسوط

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ صفحہ ۱۸۰ [2] تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۲۷ [3] تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۲۶۹ [4] معارف ابن قتیبہ صفحہ ۱۷۱
[5] ترجمان السنہ جلد ۱ صفحہ ۲۴۹ [6] سیرت النعمان صفحہ ۱۷۱/۱۷۲ [7] مقدمہ اعلاء السنن صفحہ ۲-۳ نقلاً عن ابن
حجر المکیؒ [8] الفوائد البہیہ و ترجمان السنہ جلد ۱ صفحہ ۲۵۱

حاشیہ لکھا ہے[1]۔ موطا امام مالکؒ اور موطا امام محمدؒ ہر دو کتب آج بھی دینی مدارس میں دورہ حدیث میں پڑھائی جاتی ہیں۔ امام شافعیؒ کا قول مشہور ہے کہ میں نے امام محمدؒ سے بقدر ایک اونٹ کی کتابوں کے علم حاصل کیا[2]۔ امام بخاریؒ کے استاد یحییٰ بن معینؒ فرماتے ہیں کہ میں نے جامع صغیر خود امام محمدؒ سے لے کر لکھی ہے جو اُن کی مشہور تصنیف ہے۔ امام حربیؒ کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبلؒ سے پوچھا کہ آپؒ یہ مسائل دقیقہ کہاں سے بیان فرماتے ہیں تو کہا کہ امام محمدؒ کی کتب سے[3]۔ امام محمدؒ نے مسعر بن کدامؒ، سفیان ثوریؒ، مالک بن دینارؒ اور امام اوزاعیؒ وغیرہ حضرات سے بھی احادیث روایت کیں۔ امام محمدؒ کی شہرت زیادہ تر فقہ میں ہے۔ مگر وہ تفسیر، حدیث اور ادب میں بھی اجتہاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ میرے والد نے تیس ہزار درہم ترکہ میں چھوڑے تھے۔ پندرہ ہزار میں نے نحو، شعر اور ادب پر خرچ کیے اور پندرہ ہزار فقہ و حدیث کی تعلیم پر صرف کیے[4]۔ امام دارقطنیؒ (۳۸۵ھ) آپؒ کو ثقات اور حفاظِ حدیث میں شمار کرتے ہوئے ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ یہ حدیث بیس عدد ثقات اور حفاظِ حدیث نے بیان کی ہے جن میں امام محمد بن الحسن الشیبانیؒ، یحییٰ بن سعید القطانؒ، عبداللہ بن المبارکؒ، عبدالرحمٰن بن مہدیؒ اور ابن وہبؒ وغیرہ شامل ہیں[5]۔

حضرت امام شافعیؒ (۲۰۴ھ)

امام محمد بن ادریس الشافعیؒ کی پرورش انتہائی نامساعد حالات اور تنگدستی میں ہوئی۔ بسا اوقات آپؒ کو علمی یادداشتوں کو تحریر کرنے کے لیے کاغذ بھی میسر نہ آتا تھا۔ آپؒ جانوروں کی ہڈیوں پر بھی لکھ لیتے تھے۔ تیرہ سال کی عمر میں امام مالکؒ کی خدمت میں پہنچے۔ مؤطا حفظ کر چکے تھے۔ دوسرے سال عراق چلے گئے۔ آپؒ کو پندرہ سال کی عمر میں آپؒ کے شیخ مسلم بن خالدؒ نے فتوے نویسی کی اجازت دے دی تھی۔ علم حدیث و فقہ اور تفسیر و ادب میں کمال حاصل کیا۔ امام نوویؒ نے شرح مہذب میں لکھا ہے کہ امام عبدالرحمٰن بن مہدیؒ کے فرمانے پر آپؒ نے اصولِ فقہ پر "الرسالہ" تحریر کیا۔ آپؒ کو اصول فقہ کا مؤسس کہا جاتا ہے۔ فقہ میں آپؒ صرف صحیح احادیث کو لیتے اور ضعیف کو ترک کر دیتے۔ آپؒ کی تصنیف کتاب الأم اور الرسالہ آج بھی دستیاب ہیں۔

---

[1] بستان المحدثین ص ۴۹ [2] تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۸۱ [3] ایضاً ص ۸۱، ۸۲ [4] بغدادی جلد ۲ ص ۱۷۳ [5] نصب الرایہ جلد ۱ ص ۴۰۹

وقال الزعفرانی کان اصحاب الحدیث رقوداً حتی ایقظھم الشافعی وقال ربیع بن سلیمان کان اصحاب الحدیث لا یعرفون تفسیر الحدیث حتی جاء الشافعی[1]

(ترجمہ) زعفرانیؒ کہتے ہیں کہ اصحاب حدیث محو خواب تھے۔ امام شافعیؒ نے آکر انہیں بیدار کیا (یعنی معانی اور فقہ کی طرف متوجہ کیا) ربیع بن سلیمانؒ کہتے ہیں۔ کہ اصحاب حدیث تفسیر اور شرح سے واقف نہ تھے امام شافعیؒ نے آکر حدیث کے معانی سمجھائے۔

علامہ ذہبیؒ آپؒ کی تعریف یوں کرتے ہیں:۔

الامام العلم، حبر الامت وناصر السنۃ[2]

اونچے درجہ کے امام۔ امت کے عالم اور سنت کے مددگار تھے۔

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں اگر امام شافعیؒ نہ ہوتے تو میں حدیث کے ناسخ و منسوخ کو ہرگز نہ پہنچتا ان کی مجلس میں بیٹھنے سے مجھ کو یہ سب کچھ حاصل ہوا۔[3] علماء کا آپؒ کی ثقاہت وعبادت اور نزاہت وامانت اور زہد وورع پر اتفاق ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ امام شافعیؒ جب بغداد تشریف لائے تو امام احمد بن حنبلؒ نے اس حلقۂ درس کو چھوڑ دیا جس میں یحییٰ بن معینؒ اور ان کے معاصرین شریک ہوتے تھے اور امام شافعیؒ کی صحبت اختیار کی حتیٰ کہ اگر امام شافعیؒ کہیں جاتے تو امام احمدؒ ان کی سواری کے ساتھ ساتھ چلتے یحییٰ بن معینؒ کو یہ ناگوار گزرا اور کہلا بھیجا کہ یہ طریقہ ترک کر دیں۔ امام احمد بن حنبلؒ نے کہلا بھیجا کہ اگر فقہ (مفہوم حدیث) سمجھنا چاہتے ہو تو امام شافعیؒ کی سواری کی دم پکڑ کر چلو۔ آپؒ کے خادم بنو۔[4] آپؒ فقہ وحدیث کے امام اور جلیل القدر عالم ہونے کے ساتھ ساتھ سخی بھی تھے۔ بقول حمیدیؒ آپؒ ایک مرتبہ صنعاء سے تشریف لائے۔ خیمہ مکہ سے باہر لگا ہوا تھا۔ اور آپؒ کے پاس دس ہزار دینار تھے۔ لوگ آپؒ کی ملاقات کے لیے آتے تھے تو آپؒ ان میں تقسیم فرماتے۔ یہاں تک دس ہزار دینار اسی جگہ تقسیم کر دیئے۔[5]

شروع شروع میں تحقیق اسناد پر آپؒ کی توجہ زیادہ تھی۔ ان کے ہاں حدیث کی قبولیت کا

---

[1] توالی التاسیس للحافظ ابن حجر ص ۵۹ [2] تذکرہ جلد ۱ ص ۳۲۹ [3] مشاہیر امت از قاری محمد طیب صاحب ص ۲۸
[4] توالی التاسیس (ابن حجر) ص ۵۷ [5] ترجمان السنۃ جلد ۱ ص ۲۴۶

معیار اس کی صحت سند تھا۔ استفاضۂ عمل کو کچھ نہ سمجھتے تھے۔ لیکن آخری دور میں آپ بھی اس طرف چلے۔ جو امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کا نظریہ تھا کہ تواتر عمل کے ہوتے ہوئے اسناد کی ضرورت نہیں رہتی۔ بیس رکعت تراویح کے ثبوت میں ان کے پاس کوئی صحیح حدیث نہ تھی۔ آپؒ نے یہاں اہل مکہ کے عملی استفاضہ سے استدلال کیا۔ امام ترمذیؒ لکھتے ہیں:۔

وقال الشافعی وھکذا ادرکت ببلدنا بمکۃ یصلون ـــــ عشرین رکعۃ۔[1]

ترجمہ:۔ اور امام شافعیؒ نے کہا اور اسی طرح پایا ہم نے شہر مکہ میں لوگوں کو بیس رکعت تراویح پڑھتے ہیں۔

اس فکری تبدیلی کے باعث بہت سے مسائل میں آپؒ کے دو دو قول ملتے ہیں قول قدیم اور قول جدید ـــــ اور فقہاء شافعیہ میں اس کی بحث رہی ہے۔

امام شافعیؒ کے تفردات

کبھی آپؒ اپنی تحقیق میں سب ائمہ کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔ ان مسائل کو آپؒ کے تفردات کہا جاتا ہے۔ فاتحہ خلف الامام کو فرض سمجھنے میں آپؒ دوسرے سب اماموں سے علیحدہ ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کے قائل تھے۔ مگر اسے فرض نہ سمجھتے تھے۔ ائمہ اربعہ میں سے تین امام امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کو فرض نہیں کہتے۔ امام شافعیؒ اس مسئلہ میں سب سے علیحدہ ہیں اس طرح آپؒ کے کچھ اور تفردات بھی ہیں۔

مسئلہ طلاق میں آپؒ جمہور امت کے ساتھ ہیں منفرد نہیں۔ آپؒ ایک مجلس میں تین دفعہ دی گئی طلاق کو تین طلاق قرار دیتے تھے۔ آپؒ کے مقلدین کو بھی اس مسئلہ میں کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ ایک مجلس میں تین دفعہ دی گئی طلاق گو سنت کے خلاف ہے طلاق بدعت ہے۔ لیکن اس کے واقع ہو جانے میں ائمہ اربعہ کا اختلاف نہیں۔

حضرت امام نووی شافعیؒ لکھتے ہیں:۔

وقد اختلف العلماء فیمن قال لامرأتہ انت طالق ثلثا فقال الشافعی ومالک و ابوحنیفۃ واحمد وجماھیر العلماء من السلف والخلف یقع الثلاث۔[2]

---

[1] جامع ترمذی جلد ۱ صد ۱۳۹ [2] نووی شرح مسلم جلد ۱ صد ۲۹۰۔

سو یہ کہنا کسی طرح درست نہیں کہ مسئلہ طلاق میں آپؒ دوسرے ائمہ سے منفرد تھے اور ان کا طریقہ موجودہ دور کے غیر مقلد حضرات کا سا تھا۔

آپؒ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا بہت احترام کرتے۔ دل و دماغ سے اُن کی جلالت، علمی کا اعتراف کرتے۔ ایک دفعہ حضرت امامؒ کی مسجد میں نماز پڑھی تو رکوع کے وقت رفع یدین نہ کیا۔ لوگوں نے سبب پُوچھا تو فرمایا کہ حضرت امامؒ کا علمی رعب میرے دل پر چھا گیا تھا۔ احترام اکابر کی اس سے بڑی روشن مثال اور کیا ہوگی۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ (۲۴۱ھ)

اپنے زمانہ کے متفق علیہ امام اور جلیل القدر محدث تھے علی بن المدینیؒ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے دین کو دو اشخاص کے ذریعے عزت نصیب فرمائی پہلے شخص فتنہ ارتداد کے وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے اور دوسرے فتنۂ خلق قرآن کے وقت حضرت امام احمد بن حنبلؒ تھے۔ امام احمدؒ امام المحدثین تھے۔ بخاریؒ مسلمؒ اور ابوداؤد سب حضراتؒ آپؒ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ آپؒ صاحبِ مذہب ہیں۔ آپؒ کی فقہ فقہ حنبلی کے نام سے موسوم ہے۔ آپؒ کو ایک لاکھ کے قریب احادیث یاد تھیں۔ آپؒ کی مسند احمد میں بہت سی وہ احادیث جمع ہیں جو دوسرے محدثین کے ہاں نہیں ملتیں۔ ثابت قدمی، حق گوئی اور اتباع سنت میں اپنی مثال آپ تھے۔ یہ آپؒ کا استقلال ہی تھا کہ فتنہ خلقِ قرآن میں روزانہ کوڑے کھاتے مگر خلقِ قرآن کا اقرار ہرگز نہ کرتے۔ جب انتقال ہوا تو آٹھ لاکھ مرد اور ساٹھ ہزار عورتیں جنازہ میں شریک ہوئیں۔ حنبل بن اسحٰق جو امام احمدؒ کے بھتیجے ہیں انہوں نے امام احمدؒ سے نقل کیا ہے کہ آپؒ نے مسند احمد سات لاکھ سے زیادہ ذخیرۂ احادیث سے منتخب کی ہے۔

علامہ خطیب بغدادیؒ (۴۶۳ھ) اپنی سند کے ساتھ احمد بن محمد بن خالد البراثیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ ہماری موجودگی میں ایک شخص امام احمد بن حنبلؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے حلال

---

[۱] نووی شرح مسلم جلد ا صـ

وحرام کے ایک مسئلے کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے کہا خدا تجھ پر رحم کرے کسی اور سے پوچھ لے۔ سائل نے کہا حضرتؒ ہم تو آپؒ ہی سے اس کا جواب سننا چاہتے ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا :۔

سل عافاک اللہ غیرنا سل الفقھاء سل ابا ثور[۱]

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ تجھے عافیت سے رکھے کسی اور سے پوچھ لے۔ فقہاء سے پوچھ ابوثور سے پوچھ

اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپؒ پر حدیث کا غلبہ تھا۔ فقہ میں آپؒ دوسرے ائمہ کی طرف رجوع کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔ آپؒ سرخیلِ محدثین اور مقتدائے ملت ہیں اور اہلسنت کے امام ہیں۔ مگر مسائل کے بارہ میں کس قدر احتیاط سے چلتے ہیں کہ دوسرے فقہاء کا راستہ دکھاتے ہیں۔ اور خود فتوے دینے سے حتی الوسع احتراز کرتے ہیں۔ آپؒ فقہاء کی طرف رجوع کرنے کا اس لیے حکم دیتے کہ فقہاء قرآن و حدیث کے مطابق ہی مسائل کا استنباط کرتے ہیں۔ علامہ ذہبیؒ امام احمدؒ کی تعریف ان الفاظ سے کرتے ہیں۔ شیخ الاسلام، سید المسلمین، الحافظ، اور الحجۃ[۲] امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے بغداد میں امام احمدؒ سے بڑا کوئی نہیں دیکھا۔[۳] محدث ابراہیم حربیؒ کہا کرتے تھے کہ امام احمد بن حنبلؒ میں اللہ تعالیٰ نے اوّلین و آخرین کے علوم جمع کر دیئے تھے۔[۴]

حضرت امام احمدؒ کا نظریۂ حدیث

حضرت امام احمد بن حنبلؒ آثارِ صحابہؓ کو اپنے لیئے حجت اور سند سمجھتے تھے۔ آپؒ کا عقیدہ تھا کہ صحابہؓ آسمانِ ہدایت کے روشن ستارے ہیں۔ امت پر اُن کی پیروی لازم ہے۔ صحابی کی بات کو حجۃ تسلیم کرنے میں آپؒ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ ہیں۔ حافظ ابن عبدالبر مالکیؒ (۴۶۳ھ) لکھتے ہیں :۔

(قال ابو عمر) جعل للصحابۃ فی ذلک مالم یجعل لغیرھم واظنہ مال الی ظاھر حدیث اصحابی کالنجوم واللہ اعلم والی نحو ھذا کان احمد بن حنبل یذھب۔[۵]

ترجمہ۔ امام ابوحنیفہ نے صحابہ کے لیئے وہ درجہ مانا ہے جو دوسرے راویوں کے لیے نہیں آپ حدیث اصحابی کالنجوم کے ظاہر کی طرف مائل ہیں امام احمد کی بھی یہی رائے تھی۔

---

[۱] بغدادی جلد ۱ ص ۶۹ [۲] تذکرہ جلد ۲ ص ۱۷ [۳] بغدادی جلد ۴ ص ۴۱۹ [۴] تذکرہ جلد ۲ ص ۱۷ البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۳۳۵ [۴] تذکرہ جلد ۲ ص ۱۷

[۵] جامع بیان العلم جلد ۲ ص ۱۴۵

اسی اصول پر آپؒ کا موقف یہ تھا کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھنے سے نماز ہو جاتی ہے۔ کیونکہ حضورؐ کے صحابی حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ پوری صراحت سے فرما چکے ہیں کہ سورۂ فاتحہ پڑھے بغیر نماز نہیں ہوتی مگر امام کے پیچھے[1] آپ ہی سوچیں کہ صحابی کا اس قدر صریح فیصلہ کیا نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟

حضرت امام ابو حنیفہؒ کی طرح حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا موقف بھی یہی ہے کہ حدیث ضعیف کو اپنے قیاس اور اجتہاد پر مقدم کرنا چاہیئے ضعیف حدیث کو کلیۃً نظر انداز کر دینا قطعاً صحیح نہیں جب کسی موضوع پر صحیح حدیث نہ ملے تو وہاں ضعیف حدیث کو ہی لے لینا چاہیئے۔ حضرت امام اعظمؒ اور حضرت امام احمدؒ کا مسلک اس باب میں ایک ہے۔ حافظ ابن قیمؒ (۷۵۱ھ) لکھتے ہیں:۔

تقديم الحديث الضعيف وآثار الصحابة على القياس والرای قوله وقول احمد[2]

ترجمہ۔ ضعیف حدیث اور آثار صحابہ کو قیاس اور رائے پر مقدم کرنا امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے اور یہی قول امام احمد کا ہے۔

نوٹ

صحابہؓ کی پیروی سے جو فقہ مرتب ہوئی اللہ تعالیٰ اسے بڑی قبولیت سے نوازتے رہے ہیں۔ تاریخ اسلامی میں حکومتی سطح پر زیادہ تر دو ہی فقہ نافذ العمل رہی ہیں۔ فقہ حنفی اور فقہ حنبلی۔ دورِ اوّل میں قاضی القضاۃ حضرت امام ابو یوسفؒ تھے۔ اس دور میں سعودی عرب کو اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق بخشی ہے کہ انہوں نے اللہ کی حدود قائم کیں اور فقہ حنبلی کے مطابق فیصلے کیئے۔

جن حضرات کا ہم نے یہاں تذکرہ کیا ہے وہ سب ائمہ حدیث تھے۔ ائمہ حدیث میں صرف وہی حضرات شامل نہیں ہوتے جو کہ صرف روایات کو اسانید اور مختلف طُرق سے بیان کر سکیں۔ بلکہ وہ بھی ائمہ حدیث ہوتے ہیں جو حدیث کی کسی بھی نوع کی خدمت کریں۔ خواہ اسناد بیان کریں، خواہ مسائل کا استنباط کریں اور علماء کا اس پر اجماع ہے۔

صاحبِ کنز العمال لکھتے ہیں:۔

حضرت صدیق اکبرؓ کو کوئی مسئلہ پیش آتا تو اہل الرائے اور اہل الفقہ کو مشورہ کے لیئے بُلاتے مہاجرینؓ و انصارؓ میں سے اہل علم کو بُلاتے۔ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ،

---

[1] جامع بیان العلم جلد ۲ صہ — موطا امام مالک صہ جامع ترمذی جلد ۱ صہ ۴۲ [2] اعلام الموقعین جلد صہ

حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت
ابی بن کعبؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ کو بلاتے۔ یہی لوگ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ
خلافت میں فتوے دیا کرتے تھے۔ پھر حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے وہ بھی انہی حضرات
سے مشورہ لیا کرتے تھے اور فتوے کا مدار انہی حضرات پر تھا۔[1]

اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ علماء حدیث سب صحابہ کرامؓ تھے۔ مگر اہل الرائے اور اہل الفقہ صرف فقہاء صحابہؓ ہی تھے۔ فقہ حدیث سے جدا کوئی چیز نہ تھی۔ یہ حدیث کی ہی تفسیر ہوتی تھی۔ اسے محض رائے سمجھ لینا بہت بڑی غلطی ہے۔ سوید بن نصرؒ جو کہ امام ترمذیؒ اور امام نسائیؒ کے شیوخ میں سے ہیں فرماتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن مبارکؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے:۔

لا تقولوا رأی ابو حنیفۃ ولکن قولوا تفسیر الحدیث۔[2]

(ترجمہ) یہ نہ کہا کرو ابو حنیفہ کی رائے بلکہ کہو یہ حدیث کی شرح اور تفسیر ہے۔

فقہ حدیث سے الگ کوئی چیز نہیں فقہ کے خلاف ذہن بنانا خود حدیث سے بدگمان کرنا ہے نظر رای یہ فقہی استنباط کا ہی دوسرا نام ہے۔ اجتہاد رائے سے ہی تو ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے قاضی شریح کو لکھا تھا۔ فاختر ای الامرین شئت ان شئت ان تجتھد برأیک۔[3]

ترجمہ۔ ان دو کاموں میں سے جس کو چاہے اختیار کر لے چاہے تو اپنی رائے سے اجتہاد کر لینا۔

حضرت زید بن ثابتؓ نے اس کے ساتھ دوسرے مجتہدین سے معلوم کر لینے کی بھی تعلیم دی ہے۔

فادع اھل الرای ثم اجتھد واختر لنفسک ولا حرج۔[4] دوسرے اہل الرائے سے بھی پوچھ لینا پھر اجتہاد کرنا اور اپنا موقف اختیار کرنا اور اس میں کوئی حرج نہیں۔

صحابہ میں حضرت ابوبکرؓ[5] حضرت عمرؓ[6] حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ[7] حضرت عبداللہ بن مسعود حضرت ابوالدرداء، حضرت زید بن ثابت حضرت عبداللہ عباسؓ[8] اور مغیرہ بن شعبہؓ[9] سب اہل الرائے تھے۔

---

[1] کنز العمال جلد ۳ صفحہ ۱۳۴ [2] کتاب المناقب للموفق جلد ۲ صفحہ ۵۱ [3] سنن دارمی جلد ۱ صفحہ ۲۰ سنن کبریٰ بیہقی جلد ۱۰ صفحہ ۱۱۵ [4] ایضاً [5] مستدرک حاکم جلد ۴ صفحہ ۳۴۲ [6] میزان کبریٰ للشعرانی جلد ۱ صفحہ ۴۹ [7] شرح فقہ اکبر صفحہ ۹۴ [8] سنن دارمی جلد ۱ صفحہ ۵۹ مستدرک جلد ۱ صفحہ ۱۲۷ سنن بیہقی جلد ۱۰ صفحہ ۱۱۵ [9] مستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۴۴۷

ائمہ جرح وتعدیل

ائمہ حدیث کی وہ جماعت جس نے رواۃِ حدیث کی جانچ پڑتال پر زیادہ توجہ کی اور ان کا موضوع زیادہ تر راویوں کے حالات معلوم کرنا اور ان کے صدق وکذب اور حفظ وضبط کی دریافت رہا۔ وہ علمِ حدیث کے بڑے محسنین میں سے ہیں۔ ان میں سے ہم یہاں حضرت امام شعبہؒ (۱۶۰ھ) حضرت سفیان الثوریؒ (۱۶۱ھ) امام مالکؒ (۱۷۹ھ) حضرت امام عبداللہ بن مبارکؒ (۱۸۱ھ) حضرت امام وکیع بن الجراحؒ (۱۹۷ھ) حضرت عبدالرحمٰن بن مہدیؒ (۱۹۸ھ) حضرت یحییٰ بن سعید القطانؒ (۱۹۸ھ) امام سفیان بن عیینہؒ (۱۹۸ھ) امام یحییٰ بن معینؒ (۲۳۳ھ) امام علی بن المدینیؒ (۲۳۴ھ) اور امام احمد بن حنبلؒ (۲۴۱ھ) کا ذکر کریں گے۔

ان میں سے حضرت امام سفیان الثوریؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا ذکر ائمہ اصول (ائمہ مجتہدین) کے ذیل میں آچکا ہے۔ باقی آٹھ بزرگوں کا ترجمہ یہاں ملاحظہ کیجئے۔ یہ صحیح ہے کہ امام دارمیؒ (۲۵۵ھ) امام بخاریؒ (۲۵۶ھ) امام نسائیؒ (۳۰۳ھ) بھی جرح وتعدیل میں بہت اہم شخصیتیں ہیں لیکن ان کے تذکرے چونکہ ائمہ تالیف کے ذیل میں آرہے ہیں۔ اس لئے ہم یہاں ان کا ذکر نہ کریں گے۔ ان کے علاوہ بھی بہت شخصیات ہیں جنہوں نے جرح وتعدیل میں نمایاں کام کیا اور ان کی آراء کتب اسماء الرجال میں مذکور ہیں لیکن اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم انہی بزرگوں کے تراجم پر اکتفا کرتے ہیں۔

(۱) امیر المومنین فی الحدیث شعبہ بن الحجاج (۱۶۰ھ) نزیل البصرہ ومحدثہا

ان کی وجہ سے عراق میں علم حدیث بہت پھیلا۔ شیخ صالح بن محمد جزرہؒ کہتے ہیں کہ اسماء الرجال میں سب سے پہلے شعبہؒ نے کلام کیا۔ پھر یحییٰ بن سعید القطانؒ نے پھر امام احمدؒ اور یحییٰ بن معینؒ نے ــــــ سو یہ چار حضرات اس فن کے عمائدین میں سے ہیں۔ آپ نے ثابت بنانیؒ، حماد بن

ابی سلیمانؒ، اعمشؒ، معاویہ بن قرہؒ، عمرو بن مرہؒ، حکمؒ، سلمہ بن کہیلؒ، انس بن سیرینؒ، یحیٰی بن ابی کثیرؒ اور حضرت قتادہؒ سے حدیث سنی، آپ نے چار سو کے قریب تابعینؒ سے روایت لی ہے۔ آپؒ سے حضرت سفیان الثوریؒ، ایوب السختیانیؒ اور حضرت عبداللہ ابن مبارکؒ جیسے اکابر نے حدیث پڑھی۔ امام سفیان الثوریؒ آپ کو امیر المومنین فی الحدیث کہتے تھے۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں۔ آپ فنِ رجال اور حدیث کی معرفت میں فردِ کامل تھے۔ ابن المدینیؒ کہتے ہیں۔ شعبہ احفظ للمشائخ وسفیان احفظ للابواب ——— سلیمان بن ابی الشیخؒ کہتے ہیں :۔

منشأ شعبۃ واسط وعلمہ کوفی۔[1] شعبہ نے پرورش واسط میں پائی اور علم کوفہ میں پایا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کوفہ کس طرح علم حدیث کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔

⑵ حضرت امام عبداللہ بن المبارکؒ (۱۸۱ھ)

علامہ ذہبیؒ کہتے ہیں۔ الامام الحافظ العلامہ شیخ الاسلام فخر المجاھدین قدوۃ الزاھدین۔[2] ایک ہزار اساتذہ سے روایت لی۔ ابو اسامہؒ کہتے ہیں۔ امیر المومنین فی الحدیث۔ آپ کے تلامذہ کی متفقہ رائے آپ کے بارے میں یہ تھی :۔

جمع بین العلم[3] والفقہ والادب والنحو والفقہ والزھد والشجاعۃ والشعر والفصاحۃ وقیام اللیل والعبادۃ والحج والغزو۔[4]

ابن سعدؒ آپ کو مقتدا، الحجہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔[5] امام نسائی فرماتے ہیں :۔

"ابن المبارکؒ کے زمانہ میں اُن سے زیادہ جلیل القدر، بلند مرتبہ اور تمام بہترین خصائل کا جامع ہمارے علم میں نہیں گزرا۔"

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد تھے۔ اس جلالتِ شان کے باوجود برملا فرماتے :۔

ہم امام ابوحنیفہؒ کے سامنے بیٹھتے تو اس طرح محسوس کرتے جیسے چڑیاں باز کے سامنے بیٹھی ہوں۔ حضرت امام نوویؒ لکھتے ہیں۔ کہ ان کی امامت اور جلالت پر سب کا اتفاق ہے۔ وہ تمام

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۱۸۴ [2] ایضاً صفحہ ۲۵۳ [3] علم سے مراد ان دنوں علمِ حدیث لیا جاتا تھا [4] تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۲۵۴
[5] تہذیب الاسماء جلد ۱ صفحہ ۲۸۵

چیزوں کے امام تھے۔ ان کے ذکر سے رحمت نازل ہوتی ہے اور ان کی محبت سے بخشش کی امید کی جاتی ہے آپ مرو کے رہنے والے تھے بارہا بغداد آئے امام ابوحنیفہ سے کوفہ میں ہی پڑھا۔

③ امام وکیع بن الجراحؒ (۱۹۷ھ) الامام الحافظ محدّث العراق

کوفہ کے جلیل القدر امام ابوسفیان الرواسیؒ وکیع بن الجراحؒ نے ہشام بن عروہؒ، جعفر بن برقانؒ، اعمشؒ، سفیان الثوریؒ اور امام اوزاعیؒ سے حدیث سُنی۔ آپ سے علی بن المدینیؒ، یحییٰ بن معینؒ اور امام احمدؒ نے روایت لی۔ آپ سفیان الثوریؒ کے علمی جانشین سمجھے جاتے تھے۔ آپ فقہ میں بھی بہت بالغ النظر تھے۔ ابراہیم بن شماسؒ کہتے ہیں۔ کان وکیع افقہ الناس۔ ابن عمار کہتے ہیں:-

ماکان بالکوفۃ فی زمان وکیع افقہ ولا اعلم بالحدیث منہ[۱]

(ترجمہ) امام وکیع کے زمانے میں کوفہ میں ان سے بڑا فقیہ اور بڑا محدث کوئی نہ تھا۔

آپ امام ابوحنیفہؒ کے قول پر فتوے دیتے تھے[۲] اتنے بڑے امام کا حضرت امام کا مقلد ہونا پتہ دیتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب کس قدر حدیث کے قریب تھا۔ الجواہر المضیہ میں صمیری سے نقل ہے کہ آپ امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد بھی تھے۔ حضرت امام احمدؒ فرماتے ہیں:-

مارأت عینی مثل وکیع قط یحفظ الحدیث ویذاکر الفقہ[۳]

(ترجمہ) میری آنکھوں نے وکیع کی طرح کسی کو نہیں دیکھا۔ آپ حدیثیں یاد کیا کرتے اور فقہ کی بات چیت جاری رکھتے تھے۔

امام احمدؒ کو اُن کی شاگردی پر بڑا ناز تھا۔ جب ان سے حدیث روایت کرتے تو فرماتے کہ یہ حدیث مجھ سے اس شخص نے روایت کی کہ تمہاری آنکھوں نے اس کی مثل نہ دیکھا ہو گا۔ یحییٰ بن اکثمؒ کہتے ہیں کہ میں سفر و حضر میں آپ کے ساتھ رہا۔ ہمیشہ روزہ رکھتے اور ہر رات قرآن ختم کرتے

④ عبدالرحمٰن بن المہدیؒ (۱۹۸ھ)

علی بن المدینیؒ کہتے ہیں۔ عبدالرحمٰن بن المہدیؒ کا علم حدیث جادو اثر تھا۔ اسماعیل قاضیؒ کہتے

---

[۱] تذکرہ جلد ۱ ص ۲۸۳ [۲] ایضاً ص ۲۸۲ [۳] ایضاً ص ۳۰۳

ہیں آپ علم حدیث میں اعلم الناس تھے[۱] آپ نے معاویہ بن صالحؒ، شعبہؒ، سفیانؒ سے حدیث سُنی۔ امام احمدؒ اور علی بن المدینیؒ اور اسحٰق بن راہویہؒ آپ کے شاگرد تھے۔ امام احمدؒ کہتے ہیں۔ کہ عبدالرحمٰنؒ حضرت وکیعؒ سے اثبت تھے۔

علی بن المدینیؒ کہتے ہیں۔ اگر میں مقامِ ابراہیم اور حجرِ اسود کے مابین کھڑا ہوں تو حلف اُٹھا سکتا ہوں کہ میں نے کسی کو عبدالرحمٰن کی مثل نہیں دیکھا۔ فقہار سبعہ کے اقوال کو جاننے میں امام زہری اور امام مالک کے بعد عبدالرحمٰن ہی تو ہیں۔ آپ صرف محدث ہی نہیں بلند پایہ فقیہ بھی تھے۔ فتوے دینے کی پوری بصیرت رکھتے تھے۔ حافظ ذہبیؒ لکھتے ہیں :۔

کان عبدالرحمٰن فقیھاً بصیراً بالفتویٰ عظیم الشان[۱]۔

اس واضح ہے کہ ان دنوں علم حدیث اور علم فقہ ساتھ ساتھ چلتے تھے اور کسی حلقہ علم میں یہ نہ کہا جاتا تھا کہ حدیث کے ہوتے ہوئے فقہ کی کیا ضرورت ہے؟

⑤ حضرت یحییٰ بن سعید القطانؒ (۱۹۸ھ)

امام نسائیؒ کہتے ہیں۔ "اللہ کی طرف سے حدیثِ رسول کے امین تین حضرات ہی ہیں۔ ۱۔ امام مالک۔ ۲۔ شعبہ۔ ۳۔ یحییٰ بن سعید القطان۔ آپ نے ہشام بن عروہ، عطار بن السائب، سلیمان التیمی، یحییٰ بن سعید الانصاری اور اعمش سے حدیث پڑھی۔ آپ سے حضرت عبدالرحمٰن بن المہدی، اور امام احمد نے روایات لیں۔ صحاح ستہ والوں نے آپ سے احادیث روایت کی ہیں۔ علی بن المدینی کہتے ہیں۔ ما رأیت احداً اعلم بالرجال منہ[۲]۔

(ترجمہ) میں نے اسماء الرجال کا عالم ان سے بڑھ کر کسی کو نہیں پایا۔

رواۃ کی تحقیق میں اس قدر کمال تھا کہ بڑے بڑے ائمہ حدیث کہتے جس کو یحییٰ چھوڑ دیں گے اس کو ہم بھی چھوڑ دیں گے[۳] فقہی مسائل میں حنفی تھے اور امام ابوحنیفہ کے قول پر فتویٰ دیتے تھے۔ حافظ ذہبیؒ لکھتے ہیں :۔ کان یحیی القطان یفتی بقول ابی حنیفۃ[۴]۔

یحییٰ بن سعید القطانؒ امام ابوحنیفہؒ کے قول پر فتوے دیتے تھے۔

---

[۱] ایضاً [۲] ایضاً صہ ۲۷۵ [۳] فتح المغیث صہ [۴] تذکرہ جلد ۱ صہ ۲۸۲

حافظ ذہبیؒ نے آپ کو الامام العلم، سید الحفاظ کے القاب سے ذکر کیا کرتے[1]۔ فقہ میں اتنے ماہر اور بالغ النظر تھے کہ جب کسی مسئلہ پر کلام کرتے تمام فقہاء احترام سے خاموش ہو جاتے۔ ابن عماد کہتے ہیں۔ اذا تکلم انصت له الفقهاء[2]۔ حدیث میں یہ مقام تھا کہ امام احمدؒ کہا کرتے تھے:۔

یحیی القطان اثبت الناس وما کتبت عن احد مثله[3]۔

(ترجمہ) یحیی بن سعید القطان حدیث میں سب سے زیادہ پختہ ہیں میں نے جس سے بھی حدیث لکھی اُن جیسا کوئی نہ پایا۔

حدیث میں اتنے بڑے جلیل القدر امام کا حنفی المذہب ہونا اس بات کی قوی شہادت ہے کہ حنفی فقہ حدیث کے بہت قریب ہے۔ ورنہ اتنے بڑے بڑے ائمہ فن امام کے قول پر فیصلے نہ دیتے۔

⑥ حضرت سفیان بن عیینہؒ (۱۹۸ھ)

ابن المدینیؒ کہتے ہیں امام زہریؒ (۱۲۴ھ) سے جس قدر لوگوں نے حدیث پڑھی۔ اُن میں سفیان بن عیینہؒ سے زیادہ متقن اور پختہ فہم کوئی نہ تھا۔ آپ نے عمرو بن دینارؒ، زہریؒ، اسود بن قیسؒ، یزید بن اسلمؒ، عبداللہ بن دینارؒ، اعمشؒ اور شعبہ سے حدیث سُنی اور آپ سے عبدالرحمن بن المہدیؒ، حضرت امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام یحیی بن معینؒ اور اسحق بن راہویہؒ نے روایات لیں۔ آپ کبھی اپنے شیخ کا نام چھوڑ کر اُوپر کے راوی سے بھی روایت کر دیتے۔ لیکن محدثین کہتے ہیں کہ آپ انہی شیوخ کا نام چھوڑتے جو ثقہ ہوتے تھے۔ عبدالرحمن بن مہدیؒ کہتے ہیں کہ آپ اہل حجاز کی روایات کے سب سے بڑے عالم تھے۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں اگر امام مالکؒ اور سفیان بن عیینہؒ نہ ہوتے تو حجاز میں علم نہ رہتا[4]۔ حافظ ذہبیؒ انہیں العلامۃ الحافظ شیخ الاسلام کہہ کر ذکر کرتے ہیں۔

آپ کو علم حدیث پر سب سے پہلے حضرت امام ابو حنیفہؒ نے متوجہ کیا تھا[5]۔

⑦ حضرت امام یحیی بن معینؒ (۲۳۳ھ)

آپ نے حضرت عبداللہ بن المبارکؒ، معتمر بن سلیمانؒ، یحیی بن ابی زائدہؒ وغیرہم من الائمۃ

---

[1] تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۲۷۴ [2] ایضاً صفحہ ۲۷۵ [3] ایضاً [4] ایضاً صفحہ ۲۴۳ [5] الجواہر المضیۃ جلد ۱ صفحہ ۲۵۱ نقلاً عن ابن خلکان

الکبار سے حدیث پڑھی اور آپ سے امام احمدؒ، امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ابوداؤدؒ، امام ابوزرعہؒ اور ابویعلیؒ نے روایات لیں۔ امام احمدؒ آپ کے ہمعصر تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ یحییٰ بن معینؒ ہم میں سب سے زیادہ اسماء الرجال کے ماہر تھے۔ یحیی بن معین اعلمنا بالرجال[1]۔ امام علی المدینی کہتے ہیں:۔[2]

لا نعلم احداً من لدن آدم علیہ السلام کتب من الحدیث ما کتب یحیی بن معین۔[3]

(ترجمہ) آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک ہم کسی کو نہیں جانتے جس نے اتنی حدیثیں لکھی ہوں جتنی یحیٰی بن معین نے لکھیں۔

امام احمدؒ کا قول ہے کہ جس حدیث کو یحیٰی نہ جانیں وہ حدیث ہی نہیں ہے۔ امام بخاریؒ نے فرمایا میں نے اپنے آپ کو کسی صاحب علم کے سامنے حقیر نہیں پایا سوائے یحیٰی بن معینؒ کے۔ آپ فقہی پہلو سے حنفی المذہب تھے اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کے قول پر فتوے دیتے تھے[4]۔

۸ امام علی بن المدینی (۲۳۴ھ)

زیادہ علم اپنے والد عبداللہ بن جعفر اور حماد بن سے پایا امام بخاری امام ابویعلی موصلی اور امام ابوداؤد آپ کے تلامذہ میں سے تھے عبدالرحمٰن بن مہدی آپکے استاد ہیں آپ کو اعلم الناس بحدیث رسول اللہؐ کہتے تھے امام نسائی نے فرمایا انہیں علم حدیث میں یہ انہماک تھا گویا اللہ تعالیٰ نے آپکو پیدا ہی اس لیے کیا ہے۔

حضرت امام بخاریؒ (۲۵۶ھ) ــــ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ

امام محمد بن اسماعیل بخاری حضرت امام ابوحنیفہؒ (۱۵۰ھ) کی طرح فارسی النسل ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دین ثریا ستاروں سے بھی لٹک جائے تو بعض ابنائے فارس اسے وہاں سے بھی پالیں گے حضرت امام ابوحنیفہ کی طرح آپ بھی اس بشارت کا مصداق ہیں

آپ کے پردادا مغیرہ پہلے عام ابنائے فارس کی طرح مجوسی تھے۔ پھر آپؒ نے امیر بخارا یمان جعفی کے ہاتھ پر ایمان قبول کیا۔ آپ کو محض اس نسبت سے جعفی کہا گیا ہے ورنہ آپ نسلاً جعفی نہ تھے۔ آپ کے والد اپنے زمانے کے مشہور محدث تھے۔ اور امام

---

[1] ایضاً جلد ۲ صفحہ ۱۷۱ [2] ایضاً [3] الرسالۃ المستطرفہ صفحہ ۱۰۵ [4] مسند احمد جلد ۲ صفحہ ۲۹۲
[5] صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۲۱۲

مالک (۱۷۹ھ) اور امام عبداللہ بن مبارک (۱۸۱ھ) کے شاگرد تھے۔ امام بخاری رح صغیر السن تھے کہ والد وفات پا گئے۔ باپ کے ترکہ سے آپ کو کافی وافی دولت ملی آپ نے اسے بیشتر اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔

بخارا سے سولہ سال کی عمر میں حج کے لیے نکلے۔ اٹھارہ سال کی عمر تک مکہ مکرمہ میں رہے۔ پھر چار سال کے قریب مدینہ منورہ میں رہے۔ ان چھ سالوں میں آپ نے حجاز کی ساری علمی دولت پالی۔ پھر آپ نے طلب حدیث میں شام، مصر، نیشاپور، جزیرہ اور عراق کے سفر کیے اور جہاں سے بھی آپ کو کوئی روایت مل سکی آپ نے اس کے حصول میں اپنی طرف سے کوتاہی نہیں کی۔ حافظ ابن کثیر دمشقی (۷۷۴ھ) لکھتے ہیں کہ آپ آٹھ دفعہ بغداد گئے[۱] خود فرماتے ہیں :-

لا احصی کم دخلت الی الکوفۃ والبغداد مع المحدثین[۲]

میں شمار نہیں کر سکتا کتنی دفعہ محدثین کے ساتھ کوفہ اور بغداد گیا ہوں۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ عراق ان دنوں علم و فضل کا گہوارہ تھا اور بڑے بڑے محدثین طلب حدیث میں ادھر آتے تھے۔ کوفہ صحابہ کے وقت سے ہی مرکز اسلام بن چکا تھا۔ صحابی رسولؐ حضرت حذیفہ بن یمانؓ (۳۵ھ) فرماتے ہیں۔ الکوفۃ قبۃ الاسلام[۳]

مشہور تابعی امام محمد بن سیرین (۱۱۰ھ) کہتے ہیں :-

میں جب کوفہ پہنچا تو وہاں چار ہزار طلبہ حدیث پڑھ رہے تھے[۴]

حضرت امام بخاری کا بار بار جانا کوفہ کی علمی عظمت پر ایک کھلی شہادت ہے۔

حضرت امام بخاری نے ایک ہزار سے زائد محدثین سے حدیث سنی[۵] اور نوے ہزار کے قریب تلامذہ نے آپ سے بالواسطہ صحیح بخاری سنی۔ آپ کے اساتذہ میں ابوبکر عبداللہ الحمیدی (۲۱۹ھ)، امام یحیٰی بن معین (۲۳۳ھ)، امام علی بن المدینی (۲۳۴ھ) قتیبہ بن سعید (۲۴۰ھ) امام احمد بن حنبل (۲۴۱ھ) اسحٰق بن راہویہ (۲۳۸ھ) سر فہرست ہیں۔ ثقات تابعین سے

۱؎ ارشاد الساری ص۳۱ ۲؎ مقدمہ فتح الباری جلد ۲ ص۴۷۹ ۳؎ مستدرک حاکم جلد ۳ ص۸۹ ۴؎ تدریب ص۲۷۵

روایت کرنے والوں میں سے آپ نے محمد عبداللہ انصاری (ھ) ابو عاصم النبیل (ھ) سے براہِ راست حدیث سُنی۔ معاصرین میں سے آپ نے محمد بن یحییٰ الذہلی اور ابو حاتم (ھ) سے روایات لیں۔ امام مسلمؒ آپ کے جلیل القدر معاصر تھے۔ انہوں نے بھی آپ سے حدیث سُنی حضرت امام مسلم نے آپ سے قسم کھا کر کہا:۔

اشھد انہ لیس فی الدنیا مثلک[1]

آپ جیسا محدث روئے زمین پر نہیں ہے۔ میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں۔

امام ابوعیسیٰ الترمذی (۲۷۹ھ) اور امام ابوعبدالرحمٰن النسائی (۳۰۳ھ) حضرت امام بخاری کے تلامذہ میں سے تھے۔ ابن خزیمہ کہتے ہیں آسمان کے نیچے کسی عالم کو امام بخاری سے بڑھ کر نہیں پایا[2] اپنے حافظہ کے اعتبار سے آپ ایۃ من ایات اللہ۔ خدا کی قدرت کا ایک نشان تھے۔

ائمہ اربعہ سے روایت

امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ سے کوئی روایت نہیں لی۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ حضرت امام بخاریؒ کو ان سے کوئی بُعد اور تعصب تھا۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ تو امام بخاری کے براہِ راست استاد تھے اور علم حدیث میں فائق الاقران تھے۔ صحیح بخاری میں آپ نے ان سے بھی صرف دو روایتیں لی ہیں۔ ایک تعلیقاً اور دوسری ایک واسطہ سے ـــــ امام مالکؒ سے مروی صرف پانچ روایتیں صحیح بخاری میں ملتی ہیں ـــــ یہ صورتِ حال اس لیے نہیں کہ ائمہ اربعہ کے پاس حدیثی سرمایہ کم تھا۔ بلکہ اس لیے کہ آپ ان رواۃ حدیث کے علمی سرمائے کو محفوظ کرنا چاہتے تھے جن کے فقہی حلقے نہ بنے تھے اور ان کا علم اسلامی دنیا میں متفرق طور پر پھیلا ہوا تھا۔ آپ چاہتے تھے کہ علم حدیث چند حلقوں میں محدود نہ سمجھا جائے۔ اس پہ عالمی سطح پر سَیر حاصل نظر رہے اور ظاہر ہے کہ ائمہ اربعہ کا علم تو ان سے بہت پہلے اکناف عالم

---

[1] مقدمہ فتح الباری جلد ۲ صفحہ ۴۸۵ [2] تہذیب الاسماء واللغات جلد ۱ صفحہ

میں پھیل چکا تھا۔

پھر ائمہ اربعہ کا اپنا اپنا طریق استخراج ہے اور حضرت امام بخاریؒ اپنے ابواب صحیح میں اپنے خاص طرز سے حدیث سے استنباط کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے آپ پہلے مجتہدین سے ذرا ہٹ کر چلے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ان ائمہ کبار سے ذہناً دور تھے یا ان کے خلاف دل میں کوئی بوجھ رکھتے تھے۔

حضرت امام بخاریؒ کا مسلک

علمائے اہلحدیث کے ہاں امام بخاری شافعی المسلک ہیں[۱] علامہ تاج الدین السبکی (۷۷۱ھ) نے بھی آپ کو طبقات شافعیہ[۲] میں ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) بھی آپ کو امام شافعی کے قریب لکھتے ہیں[۳] علامہ طاہر الجزائری کی رائے میں آپ مجتہد تھے اور استنباط و استخراج میں آپ کی ایک اپنی راہ تھی۔ صحیح بخاری کے ابواب آپ کے فقہی نقطہ نظر کے آئینہ دار ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ آپ بہت سے مسائل میں امام شافعیؒ کے تابع چلے۔ اس کی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ آپ نے شیخ عبداللہ الحمیدی سے فقہ کی تعلیم حاصل کی اور الحمیدی شافعی المذہب تھے۔ تاہم ان مسائل کی بھی کمی نہیں جن میں آپ نے فقہ شافعی سے اختلاف کیا اور فقہ حنفی کو اختیار کیا اس کا باعث آپ کے استاد اسحٰق بن راہویہ کو سمجھا جاتا ہے ہے۔ محدث کبیر مولانا بدر عالم مدنیؒ نے فیض الباری جلد چہارم کے آخر میں ان مسائل کی ایک فہرست دی ہے جن میں امام بخاری فقہ حنفی کے مطابق چلے ہیں۔

امام بخاریؒ کی مجتہدانہ بصیرت

یہ آپ کی مجتہدانہ بصیرت ہے کہ آپ نے صحیح بخاری کو صرف مرفوع احادیث

۱ـ ابجد العلوم صـ۸۱۰ مؤلفہ نواب صدیق حسن خاں صاحب ۲ـ طبقات شافعیہ صـ

۳ـ فتح الباری جلد ا صـ۱۲۳

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و اقوال) تک محدود نہیں رکھا۔ اس میں صحابہ اور تابعین کے اقوال بھی لائے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کے بغیر شریعت کی پوری ترجمانی نہ ہو سکتی تھی ـــــــ اور آپ کے دور تک یہ آواز کہیں سنائی نہ دی گئی تھی کہ ہمیں صرف حضورؐ کے اقوال و اعمال سے غرض ہے۔ صحابہ اور تابعین کے فیصلے اسلام میں کوئی وزن نہیں رکھتے۔ آپ نے اپنے مدینہ منورہ کے قیام کے دوران ایک کتاب قضایا الصحابۃ والتابعین بھی تالیف[۱] کی۔ اس سے آپ کے ذہن و فکر اور آپ کی مجتہدانہ بصیرت کا پتہ چلتا ہے کہ آپ کس طرح پوری امت کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے۔ آپ نے اپنی مرویات پر جا بجا قرآنی آیات سے ابواب باندھے ہیں اور قرآن و حدیث کو یک جا پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ آپ کے نزدیک حدیث قرآن کے مقابل نہیں قرآن کے ذیل میں اس کی ایک عملی تفصیل ہے۔

حضرت امام کی دیانت و امانت

آپ کے اجتہاد اور استنباط سے اختلاف ہو سکتا ہے ـــــــ اجلہ مجتہدین کے آپس میں کتنے اختلافات ہیں۔ لیکن آپ کی دیانت و امانت سے اب تک کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ آپ نے اپنے فقہی موقف کو ثابت کرنے کے لیے صحیح بخاری میں کوئی کمزور روایت درج نہیں کی۔ صحیح بخاری آپ نے ایک خاص معیار رواۃ کے ساتھ ترتیب دی ہے۔ امام صاحب کو کسی خاص موضوع پر اگر اپنی شرائط کے مطابق روایت نہیں ملی۔ تو آپ نے کسی کم درجہ کی روایت کو وہاں جگہ نہیں دی ہے بلکہ اس کی بجائے اجتہاد اور قیاس سے کام لے لیا ہے۔ حدیث کے باب میں آپ اپنے قائم کردہ معیار سے نیچے نہیں اُترے۔

مسئلہ آمین بالجہر میں آپ کے پاس صحیح بخاری کی شرطوں کے مطابق کوئی روایت نہ تھی ـــــــ آپ کے ہاں کسی صحیح حدیث سے حضورؐ کا بلند آواز سے آمین کہنا مروی

---

[۱] مقدمہ فتح الباری جلد ۲ صد ۴۷۹

نہ تھا۔ اسی طرح آپ کے پاس فاتحہ خلف الامام کی کوئی روایت جس میں امام کے پیچھے ہونے کی صراحت ساتھ کی گئی ہو۔ صحیح بخاری کی شرطوں کے مطابق آپ کے پاس موجود نہ تھی ـــــ آپ نے دونوں جگہ قیاس سے کام لیا اور نص کی بجائے استدلال سے اپنی بات کہی حدیث کو آپ جس طرح سمجھ پائے اس اپنی سوچ کو آپ نے ترجمۃ الباب میں لکھ دیا۔ مگر متن میں وہی روایت لکھی جو ان کی صحیح بخاری کی شرطوں کے مطابق تھی۔ گو اس میں اس موضوع کی صراحت نہ ہو۔

قیاسات حضرت امام بخاریؒ

مسئلہ آمین بالجہر میں دیکھئے۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اذا امن الامام فامنوا۔[1]

جب امام آمین کہے تو تم آمین کہو۔

مقتدیوں کو امام کے آمین کہنے کا پتہ کیسے چلے؟ امام کے بلند آواز آمین کہنے سے ـــــ اس حدیث میں امام کے بلند آواز سے آمین کہنے کی تصریح نہ تھی۔ آمین بالجہر کی دوسری حدیثیں صحیح بخاری کی شرائط صحت پر پوری نہ اترتی تھیں اور امام بخاری آمین بالجہر کے مسلک کے تھے۔ اب دیکھئے آپ باوجود شدت ضرورت کے صحیح بخاری میں کمزور حدیث نہیں لاتے اور آمین بالجہر نص سے نہیں قیاس سے ثابت کرتے ہیں آپ کا استدلال یہ ہے کہ اگر امام بآوازِ بلند آمین نہ کہے تو مقتدیوں کو کیسے پتہ چلے گا کہ اس نے آمین کہی ہے یا نہ؟ اور وہ پھر کیسے اس کے ساتھ آمین کہہ سکیں گے۔

استدلالِ ہذا اسی صورت میں درست بیٹھتا ہے کہ مقتدیوں کو امام کے آمین کہنے کی اس کے آمین بالجہر کہنے کے بغیر کسی اور طرح سے اطلاع نہ ہو سکے ـــــ لیکن مقتدیوں کو اس اطلاع کا اگر کوئی اور ذریعہ بھی ہو سکے تو یہ استدلال درست نہیں رہتا۔

---

[1] صحیح بخاری جلد ۱ صـ۱۰۸

اب آیئے اس قیاس کے مقابل ایک حدیث نبوی دیکھئے ـــــ حضورؐ نے فرمایا۔

اذا قال الامام غیر المغضوب علیھم ولا الضالین فقولوا آمین فان الملٰئکۃ تقول آمین وان الامام یقول آمین[1]

ترجمہ۔ جب امام غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو، فرشتے بھی اس وقت آمین کہتے ہیں اور امام بھی اس وقت آمین کہہ رہا ہوتا ہے۔

اس حدیث نے امام کے آمین کہنے کی خبر دے دی اور موقعہ بھی بتلا دیا کہ امام کب آمین کہتا ہے۔ اب جب امام غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کہے تو مقتدی اس کے بعد آمین کہیں ـــــ امام بھی بفحوائے حدیث اس وقت آمین کہہ رہا ہوتا ہے ـــــ اور مقتدیوں کی آمین امام کی آمین سے متعلق ہو جاتی ہے ـــــ سو ضروری نہیں کہ مقتدیوں کو امام کے بلند آواز سے آمین کہنے کا اس کی بلند آواز سے ہی پتہ چلے۔

مقتدیوں کو امام کے آمین کہنے کا اس خبر رسول سے پتہ چلا امام سے خود آمین سُن کر نہیں ـــــ سو وہ سوال جاتا رہا کہ مقتدیوں کو امام کے آمین کہنے کا کیسے پتہ چلے اور اس کی تائید اس دوسری حدیث سے بھی ہو گئی کہ حضورؐ نے مقتدیوں کی آمین کو غیر المغضوب علیھم سے متعلق کر دیا۔ سو اب اس میں امام کی آمین بالجہر کا کوئی اشارہ نہ رہا۔

مسئلہ فاتحہ خلف الامام

امام بخاریؒ امام کے پیچھے الحمد للہ پڑھنے میں بھی حضرت امام شافعیؒ کے مسلک پر تھے۔ امام کے پیچھے الحمد للہ پڑھنے کی صریح حدیثیں جو جامع ترمذی وغیرہ میں حضرت عبادہ بن صامتؓ سے مروی ہیں سنداً صحیح نہ تھیں چہ جائیکہ صحیح بخاری کی شرطوں پر پوری اترتیں۔ امام بخاریؒ کو اپنے ترجمۃ الباب کی مطابقت کے لیے ان کی اشد ضرورت ہے۔ مگر حضرت امام کی امانت اور دیانت دیکھئے۔ وہ ان ضعیف حدیثوں کو صحیح بخاری میں نہیں لائے آپ حضرت عبادہ بن صامت (۳۴ھ) کی صرف اتنی حدیث نقل کرتے ہیں

---

[1] سنن نسائی جلد ۱ صفحہ ۱۰۱

جو سنداً صحیح ہے اور ان کی شرطوں کے مطابق ہے اور اس میں امام کے پیچھے ہونے کی کوئی تصریح نہیں۔ صحیح بخاری میں اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب[۱]

اس کی نماز نہیں جس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی۔

امام بخاری نے اس کے عموم سے استدلال کیا ہے اور مقتدی پر سورۂ فاتحہ پڑھنی لازم کی ہے۔ اس حدیث میں امام کے پیچھے ہونے کی صراحت نہ تھی اور عام کی دلالت کسی فرد پر صریح نہیں ہوتی۔ امام بخاریؒ کہتے ہیں مقتدی اس عموم میں داخل ہے؟ امام بخاری کے اساتذہ امام احمد اور سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم امام اور منفرد کے لیے ہے مقتدی اس میں داخل نہیں۔ جامع ترمذی میں حضرت امام احمد (۲۴۱ھ) سے اس کے یہ معنی منقول ہیں:۔

معنی قول النبیؐ لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب اذا کان وحدہ۔[۲]

ترجمہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کہ جس نے سورۂ فاتحہ نہ پڑھی اسکی نماز نہیں ہوئی کا مطلب یہ ہے کہ نمازی جب اکیلا ہو تو فاتحہ پڑھے بغیر اس کی نماز نہیں ہوتی۔

اور سنن ابی داؤد میں حضرت سفیان بن عیینہ (۱۹۸ھ) سے بھی یہی معنی مروی ہے کہ یہ حدیث منفرد کے لیے ہے مقتدی کے لیے نہیں لمن یصلی وحدہ۔[۳] یہ اس کے لیے ہے جو اکیلا ہو۔ اب آپ ہی کہیں لاصلوٰۃ لمن یقرأ بفاتحہ الکتاب سے مقتدی پر فاتحہ لازم کرنا حضرت عبادہ کی یہ روایت کیا اس پر نص صریح ہے؟ یا امام بخاری اسے محض اس کے عموم سے مقتدی پر لازم کر رہے ہیں اور اپنا اجتہاد کر رہے ہیں؟ ——— ظاہر ہے کہ امام بخاریؒ نے یہاں اپنے مسلک کو نص سے نہیں محض استدلال سے پیش کیا ہے ——— کیا حضرت امام کے پاس مقتدی پر فاتحہ لازم کرنے کی کوئی صریح حدیث موجود نہ تھی؟ یقیناً ہو گی لیکن چونکہ وہ سنداً صحیح نہ تھی اس لیے امام بخاریؒ نے اسے یہاں جگہ نہیں دی آپ کی عظمت کی کھلی شہادت ہے کہ شدید ضرورت کے باوجود آپ اس میں کمزور روایات نہیں لائے۔

---

[۱] صحیح بخاری جلد ۱ ص [۲] جامع ترمذی جلد ۱ ص۴۲ [۳] سنن ابی داؤد جلد ۱ ص۱۱۹

امام بخاریؒ کی دوسری تالیفات

حضرت امام بخاری نے اپنی دوسری تالیفات میں صحت کا وہ معیار قائم نہیں رکھا جو ہمیں صحیح بخاری میں ملتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ اپنی صحیح بخاری کی شرائط کو کوئی شرعی درجہ نہ دیتے تھے محض احتیاط کی ایک انتہا تھی۔ ورنہ آپ اس سے فروتر درجے کی روایات کا کہیں اعتبار نہ کرتے نہ ان کا ذکر کرتے۔

صحیح بخاری کا سلسلہ اسناد آپ تک متواتر پہنچا ہے ہزاروں محدثین نے آپ سے بالمشافہ اس کتاب کو سنا اور آگے روایت کیا ہے۔ سو یہ ان کتب میں سے ہے جو اپنے مصنفین تک سند متواتر سے پہنچتی ہیں۔ ہاں کچھ اور کتابیں بھی ہیں جو امام بخاری کی طرف منسوب ہیں۔ لیکن ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ وہ واقعی ان کی ہوں گی —— ایک رسالہ جزء القرأۃ کے نام سے اور ایک جزء رفع الیدین پر آپ کے نام سے ملتا ہے حضرت امام بخاری سے صرف ایک شخص محمود انہیں ذکر کرتا ہے اور اس کا پتہ نہیں چلتا کہ وہ کون ہے؟ ثقہ ہے یا غیر ثقہ۔ تعجب ہے کہ جس امام فن سے صحیح بخاری روایت کرنے والے ہزاروں افراد ہوں اس سے ان دو رسالوں کو نقل کرنے والے دو ثقہ عالم بھی نہ ملیں۔

امام صاحبؒ کی ثقاہت

حضرت امام ثقہ ہیں اور حفظ وضبط اور دیانت و امانت کے کسی پہلو سے مجروح نہیں۔ مگر افسوس کہ آپ کے بعض معاصرین نے آپ پر بھی جرح کر دی۔ امام ابو حاتم رازی (ھ) کے نام سے کون واقف نہیں۔ آپ نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب —— نام سے لکھی ہے۔ نام خود اپنے کام کی خبر دے رہا ہے۔

ائمہ کبار کے حق میں اس قسم کی جرحوں کا کوئی اعتبار نہیں کیا حضرت امام ابوحنیفہ پر جرح نہیں ہوئی؟ کیا ابن ابی ذئب نے حضرت امام مالک پر جرح نہیں کی۔ امام

جرح و تعدیل امام یحییٰ بن معین نے کیا حضرت امام شافعی پر جرح نہیں کی؟ کیا آپ نے محدثین کا یہ اصول نہیں پڑھا کہ معاصر کی جرح چنداں لائق اعتبار نہیں ہوتی سو حضرت امام بخاریؒ کے بارے میں کسی محدث کی جرح ہرگز لائق پذیرائی نہیں ہے۔

روایات صحیح البخاری

صحیح بخاری میں ۷۲۹۷ کے قریب روایات مرفوعہ ہیں بعض روایات بہ تکرار آئی ہیں عدم تکرار سے مجموعی احادیث چار ہزار ہوں گی صحابہ کی روایات اور اقوال تابعین کی تعداد ساڑھے تین سو کے قریب ہے۔ متابعات اور تعلیقات ساڑھے تیرہ سو کے قریب ہیں۔ بائیس روایات ثلاثیات ہیں جن میں امام بخاری صرف تین واسطوں سے حضور تک پہنچتے ہیں۔

محدثین کے نزدیک سند عالی کا میسر آنا ایک بڑا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ ایک بڑی تاریخ التاریخ الکبیر للبخاری بھی ملتی ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ ان کے استاد امام علی بن المدینی (۲۳۴ھ) کی تالیف ہے جو حضرت امام بخاری نے ان سے سُنی اور پھر انہی کے نام سے مشہور ہو گئی۔

اگر کہیں کوئی کمزور بات اس میں آگئی ہے تو وہ محض ایک اتفاقی بات ہوئی ہوگی کسی خاص مسلک کی تائید اس میں ہرگز مقصود نہ ہوگی۔ حضرت امام بخاریؒ کی عظمت اس پہلو سے نہایت کھل کر سامنے آتی ہے۔

امام دارقطنی کے تعقبات

صحیح بخاری کی ایک سو دس[1] روایات پر امام دارقطنی نے مواخذہ کیا ہے۔ اکابر شارحین نے ان تعقبات کے جواب دیئے ہیں۔ چند مقامات کے سوا کہیں دارقطنی کی تائید نہیں کی۔ صحیح بخاری کے تقریباً اسی راویوں پر جرح کی گئی ہے۔ ان کے بیشتر جوابات

---

[1] جیسے غریب جداً صحیح بخاری جلد ۱ ص ۵۱۲

محدثین نے دے دیئے ہیں۔ افسوس دارقطنی نے یہ نہیں دیکھا کہ اپنا کیا حال ہے؟ ہر قسم کی سقیم روایات ان کی سنن میں موجود ہیں۔ یہ صاحب تو حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ پر بھی جرح کرنے سے نہیں چوکے۔ اگر وہ امام بخاری پر تعقب کریں تو چنداں تعجب نہیں۔

امام مسلم بن حجاج ابوالحسین القشیری (۲۶۱ھ)

خراسان کے مشہور علمی مرکز نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ بغداد کے بعد نیشاپور سب سے بڑا مرکزِ علم سمجھا جاتا تھا۔ نیشاپور میں یحیٰی بن یحیٰی امام اسحق بن راہویہ اور امام ذہلی سے، عراق میں امام احمد بن حنبل اور عبداللہ بن مسلمۃ القعنبی سے بغداد میں محمد بن مہران اور ابوغسان سے حجاز میں سعید بن منصور اور ابومصعب سے اور مصر میں عمرو بن سواد اور حرملہ بن یحیٰی سے اور دیگر کئی ائمہ فن سے حدیث سنی۔ قتیبہ بن سعید، احمد بن یونس یربوعی اور اسمٰعیل بن ابی اویس بھی آپ کے اساتذہ میں سے ہیں۔ حضرت امام بخاری سے بھی بہت استفادہ کیا۔ امام ابوعیسیٰ الترمذی، ابوبکر بن خزیمہ، ابوحاتم رازی اور ابوعوانہ آپ کے شاگردوں میں سے ہیں۔

آپ کے استاد اسحق بن راہویہ آپ سے بہت متأثر تھے۔ فرمایا ای رجل یکون ھذا۔ معلوم نہیں یہ شخص کس مقام تک پہنچے گا۔ آپ نے صحیح مسلم اس طریق سے ترتیب دی کہ محدثانہ نقطہ نظر سے کوئی دوسری کتاب اس کی برابری نہیں کر سکی۔ پوری حدیث ایک جگہ مل جاتی ہے اور آپ اس کی جملہ اسانید عجیب حسنِ ادا سے ایک جگہ لے آتے ہیں۔ محدثِ کبیر حضرت مولانا بدرعالم مدنی لکھتے ہیں:-

> یہ تصنیف (صحیح مسلم) فن حدیث کے بہت سے عجائبات پر مشتمل ہے سردِ اسانید، متون کا حسنِ سیاق، تلخیص طرق اور ضبط انتشار میں صحیح بخاری پر بھی فائق ہے[۲]

امام مسلم کی اہل شام سے روایت امام بخاری کی اہل شام سے روایت پر فائق

---

[۱] دیکھئے عینی شرح صحیح بخاری ج ۳ ص ۶۷   [۲] ترجمان السنہ جلد ۱ ص ۲۵۹

سمجھی جاتی ہے۔ کیونکہ حضرت امام بخاری ان سے اکثر بطریق مناولہ روایت کرتے ہیں۔ امام مسلم ان سے مشافہتہً روایت لیتے ہیں۔ امام مسلم اس میں وہی روایات لاتے ہیں جن پر اس وقت کے اکابر اہلِ علم اور شیوخِ حدیث متفق ہوں۔ آپ نے صحیح مسلم لکھ کر امام الجرح والتعدیل امام ابو زرعہ کے سامنے پیش کی، جن روایات پر انہوں نے کہیں بھی اُنگلی رکھی۔ آپ نے انہیں ترک فرما دیا۔

صحیح مسلم کی روایات حذف مکررات کے بعد چار ہزار کے قریب ہیں۔ آپ نے اس میں صرف مرفوع روایات نہیں لیں۔ صحابہ کے بہت سے آثار بھی ساتھ ساتھ روایت کیے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں علم حدیث صحابہ کی مرویات کے بغیر مکمل نہ سمجھا جاتا تھا۔ قراءتِ خلف الامام جیسے اہم موضوع پر آپ کاتبِ وحی حضرت زید بن ثابتؓ (۴۵ھ) کا اثر ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں۔

عن عطاء بن یسار انه اخبره انه سأل زید بن ثابت عن القرأة مع الامام فقال لا قرأة مع الامام فی شیء[1]

ترجمہ۔ عطاء بن یسار کہتے ہیں میں نے حضرت زید بن ثابت سے پوچھا امام کے ساتھ مقتدی قرآن پڑھے یا نہ؟ آپ نے فرمایا۔ امام کے ساتھ کسی حصہ قرات میں مقتدی کو قرآن پڑھنے کی اجازت نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ امام قرأت شروع کرے تو تم چپ رہو—
اذا قرأ فانصتوا دو صحابیوں سے مروی ہے۔ (۱) ابو موسیٰ اشعریؓ (۵۲ھ) اور (۲) حضرت ابو ہریرہؓ (۵۷ھ) سے آپ نے صحیح مسلم میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت جریر عن سلیمان عن قتادہ کی روایت سے لکھی۔ لیکن حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت نہ لکھی۔ آپ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا آپ نے فرمایا میرے نزدیک وہ بھی صحیح[2] ہے۔ آپ سے کہا گیا آپ نے اسے اپنی صحیح میں کیوں روایت نہیں کیا۔ اس پر آپ نے فرمایا۔ اس کتاب صحیح مسلم میں میں ہر وہ روایت نہیں لکھتا جو میرے نزدیک صحیح ہو۔ اس میں میں وہی روایات

---

[1] صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۲۱۵ [2] صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۱۷۴

لاتا ہوں جس پر اس کے سب مشائخ متفق ہوں۔

فحديث ابي هريرة فقال هو صحيح يعني واذا قرأ فانصتوا فقال هو عندي صحيح فقال لم لم تضعه ها هنا قال ليس كل شيء عندي صحيح وضعته ههنا انما وضعت ههنا ما اجمعوا عليه[1]

ترجمہ۔ سو حدیث ابی ہریرہؓ کے بارے میں کہیئے۔ آپ نے کہا میرے نزدیک وہ صحیح ہے یعنی جملہ واذا قرأ فانصتوا میرے نزدیک واقعی صحیح حدیث کا حصہ ہے انہوں نے پوچھا پھر آپ نے اسے اپنے متن میں جگہ کیوں نہیں دی۔ آپ نے فرمایا ہر وہ حدیث جو میرے نزدیک صحیح ہو میں نے اس میں نہیں دی اس میں صرف وہی حدیثیں میں نے روایت کی ہیں جن پر ان کے روایت کرنے والے سب متفق ہوں۔

اس سے صحیح مسلم کی عظمت کا اندازہ کیجئے۔ یہ امام مسلم کی ہی تحقیقات کا حاصل نہیں۔ یہ وہ روایات ہیں جن پر وقت کے دیگر اہل فن سب متفق ہوئے۔ صحیح بخاری کے ساتھ صحت میں جو کتاب دوسرے درجہ میں شامل ہوتی ہے وہ صحیح مسلم ہے۔ انہی دو کو صحیحین کہا جاتا ہے۔

امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ اکثر اساتذہ میں شریک ہیں۔ صحیح مسلم میں معلق یا منقطع روایات بہت کم ہیں۔ لیکن صحیح بخاری میں تعلیقات کافی تعداد میں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امام بخاریؒ مسائل کے استنباط کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ان کے تراجم ابواب ان کی فقہ ہیں اور ظاہر ہے کہ فقیہ کو اپنے موضوع میں ہر قسم کی روایات سے کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن امام مسلم بطور فقیہ کے نہیں محدث کے طور پر چلتے ہیں۔ ان کی حدیث کے مختلف طرق پر نگاہ ہوتی ہے اور کوشش ہوتی ہے کہ سب احادیث میں انہیں ایک جگہ ترتیب دے دیں اور متن جس طریق سے آ رہا ہو اس کی نشاندہی کر دیں۔

اس احتیاط سے پتہ چلتا ہے کہ امام مسلم روایت بالمعنی کی بجائے روایت باللفظ کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ جس طریق سے وہ الفاظ آئیں اس کی وضاحت کر دیتے ہیں۔

صحیح مسلم کے ابواب امام مسلم نے نہیں باندھے۔ معلوم نہیں اس میں ان کے

---

[1] صحیح مسلم جلد ۱ ص ۱۷۴

پیشِ نظر کیا حکمت تھی وقت نے مہلت نہیں دی یا وہ اس موضوع میں بھی کوئی نیا انداز سامنے لانا چاہتے تھے ـــــ موجودہ ابواب دوسروں کے باندھے ہوئے ہیں صحیح مسلم بے شک ایک ترتیب رکھتی ہے اور وہ ترتیب امام مسلم کی ہی اختیار کردہ ہے لیکن آپ نے ان موضوعات پر کوئی اپنی نشاندہی نہیں کی ہے۔

صحیح مسلم کا طرۂ امتیاز اس کا وہ فاضلانہ مقدمہ ہے جو صحاح ستہ کی کسی اور کتاب کے ساتھ نہیں ملے گا۔ اس میں آپ نے فنِ حدیث کے مختلف پہلوؤں کو اس انداز میں چھوا ہے کہ پورا فن نکھر کر قاری کے سامنے آجاتا ہے۔ اکابر اہل علم کی رائے ہے کہ امام مسلم اس باب میں نظیر نہیں رکھتے۔ آپ نے صحیح مسلم لکھتے جو روایات چھوڑیں ان میں سے جو آپ کی شرطوں پر پوری اترتی تھیں انہیں ابو عوانہ اسفرائنی نے المستخرج علی صحیح مسلم کے طور پر اپنی مسند میں جمع کر دیا ہے۔ ابو عوانہ کی یہ تالیف اصطلاحی پہلو سے مسند نہیں سنن کی ترتیب پر ہے۔

امام مسلم کے نزدیک دو راوی جو ایک دور کے ہوں اگر ایک دوسرے سے روایت کریں تو وہ حدیث متصل الاسناد سمجھی جائے گی۔ امام بخاری صحیح بخاری میں صرف ہمعصر ہونے پر قناعت نہیں کرتے۔ ان کے باہم ملنے پر مستقل دلیل چاہتے ہیں۔ یہ احتیاط کی انتہا ہے۔ تاہم امام مسلم اسے بطور اصول قبول نہیں کرتے۔ اسی طرح بعض راوی جیسے عکرمہ اور عمر بن مرزوق امام بخاری کے نزدیک ثقہ ہیں۔ مگر امام مسلم ان سے روایت نہیں لیتے[1] امام مسلم نے امام بخاری کے ۴۳۴ راویوں سے روایت نہیں لی اور امام بخاریؒ نے امام مسلم کے ۶۲۵ راویوں سے روایت قبول نہیں کی ـــــ صحیح مسلم امام مسلم سے شیخ ابو اسحٰق ابراہیم بن محمد بن سفیان نیشاپوری (۳۰۸ھ) نے بڑی احتیاط سے دوسرے رواۃ کے تواتر کے ساتھ روایت کی ہے ـــــ اس دور میں علماء کی سند امام مسلم تک انہی کے واسطہ سے پہنچتی ہے۔

---

[1] دیکھئے فتح الملہم جلد ا صہ ۵ و شروط الائمہ صہ ۵۳

امام مسلمؒ کا فقہی مسلک

جماعت اہلحدیث کے نزدیک آپ شافعی المسلک تھے۔[۱] ہمارے اکابر کی تحقیق یہ ہے کہ آپ امام شافعی کے اس طرح مقلد ہیں جس طرح امام طحاویؒ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مقلد تھے۔ یعنی محض مقلد نہیں کہیں کہیں اپنے امام سے قوت دلیل پر اختلاف بھی کرجاتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں۔

وکان اهل الحدیث قد ینسب الی احد المذاهب لکثرة موافقته۔[۲]

ترجمہ۔ اور محدثین اپنے مذہب کی زیادہ موافقت کے باعث کبھی کسی امام کی طرف بھی منسوب ہو جاتے تھے۔

سو ان حضرات کا مقلد ہونا صرف اسی معنی میں ہے۔ اس طرح نہیں جس طرح کہ ہم عامی مقلد ہیں۔ گو نیت ہماری بھی یہ ہونی چاہیئے کہ اگر کوئی صحیح اور صریح حدیث جس کے خلاف کوئی اور حدیث نہ پائی جائے۔ ہمیں مل جائے اور ہمارے امام کا فتوےٰ اس کے خلاف ہو تو ہم قول امام چھوڑ دیں گے حدیث نبوی کو نہ چھوڑیں گے۔

امام ابوداؤدؒ ——— سلیمان بن اشعث سجستانی (۲۷۵ھ)

امام ابوداؤد برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں سے بہت قریب کی نسبت رکھتے ہیں۔ سیستان جو ہرات اور سندھ کے مابین ایک قصبہ ہے وہاں کے رہنے والے تھے۔ عرب اسے سجستان پڑھتے ہیں اور اسی نسبت سے امام ابوداؤد کو سجستانی کہا جاتا ہے۔ آپ تحصیل علم کے لیے بغداد تشریف لے گئے۔ زندگی کا بیشتر حصہ وہیں گزارا۔ وہیں سنن ابی داؤد تالیف کی۔ پھر آخر میں بصرہ چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔ طلب حدیث میں شام، عراق، خراسان اور الجزائر وغیرہ کے متعدد سفر کیے۔ سینکڑوں اساتذہ سے حدیث سنی۔ امام بخاری اور امام مسلم کے ساتھ بہت سے اساتذہ میں شریک ہیں۔ امام احمد بن حنبل، امام یحییٰ بن معین

۱۔ الحطہ ص۹۸ نواب صدیق حسن خاں ۲۔ حجۃ اللہ البالغہ جلد ا ص۱۲۲

ابوالولید الطیالسی عبداللہ بن مسلمہ القعنبی ان کے بھی اُستاد تھے اور امام ترمذیؒ اور امام نسائی رح ان کے بھی شاگرد تھے۔ ایک حدیث امام احمد بن حنبل رح نے ابوداؤد سے بھی روایت کی ہے ـــ اسے حدیث عتیرہ کہا جاتا ہے۔ امام ابوداؤد اس پر ناز کرتے تھے کہ ان کے استاد امام احمد نے ایک حدیث ان سے سنی ہے۔

وکیع (۱۹۷ھ) کہتے ہیں:۔

لا یصیر الرجل عالماً حتی یاخذ عمن ھو فوقه وعمن ھو دونه وعمن ھو مثله۔[۱]

ترجمہ: کوئی شخص حدیث کا عالم نہیں بن سکتا جب تک اپنے سے اُوپر کے درجے کے علماء سے اپنے سے کم درجے کے علماء سے اور اپنے ہم رتبہ علماء سے سب سے اخذ علم نہ کرے۔

امام حاکم ان کے متعلق فرماتے ہیں:۔

امام اھل الحدیث[۲] فی عصرہ بلا مدافعة۔

آپ بلا شبہ اپنے دور میں محدثین کے امام تھے۔

حافظ موسےٰ بن ہارون (۲۹۴ھ) کہتے ہیں:۔

امام ابوداؤد دنیا میں حدیث کے لیے اور آخرت میں جنت کے لیے پیدا کیے گئے تھے ــــ آپ نے سنن مکمل کر کے اپنے استاد امام احمد کے سامنے پیش کی۔ آپ نے اسے پسند فرمایا۔[۳]

---

[۱] مقدمہ فتح الباری جلد ۲ صفحہ ۱۸۰ امام وکیع کو علم حدیث پر امام ابوحنیفہ نے متوجہ کیا تھا۔

[۲] اہل حدیث کا لفظ ان دنوں محدثین کے معنی میں استعمال ہوتا تھا اس سے کوئی خاص فقہی مسلک نہ لیا جاتا تھا یہ اہل سنت ہی تھے جو اس خاص فن (حدیث) میں آگے نکل گئے اور بسا اوقات یہ فقہ میں بھی ساتھ ساتھ ماہر ہوتے۔ امام نووی (۶۷۶ھ) ایک مقام پہ لکھتے ہیں هذا الحدیث علی ظاهره عند اهل الحدیث والفقه والمتکلمین من اهل السنة خلافاً لما تاولته الباطنیه (شرح صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۸۱) اس لفظ سے غیر مقلدین کا گروہ مراد ہو۔ یہ اصطلاح جدید بہت بعد کی ہے ہم انشاء اللہ العزیز اسے آگے چل کر تفصیل سے بیان کریں گے۔

امام احمد ائمہ اربعہ میں چوتھے امام ہیں. ان سے پہلے امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی ہو چکے تھے. امام ابوداؤد کے دور میں چاروں اماموں کی فقہی کاوشیں، ان کے اصول فقہ، ان کے اجتہادی کارنامے اور ان کے ابواب فقہ لوگوں کے سامنے آ چکے تھے. امام ابوداؤد نے چاہا کہ اب ایک ایسا حدیثی ذخیرہ مرتب ہونا چاہیئے جس میں مختلف مجتہدین کے مستدلات ایک نظر میں سامنے آ جائیں۔ ان کی کتاب سنن ابی داؤد کا موضوع ائمہ کے مستدلات ہیں اور ایک فقیہ کو ان سے چارہ نہیں ــــــ امام ابو داؤد امام احمد کے شاگرد تھے اور ان سے متاثر بھی ــــــ اور ان کی سنن میں جگہ جگہ حنبلی نقطہ نظر غالب نظر آتا ہے. صرف حنابلہ کے لیے ہی نہیں ان کی کتاب ائمہ اربعہ کے پیروؤں کے لیے ایک مجتہدانہ دستاویز کا درجہ رکھتی ہے اور علماء فقہ کے لیے یہ ایک بہت بڑا علمی ماخذ ہے ائمہ اربعہ میں سے دو امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل عراق سے تعلق رکھتے تھے اور دو حجاز سے. امام مالک اور امام شافعی ــــــ مسلمانوں میں الحاد اور اعتزال اور رفض و خارجیت کے سب فتنے عراق سے ہی اُٹھے تھے. جبر و قدر کی بحثیں پہلے وہیں چلیں. فتنہ خلق قرآن نے وہیں سے سر اُٹھایا اور کوفہ و بصرہ ہی ان اختلافات کی پہلی آماجگاہ بنے ان اختلافات میں امام ابوحنیفہ اور امام احمد دونوں کا موقف یہ رہا کہ ان اختلافات میں صحابہؓ کو معیار بنائیں اور جس طریق پر وہ رہے اسی راہ کو صواب جانیں. ارشادِ نبوت ما انا علیہ و اصحابی کا تقاضا بھی یہی تھا. اور اسی میں انتشار و الحاد سے بچنے کی راہ تھی۔

حنفیہ اور حنابلہ کے ہاں قولِ صحابی حجت ہے اور دونوں نے صحابہ کرامؓ کو ہر اختلاف کا فیصل سمجھا ہے. شوافع اور مالکیہ کے ہاں ایسا نہیں. شاہ ولی اللہ محدث دہلوی حنفی اور حافظ ابن تیمیہ حنبلی کس طرح ہر اختلاف میں دکیلِ صحابہ بنے نظر آتے ہیں یہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ امام ابوداؤد کا نقطۂ نظر بھی سنن میں یہی ہے. ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

قال ابوداؤد اذا تنازع الخبران عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم نظر الی ما عمل به اصحابه من بعده۔[1]

---

[1] سنن ابی داؤد جلد ۱ صـ۱۰۲

ترجمہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دو حدیثیں اگر آپس میں ٹکراتی ہوئی ملیں تو فیصلہ اسی پہ ہو گا کہ آپ کے بعد آپ کے صحابہ نے کس روایت پر عمل کیا۔

ان حالات میں امام ابوداؤد امام ابوحنیفہ کے علم وفضل کے بڑے قائل تھے۔ آپ نے فرمایا۔ رحم الله ابا حنیفة کان اماماً[۱] اللہ امام ابوحنیفہؒ پر رحم فرمائے آپ واقعی امام تھے۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب نے امام ابوداؤد کو شافعی المسلک لکھا ہے۔ مگر حافظ ابن تیمیہ انہیں حنبلی کہتے ہیں اور یہی حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کی رائے ہے۔ سنن ابی داؤد کے مطالعہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ حنبلی تھے۔ آپ نے مراسیل ابی داؤد کے نام سے ایک اور کتاب لکھی ہے اور ظاہر ہے کہ شافعیہ مرسل کو حجت نہیں سمجھتے۔

سنن ابی داؤد کی کل مرویات چار ہزار آٹھ سو کے قریب ہیں۔ ان میں ایک حدیث ثلاثی بھی ہے۔ صحیح بخاری میں کئی ثلاثیات ہیں۔

ابوداؤد کی روایات کا درجہ

جس حدیث کو امام ابوداؤد روایت کریں اور اس پر کوئی جرح نہ کریں تو وہ حدیث صالح للاستدلال شمار ہوگی۔ محدثین کے ہاں ابوداؤد کا سکوت بڑا وزن رکھتا ہے۔ مالم یذکر فیہ شیأ فھو صالح[۲] صحت کے اعتبار سے پھر اس کے کئی درجے ہو سکتے ہیں۔ اس میں صحیح اور حسن[۳] دونوں کا احتمال ہے۔ آپ نے فرمایا۔ میں نے اس کتاب میں کوئی ایسی حدیث نہیں لی جس کے ترک پر سب کا اتفاق ہو۔[۴] ابن جوزی نے سنن ابی داؤد کی نو احادیث کو موضوع کہا ہے۔ علامہ سیوطی نے ان میں سے چار کا جواب القول الحسن فی الذب عن السنن میں دیا ہے۔ باقی پانچ کے جواب میں یہ کہنا کافی ہے کہ ابن جوزی نقد روایات میں بہت متشدد ہیں۔ سو ان کی جرح حجت نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ سنن ابی داؤد موضوع احادیث سے

---

[۱] الانتقار صہ [۲] تدریب الراوی صہ۵ [۳] نیل الاوطار جلد ۱ صہ۱۵
[۴] مرقات جلد ۱ صہ۲۲

بالکل پاک[1] ہے۔ ہاں امام احمد قیاس پر ضعیف حدیث کو بھی ترجیح دیتے ہیں۔ جیسا کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے۔ سو اس میں اگر ضعیف روایات بھی ہیں تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ مجتہد کو کبھی ان کی ضرورت بھی پڑ جاتی ہے۔ تاہم یہ ہے کہ آپ نے کوئی حدیث متروک الحدیث راوی سے نہیں لی۔

سنن ابی داؤد کے نسخے

سنن ابی داؤد کے کئی نسخے ہیں۔ مگر ان میں سے چار مشہور ہیں۔ ۱۔ روایت ابی بکر محمد بن عبدالرزاق بن درسہ (۳۴۵ھ)۔ ۲۔ ابوعلی محمد بن احمد بن عمر لؤلؤی (۳۳۱ھ) ۳۔ اسحٰق بن موسیٰ بن سعید (حافظ ابو عیسےٰ) رملی (۳۱۷ھ)۔ ۴۔ حافظ ابوسعید احمد بن محمد (ابن الاعرابی ۳۴۰ھ)۔

امام ترمذیؒ (۲۷۹ھ)

امام محمد بن عیسیٰ بن سورہ ترمذی کی کنیت ابوعیسیٰ ہے۔ ترمذ دریائے جیحوں کے ساحل پر واقع ہے۔ امام ترمذی کو حضرت امام بخاریؒ، امام مسلمؒ اور امام ابوداؤدؒ سے شرفِ تلمذ ہے۔ جامع ترمذی میں آپ نے امام مسلم سے صرف ایک[2] روایت لی ہے۔ امام بخاری نے آپ سے آپ کے استاد ہونے کے باوجود دو روایتیں لی ہیں۔ امام ترمذی نے باب مناقب علی اور کتاب التفسیر (سورۂ حشر) میں ان دونوں روایتوں کی نشاندہی بایں الفاظ کی ہے۔ سمع منی محمد بن اسمٰعیل (یہ حدیث امام بخاری نے مجھ سے لی ہے)۔ وکیع کہتے ہیں انسان کا علم کامل نہیں ہوتا اگر وہ اپنے سے کم مرتبہ اور اپنے ہم مرتبہ علماء حدیث سے روایت لینے میں عار محسوس کرے (نقل بالمعنی) آپ نے طلب علم میں چند اساتذہ پر اکتفا نہیں کی۔ طلب حدیث میں حجاز، مصر، شام، کوفہ، بصرہ، بغداد اور خراسان کے متعدد سفر کیئے۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:-

---

[1] الحطہ صفحہ ۱۱۶ [2] احصوا ہلال شعبان لرمضان (جامع ترمذی جلد ا صفحہ ۸۷)

طاف البلاد وسمع خلقاً من الخراسيين والعراقيين والحجازيين۔[1]

ترجمہ: آپ نے دنیا بھر کا چکر لگایا، خراسانی علماء، عراقی علماء اور حجازی علماء سے آپ نے حدیث سُنی۔

علماء لکھتے ہیں امام بخاریؒ نے اپنے شاگردوں میں علم وحفظ اور ورع و زہد میں امام ترمذی کی مثل کوئی نائب نہیں چھوڑا۔ آپ نے سب سے زیادہ فیض امام بخاریؒ سے پایا ہے لیکن آپ امام بخاری کے محض پیرو نہ تھے اختلاف کے موقع پر آپ اپنی بات پوری قوتِ دلیل سے کہتے ہیں۔ امام بخاری نے حدیث لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب کو مقتدی پر بھی چسپاں کیا تھا۔ امام ترمذی نے یہاں ان کی پوری مخالفت کی ہے اور حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ کی روایت لاکر امام بخاری کے استاد حضرت امام احمد سے اس کا یہ معنی نقل کیا ہے:

واما احمد بن حنبل فقال معنی قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب اذا کان وحدہ واحتج حدیث جابر بن عبداللہ

یہ حدیث اکیلے نماز پڑھنے والے کے بارے میں ہے امام والے کے لیے نہیں اور اس پر حضرت جابر بن عبداللہ کی حدیث گواہ ہے۔[2]

امام ابو داؤد امام احمد کے مقلد تھے۔ وہ اپنے امام کی تائید میں حضرت سفیان بن عیینہ (۱۹۸ھ) سے بھی حدیث لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب فصاعداً کا یہی معنی نقل کرتے ہیں[3] لمن یصلی وحدہ یہ حدیث منفرد کے لیے ہے مقتدی کی نماز سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بغیر ہو جاتی ہے۔

تراویح کے مسئلہ میں آپ نے امام احمد کی بات نقل نہیں کی۔ ان سے کئی روایات تھیں۔ یہاں آپ کھل کر امام شافعی کی بات نقل کرتے ہیں کہ اکثر اہلِ علم حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے اس فیصلہ پر ہیں کہ تراویح بیس رکعت ہی مروی ہیں اور امام شافعی نے فرمایا ہے کہ میں نے مسجد حرام میں لوگوں کو بیس رکعت پڑھتے ہی پایا ہے۔[4]

---

[1] تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۳۸۸ [2] جامع ترمذی جلد ۱ ص ۴۲ [3] سنن ابی داؤد جلد ۱ ص ۱۱۹
[4] جامع ترمذی جلد ۱ ص ۹۹

آپ کی کنیت ابو عیسیٰ ہے۔ چونکہ حضرت عیسیٰ کا کوئی باپ نہ تھا اس لیے بعض علماء اسے جائز نہیں سمجھتے۔ ابن ابی شیبہ (۲۳۵ھ) نے المصنف میں ایک باب باندھا تھا۔ باب ما یکرہ للرجل ان یکتنی بابی عیسیٰ۔ مگر امام ابو داؤد (۲۷۵ھ) نے سنن میں باب ما یکتنی بابی عیسیٰ[1] میں اس کے لیے کچھ گنجائش رکھی ہے۔

ترمذی کے نام سے ایک اور محدث بھی مشہور ہیں۔ نوادر الاصول ان کی کتاب ہے انہیں عام طور پر حکیم ترمذی (ھ) کہا جاتا ہے۔ ایک ترمذی کبیر کے نام سے بھی معروف ہیں یہ ابوالحسن احمد بن حسن ہیں۔ امام احمد کے شاگرد اور امام ترمذی (۲۷۹ھ) کے استاد ہیں۔ امام ترمذی کی تصانیف میں کتاب العلل اور کتاب الشمائل کی بھی بہت شہرت ہے۔ شمائل ترمذی دورۂ حدیث میں بھی پڑھائی جاتی ہے۔

جامع ترمذی حدیث کے آٹھوں قسم کے مضامین پر مشتمل ہے۔ ۱۔ سیر۔ ۲۔ آداب۔ ۳۔ تفسیر۔ ۴۔ عقائد۔ ۵۔ احکام۔ ۶۔ اشراط الساعۃ۔ ۷۔ مناقب۔ ۸۔ فتن ــــــ ترتیب فقہی سے آپ پہلے کتاب الطہارۃ لائے ہیں۔ اس لیے اسے سنن ترمذی بھی کہہ دیتے ہیں۔ مگر مضامین کی جامعیت کے لحاظ سے جامع بخاری کے بعد یہ کتاب ہے جسے بجا طور پر جامع ترمذی کہا جا سکتا ہے۔ ابو اسمٰعیل اصبہانی کہتے ہیں۔ کتاب ابی عیسیٰ انید من کتاب البخاری ومسلم۔[2]

حدیث کے مجموعی فوائد اور موضوع پر سیر حاصل نظر کے پہلو سے جامع ترمذی حدیث کی سب سے اعلیٰ کتاب ہے۔ عراقیوں اور حجازیوں کے اختلافات میں ہر پہلو پر علیحدہ باب باندھتے ہیں ــــــ سنن کے ابواب میں ایک حدیث لاتے ہیں اور پھر اس باب میں جتنے صحابہ کی مرویات انکی نظر میں ہوتی ہیں وفی الباب عن فلان عن فلان کہہ کر ان کے نام گنواتے چلے جاتے ہیں۔ اب یہ بات دوسروں کے ذمہ ہے کہ ان روایات کی تلاش کریں کہ کس کس سند سے انہیں کس کس کتاب میں روایت کیا گیا ہے ــــــ اس پہلو سے امام ترمذی قاری کتاب کے ہاتھ میں ایک ایسی کنجی دے دیتے ہیں جس سے وہ علم کے خزانوں پر ہمیشہ دستک دیتا رہے۔ یہ انوکھا اور اچھوتا انداز ائمہ صحاح میں سے اور کسی کے ہاں نہیں ملتا۔ اس

---

[1] سنن ابی داؤد جلد ۲ ص ۶۷۸ [2] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۳۸۰

پہلو سے جامع ترمذی حدیث کی مفید ترین کتاب ہے۔

حدیث کی ثلاثی تقسیم (صحیح حسن اور ضعیف) گو اپنی جگہ پہلے سے موجود تھی۔ مگر متن حدیث کے ساتھ اس کی نشاندہی حدیث کی کسی اور کتاب میں اس طرح نہیں ملتی جس طرح ہم اسے جامع ترمذی میں دیکھتے ہیں۔ امام ترمذی علم و فن کو موتیوں کی طرح پروتے چلے جاتے ہیں۔ امام ترمذی کے ہاں ضعیف احادیث بھی بہت ملتی ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ ضعیف حدیثیں محدثین کے ہاں کلیۃً متروک یا مردود نہ سمجھی جاتی تھیں۔ نہ انہیں موضوع قرار دیا جاتا تھا۔ بلکہ ان کا بھی ایک علمی وزن ہوتا ہے جسے مجتہدین اور ماہرین فن ہی جانتے تھے۔

امام ترمذی ائمہ امصار کے مذاہب پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں اور مختلف ابواب میں ان مذاہب کا بھی تذکرہ کرتے جاتے ہیں۔

امام ترمذیؒ (۲۷۹ھ) ثقہ ہیں اور ان کی ثقاہت مجمع علیہ ہے۔ علامہ ابن حزم (۴۵۷ھ) نے انہیں مجہول لکھا ہے یہ صحیح نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ابن حزم کی جامع ترمذی اور ان کی کسی کتاب تک رسائی ہی نہ ہوئی تھی اور وہ انہیں جان نہ پائے تھے۔ اسی طرح ملا علی قاری سے بھی ایک تسامح ہوا ہے انہوں نے امام ترمذی کی ایک روایت کو ثنائی (جو دو واسطوں سے حضورؐ تک پہنچے) تسلیم کیا ہے[1] حالانکہ انکے شیوخ امام بخاری، امام مسلم اور امام ابوداؤد کے ہاں جو سب سے بڑی عالی سند ہے۔ وہ ثلاثیات کی ہے۔

امام نسائیؒ (۳۰۳ھ)

احمد بن علی ابوعبدالرحمٰن النسائی بھی ابناء فارس میں سے ہیں۔ خراسان میں مرو کے قریب نَسَاء ایک قصبہ ہے وہاں کے رہنے والے تھے۔ نَسَاء نون کی زبر سے ہے۔ نون کی زیر سے لفظ نِساء (عورتیں) بنتا ہے۔ نادان امام ابوعبدالرحمٰن نَسائی کو نِسائی پڑھتے ہیں

---

[1] دیکھئے مرقات شرح مشکوٰۃ جلد ۱ صہ ۲۱

یہ غلط ہے۔ نَسائی ہمزہ کے مد اور قصر دونوں طرح سے پڑھا گیا ہے۔

امام نسائی ۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے۔ خراسان ان دنوں علم و فن کا مرکز تھا۔ امام نسائی تحصیلِ علم میں خراسان سے فارغ ہوئے تو پھر دوسرے مراکزِ علمی کی طرف رُخ کیا۔ محدثین نے طلبِ حدیث میں بڑے بڑے سفر کئے ہیں۔ امام نسائی نے طلبِ حدیث میں حجاز، عراق، مصر، شام اور جزیرہ کے سفر کئے۔ پندرہ سال کی عمر میں وقت کے جلیل القدر محدث قتیبہ بن سعید (۲۴۰ھ) کے پاس پہنچے اور ایک سال سے کچھ زیادہ وہاں قیام پذیر رہے جن اساتذہ کی روایتیں آپ خراسان میں بالواسطہ سُن چکے تھے ایسے بہت سے بزرگوں سے بالمشافہ بھی حدیث سنی۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:۔

رحل الی الآفاق واشتغل بسماع الحدیث والاجتماع بالائمۃ الحذاق[1] و سمع من خلائق لا یحصون[2]

ترجمہ۔ دنیا کے کناروں تک سفر کیے۔ حدیث سننے اور ماہرینِ فن سے مجلسیں کرنے میں (عمر بھر) مصروف رہے۔ اتنے بزرگوں سے حدیث سُنی کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔

مصر کو اپنا مرکز بنایا[3] اور وفات سے تقریباً ایک سال پہلے شام (دمشق) چلے آئے[4]۔ وفات سے چند دن پہلے آپ مکہ مکرمہ چلے گئے۔

امام اسحٰق بن راہویہ، محمد بن بشار، قتیبہ بن سعید، امام ابوداؤد، ابوحاتم رازی، امام ابوزرعہ اور حضرت امام بخاری آپ کے اساتذہ میں سے ہیں۔

امام ابوبکر بن احمد بن السنی (۳۶۳ھ) محمد بن قاسم الاندلسی (۳۲۸ھ) حافظ ابوالبشر الدولابی (۳۱۰ھ) اور حافظ ابوجعفر الطحاوی (۳۲۱ھ) اور علی بن جعفر الطحاوی (۳۵۱ھ) آپ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ آپ سے سنن نسائی امام طحاوی کے بیٹے علی بن جعفر طحاوی نے روایت کی ہے۔

امام نسائی حدیث میں ثقہ ثبت اور حافظ تھے۔ فنِ روایت، جرح رواۃ اور

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۱۱ ص ۱۲۳ [2] تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۷ [3] اشعۃ اللمعات جلد ۱ ص ۱۷ [4] تہذیب التہذیب ص ۱۲۳

اور معرفتِ علل حدیث میں اپنے اقران میں ممتاز تھے اور علم حدیث میں اپنے وقت کے امام تھے۔ کان امام عصرہ فی الحدیث۔[1]

حافظ ذہبی (۷۴۸ھ) سیر اعلام النبلاء میں لکھتے ہیں کہ آپ علل حدیث اور رجال حدیث کی معرفت میں امام مسلم، امام ترمذی اور امام ابوداؤد سے بھی آگے نکلے ہوئے تھے اور ان باتوں میں امام ابوزرعہ اور امام بخاری کی صف کے آدمی تھے۔ یہ بات صرف شخصیات کے بارے میں ہے۔ جہاں تک ان کی تالیفات کا تعلق ہے صحیح مسلم اور ابوداؤد فنی اعتبار سے سنن نسائی پر فائق ہیں۔

امام نسائی کا مسلک

حضرت امام اپنی عمر کے آخری حصے میں دمشق چلے گئے۔ آپ نے خصائص علی کے نام سے ایک کتابچہ تالیف فرمایا۔ آپ پر شیعیت کا الزام لگا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے کئی علماء اس پراپیگنڈے سے اثر لیے بغیر نہ رہ سکے۔ امام نسائی پر شیعیت کا الزام بالکل غلط ہے۔ سنن نسائی کے باب امامۃ اہل العلم والفضل کا مطالعہ کریں وہاں آپ کو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں یہ الفاظ ملیں گے:۔

أ لستم تعلمون ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قد امر ابا بکر ان یصلی بالناس فایکم تطیب نفسہ ان یتقدم ابا بکر قالو انعوذ باللہ ان نتقدم ابا بکر۔[2]

ترجمہ۔ کیا تم نہیں جانتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو (مرض وفات میں) لوگوں کی امامت پر مامور فرمایا۔ سو اب تم میں سے کون چاہتا ہے کہ ابو بکرؓ سے آگے بڑھے۔ اس پر انصار نے کہا ہم اللہ کی پناہ لیتے ہیں کہ ابو بکرؓ سے آگے بڑھنے کی جسارت کریں۔

کیا شیعہ علماء اس قسم کی روایات اپنی کتابوں میں لا سکتے ہیں؟ حضرت امام جب

---

[1] وفیات الاعیان جلد ۱ صـ۱۸ [2] سنن نسائی جلد ۱ صـ۹۰

دمشق میں آئے تو ان دنوں وہاں خارجیت کا بہت چرچا تھا۔ حضرت امام نے مذہب اہلسنت کے تحفظ کے لیے حضرت علیؓ کے فضائل پر خصائص علی کے نام سے ایک کتاب لکھی خارجیوں نے اس کتاب کے حوالے سے آپ پر تشیع کا الزام لگایا۔ فقہی اعتبار سے آپ شافعی المذہب[1] تھے۔ سنن نسائی کے کتاب الحج سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ جماعۃ اہلحدیث کے نواب صدیق حسن خاں صاحب نے بھی آپ کو شافعی قرار دیا ہے۔[2] البتہ مولانا انور شاہ کشمیری نے آپ کو حنبلی لکھا ہے اور سنن نسائی کے باب وقت الجمعہ سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ امام احمد کے نزدیک نماز جمعہ زوال آفتاب سے پہلے بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں امام نسائی نے اسی مؤقف کو اختیار کیا ہے۔ امام شافعی کے نزدیک امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنا فرض ہے۔ مگر امام نسائی یہاں قرآن کریم کی آیت واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلکم ترحمون (پ ۹ الاعراف آخر) کا باب باندھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پیش کرتے ہیں۔ واذا قرأ فانصتوا[3] (جب امام پڑھنا شروع کرے تو تم چپ ہو جاؤ) یعنی امام کے پیچھے قرآن پڑھنا نہیں چپ رہنا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات شافعی مسلک کے مطابق نہیں۔

یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ محدثین کرام اپنے مسلک میں ہرگز تنگ نظر نہ تھے انہوں نے ہر مسلک اور ہر قسم کی روایات اپنی کتابوں میں پیش کی ہیں۔ امام نسائی کا مسلک حنبلی مذہب کے موافق رکوع کے وقت رفع یدین کرنے کا ہے۔ اسی طرح وہ دونوں سجدوں کے درمیان رفع یدین کے قائل تھے۔ مگر ان کی انصاف پسند طبیعت دیکھئے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک کی سند سے اپنی سنن میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (۳۲ھ) کی یہ روایت لاتے ہیں کہ کیا میں تمہیں حضورؐ کے طریقے کے مطابق نماز نہ پڑھاؤں آپ نے نماز پڑھائی اور شروع نماز میں رفع یدین کیا پھر کہیں نہ کیا۔[4]

محدثین اہلسنت کی انصاف پسندی اور وسعت نظری کی داد دیجئے کہ اپنے مسلک سے قطع نظر کس طرح متوازی روایتوں کو بھی اپنی کتابوں میں جگہ دیتے ہیں۔ لیکن یہ روش

---

[1] بستان المحدثین ص۱۲۳ [2] ابجد العلوم ص۸۱۰ [3] سنن نسائی جلد ۱ ص۱۰۶ [4] ایضاً ص۱۲۳
[5] سنن نسائی جلد ۱ ص ۱۱۷، ۱۲۰۔

صرف فروع تک ہے۔ اصول میں وہ کسی نرمی کو راہ نہیں دیتے۔

امام نسائی کی تصنیفات

سنن نسائی کا اطلاق آپ کی سنن کبریٰ پر بھی ہوتا ہے اور سنن صغریٰ پر بھی ـــــــ یہ کتاب سنن نسائی جو دورۂ حدیث میں داخل ہے یہ سنن صغریٰ ہے اس کا نام المجتبیٰ بھی ہے۔ ان کی کتاب خصائص علی اور کتاب الضعفاء والمتروکین بھی یادرہے شائع ہو چکی ہے۔ صحت کے لحاظ سے سنن نسائی صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے بعد تیسرے درجہ کی کتاب ہے۔ رجال کی تنقید میں کہیں آپ امام بخاری اور امام مسلم سے بھی زیادہ سخت ہو جاتے ہیں۔ کتاب الضعفاء والمتروکین کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ جرح کرنے میں متشددین میں سے تھے۔ اسماء وکنیٰ کی تعیین میں آپ اور امام ترمذی ایک سے چلتے ہیں۔

سنن نسائی کو امام نسائی سے ابن السنی، ابن الاحمر، ابوعلی السیوطی اور دیگر کئی محدثین نے روایت کیا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں سنن نسائی کا جو نسخہ رائج ہے وہ ابن السنی کی روایت سے ہے۔ دوسرے نسخوں میں امام نسائی کا دو واسطوں سے حضرت امام ابوحنیفہ سے حدیث روایت کرنا ثابت ہے[1]

(نوٹ) جس طرح جامع ترمذی امام ابن حزم کی دسترس سے باہر رہی۔ سنن نسائی امام بیہقی کے مطالعہ میں نہ آسکی۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں۔

لم یکن عندہ سنن النسائی ولا جامع الترمذی ولا سنن ابن ماجہ۔[2]

ترجمہ: آپ کے پاس سنن نسائی، جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ تینوں کتابیں نہ تھیں

امام بیہقی کی اگر ان کتابوں پر نظر ہوتی تو شافعیت میں وہ اسقدر متشدد نہ ہوتے۔
سنن نسائی کے تراجم صحیح بخاری کے تراجم کے انداز پر ہیں بعض جگہ لفظاً لفظاً ایک

---

[1] امام نسائی کہتے ہیں۔ حدثنا علی بن حجر حدثنا عیسیٰ ھو ابن یونس عن النعمان یعنی اباحنیفۃ عن عاصم عن ابی رزین عن ابن عباس (تہذیب جلد صـ) [2] تذکرۃ الحفاظ جلد صـ

ہیں۔ یہ تراجم امام نسائی کی فقہی نظر کے آئینہ دار ہیں۔ امام نسائی کے تراجم بعض مقامات پر متن سے متعلق نہیں سند سے متعلق بھی ہوتے ہیں اور یہ بات صحیح بخاری کے تراجم میں نہیں۔ اس پہلو سے سنن نسائی ایک بیمثال کتاب ہے۔

امام ابن ماجہ قزوینی (۲۷۳ھ)

ابوعبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ ایران کے شہر قزوین میں ۲۰۹ھ میں پیدا ہوئے طلب حدیث میں بصرہ، کوفہ اور بغداد، مکہ و مدینہ اور شام کے سفر کئے، خراسان بھی گئے اور وہاں کے علماء سے حدیث سُنی۔ امام مالک اور امام لیث مصری کے تلامذہ سے استفادہ کیا۔[1] حافظ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں آپ کی کتاب سنن کے موضوع پر نہایت عمدہ کتاب ہے۔

کتابہ فی السنن جامع جید۔ تہذیب التہذیب جلد ۹ ص۵۳۱

ابن ماجہ نے سنن میں کوشش کی ہے کہ زیادہ تر وہ حدیثیں لائیں جو پہلی پانچ مشہور کتابوں میں نہیں ملتیں۔ وہ ضعاف بھی ہوں تو دوسری صحیح اور حسن احادیث کو سمجھنے میں ان سے بہت مدد ملتی ہے۔ آپ کہیں کہیں علاقوں کی نسبت سے بھی سند کی نشاندہی کرتے ہیں جس کی مثال پہلی کتابوں میں نہیں ملتی۔ مثلاً حدیث کل مسکر حرام کی ایک سند کے متعلق لکھتے ہیں۔ ھذا حدیث المصریین۔ یہ مصر والوں کی سند ہے اور دوسری سند کے بارے میں فرماتے ہیں۔ ھذا حدیث العراقیین[2]۔ عراقی اسے اس سند سے نقل کرتے ہیں۔

سنن ابن ماجہ میں پانچ ثلاثی احادیث ہیں جو عالی سند کے اعتبار سے اس کتاب کا ایک بڑا اعزاز ہیں۔ یہ پانچوں روایات ایک ہی سند سے مروی ہیں۔ سنن ابی داؤد اور سنن ترمذی میں صرف ایک ایک روایت ثلاثی ہے اور علیحدہ علیحدہ سند سے ہے صحیح مسلم اور سنن نسائی میں ایک بھی ثلاثی حدیث نہیں۔ البتہ صحیح بخاری میں بائیس ثلاثی

---

[1] مرقات جلد ۱ ص۲۳ [2] سنن ابن ماجہ ص

روایات موجود ہیں۔ سنن ابن ماجہ میں ثلاثیات کی جو سند ہے اس میں کثیر بن سلیم راوی پر محدثین نے جرح کی ہے۔ امام دارمی (۲۵۵ھ) کی مسند میں ثلاثیات دیگر سب کتابوں سے زیادہ ہیں۔

سنن ابن ماجہ کا صحاح ستہ میں شمار

علماء حدیث میں اختلاف رہا ہے کہ صحاح ستہ میں چھٹی کتاب کون سی ہے۔ ابن صلاح (۶۴۲ھ) اور امام نووی (۶۷۶ھ) نے پانچ کتابوں کو مرکزی حیثیت میں رکھا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر المقدسی (۵۰۷ھ) اطراف الکتب الستۃ اور شروط الائمہ میں اور حافظ عبدالغنی مقدسی (۶۰۰ھ) اپنی تالیفات میں سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ میں شمار کر چکے تھے۔ خطیب تبریزی (۷۴۲ھ) نے بھی الاکمال فی اسماء الرجال میں سنن ابن ماجہ کے ساتھ چھ کتابوں کے رجال کو جمع کیا ہے۔

اختلاف کرنے والے حضرات

مشہور محدث رزین (۵۲۰ھ) نے کتاب التجرید میں جن چھ کتابوں کی تجرید کی ہے ان میں چھٹی کتاب مؤطا امام مالک ہے۔ علامہ ابن اثیر جزری (۶۰۶ھ) نے بھی جامع الاصول میں چھٹی کتاب مؤطا ہی رکھی ہے۔ امام ابوسعید العلائی (۷۶۱ھ) مسند دارمی کو چھٹی کتاب کا درجہ دینا چاہتے ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) بھی مسند دارمی کو ہی چھٹی کتاب کے طور پر شامل کرتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی مسند امام احمد کو چھٹے نمبر پر رکھنا چاہتے ہیں۔

اختلاف کرنے والوں کا اختلاف چنداں مؤثر نہیں ہے اور جمہور اہل علم نے سنن ابن ماجہ کو ہی صحاح ستہ میں جگہ دی ہے۔ ابن خلکان (۶۸۱ھ) لکھتے ہیں:۔

کتابه فی الحدیث احد الصحاح الستة۔

ترجمہ: آپ کی کتاب سنن ابن ماجہ صحاح ستہ میں سے ایک ہے۔

سنن ابن ماجہ کی بائیس حدیثیں ایسی کمزور ہیں کہ ان پر وضع کا حکم بھی لگ سکتا ہے ایک ہزار کے قریب روایات پر جرح ہو سکتی ہے۔ تاہم اس کے علوِ مرتبہ سے انکار نہیں ہو سکتا۔ حافظ ابن کثیر کہتے ہیں:۔

کلها جیاد سوی الیسیرة[۱] اس کی سب حدیثیں ماسوائے چند کے جید ہیں۔

سنن ابن ماجہ میں تیس بڑے ابواب ہیں جنہیں کتاب کہتے ہیں جیسے کتاب الزکوٰۃ کتاب الحج اور پندرہ سو عام الواب ہیں۔ کل حدیثیں چار ہزار کے قریب ہیں۔

(نوٹ) صحاح ستہ کی احادیث میں صحت کے لحاظ سے فرق ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں صحت کا معیار نہایت بلند ہے اور سنن اربعہ پر صحاح کا اطلاق تغلیباً ہے۔ ان میں حسان اور ضعاف بھی ہیں اور مجموعی لحاظ سے ان چھ کتب پر صحاح ستہ کا اطلاق درست ہے۔

اب ہم کچھ ان ائمہ حدیث کا ذکر کرتے ہیں جو گو ائمہ صحاح میں سے نہیں۔ لیکن فن کی معرفت اور خدمت میں ان کے ساتھ برابر کے شریک ہیں کتابوں کے درجات اور نسبت سے ہیں۔ لیکن امام فن ہونے کے لحاظ سے یہ حضرات بھی کچھ پیچھے نہیں

۱۔ امام سعید بن منصور (۲۲۷ھ) صاحب السنن

الامام الحافظ الحجہ ابوعثمان المروزی سعید بن المنصور ثقہ محدث ہیں[۲] آپ نے امام مالک، لیث بن سعد ابومعشر جیسے اکابر سے حدیث سنی۔ ان سے امام احمد بن حنبل، مسلم بن الحجاج اور امام ابوداؤد نے روایت لی۔ سنن سعید بن منصور محدثین میں بہت معروف رہی ہے خدا کرے چھپ جائے۔ اسکی اشاعت سے علم میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔

۲۔ ابوبکر بن ابی شیبہ (۲۳۵ھ)

ثقہ امام ہیں۔ عبداللہ بن مبارک، شریک بن عبداللہ القاضی، سفیان بن عیینہ، علی بن مسہر، عباد بن العوام، وکیع بن الجراح، یحیٰی بن سعید القطان، اسمٰعیل بن عیاش، اسمٰعیل بن علیہ جیسے محدثین کے شاگرد تھے۔ ان سے امام بخاری، امام مسلم

[۱] البدایہ والنہایہ جلد ۱۱ صفحہ ۵۵

امام ابوداؤد، امام نسائی اور ابن ماجہ اور دوسرے کئی محدثین نے حدیث روایت کی ہے ترمذی میں ان سے کوئی روایت نہیں۔ انکی کتاب کا نام المصنف لابی بکر بن ابی شیبہ ہے۔ المصنف ایک خاص طرز کی کتاب کو کہتے ہیں اس سے پہلے المصنف لعبد الرزاق (۲۱۱ھ) اس نوع کی کتاب معروف تھی۔ یہ عبدالرزاق بن ہمام محدث ہیں امام ابوحنیفہ کے شاگرد ہیں۔

۳۔ ابومحمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی (۲۵۵ھ)

سمرقند کے قبیلہ دارم سے تعلق رکھتے ہیں۔ یزید بن ہارون، نضر بن شمیل اور دوسرے کئی ائمہ کبار سے حدیث سنی۔ امام مسلم، امام ترمذی، امام ابوداؤد (اور حضرت امام احمد بن حنبل کے صاحبزادے) عبداللہ آپ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ امام احمد فرماتے ہیں۔ خراسان میں چار شخص حفاظ حدیث میں سے ہیں۔ ۱۔ امام ابوزرعہ ۲۔ امام بخاری۔ ۳۔ امام دارمی۔ ۴۔ حسن بن شجاع البلخی ——— امام نسائی نے بھی سنن صغریٰ کے ماسوا آپ سے روایت کی ہے ——— امام بخاری کو آپ کے انتقال کی خبر پہنچی تو صدمہ سے سر جھکا لیا اور بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ اس سال اور بھی کئی محدث راہئ ملک بقا ہوئے نیشاپور میں محدث عبدالرحمن، واسط میں محمد بن حرب النسائی، دمشق میں موسیٰ بن عامر نے انتقال فرمایا۔

مسند دارمی سنن کے طرز کی کتاب ہے مسند کی ترتیب پر نہیں۔ ہندوستان میں ۱۲۹۳ھ میں مطبع نظامی کانپور میں چھپی تھی۔ اب مصر میں بارہا شائع ہو چکی ہے۔ حافظ ابوسعید خلیل العلائی (۷۶۱ھ) اسے سنن ابن ماجہ کی جگہ صحاح ستہ میں جگہ دیتے ہیں حافظ ابن حجر (۸۵۲ھ) سے بھی اس کی تائید منقول ہے۔ مسند دارمی میں ساڑھے تین ہزار کے قریب احادیث ہیں اور اس دور کی دیگر کتابوں کی نسبت سے اس میں ثلاثیات زیادہ ہیں۔ یہ صرف مرفوع روایات پر مشتمل نہیں۔ صحابہؓ کی روایات بھی اس میں کافی ہیں۔ باب کراہیۃ اخذ الرأے کی ایک روایت ملاحظہ ہو:۔

مسجد میں کچھ لوگ دائرہ بنائے بیٹھے بلند آواز سے ذکر کر رہے تھے۔ وہاں فقیہ الامت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی آ نکلے۔ آپ نے یہ منظر دیکھا تو فرمایا:۔

تم کس قدر جلدی تباہ ہونے لگے۔ ابھی تو تمہارے سامنے بہت سے صحابہؓ زندہ موجود ہیں۔ ابھی تو حضورؐ کے کپڑے بھی پرانے نہیں ہوئے اور آپ کے استعمال کے برتن بھی نہیں ٹوٹے ـــــ کیا تم ایسے دین پر آگئے ہو جو حضورؐ کے دین سے زیادہ ہدایت والا ہے یا گمراہی کا راستہ کھول رہے ہو۔[۱]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محدثین اس دور میں صرف مرفوع احادیث لے کر نہیں چلتے تھے۔ صحابہؓ کو ساتھ ساتھ رکھتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی وہی حدیث سنتِ قائمہ سمجھی جاتی تھی۔ جس پر صحابہؓ کا عمل موجود ہو اور اگلے آنے والے مسلمان اس طریق کار کو ما انا علیہ واصحابی کی راہ کہہ سکیں۔

۴۔ ابن ابی الدنیا (۲۸۱ھ)

بغداد کے رہنے والے تھے۔ وہیں تعلیم شروع کی۔ بغداد میں اس وقت ممتاز محدث ابو بکر عبداللہ بن محمد تھے۔ ان سے حدیث سُنی۔ ابن ابی حاتم نے آپ کو ثقہ کہا ہے خلیفہ المعتضد عباسی کے اتالیق بھی رہے۔ شارحین حدیث نے آپ کی روایات کے جابجا حوالے دیئے ہیں۔

۵۔ حافظ ابو بکر البزار (۲۹۲ھ)

حافظ احمد بن عمرو البزار البصری جلیل القدر حافظ حدیث ہیں۔ دار قطنی نے آپ کو ثقہ کہا ہے ـــــ البزار نے عبدالاعلیٰ بن حماد، حسن بن علی بن راشد، محمد بن یحییٰ بن فضل اور ان کے اقران سے حدیث کا سماع کیا۔ اجلہ محدثین نے آپ سے حدیث سُنی ہے۔

۶۔ حافظ ابو یعلی الموصلی (۳۰۷ھ)

امام احمد بن علی الموصلی الحافظ حضرت امام ابو یوسفؒ کے شاگرد حافظ بشر بن الولید کے شاگرد تھے اور حنفی المذہب تھے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں:۔

قال ابو علی الحافظ لو لم یشتغل ابو یعلی بکتب ابی یوسف علی بشر بن الولید لادرک بالبصرة اباداؤد الطیالسی۔[۲]

---

[۱] مسند دارمی ملخصاً ص ۳۸   [۲] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۱۶

ترجمہ۔ اگر ابویعلی بشر بن الولید کے ہاں امام ابویوسف کی کتابوں میں مشغول نہ رہتے تو امام ابو داؤد الطیالسی کو بصرہ میں پالیتے۔[1]

ابویعلی یحییٰ بن معین کے بھی شاگرد تھے اور یحییٰ امام ابوحنیفہ کے قول پر فتوے دیتے تھے۔ آپ کے شاگرد ابوعلی نیشاپوری آپ کے حفظ وضبط کے بڑے مداح تھے۔ ابن حبان نے آپ کو ثقہ کہا ہے۔ سمعانی کہتے ہیں مسند ابی یعلی ایک سمندر ہے۔ جس میں سب چیزیں ملتی ہیں مسند ابی یعلی عام ملتی ہے۔ حدیث کی بہت اہم اور مفید کتاب ہے۔

۷۔ ابن جارود نیشاپوری (۳۰۷ھ)

ابن جارود ابومحمد عبداللہ بن علی النیشاپوری مکہ میں مقیم رہے۔ ذہبی لکھتے ہیں۔ الحافظ الامام الناقد۔[2] کتاب المنتقی فی الاحکام آپ کی تالیف ہے۔ آپ نے ابوسعید بن الاشج، علی بن خشرم، یعقوب بن ابراہیم الدورقی، عبداللہ بن ہاشم الطوسی اور زعفرانی سے حدیث سُنی۔ ان سے محمد بن نافع المکی، یحییٰ بن منصور اور طبرانی نے حدیث روایت کی ہے۔

۸۔ حافظ ابوبشر الدولابی (۳۱۰ھ)

محمد بن احمد ابوبشر الدولابی حافظ حدیث ہیں۔ احمد بن ابوشریح الرازی، ہارون بن سعید، موسیٰ بن عامر الدمشقی، زیاد بن ایوب کے شاگرد تھے۔ طلب حدیث میں حجاز، عراق، مصر اور شام کے سفر کیے۔ طبرانی، ابن حبان البستی اور ابوبکر المقری آپ کے شاگردوں میں سے تھے دارقطنی کہتے ہیں بعض محدثین نے ان کی ثقاہت میں کلام کیا ہے۔ مگر ان میں بجز خیر اور کوئی چیز ثابت نہیں ہوئی

۹۔ حافظ ابوبکر بن خزیمہ (۳۱۱ھ)

محمد بن اسحٰق ابوبکر بن خزیمہ خراسان کے رہنے والے تھے۔ محمد بن حمید اور اسحٰق

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ صہ ۱۲ [2] ایضاً جلد ۲ صہ ۲۸۶

بن راہویہ کے شاگرد تھے۔ دارقطنی کہتے ہیں نہایت پختہ کار اور بے نظیر عالم تھے۔ ذہبی لکھتے ہیں :۔

انتهت اليه الامامة والحفظ في عصره بخراسان[1]

ترجمہ: فن حدیث میں امامت اور حدیث کا حفظ آپ کے عہد میں آپ پر ختم تھا۔

(نوٹ) صحیح ابن خزیمہ کی چار جلدیں چھپ چکی ہیں۔

۱۰۔ حافظ ابوعوانہ الاسفرائنی النیشاپوری (۳۱۶ھ)

یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم ابوعوانہ، محدث شہیر محمد بن یحییٰ الذہلی، علی بن اشکاب، یونس بن عبدالاعلیٰ اور امام مزنی کے شاگرد تھے۔ آپ سے حافظ احمد بن علی الرازی، ابوعلی النیشاپوری، ابن عدی طبرانی اور اسمٰعیلی نے حدیث سنی۔ ذہبی لکھتے ہیں۔ ثقہ جلیل[2] آپ نے صحیح مسلم پر استخراج کرتے ہوئے المسند الصحیح لکھی جو مسند ابی عوانہ کے نام سے مشہور صحیح مسلم کی احادیث پر اس میں مزید سندیں ملتی ہیں۔ اس کی دو جلدیں حیدرآباد سے شائع ہو چکی ہیں

۱۱۔ امام ابوجعفر الطحاوی (۳۲۱ھ)

یمن کے قبیلہ ازد میں سے ہیں مصر پر اسلام کا پرچم لہرایا تو ان کے آبا یمن سے مصر آگئے۔ طحا مصر میں ایک گاؤں کا نام ہے۔ آپ کے بزرگ اس گاؤں کے قریب ایک بستی میں آباد ہوئے تھے۔ امام شافعی کے شاگرد خاص امام مزنی آپ کے ماموں اور استاد بھی تھے۔ امام طحاوی سنن شافعی کے راوی انہی کے واسطہ سے ہیں۔ علامہ عینی لکھتے ہیں علما بعض اوقات سنن شافعی کو سنن طحاوی بھی کہہ دیتے ہیں۔ یہ امام طحاوی کی تالیف ہو تو بھی اس کی روایات امام شافعی کی ہیں۔

کوفہ کے بعد مصر کی زمین علم و فضل کا بڑا مرکز سمجھی جاتی تھی۔ تین سو کے قریب

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ صہ [2] ایضاً جلد صہ

صحابۂ یہاں آکر مقیم ہوئے۔ عمرو بن الحارث، یحییٰ بن ایوب، حیوۃ بن شریح اور لیث بن سعد جیسے محدثین اس سرزمین سے اُٹھے۔ پھر ان سے لے کر ابن وہب۔ ابن القاسم، امام شافعی، امام ابراہیم مزنی اور امام طحاوی تک علم حدیث کا یہاں بہت چرچا رہا۔ امام طحاوی نے دیکھا کہ امام مزنی امام محمد بن حسن الشیبانیؒ کی کتابوں کا بہت مطالعہ کرتے ہیں۔ آپ اس سے بہت متأثر ہوئے اور آپ نے محسوس کرلیا کہ فقہ حنفی میں ایسی گہرائی ہے کہ اپنے مسلک کے لوگ تو درکنار دوسرے مذاہب کے ائمہ کبار بھی اس سے مستغنی نہیں۔ اس کے بعد آپ شافعی مسلک چھوڑ کر حنفی مذہب پر آگئے۔ مصر میں فکری انقلاب کا یہ ایک نیا رُخ تھا۔

امام طحاوی کے اساتذہ میں مصر کے مرکزی عالم یونس بن عبدالاعلیٰ (۲۶۴ھ) بہت شہرت رکھتے ہیں۔ آپ نے ہارون بن سعید، عیسیٰ بن مثرود، بحر بن نصر اور دوسرے کئی اکابر سے حدیث سنی۔ ۲۶۸ھ میں شام گئے اور وہاں کے محدثین سے استفادہ کیا۔ ایک سال بعد پھر مصر آگئے۔ آپ کے شیوخ میں مصری، یمنی، شامی، کوفی، بصری، حجازی اور خراسانی ہر علاقے کے علماء شامل ہیں۔ آپ امام بخاری اور امام مسلم کے ساتھ ان کے بہت سے اساتذہ میں شریک ہیں۔ آپ کے شاگردوں میں شیخ احمد بن قاسم اخشاب، امام طبرانی، احمد بن عبدالوارث زجاج، قاضی صعید اور عبدالعزیز بن محمد جوہری خاص طور پہ معروف ہیں۔ آپ کا سال وفات ۳۲۱ محمد مصطفےٰ کی تاریخ سے نکلتا ہے۔ جس سال آپ فوت ہوئے اسی سال ہرات میں ابو علی احمد بن محمد، اصفہان میں ابو علی الحسن، بغداد میں ابو عثمان سعید بن محمد اور مصر میں آپ کے شیخ ابو بکر احمد بن عبدالوارث راہئ ملکِ بقا ہوئے۔

امام طحاوی کا علمی مقام

علامہ ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں لکھتے ہیں:۔

وکان ثقۃ فقیھا عاقلا لم یخلف مثلہ[1]

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۳۰

آپ ثقہ ہیں، فقیہ ہیں، عاقل ہیں۔ اپنے پیچھے انہوں نے اپنے جیسا کوئی نہیں چھوڑا[1]

کسے معلوم نہیں کہ کوفہ امام سفیان ثوری، حضرت امام ابو حنیفہ، امام وکیع بن جراح، امام ابو یوسف، سفیان بن عیینہ جیسے جبال علم کے باعث علم و فضل کا بڑا مرکز تھا۔ امام طحاوی مصر کے علمی مراکز میں اہم مرکزی شخصیت ہوتے ہوئے محدثین کوفہ کے سیر و اخبار اور ان کے فقہ و اجتہاد پر بھی نہایت جامع نظر رکھتے تھے۔ حافظ ابن حجر حافظ ابن عبدالبر مالکی (۴۶۳ھ) سے نقل کرتے ہیں:۔

کان الطحاوی من اعلم الناس بسیر الکوفیین و اخبارھم و فقھھم مع مشارکتہ فی جمیع المذاھب۔[2]

ترجمہ۔ آپ علماء کوفہ کے سیر و اخبار (وہاں کی احادیث) اور ان کی فقہ کے جامع ترین عالموں میں سے تھے اور یہی حال آپ کا جمیع مذاہب کے علم میں تھا۔

ابن حماد حنبلی بھی امام طحاوی کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

الثقۃ الثبت برع فی الحدیث والفقہ۔[3]

ترجمہ۔ آپ ثقہ ہیں ضبط میں پختہ ہیں۔ حدیث اور فقہ میں براعت (انتہائی کمال) پائے ہوئے ہیں۔

ابن جوزی کے تشدد سے کون آگاہ نہیں۔ آپ لکھتے ہیں:۔

کان ثبتاً فہماً فقیہاً عاقلاً۔[4]

ترجمہ۔ قوی الضبط محدث، ذہین فقیہ اور سمجھ دار عالم تھے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی راویوں کی جرح و تعدیل میں کہیں کہیں امام طحاوی کے اقوال بھی نقل کرتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ جرح و تعدیل کے بھی امام تھے۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ صفحہ ۳۰ [2] لسان المیزان جلد ۱ صفحہ ۲۷۵ [3] شذرات الذہب صفحہ [4] المنتظم جلد ۶ صفحہ ۲۵۰

آپ نے علامہ کرابیسی کے رد میں نقض المدلسین اور ابوعبیدہ کی کتاب النسب کے رد میں الرد علی ابی عبید جیسی فاضلانہ تالیفات سے اس باب میں اپنا سکہ منوایا۔ ابن تغری آپ کو احد الاعلام اور شیخ الاسلام کا خطاب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ فقہ و حدیث احکام اور عربیت اور نحو میں نظیر نہ رکھتے تھے۔[۱]

امام طحاوی پر اعتراضات

بعض علماء نے حدیث رد الشمس روایت کرنے پر آپ پر سخت تنقید کی ہے اس قسم کے مسائل پر اس قسم کا اختلاف تعجب خیز نہیں۔ کیا حافظ ابو الفتح ازدی ابوزرعہ اور عراقی نے بھی اس حدیث کو حسن نہیں کہا؟ تعجب ہے کہ حافظ ابن حجر یہاں تو مسلمہ بن قاسم اندلسی کا اعتراض بڑے اہتمام سے ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اسی مسلمہ نے جب اسی قسم کا ایک اعتراض امام بخاری پر کیا تو حافظ صاحب اسی مسلمہ کو مجہول قرار دیتے ہیں۔[۲]

امام بیہقی (۴۵۸ھ) نے امام طحاوی پر جو اعتراضات کیے ہیں شیخ عبدالقادر القرشی نے الحاوی میں ان کے جوابات دیئے ہیں۔ قاضی القضاۃ علامہ علاء الدین المارد ینی نے الجوہر النقی فی الرد علی البیہقی میں امام بیہقی کے اعتراضات کو ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔

آپ کی کتاب شرح معانی الآثار دورۂ حدیث میں پڑھائی جاتی ہے اور اپنے فن اور انداز میں نظیر نہیں رکھتی۔ اسے پڑھانا ہر استاد کے بس میں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں اس کے اہل استاد میسر نہ ہوں وہاں اسے نہیں پڑھاتے۔ علامہ عینی (۸۵۸ھ) فرماتے ہیں کہ سنن ابی داؤد جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ پر اس کی ترجیح اس قدر واضح ہے کہ اس میں کوئی نادان ہی شک کر سکے گا۔[۳] علامہ ابن حزم (۴۵۷ھ) اسے سنن ابی داؤد اور سنن نسائی کے درجہ پر رکھتے ہیں۔[۴] حضرت علامہ انور شاہ کشمیری فرماتے

---

[۱] النجوم الزاہرہ جلد ۳ ص ۲۳۹ [۲] تہذیب التہذیب جلد ص [۳] الحاوی فی تخریج معانی الآثار للطحاوی ص ۱۲ للحافظ عبدالقادر القرشی [۴] مقدمہ تعلیق الممجد علی موطا امام محمد ص للفاضل اللکنوی

ہیں:" میرے نزدیک شرح معانی الآثار سنن ابی داؤد کے قریب ہے۔ اس کے بعد جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ کا درجہ ہے[1]"

حافظ ابن حجر عسقلانی کے شاگرد حافظ سخاوی نے جن کتب حدیث کو خصوصی طور پر قابلِ مطالعہ قرار دیا ہے ان میں شرح معانی الآثار بھی ہے۔ حافظ ابن حجر نے اتحاف المہرہ میں جن دس کتابوں کے اطراف جمع کیے ان میں طحاوی شریف بھی ہے۔

علامہ امیر اتقانی فرماتے ہیں:۔

فانظر شرح معانی الآثار هل ترى له نظيراً فى سائر المذاهب فضلاً عن مذهبنا هذا[2]

ترجمہ۔ امام طحاوی کی شرح معانی الآثار کو دیکھ اپنے مسلک کی بات نہیں کیا دوسرے تمام مذاہب میں تم اس کی نظیر پیش کر سکتے ہو؟

علامہ عینی جیسے جلیل القدر محدث نے برسوں طحاوی شریف کا درس دیا اور ان کی ایک ضخیم شرح بھی لکھی ہے[3]۔ جو پچھلی تمام شروح کا سرمایہ ہے۔

امام طحاوی کی دیگر تالیفات

۱۔ مشکل الآثار۔ حیدر آباد دکن سے اس کی چار جلدیں شائع ہوئی ہیں۔ ہماری معلومات کے مطابق پوری کتاب ابھی کہیں شائع نہیں۔ قاضی ابن رشد نے اس کا ایک اختصار لکھا ہے علامہ عینی کے استاد قاضی جمال الدین یوسف بن موسےٰ نے اس اختصار کا ایک اختصار المعتصر من المختصر کے نام سے کیا ہے۔ اس میں کئی ایسی احادیث ملتی ہیں جو مشکل الآثار کی مطبوعہ چار جلدوں میں

---

[1] فیض الباری جلد ۱ ص۵۵ [2]

[3] مبانی الاخبار شرح معانی الآثار چھ جلدوں میں ہے۔ علامہ عینی نے رجال طحاوی پر مختب الاخبار فی رجال معانی الآثار علیحدہ کتاب لکھی ہے۔ اس کی ایک تلخیص معانی الاخبار کے نام سے بھی لکھی ہے۔ جس کی تلخیص کشف الاستار کے نام سے دیوبند سے شائع ہو چکی ہے۔

نہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب اگر پوری طبع ہو تو کم از کم آٹھ جلدوں میں طبع ہوگی۔ امام طحاوی کی ان کے علاوہ دیگر تالیفات بھی ہیں:۔

۱۔ اختلاف العلماء۔ ۲۔ احکام القرآن۔ ۳۔ کتاب الشروط الکبیر۔ ۴۔ النوادر الفقہیہ ۵۔ اخبار ابی حنیفہ واصحابہ[1]۔ ۶۔ شرح جامع صغیر امام محمد۔ ۷۔ اختلاف الروایات علی الکوفیین ۸۔ شرح جامع کبیر امام محمد۔ ۹۔ کتاب صحیح الآثار۔ ۱۰۔ النوادر۔ ۱۱۔ کتاب العزائف۔ ۱۲۔ التاریخ الکبیر ۱۳۔ کتاب الوصایا۔ ۱۴۔ کتاب المحاضر والسجلات۔

یہ سب کتابیں اگر شائع ہو جائیں تو ان سے حدیث و فقہ کی تحقیقات میں کئی نئے ابواب کا اضافہ ہوگا۔ آپ کی تالیفات صرف حدیث سے متعلق نہیں فقہ میں بھی آپ طبقہ ثالثہ کے مجتہدین میں سے ہیں۔ آپ نے نہایت مفید اور عمیق فقہی ذخائر چھوڑے جن میں مختصر الطحاوی ایک نہایت عجیب اور وجیز متن ہے۔ مختصر الطحاوی نہایت بلند پایہ فقہی متن ہے جو حیدرآباد سے شائع ہوا اور برصغیر پاک و ہند میں متداول ہے۔

عقائد میں آپ نے محدثین کے مسلک پر ایک رسالہ تالیف کیا جو متکلمین کی آمیزش سے مبرا اور سلف کے عین مطابق ہے۔ سعودی عرب میں یہی ایک کتاب عقائد ہے جو سبقاً پڑھائی جاتی ہے۔ علامہ ابن ابی العز الحنفی نے اس کی مفصل شرح لکھی ہے۔ جو مکہ مکرمہ سے بڑی آب و تاب سے شائع ہوئی۔ شیخ البانی نے اس پر تحقیقاتی کام کیا ہے۔

۱۲۔ ابوبکر احمد بن ابراہیم اسماعیلی علی الجرجانی (۳۵۰ھ)

انہوں نے صحیح بخاری کی شروط پر ایک نہایت بلند پایہ کتاب تالیف کی۔ افسوس کہ وہ کتاب عام رائج نہ ہو سکی۔ ورنہ صحاح میں مقام پاتی۔ خطیب تبریزی آپ کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

الامام الحافظ جمع بین الفقه والحدیث ورئاسة الدین والدنیا۔[2]

ترجمہ: حدیث کے امام اور حافظ ہیں۔ فقہ و حدیث کے جامع ہیں اور دین اور دنیا میں بڑے لوگوں میں سے ہیں۔

---

[1] یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔ [2] الاکمال ص۶۲۲

حافظ ابویعلی موصلی، حافظ ابن خزیمہ، محمد بن یحییٰ المروزی اور فریابی سے حدیث سنی حاکم ان کے شاگرد تھے. فقہ اور حدیث دونوں کے جامع تھے. شیخ المحدثین والفقہاء انہیں کہا جاتا تھا.[1] دینی اور دنیوی ہر اعتبار سے بڑے تھے.

۱۳۔ حافظ ابن حبان البستی (۳۵۴ھ)

حافظ محمد بن حبان بن احمد ابو حاتم تمیمی البستی، حسین بن ادریس الہروی، امام نسائی، حافظ ابویعلی، حافظ ابوبکر ابن خزیمہ اور جعفر بن احمد دمشقی کے شاگرد تھے. امام حاکم کے شیخ تھے. فقہ، لغت اور حدیث کے جامع تھے. کان من فقہاء الدین وحفاظ الآثار.[2]
آپ فقہی نظر کے مالک تھے اور حدیث کے بڑے حافظ تھے.

۱۴۔ امام طبرانی (۳۶۰ھ)

سلیمان بن ایوب ابو القاسم الطبرانی (۲۶۰ھ) میں شام کے قصبہ عکا میں پیدا ہوئے آپ امام طحاوی کے نامور شاگرد تھے اور ان کی طرح کثیر التصنیف بھی تھے. حدیث میں آپ کے تین معجم، معجم صغیر، معجم اوسط، معجم کبیر کے ناموں سے مشہور ہیں —— حافظ ابن مندہ نے آپ کی کتابوں میں کتاب المسالک، کتاب عشرۃ النساء، کتاب النوادر اور دلائل النبوت کا ذکر بھی کیا ہے. آپ نے طلب علم میں حجاز، عراق (کوفہ، بصرہ، بغداد) یمن، شام، مصر اور اصفہان کے سفر کیے اور بڑی مشقتیں جھیلیں. ابو العباس احمد بن منصور کہتے ہیں میں نے طبرانی سے تین لاکھ حدیثیں سنی ہیں. اس سے ان کی وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے. ۳۶۰ھ میں انتقال فرمایا. حافظ ابونعیم اصفہانی (۴۳۰ھ) نے نماز جنازہ پڑھائی. طبرانی طبریہ کی طرف منسوب ہے طبرستان کی طرف نہیں. مشہور مؤرخ ابن جریر طبری طبرستان سے نسبت رکھتے ہیں.

۱۵۔ امام احمد السنی (۳۶۴ھ)

حافظ ابوبکر احمد بن اسحق بن محمد السنی امام نسائی کے شاگرد ہیں. حدیث کی مشہور کتاب

---

[1] تذکرہ جلد ۳ صفحہ ۱۲۰ [2] ایضاً ص

عمل الیوم واللیلہ انہی کی تالیف ہے۔ ۱۳۵۸ھ میں حیدر آباد سے شائع ہوئی۔ حفاظ حدیث میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ الحافظ الامام الثقة[۱] آپ سنن نسائی کے راوی ہیں۔ احمد بن عبداللہ اصبہانی ان کے شاگرد تھے۔

۱۶۔ الحافظ ابوالشیخ بن حیان الانصاری الاصبہانی (۳۶۹ھ)

حافظ ابویعلی الموصلی (۳۰۷ھ) کے شاگرد تھے۔ ذہبی لکھتے ہیں کان حافظاً ثبتاً متقناً[۲]۔ علم بہت وسیع اور حافظہ کے بہت پختہ تھے۔ نہایت نیک اور باخدا بزرگ تھے۔ ذہبی لکھتے ہیں:۔

کان مع سعة علمه وغزارة حفظه صالحاً خیراً قانتاً لله صدوقاً[۳]

ترجمہ۔ وسعت علم اور کثرت حفظ کے ساتھ بہت نیک صالح، عابد اور راست گو تھے۔

۱۷۔ ابوالحسن علی بن عمر الدارقطنی (۳۸۵ھ)

بغداد کے محلہ دارقطن کے رہنے والے تھے۔ خطیب تبریزی لکھتے ہیں:۔

کان فرید عصره وفریع دهره وامام وقته انتهی الیه علم الحدیث والمعرفة بعلله واسماء الرجال ومعرفة الرواة مع الصدق والامانة والثقة والعدالة۔[۴]

ترجمہ۔ اپنے عہد کے بے مثال محدث تھے زمانے کا مرجع اور امام وقت تھے۔ علم حدیث اس کی معرفت علل اسماء الرجال اور راویوں کو ان کے صدق و امانت اور اعتماد و عدالت سے پہچاننا ان پر ختم تھا۔

معرفت علل میں اس درجہ پر تھے کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم جیسی کتابوں پر تعقبات کیے گو اکثر مقامات پر ان کی پکڑ بے جا نکلی اور علمائے شیخین کی طرف سے ان کے شافی و وافی جواب دیئے۔ تاہم ان کی اس جرأت سے ان کے علم و عظمت کی ایک جھلک ضرور سامنے آجاتی ہے۔ امام ابوحنیفہ پر بھی اس زعم میں جرح کی۔ لیکن امام الجرح والتعدیل

---

[۱] تذکرة الحفاظ جلد ۲ ص۲۵۷ [۲] ایضاً ص [۳] ایضاً ص۱۴۴ [۴] الاکمال ص

امام یحییٰ بن معین کی توثیق کے سامنے ان کی کیا شنوائی ہو سکتی تھی۔ آپ شافعی المسلک تھے اور آپ کی اس جرح میں بلاشبہ ان کے تشدد کو دخل تھا۔

اسماعیل صفار، ابوسعید اصطخری اور دیگر اساتذہ فن سے حدیث سنی طلب حدیث میں کوفہ، شام، واسط اور مصر کے کئی سفر کیے۔ ابوعبداللہ الحاکم (۴۰۵ھ) ابومحمد عبدالغنی (ھ) حافظ ابونعیم صاحب الحلیہ (۴۳۰ھ) ابوبکر احمد البرقانی (۴۲۵ھ) اور قاضی ابوالطیب الطبری (ھ) ان کے تلامذہ میں سے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ آپ کی طبیعت میں تیزی اور تشدد تھا لیکن اس میں شک نہیں کہ علل حدیث اور معرفت رجال میں اپنے وقت کے مقتدا تھے خطیب بغدادی (۴۶۳ھ) کو آپ کے اس تفوق کا پورا اعتراف ہے۔

آپ اپنے مقام کے مناسب حدیث کی کوئی بلند پایہ کتاب نہ لکھ سکے سنن دارقطنی بیشک ایک مجموعہ حدیث ہے اور اس میں کئی ایسی حدیثیں ملتی ہیں جو دوسری کتابوں میں نہیں لیکن افسوس کہ آپ اس میں رجال و اسانید کا کوئی معیار قائم نہ رکھ سکے اور موضوع روایات تک کو اس میں جگہ دے دی۔ شارح بخاری علامہ عینی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

وروی فی سننہ روایات سقیمۃ ومعلولۃ ومنکرۃ وغریبۃ وموضوعۃ[1]

ترجمہ۔ اس سنن میں سقیم، معلول، منکر، غریب اور موضوع روایات تک روایت کر دی ہیں۔

سنن دارقطنی کو کسی جہت سے صحیح دارقطنی نہیں کہا جا سکتا۔ ماسوائے مرزا غلام احمد قادیانی کے کسی نے اسے صحیح دارقطنی نہیں لکھا۔ مرزا غلام احمد ایک مقام پر لکھتا ہے:۔

یہ حدیث اگر قابل اعتبار نہیں تھی تو دارقطنی نے اپنی صحیح میں کیوں اس کو درج کیا۔ حالانکہ وہ اس درجہ کا آدمی ہے کہ جو صحیح بخاری پر بھی تعاقب کرتا ہے[2]

۱۸۔ ابن عدی صاحب کتاب الکامل و کتاب الضعفاء (۳۶۵ھ)

کان حافظاً متقناً لم یکن فی زمانہ احد مثلہ[3]

---

[1] عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری جلد ۳ صـ ۶۷ [2] تحفہ گولڑویہ صـ ۲۸ مطبوعہ ۱۹۲۳ء۔ اس میں رمضان میں کسوف و خسوف کی منقطع روایت نقل کی گئی ہے۔ [3] تذکرہ جلد ۳ صـ ۱۵۳

محمد بن ابی سوید، امام نسائی اور ابو یعلی سے حدیث سنی ان سے ابو العباس بن عقدہ نے

۱۹۔ الخطابی (۳۸۸ھ)

حافظ ابو سلیمان احمد بن محمد الخطابی صاحب معالم السنن شرح ابی داؤد و غریب الحدیث

۲۰۔ امام ابو عبداللہ الحاکم (۴۰۵ھ)

امام ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ الحاکم (صاحب مستدرک حاکم) نیشا پور کے رہنے والے تھے۔ نیشا پور ان دنوں علم و فضل کا مرکز تھا۔ امام مسلم (صاحب صحیح) اسی علاقہ کے رہنے والے تھے۔ حاکم نے نیشا پور میں ایک ہزار کے قریب اساتذہ سے استفادہ کیا۔ طلب حدیث میں خراسان، ماوراء النہر اور دیگر کئی علاقوں کے سفر کئے اور دو ہزار کے قریب شیوخ سے حدیث سنی۔ آپ کے تلامذہ میں امام بیہقی (۴۵۸ھ) ابوالقاسم القشیری (۴۶۵ھ) اور ابوذر ہروی (ھ) جیسے ائمہ فن تھے۔ صحیح بخاری جن حضرات سے آگے چلی۔ ان میں یہ ابوذر ہروی بھی ہیں جو امام حاکم کے شاگرد تھے۔

ان پر تشیع کا الزام بھی لگا۔ لیکن ان دنوں اس لفظ سے روافض مراد نہ لیئے جاتے تھے۔ نہ یہ لوگ حضورؐ کے بعد کسی آسمانی سلسلہ امامت کے قائل تھے۔ علامہ تاج الدین السبکی نے طبقات شافعیہ میں اس الزام کی پُرزور تردید کی ہے۔ خطیب بغدادی نے انہیں ثقہ کہا ہے۔ مگر انہوں نے بھی ان پر شیعیت کی جرح کی۔

مستدرک حاکم کی کھلی روایات ان کی شیعیت کی تردید کر رہی ہیں۔ روافض کی بنار آسمانی عقیدہ امامت عقیدہ تحریف قرآن اور انکار خلافت خلفاء ثلثہ پہ ہے اور ظاہر ہے کہ حاکم ان عقائد سے بالکل پاک تھے۔ جو شخص اہلبیت اور ذریت طیبہ کی محبت میں ذرا زیادتی کرے ان دنوں اسے بھی شیعہ کہہ دیتے تھے۔ حاکم کی بات بھی کچھ اس سے بڑھ کر نہیں۔

حاکم کی کتاب چار ضخیم جلدوں میں حیدر آباد دکن سے شائع ہو چکی ہے۔ حاکم تصحیح میں متساہل ہیں علماء اس کا اعتبار نہیں کرتے۔ اس کے ذیل میں علامہ ذہبی کی تلخیص المستدرک

ہے۔ اس کی تائید کے بغیر مستدرک کی کسی روایت کو علی شرط الشیخین نہ سمجھنا چاہیئے۔

امام حاکم بہت بڑے مصنف تھے۔ ابن خلکان نے ان کی تالیفات ڈیڑھ ہزار کے قریب بتلائی ہیں۔ علم تفسیر میں ان کی کتاب الاکلیل اپنے فن کی بہت معرکۃ الآراء کتاب ہے۔

۲۰۔ حافظ ابو نعیم اصبہانی (۴۳۰ھ)

ابوالشیخ اصبہانی (۳۶۹ھ) کے بعد اس سرزمین سے اٹھنے والے یہ دوسرے عظیم محدث ہیں۔ خطیب تبریزی ان کے ذکر میں لکھتے ہیں:۔

هو من مشائخ الحديث الثقات المعمول بحديثهم المرجوع الى قولهم كبير القدر ولد سنة ۳۳۴ھ[1]

ترجمہ۔ حدیث کے ان ثقہ مشائخ میں سے ہیں جن کی روایت معمول بہ اور جن کا قول لائق قبول رہا ہے۔ آپ بڑے درجہ کے محدث تھے۔ ۳۳۴ھ میں پیدا ہوئے۔

علامہ نورالدین ابوالہیثمی (صاحب مجمع الفوائد) نے آپ کی کتاب حلیۃ الاولیاء کو ابواب پر مرتب کیا ہے اور یہ کتاب چھپ چکی ہے۔

۲۱۔ ابن حزم الاندلسی (۴۵۷ھ)

ابو محمد علی بن احمد بن حزم فارسی النسل تھے۔ آباء و اجداد سپین جا بسے تھے۔ ابن حزم ۳۸۴ھ میں قرطبہ میں پیدا ہوئے۔ پہلے شافعی المذہب تھے۔ پھر داؤد ظاہری کا مسلک اختیار کیا اور قیاس کا سرے سے انکار کیا۔

حدیث پر بڑی گہری نظر تھی۔ مگر فقہ کے انکار سے اس سے کماحقہ استفادہ کرنے کے دروازے خود اپنے آپ پر بند کر چکے تھے۔ تاہم اس سے انکار نہیں کہ ان کے علوم سے ایک عالم مستفید ہوا۔ امام غزالی نے بھی ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ علوم عربیت پر علماء قرطبہ کو ویسے بھی بڑی دسترس ہوتی ہے اور یہ تو اس باب میں سباق الغایات تھے۔

---

[1] الاکمال ص۶۳۲ مع المشکوٰۃ

ان کی کتابوں میں کتاب الاحکام، المحلی اور کتاب الفصل فی الملل والنحل عام ملتی ہیں۔ شیخ عزالدین کہتے ہیں جتنا علم میں نے محلی ابن حزم اور مغنی ابن قدامہ میں دیکھا ہے اتنا کسی اور اسلامی کتاب میں نہیں دیکھا۔ تعجب ہے کہ امام ترمذی (۲۷۹ھ) کو آپ نے مجہول لکھا ہے۔ بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ جامع ترمذی وغیرہ آپ دیکھ ہی نہ پائے تھے المحلی مطبع منیر مصر نے ۱۳۴۸ھ میں ۱۱ ضخیم جلدوں میں شائع کی۔

۲۲۔ امام ابوبکر احمد بن الحسین البیہقی (۴۵۸ھ)

خطیب تبریزی اکمال میں لکھتے ہیں:۔

کان اوحد دھرہ فی الحدیث والتصانیف ومعرفۃ الفقہ وھو من کبار اصحاب الحاکم ابی عبد اللہ[1]

ترجمہ۔ آپ حدیث میں یکتائے روزگار تھے۔ فن تالیف اور معرفت فقہ میں نظیر نہ رکھتے تھے اور امام حاکم کے بڑے شاگردوں میں سے ایک تھے

آپ نے ابوطاہر، ابوعلی رودباری اور ابوعبدالرحمٰن سلمی سے بھی استفادہ کیا اور طلب حدیث میں کوفہ، بغداد، خراسان، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور دیگر کئی ممالک کے سفر کیے۔ شافعی المسلک تھے اور فقہ شافعی کی حمایت میں بہت تیز تھے۔ امام الحرمین کہتے ہیں:۔

ہر شافعی مذہب والے پر امام شافعی کا احسان ہے۔ لیکن بیہقی ہیں جن کا خود امام شافعی پر احسان ہے کیونکہ ان کی فقہ کو اس طرح مضبوط اور مدلل کر کے مدون کرنا اس کا سہرا ان کے سر ہے[2]

آپ نے ابن فورک متکلم سے بھی استفادہ کیا ہے۔ کتاب الاسماء والصفات میں اس کی جھلک ملتی ہے۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری نے استواء علی العرش کے مسئلہ میں امام بیہقی سے استناد کیا تھا۔ مگر ان کے دوسرے علماء نے اسے مذہب محدثین سے خروج قرار دیا حالانکہ امام بیہقی بالاتفاق ایک جلیل القدر محدث ہیں۔

---

[1] الاکمال ص ۶۳۲ مع المشکوٰۃ [2] ترجمان السنۃ جلد ۱ ص ۲۷ ملخصاً

امام بیہقی کا مسلک اہلسنت میں تصلب

سلطان طغرل بیگ سلجوقی کے دربار میں ایک ملحد ابونصر منصور بن محمد الکندری وزارت کے منصب پر آگیا تھا۔ اس نے معتزلہ کی حمایت میں بہت کوششیں کیں اور دو مسئلوں کو اپنا محور بنایا۔

۱- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد اطہر قبر میں جماد محض ہے اور وفات کے بعد اب آپ رسول نہیں رہے۔ رسول کی وفات سے رسالت ختم ہو جاتی ہے۔

۲- وفات کے بعد روح و بدن کی کلی مفارقت ہے اور برزخ کے تمام معاملات روح پر گزرتے ہیں۔ جسد عنصری سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا ـــــ یہاں تک جھوٹ بولا گیا کہ امام ابوالحسن اشعری بھی انہی عقائد پر تھے اور یہ کہ ہم بھی اہلسنت ہیں ان سے خارج نہیں ہیں۔

امام بیہقی (۴۵۸ھ) اور امام ابوالقاسم قشیری (۴۶۵ھ) نے بڑی قوت سے ان بدعتیوں کا مقابلہ کیا۔ علامہ قشیری نے شکایۃ اہل السنۃ بما نالہم من المحنۃ لکھی اور امام بیہقی نے رسالہ حیات الانبیاء لکھ کر معتزلہ اور کرامیہ پر حجت تمام کی۔

حافظ ابن عساکر (۵۷۱ھ) نے تبیین کذب المفتری فیما نسب الی الامام الاشعری لکھ کر کرامیہ اور معتزلہ کی تردید کی ہے اور انہیں کذاب اور مفتری قرار دیا ہے۔ علامہ تاج الدین سبکی لکھتے ہیں:-

فان قیل فمن این وقعت ھذہ المسئلۃ ان لم یکن لھا اصل قیل ان بعض ـــــ الکرامیہ ملاء اللہ تعالیٰ قبرہ نارا وظنی ان اللہ قد فعل، الزم بعض اصحابنا ..... الخ

ترجمہ: اگر پوچھا جائے کہ یہ مسئلہ اگر اس کی کوئی اصل نہ تھی کہاں سے آ گیا تو کہا جائے گا کہ بعض کرامیہ نے اللہ ان کی قبر کو آگ سے بھرے اور اور اپنا گمان یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کر دیا ہے۔ ہمارے بعض بزرگوں کو الزام دیا کہ ان کے عقیدہ میں حضور اپنی قبر میں نبی اور رسول نہیں ہیں ..... الخ

یہ مسئلہ کہ برزخ کے سارے معاملات صرف روح پر گزرتے ہیں بدن پر نہیں

اور قبر میں روح کا اس بدن عنصری سے کوئی تعلق نہیں ہوتا غلط ہے۔ پہلے یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اس باب میں مذہب اہلسنت کیا ہے پھر کرامیہ کے اس الحاد کا جائزہ لیجئے۔ امام نووی شارح مسلم (۶۷۶ھ) لکھتے ہیں:۔

ثم المعذب عند اهل السنة الجسد بعينه او بعضه بعد اعادة الروح اليه او الى جزء منه وخالف فيه عبد الله ابن كرام وطائفه فقالوا لايشترط اعادة الروح قال اصحابنا هذا فاسد لان الالم والاحساس انما يكون فى الحى قال اصحابنا ولا يمنع من ذلك كون الميت قد تفرقت اجزاءه كما نشاهد فى العادة او اكلته السباع او حيتان البحر او نحو ذلك فكما ان الله تعالى يعيده للحشر و هو سبحانه وتعالى قادر على ذلك فكذا يعيد الحيوة الى جزء منه او اجزاء وان اكلته السباع والحيتان[2]۔

ترجمہ۔ اہل سنت کا مذہب یہی ہے کہ عذاب اسی جسم کو یا اس کے کچھ حصے کو ہوتا ہے اور یہ روح کے جسم کی طرف لوٹنے سے ہوتا ہے اس میں (کرامیہ فرقے کے بانی) عبداللہ بن کرام اور کچھ لوگوں نے خلاف کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ عذاب قبر کے لیے روح کا بدن کی طرف لوٹنا ضروری نہیں ہم اہلسنت کے نزدیک یہ مذہب فاسد ہے کیونکہ الم اور احساس صرف زندہ کو ہی ہو سکتا ہے۔ اہلسنت اکابر کہتے ہیں کہ میت کے اجزاء بدن کا متفرق ہونا جیسا کہ ہم عام طور پر دیکھتے ہیں یا یہ کہ اسے درندے کھا گئے ہوں یا دریا کی مچھلیاں۔ یہ اس میں رکاوٹ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جس طرح اسے حشر کے دن اٹھائے گا اور وہ اس پر قادر ہے اس طرح وہ اس پر بھی قادر ہے کہ (قبر میں) اس کی طرف یا اس کے بعض حصہ بدن میں وہ حیات لوٹا دے۔

امام بیہقی محدثین کی نصرت میں بڑی جرأت سے نکلے اور ان ملاحدہ کے خلاف کتاب

---

[1] طبقات الشافعیہ جلد ۲ صد ۲۸۲ صد ۲۷۹ وراجع لہ باب المغنم من رد المحتار (فتاوے شامی) جلد ۳ صد ۴۴ وروضة البهیه فیما بین الاشاعره والماتریدیه صد ۱۵ [2] صحیح مسلم مع شرح نووی جلد صد ۳۸۶

حیات الانبیاء تحریر فرمائی۔ اس میں محض حدیث کی روایت آپ کے پیش نظر نہ تھی نہ اس میں آپ کا موضوع راویوں کی جرح و تعدیل ہے۔ اس کتاب کا مقصد محض مذہب اہل سنت کی نشاندہی تھی اور وہ آپ نے کردی۔ جو روایات آپ نے اس کتاب میں جمع کی ہیں آپ نے ان کے عام طرق اور شواہد یہاں جمع نہیں کئے اور نہ یہ ان کا یہاں موضوع تھا۔ اس مسئلہ میں محدثین کس عقیدہ پر رہے ان کے پیش نظر محض اس کا بیان ہے۔ سو اس کتاب کو اسی پس منظر میں پڑھنا چاہیئے کہ یہ محض کرامیہ کے رد میں لکھا گیا تھا اور اس کا مقصد محض مذہب اہل سنت کا اظہار تھا۔ ورنہ ان روایات کے دوسرے طرق جو اور کتابوں میں ملتے ہیں ان روایات کی پوری توثیق کرتے ہیں۔ امام بیہقی کا یہ رسالہ حیات الانبیاء روایات کی صحت و ضعف کا مبحث نہیں۔ یہ مذہب اہل سنت اور کرامیہ کے ذہنی تصادم کا بیان ہے اور یہ بات اہل علم پر مخفی نہیں ہے۔

(نوٹ) جس طرح جامع ترمذی امام ابن حزم کے مطالعہ سے نہ گزر سکی۔ اس طرح امام بیہقی، سنن نسائی، جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ تک رسائی نہ پا سکے تھے۔

سنن کبریٰ بیہقی کے بعد معرفۃ السنن والآثار آپ کی اہم کتاب ہے۔ آپ کی کتابیں شعب الایمان اور دلائل النبوت بھی بارہا چھپ چکی ہیں۔ کتاب الاسرار، کتاب الزہد اور دعوات الکبیر ہماری نظر سے نہیں گزریں۔ کتاب الاسماء والصفات، اسماء الٰہیہ اور مسئلہ صفات میں ایسی بلند پایہ تالیف ہے کہ سابقین میں بھی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ جس طرح امام بخاری نے خلق افعال عباد اور الرد علی الجہمیہ عقائد کی اصلاح کے لیے لکھیں، امام مسلم نے کتاب الایمان لکھی۔ امام طحاوی نے عقیدۃ الطحاوی لکھی۔ امام بیہقی نے بھی اپنے وقت میں عقائد اہل سنت کے گرد حفاظت کا پہرہ دیا اور محدثین اس باب میں کبھی غافل نہیں رہے۔

(نوٹ) کتاب الاسماء والصفات میں آپ اگر کہیں صحیح بخاری، صحیح مسلم یا پہلے محدثین کا حوالہ دیتے ہیں تو اس سے ان کے الفاظ کی پابندی اور ان روایات کی پوری نقل آپ کے پیش نظر نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ اسی طرح ہوتا ہے جس طرح امام ترمذی کسی روایت کو نقل کرنے کے بعد وفی الباب عن فلاں عن فلاں کہہ دیں۔ حالانکہ روایات کے الفاظ اپنے اپنے ہوتے

ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امام بیہقی مسندین (اپنی سند سے روایت لانے والوں) میں سے ہیں مخرجین (تخریج کرنے والوں) میں سے نہیں۔ صاحب مشکوٰۃ، صاحب بلوغ المرام، صاحب آثار السنن، صاحب مجمع الزوائد، صاحب اعلاء السنن یہ مخرجین میں سے ہیں انہیں الفاظ کی کمی بیشی یا روایت بالمعنیٰ کا حق نہیں پہنچتا ـــــ امام ترمذی ہوں یا امام بیہقی ان کے اس قسم کے حوالوں سے جن میں الفاظ کی پابندی نہ ہو طلبہ کو شک میں نہ پڑنا چاہیئے مسندین کا مقام اور ہے اور مخرجین کا اور ـــــ آج بھی کئی لوگ غلط حوالے دے دیتے ہیں اور پھر امام بیہقی سے اس کا جواز ڈھونڈتے ہیں۔

۲۳۔ ابن عبدالبر مالکی (۴۶۳ھ)

جامع بیان العلم، الاستیعاب اور تجرید التمہید آپ کی مشہور کتابیں ہیں، اہم ترین تالیف کتاب التمہید لما فی الموطا من المعانی والاسانید ہے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس کی بیس جلدیں ہیں۔ مراکش کے محکمہ شئون اسلامی نے اسے شائع کیا ہے۔ ابن عبدالبر بیشتر روایات اپنی سند سے لاتے ہیں۔ جامع بیان العلم سے ایک عالم فیضیاب ہے۔

آپ خلف بن قاسم، عبدالوارث بن سفیان، عبداللہ بن محمد بن عبدالمؤمن، ابوعثمان سعید بن نصر اندلسی، ابوالفضل احمد بن قاسم البزاز، ابوعمر واحمد بن محمد الطلمنکی اور ابوعمر واحمد الاشبیلی سے حدیث سُنی۔ آپ سے ابوعبداللہ الحمیدی، ابوعلی غسانی، ابوالحسن طاہر بن فوز بن احمد المعافری اور ابویحییٰ سفیان بن ابی العاص نے حدیث روایت کی۔

۲۴۔ خطیب بغدادی (۴۶۳ھ)

شام اور عراق کے محدث ہیں۔ بغداد کے بعد شام اور پھر اصفہان گئے۔ حافظ ابونعیم سے بھی سماع کیا۔ معرفت حدیث، حفظ و ضبط اور علل و اسانید کے ماہر تھے۔ سمعانی کہتے ہیں میں نے خطیب کے سولہ شاگردوں سے حدیث پڑھی ہے۔ شرف اصحاب الحدیث، الکفایہ فی علوم الروایۃ الجامع اور تاریخ بغداد آپ کی مشہور کتابیں ہیں۔ تاریخ میں رطب و یابس لے آئے ہیں۔

چھٹی صدی میں تالیفِ حدیث نئے دور میں

اسلام کی پہلی پانچ صدیوں کے محدث مسندین تھے۔ ان ادوار میں راویوں کی جرح و تعدیل اور سندوں کے اتصال و انقطاع، مسائل کے اثبات و نسخ اور عقائد کے احقاق و ابطال کی بحثیں خوب رہیں چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں گو اپنے اسناد سے چلنے والے محدثین جیسے ابوالحسن رزین (۵۲۵ھ) ابن جوزی (۵۹۷ھ) مبارک بن محمد ابن اثیر الجزری (۶۰۶ھ) بھی رہے۔ لیکن محدثین کی زیادہ تر توجہ پچھلے ذخائر حدیث کو نئی نئی تالیفات میں لانے میں لگی رہی۔ محمد بن ابی نصر الحمیدی الاندلسی (۴۸۸ھ) جنہوں نے بغداد میں اصحاب دارقطنی سے حدیث سُنی تھی۔ انہوں نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو جمع کر کے کتاب الجمع بین الصحیحین لکھی۔

۱۔ ابو محمد حسین البغوی (۵۱۶ھ)

صاحب معالم التنزیل نے کتاب المصابیح[1]، شرح السنۃ لکھیں۔ اکمال میں ہے:۔

کان اماماً فی الفقه والحدیث وکان متورعاً ثبتاً حجة صحیح العقیدة فی الدین[2]

۲۔ ابوالحسن رزین بن معاویہ (۵۲۵ھ)

کتاب التجرید فی الجمع بین الصحاح لکھی۔ آپ حفاظ حدیث میں شمار کیے گئے ہیں۔ آپ نے بعض روایات اپنی سند سے بھی نقل کی ہیں۔ مشکوٰۃ میں ان کی بھی تخریج ملتی ہے۔

۳۔ المبارک بن محمد الجزری (۶۰۶ھ)

ابن اثیر جزری الجزیرہ کے رہنے والے تھے۔ پھر ۵۶۵ھ میں موصل منتقل ہو گئے۔ بغداد بھی گئے اور ائمہ کبار سے حدیث سُنی۔ حدیث اور لغت میں امام تھے۔ جامع الاصول اور النہایہ انہی کے تالیفات ہیں۔ تاریخ کامل ابن اثیر ان کی نہیں ان کے بھائی کی تالیف ہے۔

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح اسی پر مرتب کی گئی ہے۔ [2] الاکمال ص

۴۔ شیخ زکی الدین المنذری (۶۵۶ھ)

عبدالعظیم بن عبدالقوی زکی الدین ابو محمد المنذری اصلاً شامی ہیں۔ پھر مصر چلے آئے۔ امام بیہقی کے بیٹے المطہر اور حافظ علی بن المفضل المقدسی سے حدیث سنی۔ حافظ ابو محمد الدمیاطی، تقی الدین بن دقیق العید اور شریف عزالدین کے شاگرد ہیں۔

عدیم النظیر فی علم الحدیث علی اختلاف فنونہ۔ عالما بصحیحہ وسقیمہ ومعلولہ وطرقہ۔ متبحرا فی معرفۃ احکامہ ومعانیہ ومشکلہ۔ قیما بمعرفۃ غریبہ واعرابہ واختلاف الفاظہ، اماما حجۃ ثبتا ورعا۔ (طبقات الحفاظ)

۵۔ حافظ قطب الدین الحلبی (۷۳۵ھ)

کبار محدثین میں سے ہیں۔ مذہبا حنفی تھے۔ غنیۃ المستملی شرح منیۃ المصلی انہی کی تالیف ہے۔

۶۔ خطیب تبریزی (۷۴۳ھ)

کتاب المصابیح کی اساس پر مشکوٰۃ المصابیح تالیف کی اور حدیث کی پندرہ کتابوں سے تین مختلف فصول میں ان کے درجات کے مطابق روایات نقل کی ہیں۔ آپ شافعی المسلک ہیں۔

۷۔ حافظ جمال الدین الزیلعی (۷۶۲ھ)

صاحب نصب الرایہ (چار ضخیم جلدوں میں) جمال الدین الزیلعی فخر الدین الزیلعی شارح کنز سے کچھ متاخر ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے نصب الرایہ کی تلخیص الدرایہ کے نام سے کی ہے۔

۸۔ نورالدین ابوالحسن الہیثمی (۸۰۷ھ)

قاہرہ میں پیدا ہوئے اور وہیں فوت ہوئے۔ ابوالفتح میدومی، ابن ملوک، ابن قطروانی، سے مصر میں اور ابن الحموی اور ابن قیم ضیائیہ سے شام میں استفادہ کیا۔ زین الدین عراقی (۸۰۶ھ) کے ہمیشہ رفیق رہے۔ حجاز و شام کے سفر انہوں نے اکٹھے کیے۔ مجمع الزوائد ومنبع الفوائد جیسی

عظیم کتاب انہی کی تالیف ہے۔ اس میں آپ نے مسند امام احمد، طبرانی کے تین معجموں، مسند بزار اور زوائد ابی یعلیٰ سب کتابوں کو جمع کر دیا ہے۔ یہ کتاب مطبع انصار دہلی سے ۱۳۰۸ھ میں پھر مصر ۱۳۵۲ھ سے دس ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) نے نصف مجمع الزوائد ان سے پڑھی۔ مجمع الزوائد میں آپ نے کہیں کہیں راویوں پر جرح و نقد بھی کی ہے اور روایات پر صحت و سقم کا حکم بھی لگایا ہے۔ ان میں سے بعض امور میں حافظ ابن حجر کو اختلاف تھا۔ لیکن آپ نے ان کے احترام میں اس پر کچھ نہیں لکھا۔ حافظ ابن حجر آپ کی حدیثی مہارت کے پوری طرح قائل تھے۔ آپ نے حافظ ابو نعیم کی کتاب الحلیہ کو بھی ابواب پر مرتب کیا اور یہ بھی حدیث کی بڑی خدمت تھی۔ علماء میں آپ زین الدین العراقی صاحب المغنی عن حمل الاسفار فی تخریج ما فی الاحیاء من الآثار کے جانشین کے طور پر مشہور تھے۔

ابن اثیر جزری (۶۰۶ھ) کے جامع الاصول اور نور الدین الہیثمی کے مجمع الزوائد سے جمع الفوائد لکھی گئی۔ جو مطبع خیریہ میرٹھ سے ۱۳۴۵ھ میں شائع ہوئی۔

یہاں کتابوں کا تذکرہ مقصود نہیں۔ اسے ہم کتب حدیث کے تحت بیان کر چکے ہیں یہاں ہم انہی ناموں پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہاں اصل موضوع محدثین کا تذکرہ ہے جو اپنی حدیثی خدمات میں علمائے مسندین کے بعد علمائے مخرجین کی حیثیت سے حدیث کی برابر خدمت کرتے رہے اور اپنے وقت میں اس فن کی ریاست اور موضوع کی سیادت انہی کے ہاتھ میں رہی علمائے امت نے ہر دور میں جن کو ائمہ فن سمجھا۔ ان میں امام ابن صلاح (۶۴۳ھ) حسن صغانی لاہوری (۶۵۰ھ) امام نووی صاحب ریاض الصالحین (۶۷۶ھ) شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ (۷۲۸ھ) حافظ قطب الدین الحلبی (۷۳۵ھ) ابن قیم جوزیہ (۷۵۱ھ) ابن کثیر صاحب البدایہ والنہایہ (۷۷۴ھ) زین الدین العراقی (۸۰۶ھ) حافظ ذہبی (۸۴۸ھ) حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) حافظ بدر الدین العینی (۸۵۵ھ) علامہ ابن ہمام الاسکندری (۸۶۱ھ) وغیرہم اس فن میں روشنی کے مینار ہیں۔

یہ حضرات بیشتر برصغیر پاک و ہند سے باہر کے ہیں۔ اس برصغیر میں کون کون سے علماء

گذرے جنہوں نے نمایاں طور پر حدیث کی خدمت کی۔ ان میں سے بعض حضرات کے اسمار گرامی لکھ لیجیے۔ انہیں اپنی صف کے ائمہ حدیث میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ کچھ علمائے حدیث اور بھی ہوں گے

گجرات کے علاقہ احمد آباد کے شیخ راجح بن داؤد (۹۰۴ھ) شاگرد امام سخاوی، شیخ علی المتقی (۹۷۵ھ) صاحب کنز العمال من سنن الاقوال والافعال، شیخ محمد طاہر الفتنی (۹۸۶ھ) صاحب مجمع البحار، المغنی فی ضبط اسماء الرجال و تذکرۃ الموضوعات، شیخ رحمت اللہ سندھی (۹۹۴ھ) صاحب تلخیص تنزیہہ الشریعہ عن الاحادیث الموضوعہ، شیخ وجیہہ الدین علوی شارح شرح نخبۃ الفکر (۹۹۸ھ) مولانا محمد عثمان سندھی شارح بخاری (۱۰۰۸ھ) شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۰۵۲ھ) صاحب لمعات التنقیح شرح مشکوٰۃ المصابیح شیخ نورالحق محدث دہلوی (۱۰۷۳ھ) شارح صحیح البخاری، ابو یوسف محمد بن یعقوب بنانی لاہوری (۱۰۹۸ھ) صاحب الخیر الجاری بشرح صحیح البخاری والمعلم بشرح صحیح مسلم، شیخ محمد بن جعفر گجراتی صاحب زینۃ النکات فی شرح المشکوٰۃ (۱۱۱۱ھ) محدث ابوالحسن السندھی شارح صحاح ستہ (۱۱۳۸ھ) شیخ محمد افضل سیالکوٹی (۱۱۴۶ھ) شیخ نورالدین احمد آبادی (۱۱۵۵ھ) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۷۶ھ) علامہ مرتضیٰ زبیدی (۱۲۰۵ھ) صاحب عقود الجواہر المنیفہ و اتحاف النبلاء و تاج العروس حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی (۱۲۲۵ھ) صاحب تفسیر مظہری، مخدوم عبداللہ سیہوانی (۱۲۲۴ھ) مؤلف الازہار المتناثرہ فی الاخبار المتواترہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (۱۲۳۹ھ) شاہ رفیع الدین دہلوی (۱۲۳۳ھ) شاہ عبدالقادر محدث دہلوی (۱۲۳۰ھ) مولانا عبدالعزیز پرہاروی صاحب نبراس (۱۲۴۶ھ) شاہ محمد اسحق محدث دہلوی (۱۲۶۲ھ) شاہ عبدالغنی مجددی (ھ) محدث العصر مولانا مملوک علی (۱۲۶۷ھ) مولانا احمد الدین بگوی (۱۲۸۶ھ) نواب قطب الدین دہلوی شارح مشکوٰۃ (۱۲۸۹ھ) مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری (۱۲۹۷ھ) بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۲۹۷ھ) حضرت مولانا عبداللہ غزنوی (۱۲۹۸ھ) مولانا حیدر علی فیض آبادی صاحب منتہی الکلام (۱۲۹۹ھ) مولانا محمد مظہر نانوتوی (۱۳۰۲ھ) مولانا محمد یعقوب نانوتوی (۱۳۰۲ھ) حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی شارح موطا امام محمد (۱۳۰۴ھ) مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی (۱۳۱۳ھ) مولانا فخرالحسن گنگوہی (۱۳۱۵ھ) محدث محمد بن علی الیمنوی صاحب آثار السنن

(۱۳۲۲ھ) نواب صدیق حسن خاں (۱۳۰۷ھ) مولانا رشید احمد محدث گنگوہی (۱۳۲۳ھ) مولانا احمد حسن محدث امروہی (۱۳۳۰ھ) مولانا سید نذیر حسین دہلوی (۱۳۲۰ھ) حافظ عبدالمنان وزیر آبادی (۱۳۳۴ھ) مولانا شمس الحق عظیم آبادی شارح ابی داؤد و سنن دارقطنی (ھ) شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی (۱۳۳۹ھ) مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری شارح ابی داؤد (۱۳۴۶ھ) مولانا عبدالجبار غزنوی (ھ) حضرت مولانا محمد علی مونگیری (۱۳۴۶ھ) حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی (۱۳۴۷ھ) مولانا فخر الدین گنگوہی (۱۳۵۲ھ) امام العصر مولانا انور شاہ کشمیری (۱۳۵۲ھ) مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری شارح ترمذی (۱۳۵۳ھ) حضرت مولانا حسین علی واں بھچراں والے (۱۳۶۳ھ) مولانا عبدالعزیز گوجرانوالوی صاحب نبراس الساری (ھ) شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی شارح صحیح مسلم (۱۳۶۹ھ) محدث کبیر حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی ثم المدنی (ھ) حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی (۱۳۷۲ھ) حضرت مولانا محمد حسن محدث فیض پوری (۱۹۲۱ء) حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی (۱۳۷۷ھ) حضرت مولانا عبدالشکور لکھنوی (۱۳۸۱ھ) مولانا فخر الدین امروہوی شیخ الحدیث دیوبند (۱۳۹۲ھ) سید منظہر حسین حیدرآبادی صاحب زجاجۃ المصابیح (ھ) محدث دیوبند میاں سید اصغر حسین (ھ) محدث العصر مولانا ظفر احمد عثمانی مؤلف اعلاء السنن و قواعد علوم الحدیث (ھ) مولانا محمد ادریس کاندھلوی مؤلف التعلیق الصبیح علی المشکوٰۃ و تحفۃ الباری فی حل المشکلات البخاری (ھ) مولانا شمس الحق افغانی شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (ھ) حضرت مولانا عبدالرحمٰن کیمبلپوری سابق صدر مدرس مظاہر العلوم سہارنپور (ھ) شیخ الحدیث مولانا نصیر الدین غورغشتوی (ھ) محدث العصر مولانا یوسف البنوری شارح جامع ترمذی (ھ) حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب (ھ) حضرت مولانا خیر محمد جالندھری بانی خیر المدارس جالندھر (ھ) مولانا مفتی محمد شفیع صاحب شیخ الحدیث سراج العلوم سرگودھا (ھ) حضرت مولانا عبدالحنان اوکاڑوی ثم المدنی (ھ) قاضی شمس الدین صاحب گوجرانوالہ (ھ) شیخ الحدیث مولانا حافظ محمد گوندلوی از گوجرانوالہ

اہل حدیث

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ. امابعد:

اہل حدیث کا عنوان دو اصطلاحوں میں مختلف معانی کا حامل ہے. ① اہلحدیث باصطلاح قدیم ② اہلحدیث باصطلاح جدید ——— اصطلاح قدیم میں اس سے مراد وہ لوگ تھے جو حدیث روایت کرنے، پڑھانے، اس کے راویوں کی جانچ پڑتال کرنے اور اس کی شرح میں مشتغل رہتے تھے. انہیں محدثین بھی کہا جاتا تھا اور وہ واقعی اس فن کے اہل سمجھے جاتے تھے. سو اہل علم کی اصطلاح قدیم میں اہل حدیث سے مراد حدیث کے اہل لوگ تھے. اہل ادب، اہل حدیث، اہل تفسیر سب اسی طرح کی اصطلاحیں ہیں ——— حافظ محمد ابراہیم الوزیر لکھتے ہیں:

ومن المعلوم ان اهل الحديث اسم لمن عنى به وانقطع فى طلبه......

فهؤلاء هم اهل حديث من اى مذهب كانوا۔[1]

ترجمہ: یہ بات معلوم ہے کہ اہل حدیث اس طبقے کا نام ہے جو اس فن کے درپے ہو اس کی طلب میں منہمک رہے ایسے سب لوگ اہل حدیث ہیں. خواہ وہ کسی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں.

اس سے واضح ہوتا ہے کہ محدثین خواہ وہ کسی بھی فقہی مسلک سے تعلق رکھتے ہوں اس فن کے اعتبار سے اہلحدیث کہلاتے تھے. مولانا محمد ابراہیم صاحب میر بھی لکھتے ہیں:

بعض جگہ تو ان کا ذکر لفظ اہل حدیث سے ہوا ہے اور بعض جگہ اصحاب حدیث سے، بعض جگہ اہل اثر کے نام سے اور بعض جگہ محدثین کے نام سے، مرجع ہر لقب کا یہی ہے۔[2]

---

[1] الروض الباسم جلد ۱ صد ۱۲۲ [2] تاریخ اہلحدیث صد ۱۲۸

اصطلاح جدید میں اہل حدیث سے مراد اہل علم کا کوئی طبقہ نہیں، بلکہ ایک خاص فقہی مسلک ہے۔ جو ائمہ اربعہ میں سے کسی کی پیروی کا قائل نہیں۔ اہل حدیث کی یہ اصطلاح بہت بعد کی ہے قرون وسطیٰ میں یہ کسی فقہی مسلک کا نام نہ تھا۔ اصطلاح جدید میں اس سے مراد جماعت اہلحدیث ہے۔ اس میں پڑھے ہوئے اور اَن پڑھ دونوں طرح کے لوگ شامل ہیں۔

آج کے عنوان میں "اہلحدیث" کا لفظ اسی جدید اصطلاح میں ہے اور اس سے مراد جماعت اہلحدیث ہے۔ انہیں غیر مقلدین بھی کہتے ہیں۔ یہ حضرات براہِ راست حدیث سے انتساب کے مدعی ہیں۔ سو یہاں اہلحدیث سے مراد حدیث کے ماننے والے نہیں جیسا کہ اس کی لفظی دلالت ہے۔ کیونکہ حدیث کو تو سب مسلمان اپنے لیے حجت مانتے ہیں اور سب فرقے اس سے تمسک کے مدعی ہیں۔ جو حدیث کو نہیں مانتا وہ تو مسلمان ہی نہیں ہے۔ سو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کا صرف ایک فرقہ اہلحدیث یعنی حدیث کو ماننے والا ہو ——— اور باقی مسلمانوں کے بارے میں یہ سمجھا جائے کہ وہ حدیث کو نہیں مانتے اور ہیں وہ بھی مسلمان۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ خود ایک بڑی غلطی ہوگی۔

ع بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

حجیت حدیث کی بحث میں ہم کہہ آئے ہیں کہ جو شخص حدیث ماننے کا قائل نہ ہو۔ وہ مسلمان نہیں ہے۔ پس یہ تسلیم کرنے سے چارہ نہیں کہ یہاں "حدیث" سے مراد "حدیث کے ماننے والے" نہیں لیے جا سکتے۔ بلکہ وہ ایک خاص فرقہ ہے جو فقہی مسائل میں کسی امام کی پیروی کا قائل نہیں اور فروعات میں براہِ راست حدیث سے انتساب کا مدعی ہے۔

عوامی سطح پر اگر اہلحدیث کے معنی "حدیث کے ماننے والے" کیے جائیں تو اس سے منکرین حدیث کو بہت قوت ملے گی اور وہ برملا کہیں گے کہ مسلمانوں کا صرف ایک فرقہ جو برصغیر پاک و ہند میں پانچ فیصد سے زیادہ نہیں، حدیث ماننے کا قائل ہے۔ باقی سب مسلمان خواہ وہ کسی بھی مسلک سے تعلق رکھتے ہوں ان کے ہاں حدیث حجت نہیں اور اُسے ماننا ضروری نہیں۔ حدیث اگر سب مسلمانوں کے ہاں حجت سمجھی جاتی اور اس کا ماننا سب مسلمانوں کے نزدیک ضروری ہوتا تو ایک فرقے کا نام اہلحدیث کیوں ہوتا؟ جواباً گذارش

ہے کہ مسلمانوں کے کسی ایک فرقے کو "اہلحدیث" موسُوم کرنا پہلے دور سے بہت بعد کی اور ایک جدید اصطلاح ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں اس نام سے کوئی فقہی مسلک یا فرقہ معروف نہ تھا۔

اس تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ اس معنی کے لحاظ سے اپنے آپ کو اہلحدیث کہنا اسی طرح صحیح نہیں جس طرح منکرین حدیث کا اپنے آپ کو اہل قرآن کہنا صحیح نہیں۔ کیوں کہ قرآن کریم کو تو سبھی مسلمان مانتے ہیں۔ ان میں کسی ایک فرقے کی کیا تخصیص؟ اور حدیث کو سبھی مسلمان مانتے ہیں اس میں بھی کسی ایک کی کیا تخصیص؟ قرآن و حدیث کو اصُولاً تسلیم کیئے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا ——— ہاں جب اس عنوان سے ایک مسلک اپنی جگہ معروف ہو چکا۔ تو ضروری ہے کہ حدیث کے طلبہ اس سے بھی کچھ نہ کچھ تعارف ضرور رکھتے ہوں۔ لیکن ضروری ہے کہ وہ ہر دو اصطلاحوں کو پیش نظر بھی رکھیں۔

اہلحدیث متقدمین کی اصطلاح میں

قرُونِ اُولیٰ اور قرونِ وسطیٰ میں اہلحدیث سے مراد وہ اہل علم تھے۔ جو حدیث پڑھنے پڑھانے راویوں کی جانچ پڑتال اور حدیث کی شرح و روایت میں مشغول رہتے ہوں۔ حدیث ان کا فن ہو اور وہ علمی طور پر اس کے اہل ہوں۔ دوسرے لفظوں میں یُوں سمجھیئے کہ ان ادوار میں اہلحدیث سے محدثین مراد لیئے جاتے تھے۔ اگر کوئی علمی طور پر اس درجے میں نہیں کہ حدیث پر کوئی فیصلہ دے یا اس کے راویوں کو پہچانے۔ تو صاف کہہ دیا جاتا تھا کہ وہ اہلحدیث میں سے نہیں ہے عامی ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ (۷۲۸ھ) ایک مقام پر محدثین کی اس عادت پر کہ فضائل میں ضعیف حدیثیں بھی روایت کر دیتے ہیں۔ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

والبیھقی یروی فی الفضائل کثیرۃ ضعیفۃ بل موضوعۃ کما جرت عادۃ امثالہ من اھل الحدیث۔[1]

ترجمہ: بیہقیؒ فضائل میں بہت سے ضعیف بلکہ موضوع احادیث بھی لے آتے ہیں جیسے کہ ان جیسے اہلحدیث کی عادت جاری ہے۔

---

[1] منہاج السنۃ جلد ۳ صہ ۸

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ جس طرح علم نحو میں نحویوں کی طرف، لغات میں علمار لغت کی طرف، شعر میں علمار ادب کی طرف اور طب میں علمار طب کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اہل حدیث سے مراد بھی وہ علمار فن ہوں گے جن کی طرف اس فن میں رجوع کیا جاسکے۔

المنقولات فیہا کثیر من الصدق وکثیر من الکذب والمرجع فی التمییز بین ہذا وبین ہذا الی اہل الحدیث کما یرجع الی النحاۃ فی النحو ویرجع الی علماء اللغۃ فیما ہو من اللغۃ وکذلک علماء الشعر والطب وغیر ذلک فلکل علم رجال یعرفون بہ والعلماء بالحدیث اجل قدراً من ہولاء واعظمہم صدقاً واعلاہم منزلۃ واکثرہم دیناً[1]

ترجمہ۔ اس باب میں صدق وکذب پر مشتمل روایات بہت ہیں۔ سچی اور جھوٹی کی تمیز کے لیے اہلحدیث کی طرف ہی رجوع کرنا ہوگا۔ جیسے نحو کے باب میں نحویوں کی طرف، لغت کے باب میں علمار لغت کی طرف رجوع کیا جاتا ہے ——— ہر علم کے کچھ رجال ہوتے ہیں۔ انہیں اس علم کے پہلو سے جانا جاتا ہے۔ علمار حدیث ان سب سے زیادہ جلیل القدر ہیں۔ سب سے زیادہ سچے ہیں اور سب سے اونچا درجہ رکھتے ہیں اور ان میں دین بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔

حافظ جمال الدین الزیلعی (۷۶۲ھ) ابن دمیہ سے نقل کرتے ہیں

یجب علی اہل الحدیث ان یتحفظوا من قول الحاکم فانہ کثیر الغلط ظاہر السقط وقد غفل عن ذلک کثیر من جاء بعدہ وقلدہ فی ذلک[2]

ترجمہ۔ اہل حدیث پر لازم ہے کہ حاکم کے قول سے بچیں وہ بہت غلطیاں کرتے ہیں، ناقابل اعتماد ہیں۔ بہت سے لوگ جو ان کے بعد آئے اور اس میں اس کی پیروی کرتے رہے اس حقیقت سے ناواقف ہیں۔

دوسری صدی کے جلیل القدر محدث حضرت امام شافعی ایک جگہ حدیث لا وصیہ لوارث کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

---

[1] منہاج السنۃ جلد ۴ صفحہ ۱۰ از الاجوبۃ الفاضلہ صفحہ ۱۴۲ [2] نصب الرایہ جلد ۱ صفحہ ۳۴۵

انہ لا یثبتہ اہل الحدیث ولکن العامۃ تلقتہ بالقبول وعملوا بہ[1]

ترجمہ۔ اہلحدیث تو اسے ثابت نہیں مانتے لیکن عامۃ الناس نے اسے قبول کیا اور اس پر عمل کیا ہے۔

یہاں اہلحدیث کا لفظ عامہ کے مقابلہ میں ہے اور مراد اس سے اہل علم ہیں

محدثین میں ہلال بن یساف کے بارے میں ایک سوال اٹھا کہ اس نے وابصہ بن معبد اسدی کو پایا ہے یا نہیں؟ اور یہ روایت کس طرح ہے۔ اس پر امام ترمذیؒ لکھتے ہیں:۔

فاختلف اہل الحدیث فی ہذا فقال بعضہم حدیث عمرو بن مرۃ عن ہلال بن یساف عن عمرو بن راشد عن وابصۃ اصح وقال بعضہم حدیث حصین عن ہلال بن یساف عن زیاد بن ابی الجعد عن وابصۃ اصح قال ابو عیسٰی وہذا عندی اصح من حدیث عمرو بن مرۃ[2]

ترجمہ۔ اہلحدیث کا اس میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں عمرو بن مرہ کی روایت زیادہ صحیح اور بعض کہتے ہیں حصین کی روایت زیادہ صحیح ہے۔

یہ عبارت بڑی وضاحت سے بتلا رہی ہے کہ اہلحدیث سے مراد یہاں محدثین ہیں۔ سند میں محدثین کے اختلاف کو اختلاف اہلحدیث کہہ کر ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں فقہی مسلک کا کوئی فرقہ مراد نہیں ہے جس میں تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ دونوں قسم کے لوگ ہوں۔ یہ تیسری صدی ہجری کی تحریر صریح طور پر بتلا رہی ہے کہ ان دنوں اہلحدیث سے مراد محدثین لیئے جاتے تھے۔ نہ کہ کوئی فقہی مسلک یا فرقہ۔

ابو ابراہیم الانصاری المدینی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

لیس ہو بالقوی عند اہل الحدیث[3] وہ اہلحدیث کے ہاں قوی نہیں ہے۔

ایک راوی کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

تکلم فیہ بعض اہل الحدیث من قبل حفظہ[4] اس میں بعض اہلحدیث نے حفظ کی رو سے کلام کیا ہے

پھر ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

---

[1] التمہید لما فی المؤطا من المعانی والاسانید جلد ۱ صہ [2] جامع ترمذی جلد ۱ صہ ۳۱ [3] ایضاً جلد ۲ صہ ۴۲ [4]

[4] ایضاً جلد ۲ صہ ۴۲

وھو ضعیف عند اھل الحدیث۔ وہ اہل حدیث کے ہاں ضعیف ہے۔

امام ترمذی اہلحدیث کو کہیں کہیں اصحاب الحدیث کہہ کر بھی ذکر کرتے ہیں حدیث لا تزال طائفۃ من امتی ظاھرین علی الحق کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان سے مراد اصحاب الحدیث ہیں امام بخاری نے بھی تصریح کی ہے کہ اس سے مراد علم حدیث کے ماہر اہل العلم ہیں[۱]

خطیب بغدادی (۴۶۲ھ) ابو عبداللہ الحاکم کے اس زعم پر کہ حدیث طیبہ اور حدیث من کنت مولاہ صحیحین کی شرطوں کے مطابق ہیں جرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

فانکر علیہ اصحاب الحدیث ذالک ولم یلتفتوا الی قولہ ولا صوبوہ علی فعلہ[۲]

ترجمہ: اصحاب الحدیث نے اس پر انکار کیا ہے اور اس کی بات پر توجہ نہیں کی اور اسے اس کے عمل میں درست نہیں کہا۔

حافظ ابن عبدالبر مالکی (۴۶۳ھ) بھی ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

وقالت فرقۃ من اھل الحدیث ان وطئ فی الدم فعلیہ دینار وان وطئ فی انقطاع الدم فنصف دینار ورأت فرقۃ من اھل الحدیث تطویل السجود فی ذالک[۳]

ترجمہ: اہل حدیث کی ایک جماعت نے کہا ہے اگر اس نے ایام میں اس سے صحبت کی تو اسے ایک دینار صدقہ لازم آئے گا اور بعض اہل حدیث نے کہا ہے کہ اس پر دراز سجدہ اس کے ذمہ ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اہلحدیث میں فقہی مسلک کے کئی فرقے تھے۔ اہلحدیث خود کوئی فقہی مسلک یا فرقہ نہ تھا نہ ان کی کوئی علیحدہ جماعت بندی تھی۔

امام نووی شارح صحیح مسلم ساتویں صدی ہجری کے نامور محدث ہیں۔ آپ نے ایک مقام پر حذف الفاظ کی بحث کی ہے۔ اس میں آپ محدثین کی عادت ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

جرت عادۃ اھل الحدیث بحذف قال ونحوہ فیما بین رجال الاسناد فی الخط وینبغی للقاری ان یلفظ بھا۔[۴]

---

[۱] صحیح البخاری جلد ۲ صفحہ ۱۰۸۷ [۲] تاریخ بغداد جلد ۵ صفحہ ۴۷۴ [۳] تہمید جلد ۳ صفحہ ۱۷۶ [۴] مقدمہ شرح نووی صفحہ ۱۹ (دہلی)

ترجمہ۔ اہل حدیث کا طریقہ تحریری رجال اسناد میں قال وغیرہ کے الفاظ کو حذف کرتا رہا ہے۔ لیکن قاری کو چاہیئے کہ وہ انہیں بولا کرے۔

ظاہر ہے کہ یہاں اہل حدیث سے مراد اصحاب اہل فن علماء حدیث ہی ہو سکتے ہیں نہ کہ کسی ایک فقہی مسلک کے عوام۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ساتویں صدی ہجری تک اہل علم کے ہاں اہلحدیث سے مراد محدثین ہی لیئے جاتے تھے۔ ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:۔

یجوز عند اہل الحدیث التساہل فی الاسانید الضعیفۃ وروایۃ ماسوی الموضوع من الضعیف والعمل بہ۔[1]

ترجمہ۔ اہل حدیث کے ہاں اسانید ضعیفہ میں بشرطیکہ موضوع کی حد تک نہ ہوں۔ درگزر سے کام لینا اور اس پر عمل کرنا جائز رکھا گیا ہے۔

صحیح البخاری کے الفاظ فاجازوہ کی شرح میں حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) لکھتے ہیں:۔

فمعنی قول البخاری فاجازوہ ای تبلوہ منہ ولم یقصدوا الاجازۃ المصطلحۃ بین اہل الحدیث۔[2]

ترجمہ۔ امام بخاری نے فاجازوہ کے الفاظ اجازت کے اس معنی میں استعمال نہیں کیئے۔ جو اہلحدیث کی اصطلاح ہے۔

حافظ ابن حجر کے ان الفاظ سے یہ بات واضح ہے کہ ان دنوں اہلحدیث سے کوئی فقہی مکتب فکر ہرگز مراد نہ تھا۔ بلکہ اس سے اہل فن محدثین ہی مراد لیئے جاتے تھے اور ان کی اپنی اپنی اصطلاحات تھیں اور اس سے یقیناً اہل علم کا ہی ایک طبقہ مراد ہوتا تھا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رح ایک اور مقام پر حدیث لن تزال ہذہ الامۃ قائمۃ علی امر اللہ کی شرح میں لکھتے ہیں:۔

وقد جزم البخاری بان المراد بہم اہل العلم بالآثار وقال احمد بن حنبل ان لم یکونوا اہل الحدیث فلا ادری من ہم۔[3]

ترجمہ۔ امام بخاری نے پورے یقین سے کہا ہے کہ اس سے مراد احادیث کے اہل علم ہیں اور امام احمد فرماتے ہیں کہ اگر اس سے اہلحدیث مراد نہ ہوں تو میں نہیں جانتا کہ پھر کون لوگ مراد ہوں گے۔

---

[1] تقریب بشرح التدریب صفحہ ۱۹۶ [2] فتح الباری جلد ا صفحہ ۱۴۹ [3] فتح الباری صفحہ ۱۲۴ جلد ا

لانورث ما ترکناہ صدقۃ مشہور حدیث ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ انبیاء کی وراثت نہیں ہوتی۔ ہم جو چیز چھوڑیں وہ صدقہ میں جائے گی۔ شیعہ علماء نے اسے اپنے معتقد کے خلاف سمجھتے ہوئے لا نورث کے الفاظ کو لا یورث سے بدل دیا۔ اب معنی یہ ہو گئے کہ ہم مسلمان جو چیز صدقہ میں چھوڑیں اسے وراثت میں نہ لایا جائے۔ اب یہ مسئلہ وراثت انبیاء سے نکل کر ایک عام ضابطہ میں آگیا کہ صدقہ میں دی گئی چیز پھر اپنی ملکیت میں نہیں لی جاتی۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ یہاں دیکھنا چاہیئے محدثین کی اصل روایت کیا اور انہوں نے حدیث کو کن الفاظ میں ضبط کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

والذی توارد علیہ اہل الحدیث فی القدیم والحدیث لانورث بالنون [1]

یہاں اہلحدیث سے مراد فن حدیث کے ماہرین ہیں۔ اس وقت تک اہلحدیث کا لفظ انہی معنوں میں بولا جاتا تھا جو عہد قدیم میں اس لفظ کے معنی تھے۔ یہ لفظ اہل علم کے اس طبقہ کے لیئے استعمال ہوتا تھا جو محدثین تھے۔ یہ کسی ایک مکتب فکر یا فرقے کا نام نہ تھا۔ یہ ماہرین فن سب اس پر متفق ہیں کہ اصل روایت نون سے ہے یا سے نہیں۔ اہل حدیث الفاظ حدیث کو ان کے اصل مراجع و مصادر سے پہچانتے ہیں اور وہ محدثین ہیں۔

سو اس میں کوئی شک نہیں کہ اہلحدیث باصطلاح قدیم سے مراد فن حدیث کے جاننے والے تھے۔ اہل العلم بالآثار سے یہی مراد ہے۔ علامہ شامی محقق ابن ہمام (۸۶۱ھ) سے یہ بحث نقل کرتے ہیں کہ خوارج کو کافر کہا جائے یا نہ؟ محقق ابن ہمام نے لکھا ہے:۔

ذهب بعض المحدثين الى كفرهم قال ابن المنذر ولا اعلم احداً وافق اهل الحديث على تكفيرهم [2]

ترجمہ: بعض محدثین ان کی تکفیر کے قائل ہیں ابن المنذر نے کہا ہے میں نہیں جانتا کہ کسی نے اس پر محدثین کی موافقت کی ہو۔

---

[1] فتح الباری کما فی حاشیۃ ابی داؤد ج۲ ص۴۱ [2] ردالمحتار جلد ۳ ص۴۲۸

نویں صدی کے اہلحدیث میں حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) اور حافظ ابن ہمام اسکندری (۸۶۱ھ) کے ناموں سے کون واقف نہیں۔ پہلے بزرگ شافعی ہیں اور دوسرے حنفی اور دونوں اہل حدیث سے حدیث کے علمار فن مراد لیتے تھے۔ ان الفاظ سے کوئی خاص فقہی مسلک مراد نہیں لیا جاتا تھا۔

اہل فن محدثین میں پھر کئی فرقے اور مسالک تھے۔ ان میں حنفی بھی تھے اور شافعی بھی۔ اہلحدیث خود کسی فرقے کا نام نہ تھا۔ کسی محدث کا فقہی مسلک اس کے اہلحدیث ہونے کے خلاف نہ سمجھا جاتا تھا۔ محدث ہونے کے پہلو سے سب اہل حدیث تھے

نویں صدی کا حال اور اس دور کے علمار کی اصطلاح ابن ہمام کی اس تحریر سے ظاہر ہے پھر علامہ شامی (۱۲۵۲ھ) اسے تیرہویں صدی ہجری میں نقل کرتے ہیں اور اس میں کہیں اختلاف ذکر نہیں کرتے۔ کہ اہلحدیث نام سے ان دنوں کوئی غیر مقلد جماعت بھی مراد لی جاتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک اہلحدیث سے وہ اہل علم ہی مراد لیئے جاتے تھے جو فن حدیث میں حاذق اور صاحب الرای ہوں۔ جس طرح تفسیر پڑھنے پڑھانے والے اہل تفسیر اور زبان پر کامل دسترس رکھنے والے اہل لغت کہلاتے تھے۔ محدثین کا یہ طبقہ اہل حدیث کے نام سے بھی کبھی ذکر ہوتا تھا۔ ہندوستان میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے حدیث کی باقاعدہ اشاعت ہوئی آپ کے دور تک لفظ اہل الحدیث اسی پرانی اصطلاح سے جاری تھا حضرت شیخ ایک مقام پر لکھتے ہیں۔

وکانوا لہ اصحاب من التابعین و اتباعھم وکلھم کانوا اھل الحدیث والفقہ والزھد والورع۔[1]

ترجمہ: تابعین اور تبع تابعین میں ان کے کئی ساتھی تھے اور وہ سب اہلحدیث و فقہ و زہد و ورع تھے۔

اہلحدیث سے مراد ترک تقلید کے نام سے ایک فقہی مسلک ہو، یہ جدید اصطلاح اسلام کی پہلی تیرہ صدیوں میں کہیں نہیں ملتی۔ اس کا آغاز چودہویں صدی ہجری سے ہوتا ہے۔ یا یوں سمجھ لیجئے کہ تیرہویں صدی کے آخر میں ہندوستان میں اس کے لیئے کچھ حالات سازگار ہو گئے تھے۔

---

[1] انوار السنۃ لرداد الجنۃ صد ۱۲ مطبع حسامیہ دیوبند

اہلحدیث باصطلاح دورِ جدید

اس اصطلاح جدید میں جماعت اہلحدیث سے مراد پاک و ہند کا ایک معروف دینی حلقہ ہے جو جمہور اہل السنۃ مسلمانوں سے ترکِ تقلید پر مختلف ہے. لیکن بنیادی عقائد میں یہ حضرات زیادہ تر اہل السنۃ ہی ہیں. ان کے حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ سے تقریباً اسی قسم کے فروعی اختلافات ہیں. جس طرح کے اختلافات مذاہب اربعہ میں آپس میں ہیں. کچھ ایسے اختلافات بھی ہیں جن میں یہ چاروں اماموں کے خلاف ہیں. جیسے "طلاق ثلاثہ ایک مجلس میں" اسے یہ ایک ہی طلاق قرار دیتے ہیں اور چاروں اماموں میں سے ایک بھی اس طلاق کے ایک ہونے کا قائل نہیں. امام نووی شارح صحیح مسلم لکھتے ہیں:۔

قال العلماء فيمن قال لامرأته انت طالق ثلثاً. فقال الشافعي ومالك وابو حنيفة واحمد وجماهير العلماء من السلف والخلف يقع الثلاث.[1]

ائمہ اربعہ ہی نہیں سلف و خلف کے جمہور علماء کہتے ہیں طلاقیں تین واقع ہو جاتی ہیں

اسی طرح یہ حضرات آٹھ رکعت تراویح کے قائل ہیں. حالانکہ چاروں اماموں میں سے ایک بھی بیس سے کم کا قائل نہیں. مسجد حرام اور مسجد نبوی میں آج تک بیس رکعت تراویح ہی پڑھی جا رہی ہیں اور یہی حنابلہ کا موقف ہے. امام شافعی بھی اس میں جمہور امت کے ساتھ ہیں. امام ترمذی لکھتے ہیں:۔

اكثر اهل العلم على ماروى عن علي وعمر وغيرهما من اصحاب النبي عشرين ركعة وهو قول سفيان الثوري وابن المبارك والشافعي وقال الشافعي هكذا ادركت اهل مكة يصلون عشرين ركعة.[2]

اس قسم کے چند مسائل ہیں جن میں غیر مقلدین حضرات جمہور اہل السنۃ والجماعت سے مختلف ہیں. لیکن ان جزوی اختلافات کو دبا یا جائے اور دیگر فروعی اختلافات کو توسع عمل پر محمول کیا جائے تو اختلاف مسلک کے باوجود یہ حضرات خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ کے موضوع پر جمہور اہل السنۃ کے ساتھ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو سکتے ہیں. شیعہ یا معتزلہ یا خوارج کے بالمقابل سُنّی کا لفظ آئے

---

[1] شرح صحیح مسلم جلد ۱ ص ۴۷۸ [2] جامع ترمذی جلد ۱ ص ـــ طبع دوم ص ۱۳۰

تو اس سُنّی دائرہ میں جماعت اہل حدیث بھی شامل ہوگی. ہاں ان میں جو لوگ ائمہ کرام کے گستاخ ہوں یا فقہ حنفی کے بعض باریک مسائل پر تمسخر اور استہزاء کا انداز اختیار کرتے ہوں وہ اہلحدیث ہونے کے مدعی ہونے کے باوجود اس دائرہ میں جو احترام سلف پر قائم ہے شامل نہ رہیں گے۔ انہیں اہلحدیث کہنا یقیناً غلط ہوگا۔ اور اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ وہ اہل سنت میں داخل نہیں ہیں۔

۱۹۵۶ء میں پاکستان میں سکندر مرزا کا دور تھا۔ پنجاب میں نواب مظفر علی قزلباش برسر اقتدار تھے۔ شیعہ سُنّی آویزش زوروں پر تھی۔ پولیس افسران شیعوں کو دھڑا دھڑ ماتمی جلوسوں کے لائسنس دے رہے تھے۔ جہاں جہاں نئے لائسنس جاری ہوتے فرقہ وارانہ اختلافات کی آگ اور بھڑکتی جاتی محسوس ہوتا کہ یہ لائسنس ایک فرقے کے مطالبہ کو پورا کرنے کیلئے نہیں بلکہ فرقہ وارانہ فضا کو گرم کرنے کے لیئے ہی جاری کیئے جا رہے ہیں۔ سُنّی دائروں میں ان حالات کے باعث سخت اضطراب تھا۔

ان دنوں حقوق اہل السنّۃ کے تحفظ کے لیئے "سنّی بورڈ" کا قیام عمل میں آیا تھا جس میں شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی قادریؒ، مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ، مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری، مولانا عبدالستار خاں نیازی اور راقم خالد محمود عفا اللہ عنہ سب اس سُنّی بورڈ کے رکن تھے۔ اُن دنوں سُنّی دائرہ ان سب مسالک عمل کو محیط سمجھا گیا تھا۔

سو اس اصطلاح جدید میں اہلحدیث سے مراد اسلام کے بنیادی عقائد پر کوئی مختلف گروہ نہیں۔ چند فروعی امتیازات کا حامل ایک طبقہ عمل ہے۔ جو ترک تقلید کے عنوان سے حدیث سے براہ راست نسبت کا مدعی ہے۔ جن مسائل میں اختلاف ہے وہ زیادہ تر وہی ہیں جو ائمہ اربعہ کے مابین بھی مختلف فیہ ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں۔ کہ انسان حق سے تبھی نکلتا ہے جب ان چاروں مذاہب کے دائرہ عمل سے باہر آ جائے اور ایسے مواقع اس باب میں کم ہیں۔ اور جو ہیں ان میں واقعی اصولی اختلاف ہے تقلید ہمیشہ سے جائز رہی ہے اسے حرام کہنا یقیناً حرام ہے۔

ہندوستان میں جماعت اہلحدیث بہ اصطلاح جدید کا قیام اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات کے بہت بعد شروع ہوا ہے۔ فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کے وقت ہندوستان کے کسی گوشہ میں فقہی اختلاف مسلک کی آواز نہ اُٹھی تھی۔ سب اہل السنّۃ والجماعت ایک ہی فقہی مسلک کے پیرو تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے والد حضرت شاہ عبدالرحیم اس عظیم علمی خدمت

میں شریک تھے۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں:۔

خلاصہ حال ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ ہے کہ جب سے یہاں اسلام آیا ہے چونکہ اکثر لوگ بادشاہوں کے طریقہ اور مذہب کو پسند کرتے ہیں۔ اس وقت سے آج تک یہ لوگ (ہندوستان کے مسلمان) مذہب حنفی پر قائم رہے اور ہیں اور اسی مذہب کے عالم اور فاضل اور قاضی اور مفتی اور حاکم ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک جم غفیر نے مل کر فتاوٰے ہندیہ جمع کیا اور اس میں شاہ عبدالرحیم صاحب والد بزرگوار شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی بھی شریک تھے۔[1]

مغلیہ سلطنت کے زوال پر مسلمانوں پر کوئی اجتماعی گرفت نہ رہی تو عام ذہن کچھ آزادی فکر کی طرف مائل ہوئے۔ نواب صدیق خاں صاحب اس سے پہلے لکھ آئے ہیں:۔

کتب تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو امن و آسائش و آزادگی اس حکومت انگریزی میں تمام خلق کو نصیب ہوئی کسی حکومت میں بھی نہ تھی اور وجہ اس کی سوائے اس کے کچھ نہیں سمجھی گئی کہ گورنمنٹ نے آزادی کامل ہر مذہب کو دی۔[2]

عہد جدید کی اس آزادی میں میں تقلید کا بند ٹوٹا اور پھر دیکھتے دیکھتے کچھ لوگ مختلف کشتیوں میں بہہ نکلے اور تاریخ نے مسلمانوں کا وہی حال کیا جو منتشر اقوام کا ہوتا ہے۔ بیشتر اس کے کہ اہلحدیث باصطلاح جدید پر کچھ تاریخی بحث کی جائے۔ کہ اس نام سے ایک فقہی مسلک کی ابتدا کب سے ہوئی اور اس نام سے ایک فرقہ عمل کب سے موسوم ہوا۔ مناسب ہو گا کہ مختصر طور پر یہ بتلا دیا جائے کہ اورنگ زیبؒ سے بہت پہلے ہندوستان میں علم حدیث آچکا تھا اور اس وقت تک لفظ اہلحدیث اصطلاح قدیم کے مطابق ہی چلا آرہا تھا۔

ہندوستان میں نامور محدثین کی آمد

علماء حدیث کی یہاں تشریف آوری مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی شروع ہو چکی تھی۔ پانچویں صدی ہجری میں علم حدیث لاہور میں آچکا تھا۔ یہ عہد غزنوی کی بات ہے۔ شیخ اسمٰعیل کے بارے میں مؤرخین لکھتے ہیں:۔

---

[1] ترجمان وہابیہ تصنیف نواب صدیق حسن خاں مرحوم صفحہ ۱۰   [2] ایضاً صفحہ ۱۶

اوّل کہ علم حدیث بلاہور آوردہ او بود ـــــ پھر شیخ صغانی لاہوری (٦٥٠ھ) آئے اور صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی قولی احادیث مجموعہ مشارق الانوار کے نام سے جمع کیں۔ یہ کوششیں ان دنوں کے مسلمانوں کے ذوقِ حدیث کا پتہ دے رہی ہیں ـــــ شیخ نورالدین شیرازی (٨١٦ھ) احمد شاہ اوّل کے عہد میں ہندوستان کے علاقہ گجرات میں آچکے تھے۔ اُن کی صحیح بخاری کی سند بہت عالی تھی۔ اور دُور دُور سے علماء آپ سے سند لینے آتے تھے۔ مولانا سید الاوّل چشتی جونپوری کی خدماتِ حدیث کو کون بھلا سکتا ہے۔ یہ صحیح نہیں کہ چشتی حضرات علمی پہلو سے اہل حدیث نہ تھے۔ آخر یہ محدث جلیل بھی تو سلسلہ چشتیہ سے ہی تھے۔ پھر شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی کے شاگرد حافظ شمس الدین سخاوی کے دو شاگرد شیخ وجیہ الدین مالکی (٩٢٩ھ) اور شیخ جمال الدین محمد بن عمر حضرمی (٩٣٠ھ) ہندوستان آئے ـــــ پھر شیخ محمد طیب سندھی (٩٦٨ھ) شیخ علاؤالدین علی المتقی (٩٧٥ھ) پٹنہ کے شیخ طاہر صاحب مجمع البحار (٩٨٦ھ) شیخ عبدالوہاب المتقی (ھ) اور ان کے شاگرد شیخ عبدالحق محدث دہلوی (١٠٥٢) شیخ علی بن احمد (١٠٤٣ھ) صاحب السراج المنیر فی شرح الجامع الصغیر، شیخ نورالحق محدث دہلوی (١٠٧٣ھ) شارح بخاری کو دیکھئے۔ یہ سب حضرات اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی جگہ حدیث کی بڑی خدمات سرانجام دے چکے تھے۔ شیخ ابوالحسن سندھی (١١٣٩ھ) کے صحاح ستہ پر حواشی اب تک اہل علم کا عظیم سرمایۂ حدیث سمجھے جاتے ہیں۔ فقہی پہلو سے ان میں سے بیشتر محدثین حنفی تھے۔ مگر فن کے لحاظ سے بلاشبہ وہ اہلحدیث تھے۔ اور انہوں نے پوری عمر حدیث کی خدمت میں گزاری ـــــ سو اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ علم حدیث ہندوستان میں بہت پہلے دور میں آچکا تھا۔

پھر بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری میں حدیث کی نہضت علمی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی کے ہاں جمع ہو چکی تھی۔ یہ سب حضرات محدث کے نام سے معروف تھے اور پورے ہندوستان میں انہی محدثین دہلی کی سند چلتی تھی۔ حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اور حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی حضرت شاہ عبدالعزیز کے چھوٹے بھائی تھے اور محدثین کا یہ سارا گھرانہ علم حنفیہ کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ جناب نواب صدیق حسن خاں صاحب (١٣٠٧ھ) اس خاندان کو

بیت علم الحنفیہ[5] کہا کرتے تھے۔ اس سے واضح ہے کہ ان دنوں مقلد ہونے اور محدث ہونے میں کوئی تباین کی نسبت نہ تھی ان میں تفاوت نہ سمجھا جاتا تھا۔ تقلید سے ان کے مسلک کا اظہار ہوتا تھا اور حدیث سے ان کے فن کا پتہ چلتا تھا ——— اور حق یہ ہے کہ ان دنوں تک ہندوستان میں ترکِ تقلید کے عنوان سے "اہلحدیث" نام سے کوئی فقہی مسلک معروف و موسوم نہ تھا۔

شاہ محمد اسحٰق صاحب محدث دہلوی (۱۲۶۲ھ) کے شاگردوں میں جناب میاں نذیر حسین صاحب (۱۳۲۰ھ) سب سے پہلے اس باب میں نمایاں ہوئے۔ ان سے پہلے بنارس کے نومسلم عبدالحق نامی تقلید کے خلاف کچھ کام کرچکے تھے۔ صادق پور کے مولانا ولایت علی بھی کچھ اس طرف مائل ہوئے تھے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ اس سلسلہ کے شیخ الکل جنہوں نے ہندوستان میں ترکِ تقلید کے عنوان سے ایک علیحدہ فقہی مسلک کی بنا رکھی۔ وہ جناب میاں نذیر حسین صاحب دہلوی ہی تھے۔ جناب میاں صاحب بھی کلیۃً فقہ حنفی کے خلاف نہ تھے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ جہاں تک حدیث سے براہِ راست مسئلے سکیں۔ فقہ کی طرف رجوع نہ کیا جائے۔ اور جو مسائل حدیث میں نہ مل سکیں۔ ان میں فقہ حنفی پر اعتماد کرلیا جائے۔ فتاوے نذیریہ میں میاں صاحب کی یہی روش کارفرما رہی ہے اور جگہ جگہ فقہ حنفی سے استناد کیا گیا ہے۔

اہلحدیث ایک فرقہ کی صورت میں

ابتداء میں اس جماعت کے لوگ کہیں اہلحدیث کہیں محمدی اور کہیں موحد کہلاتے تھے۔ جماعت کسی ایک نام سے متعارف نہ تھی۔ اُن کے مخالفین انہیں وہابی یا غیر مقلد کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ مولانا محمد حسین بٹالوی صاحب نے انگریزی حکومت کو درخواست دی کہ اُن کے ہم خیال لوگوں کو سرکاری طور پر اہلحدیث کا نام دیا جائے۔ اس کے بعد اس اصطلاح جدید میں اہلحدیث سامنے آئے اور ہندوستان میں ترکِ تقلید کے عنوان سے ایک مستقل مکتبِ فکر کی بنیاد پڑگئی۔ تاہم یہ صحیح ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے باہر اس نام سے (اہلحدیث یا صطلاح جدید) اب تک کوئی فرقہ موجود نہیں ہے۔

---

[5] الحطہ ص۔ ھدایۃ السائل إلی أدلۃ المسائل ص

ہندوستان کے مشہور عالم دین مولانا محمد شاہ صاحب شاہجہانپوری لکھتے ہیں:۔

پچھلے زمانہ میں شاذ و نادر اس خیال کے لوگ کہیں ہوں تو ہوں مگر اس کثرت سے دیکھنے میں نہیں آئے۔ بلکہ ان کا نام ابھی تھوڑے ہی دنوں سے سنا ہے۔ اپنے آپ کو تو وہ اہلحدیث یا محمدی یا موحد کہتے ہیں۔ مگر مخالف فریق میں ان کا نام غیر مقلد یا وہابی یا لامذہب لیا جاتا ہے[1]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک جماعت کسی ایک نام سے موسوم نہ تھی۔ مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی کی کوششوں سے یہ جماعت اہلحدیث (باصطلاح جدید) کے نام سے موسوم ہوئی۔ مولانا عبدالمجید صاحب سوہدروی لکھتے ہیں:۔

مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی نے اشاعۃ السنّۃ کے ذریعہ اہلحدیث کی بہت خدمت کی۔ لفظ وہابی آپ ہی کی کوششوں سے سرکاری دفاتر اور کاغذات سے منسوخ ہوا اور جماعت کو اہلحدیث کے نام سے موسوم کیا گیا[2]

سر چارلس ایچی سن صاحب جو اس وقت پنجاب کے لفٹیننٹ گورنر تھے آپ کے خیر خواہ تھے۔ انہوں نے گورنمنٹ ہند کو اس طرف توجہ دلا کر اس درخواست کو منظور کرایا اور پھر مولانا محمد حسین صاحب نے سیکریٹری گورنمنٹ کو جو درخواست دی اس کے آخری الفاظ یہ تھے:۔

استعمال لفظ وہابی کی مخالفت اور اجرا نام اہلحدیث کا حکم پنجاب میں نافذ کیا جائے[3]

وہابی نام سے اختلاف کی وجہ

وہابی نام سے اس کی اسمی مناسبت کے سبب شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیرو مراد لیئے جاتے ہیں اور چونکہ یہ سب حضرات مقلد تھے اور امام احمد بن حنبل کی تقلید کرتے تھے اس لیئے اہلحدیث جو ترک تقلید کے عنوان سے جمہور اہلسنت سے علیحدہ سمجھے جاتے ہیں مقلدین کی طرف اپنی نسبت پسند نہ کرتے تھے۔ اس لیئے وہ لفظ وہابی کو اپنے لیئے پسند نہ کرتے تھے۔

---

[1] الارشاد الی سبیل الرشاد صفحہ ۱۳ [2] سیرت ثنائی صفحہ ۳۷۲ [3] اشاعۃ السنّۃ جلد ۱۱ شمارہ نمبر ۲ صفحہ ۲۶

مقلدین سے غیر مقلدین کو اصولی اختلاف رہا ہے۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

سو مذہب نجدی مذکور کا حنبلی تھا اور اس نے بوہروں اور بدوؤں پر چڑھائی کی تھی۔ اس مذہب (حنبلی مذہب) کی کتابیں ہندوستان میں رائج نہیں ہیں [1]

مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری نے بھی لکھا۔

محمد بن عبدالوہاب نجد میں پیدا ہوا تھا جو مذہب حنبلی کا پیرو تھا محمد بن عبدالوہاب مقلد تھا اور اہلحدیث کے نزدیک تقلید جائز نہیں۔ اہلحدیث کو اس سے مسئلہ تقلید میں اختلاف تھا اور اب بھی ہے۔ [2]

نوٹ: موجودہ اہلحدیث اب شیخ کی مخالفت نہیں کرتے تاکہ سعودی عرب سے مالی امداد بند نہ ہو جائے۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب خود لکھتے ہیں:۔

ونحن ایضاً فی الفروع علی مذهب الامام احمد بن حنبل ولا ننکر علی من قلد الائمة الاربعة دون غیرهم لعدم ضبط مذاهب الغیر۔ [3]

ترجمہ: ہم فروعات میں امام احمد کے مذہب پر ہیں اور مذاہب اربعہ میں سے کوئی کسی کی تقلید کرے ہم اس پر کوئی نکیر نہیں کرتے۔

یہ تو شیخ کے الفاظ تھے۔ اب سوانح نگار کے الفاظ بھی سن لیجئے:۔

وانهم الحنابلة متعصبون لمذهب الامام احمد فی فروعه ککل اتباع المذاهب الاخری فهم لا یدعون لا بالقول ولا بالکتابة ان الشیخ اتی بمذهب جدید ولا اخترع علماً غیر ما کان عند السلف۔ [4]

ترجمہ: اور یہ سب حنبلی المذہب تھے امام احمد کے مذہب پر سختی سے کاربند تھے جیسے کہ دوسرے مذاہب کے پیرو اپنے اپنے امام کے طریقے پر کاربند ہیں زبانی اور تحریری انہوں نے کبھی نہیں کہا کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کوئی نیا دین لائے اور انہوں نے کوئی نیا علم دریافت کیا جو پہلوں کے پاس نہ تھا۔

---

[1] ترجمان وہابیہ ص۱۵ [2] فتاویٰ ثنائیہ جلد ۱ ص۲۱۴ [3] سیرۃ الشیخ محمد بن عبدالوہاب ص۵۶ [4] ایضاً ص۹۰

شیخ محمد بن عبدالوہاب سے لاتعلقی

غیر مقلد ہونیکی وجہ سے یہ حضرات اس میں حق بجانب تھے کہ انہیں وہابی نہ کہا جائے۔ اس میں انہوں نے سر توڑ کوشش کی اور انگریزی حکومت نے انہیں لفظ اہلحدیث سے موسوم کر دیا۔ اس وقت سے جماعت اہلحدیث اس نام سے باضابطہ طور پر موسوم ہوئی تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ اس سے پہلے ہندوستان میں ایک حلقے میں ترک تقلید کی فضا پیدا ہو چکی تھی گو یہ نام ابھی طے نہ ہوا تھا۔

میاں نذیر حسین صاحب دہلوی جو اس جماعت کے بانی یا شیخ الکل کہلاتے ہیں، اُن کے استاذ اور خسر مولانا عبدالخالق صاحب (۱۲۶۱ھ) لکھتے ہیں :۔

> سو بانی مبانی اس فرقہ نو احداث کا عبدالحق ہے اور چند دنوں سے بنارس میں رہتا ہے اور حضرت امیر المؤمنین (سید احمد شہید شیخ مولانا اسماعیل شہید) نے ایسی ہی حرکات ناشائستہ کے باعث اپنی جماعت سے اس کو نکال دیا تھا[1]
>
> اگر حضرت امیر المؤمنین اس زمانہ میں ہوتے تو ان نئے مذہب والے مفسد گمراہوں غیر مقلدوں کا وہی حال کرتے جو ان کے پیشوا عبدالحق کا کیا تھا۔[2]

مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور ان کے شیخ سید احمد شہیدؒ غیر مقلدوں کے سخت خلاف تھے تقلید کے خلاف جو شخص بات کرے اسے اپنی جماعت سے نکال دیتے تھے۔

وہابیوں کے خلاف انگریزوں کی برہمی

شیخ محمد بن عبدالوہاب کے پیروؤں اور شریف مکہ کے مابین نجد اور حجاز کی سرحد پر جھڑپیں ہوتی تھیں۔ انگریزوں کے شریف مکہ سے گہرے تعلقات تھے۔ وہ اسے ترکوں کے خلاف استعمال کرنے کی سوچ رہے تھے۔ لیکن اس وقت نجد اور حجاز کی سرحد پر ان کی ہمدردیاں شریف مکہ کے ساتھ تھیں۔ سو ان کا وہابیوں کے خلاف ہونا ایک لازمی امر تھا۔ انگریزوں کے ہاں آل شیخ (وہابیوں) کا یہی تصور تھا کہ وہ ایک جنگجو حملہ آور گروہ ہے۔ جو گاہے گاہے اُن پہ حملہ آور رہتا ہے۔ سو جہاں کسی نے جہاد کا نام لیا انگریز اس پر بڑی آسانی سے لفظ وہابی سیٹ کر دیتے تھے۔

---

[1] دیکھئے تنبیہ الضالین صد ۱۳ [2] ایضاً صد ۹

انگریز ہندوستان میں آئے تو یہاں بھی انہوں نے جسے ذرا سر اٹھاتے دیکھا اسے وہابی کا نام دے دیا قطع نظر اس سے کہ اس کا شیخ محمد بن عبدالوہاب سے کوئی علمی یا روحانی رشتہ ہے یا نہیں عربی نہ جاننے کے باعث انگریز نہ جان سکے کہ شیخ کی نسبت کے بغیر کسی کو وہابی کا نام دینا علمی اعتبار سے درست نہیں۔ وہ اس لفظ کو جنگجو اور مجاہد کے معنی میں لے کر ہر آزادی پسند اور بہادر مسلمان کو وہابی کہتے رہے اور جہاں کہیں آزادی کی کوئی تحریک چلتی۔ وہ اسے وہابیوں کی یلغار بتلاتے۔ اگرچہ ان کا شیخ محمد بن عبدالوہاب سے کوئی بھی تعلق نہ ہوتا تھا۔

ہندوستان میں لفظ وہابی کا استعمال

مجاہد کبیر حضرت سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے روحانی خلیفہ اور شاگرد تھے۔ محدثین دہلی کا یہ گھرانہ بقول نواب صدیق حسن خاں صاحب بیت علم الحنفیہ،، (حنفیوں کے علم کا گھر) سمجھا جاتا تھا۔ مگر چونکہ انہوں نے سکھوں کے خلاف جہاد کیا اور سکھ ان دنوں انگریزوں کے حلیف تھے۔ تو انگریزوں نے انہیں بھی باوجود حنفی ہونے کے وہابی کہا۔ ہندوستان میں لفظ وہابی کا یہ پہلا استعمال تھا۔ انگریز مؤرخ ڈاکٹر اسٹارڈ Stuard لکھتا ہے:۔

> شمالی ہند میں ایک وہابی جانباز سید احمد نے پنجابی مسلمانوں کو ابھار کر حقیقۃً ایک مذہبی سلطنت قائم کرلی۔ مگر اُن کی ناگہانی موت سے شمالی ہند میں وہابی فتوحات کا امکان جاتا رہا۔ اس سلطنت کو سکھوں نے ۱۸۲۰ء میں برباد کیا لیکن جب انگریزوں نے اس ملک کو فتح کیا تب وہابی عقائد کی سُلگتی ہوئی چنگاریوں نے بہت کچھ پریشان کیا۔ یہ خیالات عرصہ تک باقی رہے اور اسباب غدر میں ممد ہوئے اور انہی عقائد نے افغانستان اور شمال مغربی سرحد کے وحشی قبائل کو ہمیشہ کے لیئے مذہبی تعصب میں رنگ دیا۔[۱]

یہاں وہابی عقائد سے مراد لڑنا اور حملہ آور ہونا ہے۔ یہاں اس کا معنی مخالفین سے صف بندی کے سوا اور کچھ نہیں۔ ورنہ حضرت سید احمد شہید تو حنفی تھے آل شیخ کی طرح حنبلی نہ

---

[۱]

تھے اور مقلدین ہونے کے باوجود دونوں میں بہت سے مسائل میں اختلاف تھا۔ کوئی رشتہ تمذد و تعلق بھی نہ تھا۔ حضرت سید احمد شہید امیر مجاہدین بالاکوٹ اپنے عقائد کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

ایں فقیر و خاندان ایں فقیر در بلادِ ہندوستان گمنام نیست الوف الوف انام از خواص وعوام ایں فقیر و اسلاف ایں فقیر رامے دانند کہ مذہب ایں فقیر آباً عن جد حنفی است۔[۱]

اس حقیقت کے ہوتے ہوئے مجاہدین بالاکوٹ کو وہابی کہنا کسی پہلو سے درست نہ تھا۔

انگریز چونکہ عربی زبان سے ناواقف تھے۔ اس لیئے وہ یہ جانے بغیر کہ نام اپنے معنی کے اعتبار سے اپنے مسمیٰ پر کسی نہ کسی طرح منطبق ضرور ہونا چاہیئے بے محابا یہ لفظ بولتے تھے اور چاہتے تھے کہ یہ لفظ آزادی کی تحریکوں میں حصہ لینے والوں کے لیئے زیادہ سے زیادہ استعمال ہو۔ ان لوگوں کو وہ وہابی کہتے جو کبھی ان کے سامنے آزادی کا دم مارتے یا کسی تحریک کا نام لیتے اور لفظ وہابی کا یہ تصور ان کے ذہن میں خود نواب صدیق حسن خاں صاحب نے ہی ڈالا تھا۔ موصوف لکھتے ہیں:۔

اصل وہابی وہی لوگ ہیں جو پیرو محمد بن عبدالوہاب کے ہیں جس نے ۱۲۱۲ھ میں نشان مخالفت کا ملک نجد عرب میں قائم کیا تھا اور خود یہ ایک عزیب جنگ جو تھا اس کے جو مقلد ہیں وہی وہابی مشہور ہیں۔[۲]

اس عبارت میں وہابی کا یہی معنی بتلایا گیا ہے کہ وہ جنگ جو اور حملہ آور قسم کے لوگوں کا نام ہے اور غیر مقلدین ایسے ہرگز نہیں۔ پھر انگریزوں نے اس لفظ کو جتنا بدنام کرنے کی کوشش کی لوگوں نے ان کی مخالفت میں کچھ اچھے معنی بھی تلاش کر لیئے اور پھر یہ لفظ اتنا عام ہو گیا کہ بعض لوگ اس کی تاریخ سے کسی قسم کے تعارف رکھے بغیر اسے اللہ کے نام "الوہاب" سے جوڑنے لگے۔ اس تاویل سے البتہ اس میں کوئی غلطی نہ تھی لیکن اس کا تاریخی پس منظر اس کے خلاف ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں یہ لفظ سب سے پہلے مقلدین پر بغیر کسی جوڑ کے آزمایا گیا کیونکہ عرب میں بھی یہ لقب مقلدین کو ہی دیا گیا تھا۔ جب یہ سکہ وہاں نہ چلا تو پھر اسے ہندوستان کے غیر مقلدین پر استعمال کیا گیا اور اس میں صرف یہ نسبت محفوظ رکھی گئی کہ تمام فروعی مسائل میں ان

---

[۱] مکاتیب سید احمد شہید ص۱۲۱ [۲] ترجمان وہابیہ ص۱۱

غیر مقلدین کا طریقہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کے پیروں کے طریقہ سے ملتا جلتا تھا۔ گو وہ مقلدین ہیں اور یہ غیر مقلدین۔ لیکن چونکہ نماز کی ہیئت ترکیبی دونوں میں ایک سی تھی۔ اس لیے ان پر بھی یہ نام چسپاں کر دیا گیا۔ وہابی ہونے کے لیے گو یہاں کوئی نسبت نہ تھی۔ مگر ایک مناسبت ضرور تھی۔ سوان پر تاریخی پہلو سے نہ سہی علمی پہلو سے یہ لفظ بولا جانے لگا۔ موحدین ہند نے اسے بہت برا منایا اور ہر ممکن کوشش کی کہ کسی طرح انہیں اس لفظ سے رہائی ملے اور انگریز انہیں اپنا مخالف نہ جانیں۔

غیر مقلدین کا وہابیوں سے لاتعلقی کا اظہار

لفظ وہابی انگریزی سیاست میں کسی نہ کسی طبقے پر تو آنا ہی تھا۔ غیر مقلدین نہ چاہتے تھے کہ انہیں ایک جنگ جو یا جانباز قوم سمجھا جائے۔ وہ صرف ترک تقلید کے عنوان سے ایک علیحدہ مکتب فکر قائم کرنا چاہتے تھے یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ وہ اپنے آپ کو میدان جنگ میں نہیں صرف ایک مذہبی دائرہ میں رکھنا چاہتے تھے۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ وہ مولانا اسماعیل شہیدؒ سے اور ان کی جماعت مجاہدین سے پوری لاتعلقی کا اظہار کریں۔ اور لوگوں کو بتائیں کہ اُن کا وہابیانِ ہزارہ سے کوئی تعلق نہیں۔ انگریز اس جماعت مجاہدین کو حنفی ہونے کے باوجود وہابی کا ٹائٹل دے چکے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ لوگ ہندوستان میں حکومت حاصل کرنے کی سعی میں ان کے خلاف ایک خطرہ ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

> بخلاف ان لوگوں کے جو لفظ وہابی کو پسند نہیں کرتے اور اہلسنت وحدیث ہیں ان کے دین میں حکومت حاصل کرنے کی تگ و دو کرنا اور زمین میں فساد پھیلانا اور مذہبی تعصب کو رونق دینا اور ہر کسی پر نفسانیت و عداوت سے مدعی ہونا سخت گناہ اور حرام ہے۔[1]

شیخ محمد بن عبدالوہاب سے لاتعلقی کا اظہار

نواب صدیق حسن خاں صاحب نہ چاہتے تھے کہ ان کی جماعت کسی پہلو سے حکومت

[1] ترجمان وہابیہ ص۱۱

کی نظر میں معتوب ٹھہرے۔ اس لیئے وہ لفظ وہابی سے لاتعلقی کے ساتھ شیخ محمد بن عبدالوہاب سے بھی کلیۃً لاتعلقی چاہتے تھے۔ آپ لکھتے ہیں:۔

اور سچ تو یہ ہے کہ وہابی ہونا عبارت ہے مقلد مذاہب خاص ہونے سے، کیونکہ پیشوا وہابیوں کا محمد بن عبدالوہاب مقلد مذہب حنبلی تھا اور تابعین حدیث کسی مذہب کے مذاہب مقلدین میں سے مقلد نہیں۔ پس وہابیہ اور اہلحدیث میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔[1]

اصل وہابی وہی لوگ ہیں جو پیرو محمد بن عبدالوہاب کے ہیں جس نے ۱۲۱۲ھ میں نشان مخالفت کا ملک نجد عرب میں قائم کیا تھا اور خود یہ ایک غریب جنگجو تھا اس کے جو مقلد ہیں وہی وہابی مشہور ہیں۔[2]

شیخ محمد بن عبدالوہاب سے اس کھلی مخالفت کے باعث غیر مقلدین حضرات لفظ وہابی کو اپنے لیئے گالی سے کم نہ سمجھتے تھے اور نہ چاہتے تھے کہ ان کی شیخ عبدالوہاب سے کوئی نسبت ہو۔ نواب صاحب مرحوم ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

ہم کو وہابی کہنا ایسا ہے جیسا کوئی کسی کو گالی دے۔[3]

پھر ایک اور جگہ شیخ کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

وہ مذہب خاص رکھتا تھا اور یہ لوگ (نواب صاحب کے گروہ کے) مذہب خاص نہیں رکھتے۔ قرآن و حدیث پر عمل کرتے ہیں یہی ان کا مذہب ہے اور ہر فساد کی بات سے ہزاروں کوس بھاگتے ہیں اور نام سے وہابی کے انکار و تعجب کرتے ہیں اور وہابیت کو دین میں ایک بدعت جانتے ہیں۔[4]

نواب صاحب مرحوم کا ملکی آزادی کی تگ و دو کو فساد سمجھنا ان کا سیاسی موقف ہو سکتا ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں لیکن آل شیخ کے مسلک کو بدعت قرار دینا یہ ہمیں کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب کے بارے میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی رائے یہ ہے:۔ اس وقت کی سیاسی فضا میں یہ جرأت مندانہ بیان دیکھئے۔

---

[1] ترجمان وہابیہ ص۱۰ [2] ایضاً ص۱۲۳ [3] ایضاً ص۱۰۱ [4] ایضاً ص۱۱۸

محمد بن عبدالوہاب کے مقتدیوں کو وہابی کہتے ہیں ان کے عقائد عمدہ تھے
اور مذہب ان کا حنبلی تھا۔ البتہ ان کے مزاج میں شدت تھی۔[1]

سو غیر مقلدین حضرات کا شیخ محمد بن عبدالوہاب کے طریقے کو بدعت قرار دینا اور وہابیوں کو بدعتی سمجھنا کسی طرح صحیح نہیں۔ یہ مقلدین حقیقت میں حدیث کے ہی پیرو ہیں۔

تقلید کرنے والے کو بدعتی کہنا اور آل شیخ کو بھی مبتدعین قرار دینا یہ ایک زیادتی ہے۔ مقلدین ائمہ کی پیروی سے حدیث کی پیروی ہی مراد لیتے ہیں۔ امام کی ذاتی پیروی ان کے پیش نظر نہیں ہوتی وہ اس لیئے اُن کی بات مان رہے ہوتے ہیں۔ کہ وہ امام حدیث کے مطابق یا مراد حدیث کے مطابق بات کہتے ہونگے۔ حضرت مولانا اسماعیل شہید کے ساتھی حضرت شاہ محمد اسحق صاحب محدث دہلوی جو میاں نذیر حسین صاحب دہلوی کے شیخ حدیث تھے۔ لکھتے ہیں :-

مقلد ایشاں را ہرگز بدعتی نخواہند گفت زیرا کہ تقلید ایشاں تقلید حدیث
شریف است۔ پس متبع حدیث را بدعتی گفتن ضلال و موجب نکال است۔[2]

اس وقت یہ تاریخی موضوع پیش نظر نہیں کہ ہندوستان میں لفظ وہابی کی آمد کیسے ہوئی کس طرح یہ لفظ "وہابیان ہزارہ" (جو مذہب حنفی کے مقلد تھے) پر آزمایا گیا۔ پھر کس طرح یہ لفظ غیر مقلدین ہند پر (اس مناسبت سے کہ ان کی ہیئت نماز آل شیخ کی ہیئت نماز سے ملتی جلتی تھی) لایا گیا اور پھر اس لیئے کہ جن لوگوں میں اس لقب کا سیاسی مفہوم کارفرما نہ تھا۔ یہ لقب اُن سے واپس لے کر انہیں اہلحدیث سے موسوم کیا گیا۔ یہ مباحث اس وقت موضوع گفتگو نہیں۔ اس وقت صرف یہ عرض کرنا ہے۔ کہ ہندوستان میں جماعت اہلحدیث کا قیام کب سے عمل میں آیا اور ترک تقلید کے عنوان سے اس دور میں یہ جماعت کیسے بنی۔ مذکورہ تفصیلات سے یہ بات سامنے آچکی ہے کہ ترکِ تقلید کے عنوان سے جماعت کے شیخ الکل میاں نذیر حسین صاحب دہلوی تھے۔ لیکن ان کے عہد تک جماعت مختلف ناموں سے معروف تھی۔ کہیں یہ حضرات محمدی کہلاتے تھے کہیں انہیں موحدین کہا جاتا تھا اور کہیں انہیں اہلحدیث بھی کہہ دیتے تھے۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب کے دور تک کچھ اسی طرح کی کیفیت رہی۔

---

[1] فتاوے رشیدیہ جلد صـ۳۷۴ [2] مأتہ مسائل سوال ۶۲ صـ۹۳

مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی پہلے شخص ہیں جنہوں نے بڑی تگ و دو سے اپنے گروہ کے لیئے حکومت سے یہ ٹائٹل منظور کرایا اور اسی وقت سے جماعت اہلحدیث کے نام سے چل رہی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں ترکِ تقلید کے عنوان سے جس شخص نے پہلے زبان کھولی وہ عبدالحق بنارسی تھا لیکن علمی پہلو سے اس کی کوئی خاص حیثیت نہ تھی۔ سو جماعت کے شیخ الکل جناب میاں نذیر حسین صاحب ہی سمجھے گئے اور انہی سے اس سلسلے کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اس وقت اس گروہ کے چند اکابر کا کچھ مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ ان متقدمین سے ان کے متاخرین کو سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔

میاں نذیر حسین صاحب دہلوی (بانی مسلک جنہیں جماعت شیخ الکل کہتی ہے)

آپ ۱۲۲۰ھ کو موضع سورج گڑھ ضلع مونگیر (بہار) میں پیدا ہوئے اور ۱۳۲۰ھ میں سو سال کی عمر پاکر وفات پائی۔ آپ کے استاد اور خسر مولانا عبدالخالق صاحب (متوفی ۱۲۶۱ھ) آپ کے سنت خلاف ہو گئے تھے۔ آپ پہلے رفع یدین نہ کرتے تھے، حالانکہ آپ حدیث پڑھ چکے تھے۔ سرسید احمد خاں ۱۸۹۸ء کی تحریک سے آپ نے رفع یدین شروع کی اور ایک مسلک کی بنیاد ڈالی۔ سرسید ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> جناب مولوی سید نذیر حسین صاحب دہلوی کو میں نے ہی نیم چڑھا وہابی بنایا ہے۔ وہ نماز میں رفع یدین نہیں کرتے تھے۔ مگر اس کو "سنت ہدیٰ" جانتے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ نہایت افسوس ہے کہ جس بات کو آپ نیک جانتے ہیں لوگوں کے خیال سے اس کو نہیں کرتے ـــــ میرے پاس سے اٹھ کر جامع مسجد میں نماز عصر پڑھنے گئے اور اس وقت سے رفع یدین کرنے لگے۔[۱]

پھر حکومت نے آپ کو شمس العلماء کا خطاب دے دیا۔ مولوی فضل حسین صاحب بہاری نے الحیاۃ بعد المماۃ ،، کے نام سے آپ پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں کئی ایسے واقعات ملتے ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ انگریز سرکار آپ کے بارے میں کس طرح سوچتی تھی۔

---

[۱] موج کوثر ص۱۵ مؤلفہ شیخ محمد اکرام صاحب

کسے پتہ نہیں کہ سرسید احمد خاں کے حکومت سے کیا روابط تھے۔ ان کے کہنے سے رکوع کے وقت رفع یدین کرنا اور حکومت سے ۱۸۹۷ء میں شمس العلماء کا خطاب پانا اس پورے پس منظر کو واضح کر رہا ہے۔ رہی یہ بات کہ حضرت شاہ محمد اسحٰق نے پھر انہیں سند حدیث کیوں دی، سو یہ خود محل بحث ہے۔ مولوی فضل حسین بہاری لکھتے ہیں:۔

آپ نے میاں صاحب کو صرف اطراف صحاح کی سند دی تھی میاں صاحب نے استیعاباً نہ آپ سے صحاح ستہ پڑھیں نہ ان کی سند لی۔ میاں صاحب خود اس سند کو چپڑاس کہتے تھے۔[1]

آپ مطلق تقلید کے قائل تھے۔ فقہ حنفی سے فتویٰ دینا جائز سمجھتے تھے۔ ائمہ کی شان میں گستاخ نہ تھے اور اس پہلو سے آپ کا احترام ہر حلقے میں موجود تھا۔ غیر مقلد حلقوں میں گستاخ اور تفرقہ انگیز انداز کے داعی عبدالحق بنارسی اور ابوالحسن محی الدین تھے۔ یہ دونوں نو مسلم تھے۔ جو مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پھیلانے کے لیے داخل کئے گئے تھے اصلاً یہ ہندو تھے۔

عبدالحق بنارسی کا عقیدہ ملاحظہ کیجئے۔ میاں صاحب کے شاگرد قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی ان سے نقل کرتے ہیں عبدالحق نے کہا۔

عائشہ علی سے لڑی اگر توبہ نہ کی تو مرتد مری[2] (معاذ اللہ)

زبان اور زندقہ دونوں ملاحظہ ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے شیعہ بھی ترک تقلید کی اس تحریک کے پیچھے بڑی سرگرمی سے کام کر رہے تھے اور اہل سنت نہ جانتے تھے کہ ان کے حلقوں میں آزاد خیالی کی ہوا کہاں سے تیز کی جا رہی ہے ـــــ ابوالحسن محی الدین جس نے الظفر المبین لکھ کر اس آگ کو اور بھڑکایا اس کا اصل نام ہری چند تھا۔ یہ دیوان چند قوم کھتری ساکنہ علی پور ضلع گوجرانوالہ کا بیٹا تھا۔ اس کے اثرات اب تک علی پور چٹھہ میں موجود ہیں۔ وہاں منکرین حدیث کافی تعداد میں پیدا ہو چکے ہیں اور ترک تقلید کی یہ روش اب انہیں کفر کی سرحد کے بہت قریب لا چکی ہے۔ تفسیر القرآن بالقرآن وہیں لکھی گئی ہے۔ جس پر مؤلف کا نام نہیں ہے۔

---

[1] دیکھئے الحیات بعد الممات صہ ۶۸ [2] کشف الحجاب صہ ۲۴

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ

میاں نذیر حسین صاحب کے بعد جماعت کے بڑے بزرگ جناب نواب صدیق حسن صاحب سمجھے جاتے ہیں۔ ۱۲۴۸ھ میں بانس بریلی میں پیدا ہوئے اور ۱۳۰۷ھ میں وفات پائی۔ آپ کی وفات کے وقت میاں نذیر حسین صاحب زندہ تھے۔ نواب صاحب مفتی صدر الدین صاحب دہلوی تلمیذ حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے شاگرد تھے۔ ان کے ذریعہ ہندوستان میں ترکِ تقلید کی ہوا بڑی تیزی سے چلی۔ ملکۂ بھوپال شاہ جہاں بیگم سے آپ کی شادی ہوئی تھی۔ اس دولت کی بدولت آپ کو مسلک کی اشاعت اور علمی خدمات کا خوب موقع ملا۔ آپ امت کے کثیر التصنیف علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ اپنے آپ کو موحد اور اپنے گروہ کو موحدین ہند کہتے تھے۔ جماعت کے لفظ اہلحدیث کا تعین اس وقت تک نہ ہوا تھا۔ ریاست بھوپال سے تعلق کی وجہ سے آپ چاہتے تھے کہ موحدین ہند ہر اس تحریک سے نفرت کریں جو انگریزوں کے خلاف ہو۔ چنانچہ مجاہدین بالاکوٹ جن کی قیادت حضرت سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید نے کی تھی، آپ نے ان سے ان الفاظ میں لاتعلقی ظاہر کی ہے۔

> گورنمنٹ ہند کے دیگر فرقِ اسلام نے یہ دلنشین کر دیا ہے کہ فرقہ موحدین ہند مثل وہابیان ملک ہزارہ ایک بدخواہ فرقہ ہے اور یہ لوگ (موحدین ہند) ویسے ہی دشمن و فسادی ملک گورنمنٹ برٹش ہند کے ہیں۔ جیسے کہ دیگر شریر اقوام سرحدی (مجاہدین بالاکوٹ وغیرہ) بمقابلہ حکومت ہند سوچا کرتے تھے[1]

لفظ وہابی کے بارے میں انگریزوں اور نواب صاحب کی ایک سوچ

ملحوظ رہے کہ نواب صاحب نے وہابی کا لفظ "لڑنے والوں" کے لیے اس معنی میں استعمال کیا ہے جس معنی میں انگریز اسے مجاہدین پر لانا چاہتے تھے اور اپنے لیے ان سے متمائز نام "موحدین ہند" اختیار کیا ہے۔ نیز اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ یہ جماعت صرف ہندوستان میں ہے اور ہندوستان سے باہر ان دنوں ترکِ تقلید کے عنوان سے کوئی مکتبِ فکر موجود نہ تھا۔ لفٹیننٹ گورنر

[1] ترجمان وہابیہ صلا [2] ایضاً صلا

نے جب یہ درخواست منظور کرلی کہ غیر مقلدین کو وہابی نہ کہا جائے تو اس میں صراحت کی کہ یہ لوگ وہابیان ملک ہزارہ (مولانا اسماعیل شہید وغیرہم) سے نفرت رکھتے ہیں. چنانچہ نواب صاحب لکھتے ہیں:

> چنانچہ لفٹیننٹ گورنر صاحب بہادر موصوف نے اس درخواست کو منظور کیا اور پھر ایک اشتہار اس مضمون کا دیا گیا کہ موحدین ہند پر شبہ بدخواہی گورنمنٹ عامہ نہ ہو، خصوصاً جو لوگ کہ وہابیان ملک ہزارہ سے نفرت رکھتے ہوں اور گورنمنٹ ہند کے خیر خواہ ہیں ایسے موحدین مخاطب بہ وہابی نہ ہوں۔[1]

موحدین ہند اس وقت تک صرف اس درجہ تک پہنچے تھے کہ لفظ وہابی اُن پہ نہ بولا جائے اور مولانا اسماعیل شہیدؒ سے ان کا کوئی تعلق ظاہر نہ ہو، لیکن ابھی تک یہ مرحلہ باقی تھا کہ حکومت سے اپنے لیے سرکاری سطح پر لفظ اہلحدیث خاص کرالیا جائے اور لفظ وہابی سرکاری طور پر بھی کاغذات سے نکال دیا جائے. یہ خدمت مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی نے سرانجام دی۔

نواب صاحب کی جماعتی فکر

ترک تقلید کی فضا ہموار کرنے کے ساتھ ساتھ آپ شیخ عبدالوہاب نجدی اور ان کے پیرووں کے بھی سخت خلاف تھے. لفظ وہابی سے سخت نفرت تھی. انگریزوں کو بار بار یاد دلاتے کہ ہم وہابی نہیں ہیں اور وہابیوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے[2] نجد کے شیخ محمد بن عبدالوہاب اور عرب کے وہابی امام احمد کے مقلد ہیں اور ہم غیر مقلد ہیں۔

> وقت کی سیاسی فضا میں مسلمانوں میں آزادی پیدا کرنیکی ان خدمات کے باعث آپ کی انگریزی سرکار میں بہت قدر و منزلت تھی. آپ کو ایک لاکھ چوبیس ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ ملتا تھا[3] آپ کی صاحبزادی شمس الامراء کو بھی حکومت سے باون لاکھ کی جاگیر ملی تھی[4]. ان مراعات کے ہوتے ہوئے ان کی وفاداری کسی پہلو سے بھی محل شبہ میں نہ تھی۔

---

[1] ترجمان وہابیہ صہ ۶۲ [2] دیکھئے ترجمان وہابیہ صہ ۲۸ [3] الحطہ صہ ۱۵۱ [4] دیکھئے مآثر صدیقی صہ ۴ مولانا حسن علی

موحدین ہند کی علمی اور عملی حالت

نواب صاحب کے عہد میں غیر مقلدین اہلحدیث کے نام سے موسوم نہ تھے۔ ترکِ تقلید کی فضا خاصی معروف ہو چکی تھی اور یہ لوگ موحدینِ ہند کہلاتے تھے۔ یہ لوگ کس علمی اور عملی حالت میں تھے۔ اسے خود نواب صاحب سے سنیئے :۔

یہ لوگ معاملات کے مسائل میں حدیث کی سمجھ اور بوجھ سے بالکل عاری ہیں اور اہل سنت کے طریق پر ایک مسئلہ بھی استنباط نہیں کر سکتے، حدیث پر عمل کرنے کی بجائے زبانی جمع وخرچ اور سنت کی اتباع کی جگہ شیطانی تسویلات پر اکتفا کرتے ہیں اور اسکو عین دین تصور کرتے ہیں[1]۔

نواب صاحب نے معاملات کی قید اس لیئے لگائی ہے کہ عبادات میں ان لوگوں نے آمین بالجہر اور رفع الیدین وغیرہ کی کچھ روایات ضرور یاد کی ہوتی ہیں۔ سو اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ لوگ فنِ حدیث سے کچھ آشنا ہیں۔ نواب صاحب عبادات میں بھی ان غیر مقلدین سے چنداں موافق نہ تھے۔ آپ کے صاحبزادہ حسن علی لکھتے ہیں۔

آپ حنفی نماز کو ہمیشہ اقرب الی السنۃ فرماتے رہتے تھے[2]۔

پیشِ نظر رہے کہ عبدالحق بنارسی اور میاں نذیر حسین صاحب کے دور تک یہ حضرات اہلحدیث (اصطلاحِ جدید) میں معروف نہ تھے نہ اس وقت تک یہ اصطلاح باضابطہ طور پر قائم ہوئی تھی۔ ابھی یہ حضرات ترکِ تقلید کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ یا موحدین ہند کے نام سے۔

مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی

مولانا بٹالوی ۱۲۵۲ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ اور نواب صدیق حسن خاں صاحب ہم استاد تھے۔ مولانا بٹالوی کے استاد بھی مفتی صدرالدین صاحب دہلوی تھے۔ آپ نے حدیث میاں نذیر حسین صاحب دہلوی سے پڑھی۔ آپ مولانا عبدالمجید صاحب سوہدروی کا یہ بیان پہلے سُن آئے ہیں :۔

---

[1] الحطہ صد ۱۵۱ [2] مآثر صدیقی جلد ا صد ۳

لفظ وہابی آپ ہی کی کوششوں سے سرکاری دفاتر اور کاغذات سے منسوخ ہوا اور جماعت کو اہلحدیث کے نام سے موسُوم کیا گیا۔[۹]

یہیں سے جماعت اہلحدیث ایک مستقل مکتبِ فکر کے طور پر اُبھرتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس فرقے کا مولد و مسکن ہندوستان سے باہر کہیں نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ حضرات اہل حدیث کہلانے سے پہلے موحدین ہند کہلاتے تھے۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ ان دنوں یہ فرقہ اہلحدیث کے عنوان سے مشہور نہ تھا۔ اور اس کے تمام علماء تقریباً انہی بزرگوں کے شاگرد اور شاگرد در شاگرد ہیں جنہیں جماعت کے موسسین کے طور پر ہم ذکر کر آئے ہیں۔ مولانا حافظ عبدالمنان وزیرآبادی مولانا سلامت اللہ جیراجپوری، مولانا عبدالوہاب ملتانی (بانی فرقہ امامیہ اہلحدیث) اور حافظ محمد لکھوی حافظ غلام رسول قلعہ میہاں سنگھ والے سب میاں نذیر حسین صاحب دہلوی کے ہی شاگرد تھے۔ البتہ غزنی سے چند ایسے اور بزرگ ضرور تشریف لائے جو اس مکتبِ فکر میں نئے شامل ہوئے اور پھر اپنی محنت و خدمت سے پنجاب میں ایک ممتاز گروہ بن کر اُبھرے۔ یہ گروہ غزنوی نام سے معروف ہے۔

مولانا عبداللہ غزنوی میاں صاحب سے حدیث پڑھ کر واپس غزنی چلے گئے۔ وہاں مسلمانوں کو ترکِ تقلید کی دعوت دی۔ ان کی یہ تحریک وہاں مسلمانوں کی وحدتِ ملی کو توڑنے کا موجب سمجھی گئی اور اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں اس کے پیچھے انگریزوں کی افغانستان پر قبضہ کرنے کی سازش کارفرما نہ ہو اس پر حکومتِ افغانستان نے انہیں ملک سے نکال دیا۔ اور یہ حضرات ہندوستان آگئے۔ ہندوستان میں ان دنوں مولانا محمد حسین بٹالوی غیر مقلدین کے مذہبی ایڈوکیٹ تھے۔ آپ جہاد کے خلاف رسالہ الاقتصاد لکھ کر انگریزوں کو مطمئن کر چکے تھے اور پھر انہیں سرکارِ انگلشیہ سے ایک وسیع جاگیر بھی ملی تھی۔

سو ہندوستان میں غیر مقلد ہو کر رہنا اب ان حضرات کے لیے چنداں مشکل نہ تھا۔ یہاں کے غیر مقلدوں نے ان علمائے غزنی کا بڑے تپاک سے استقبال کیا۔

پنجاب میں غزنوی علماء کی آمد

مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی کے عہد میں پنجاب میں غزنوی علماء کی آمد ہوئی۔ حضرت مولانا عبداللہ غزنوی افغانستان سے جلاوطن ہوئے تھے۔ ان حضرات کا رجحان ترکِ تقلید کی طرف تھا۔ انہیں یہاں بنا بنایا میدان مل گیا۔ ہندوستان کے دیگر اہلحدیث حضرات سے اُن کا ایک موضوع میں اختلاف رہا۔ یہ حضرات تصوف اور بیعت وسلوک کے قائل تھے۔ مولانا عبدالجبار غزنوی نے "اثبات الالہام والبیعۃ" کے نام سے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی مولانا عبداللہ غزنوی کے دو بیٹے مولانا عبدالجبار اور مولانا عبدالواحد تھے مولانا عبدالجبار کے بیٹے مولانا داؤد غزنوی اور مولا عبدالغفار تھے۔ مولانا عبدالواحد کی اولاد میں سے مولانا اسماعیل غزنوی اپنے حلقے میں معروف ہوئے۔ مولانا اسماعیل غزنوی سعودی عرب کے ملک عبدالعزیز بن آلِ سعود کے وزیر رہے ہیں۔ آپ کے واسطے سے سعودی عرب کے اور نجد کے علماء اور موحدین ہند کے مابین خاصے تعلقات قائم ہو گئے۔ یہاں تک کہ اس مناسبت سے پھر سے لفظ وہابی موحدین ہند پر آگیا۔ اب یہ لوگ لفظ وہابی سے زیادہ گریز نہ کرتے تھے کیونکہ سعودی تعلقات سے ان کی ایک نسبت آلِ شیخ سے قائم ہو چکی تھی۔ سو لفظ وہابی یہاں اور قوت پکڑ گیا اس دور میں۔ غزنوی حضرات جماعت میں اپنی محنت وخدمت سے ایک ممتاز گروہ بن کر اُبھرے۔ اور ایک دَور تک جماعتِ اہلحدیث کی قیادت ان کے ہاتھ میں رہی۔

مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری

مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری علماء دیوبند اور جماعت اہلحدیث کے مابین ایک نقطۂ اتصال تھے۔ آپ دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے۔ مگر مسلک ترکِ تقلید کا ہی رہا تاہم آخردم تک علماء دیوبند سے بہت قریب کا تعلق رہا۔ غیر مقلدین میں سے آپ نے مولانا حافظ عبدالمنان وزیرآبادی سے حدیث پڑھی۔ مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی کے بھی شاگرد تھے۔ ملک کی سیاسی جدوجہد میں بارہا علماء دیوبند کے ساتھ شریک ہوئے اور فرقہ باطلہ کے رد میں بھی علماء دیوبند کے شانہ بشانہ کام کیا۔ انگریزوں کی ڈائری میں تحریک ریشمی رومال کے ذیل میں لکھا ہے:۔

جنود ربانیہ کی فہرست میں میجر جنرل ہے یہی شخص مولوی ثناء اللہ امرتسری ہے انجمن اہلحدیث پنجاب کا صدر ہے۔ ہندوستان میں شاید سب سے ممتاز وہابی ہے۔ امرتسر سے شائع ہونے والے ہفت روزہ اردو اخبار اہلحدیث کو مرتب کرتا ہے۔ مولوی ثناء اللہ امرتسری مولانا محمود الحسن کا شاگرد ہے اور شاید بیس یا پچیس برس گزرے ان سے حدیث پڑھی تھی۔[1]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ انگریز اب پھر سے لفظ وہابی ان حضرات کے لیئے واپس لا رہے تھے۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب اور مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی نے جب رسالہ تنسیخ جہاد پر دستخط کیئے اور وہابیان ہزارہ سے نفرت کا اظہار کیا تھا تو لفظ وہابی ان موحدین ہند سے اُٹھا لیا گیا تھا اور جو بھی ان میں سے کسی نے مولانا محمود الحسن سے نسبت ظاہر کر دی تو پھر اُسے وہابی قرار دیا جانے لگا۔ انگریزی سیاست کے اس مد و جزر میں معلوم نہیں کتنے لوگ ڈوبے ہوں گے۔

مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی

آپ مولانا غلام حسن صاحب سیالکوٹیؒ (شاگرد نواب صدیق حسن صاحب) اور حافظ عبدالمنان صاحب وزیر آبادی کے شاگرد تھے۔ مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری سے گہرے تعلق کی بناء پر یہ بھی علماء دیوبند کے بہت قریب ہوگئے تھے یہاں تک کہ آپ کے بارے میں انگریزوں کی ڈائری میں یہ الفاظ ملتے ہیں :۔

> پسر مستری قادر بخش سکنہ سیالکوٹ ——— مشہور اور نہایت با اثر اور متعصب وہابی مبلغ ——— ہندوستان میں سفر کرتا رہتا ہے اور وہابیوں کے جلسوں میں اور دوسرے فرقوں سے مناظروں کے دوران نہایت پرجوش تقریریں کرتا ہے اس لیئے اس کی ہر وقت مانگ رہتی ہے ——— ظفر علی کا کٹر حامی ہے اور ثناء اللہ امرتسری کا ساتھی اور مولوی عبدالرحیم عرف بشیر احمد اور عبداللہ پشاوری کتب فروش کا ساتھی ہے۔[2]

---

[1] تحریک ریشمی رومال (انگریزوں کی اپنی ڈائری) صـــ [2] ایضاً

جنگ طرابلس، جنگ بلقان اور کان پور کی مسجد کے واقعہ پر اس نے
سیالکوٹ میں کافی بے چینی اور شورش پھیلا دی تھی۔ ایم ابراہیم کے بارے
میں شبہ ہے کہ برطانیہ کے خلاف مسلم پراپیگنڈے میں اس کا ہاتھ ہے[1]

کیا ستم ظریفی ہے کہ جماعت اہل حدیث کے جس فرد نے کسی قومی کام یا تحریک آزادی میں حصہ لیا، انگریز پھر سے اس کے لیے لفظ وہابی لوٹا لاتے اور باوجودیکہ شمس العلماء میاں نذیر حسین صاحب، نواب صدیق حسن صاحب اور مولانا محمد حسین بٹالوی نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ ان کا کوئی تعلق مولانا اسماعیل شہید سے ثابت نہ ہو اور وہ اپنے ماحول میں وہابیانِ ہزارہ سے ہر گونہ اظہار نفرت بھی کرتے رہے۔ مگر وہابی کا ٹائٹل جماعت سے پھر بھی کلیتہً اُٹھ نہ سکا اور ان سے تعلق کا داغ دُھل نہ سکا۔

یہاں تک گفتگو اس موضوع میں تھی کہ جماعت اہلحدیث (بہ اصطلاح جدید) کب سے قائم ہوئی اور اس کے موسسین کون کون حضرات تھے۔ اس ضمن میں لفظ وہابی بھی زیر بحث آ گیا اور ہم نے اختصار وقت کی رعایت کرتے ہوئے اس پر بھی کچھ تاریخی بحث کی ہے۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ بنیادی عقائد میں جماعت اہلحدیث عام مسلمانوں سے الگ کوئی جماعت نہیں۔ ترک تقلید کی تحریک میں جو لوگ حد سے بڑھنے والے تھے وہ اپنی اپنی جگہ خود ہی جماعت سے نکل گئے۔ کوئی مرزائیت میں چلا گیا، کوئی انکار حدیث کی لہروں میں جا ڈوبا، کسی نے نیچریت کی قبا زیب تن کرلی اور جماعت اہلحدیث نے اپنی موجودہ شکل میں اپنے لیے سلفی کا عنوان اختیار کر لیا۔ یہ مذاہب باطلہ سے دوری کی ایک اچھی تعبیر ہے۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ تبدیلی ان میں سعودی عرب سے وابستگی کے بعد آئی ہے۔ چونکہ علماء آل سعود زیادہ تر مقلدین ہیں، یہ اس لیے سلفی ہوئے کہ ان سے رابطہ اس کے بغیر نہ ہو سکتا تھا۔ حقیقت میں یہ سلف کے پیرو ہیں یا نہیں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے انکار بدگمانی ہے جو بلا شہادت جائز نہیں۔ جو بات وفاق و اتفاق کے قریب ہو اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے جب تک بات اس کے خلاف کھل کر سامنے نہ آ جائے۔

---

[1] انگریزوں کی ڈائری تحریک ریشمی رومال ص

ترکِ تقلید کے نتیجہ میں نئے نئے مذاہب

ہندوستان میں مغلیہ عہد میں صرف دو ہی فرقے پائے جاتے تھے سُنّی تھے یا شیعہ۔ نواب صدیق حسن خان صاحب لکھتے ہیں :۔

ہندوستان کے مسلمان ہمیشہ سے مذہب شیعی یا حنفی رکھتے ہیں[1]

انگریزوں نے جب یہاں مذہبی آزادی کا اعلان کیا تو سلاطین مغلیہ کی وہ گرفت جو عام مسلمانوں کو ایک ہی مذہب پر رکھے ہوئے تھی ڈھیلی پڑ گئی۔ نواب صاحب گورنمنٹ کی پالیسی کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

جو امن و آسائش و آزادگی اس حکومت انگریزی میں تمام خلق کو نصیب ہوئی کسی حکومت میں بھی نہ تھی اور وجہ اس کی سوائے اس کے کچھ نہیں سمجھی گئی کہ گورنمنٹ نے آزادی کامل ہر مذہب والے کو دی ہے[2]۔

شیخ الکل میاں نذیر حسین صاحب نے اس آزادی سے فائدہ اُٹھایا : تو سر سید احمد خاں نے کل اسلاف سے ہی علمی بغاوت کر دی اور نیچری فرقہ کے عنوان سے معتزلہ ایک نئی شکل میں سامنے آئے۔ مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی اور مرزا غلام احمد قادیانی جو مدتوں اہلحدیث مسلک پر اکٹھے کام کرتے رہے تھے۔ ان میں سے مرزا غلام احمد کل پُرانے اسلام سے بغاوت کر گئے اور قادیانی مذہب وجود میں آیا۔ میاں نذیر حسین صاحب کے شاگرد مولانا سلامت اللہ جیراجپوری اہلحدیث (باصطلاح جدید) کے نامور عالم تھے۔ مگر اُن سے ان کے بیٹے حافظ اسلم جیراجپوری ترکِ تقلید میں آگے بڑھ کر ترکِ حدیث کی سرحد پر آگئے۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے شاگرد مولوی عبد اللہ چکڑالوی جو لاہور میں جماعت اہلحدیث کی پہلی مسجد (چینیاں والی) کے امام اور خطیب تھے۔ رفتہ رفتہ منکرین حدیث کے پیشوا بنے اور برطانوی ہندوستان میں قادیانی، نیچری، چکڑالوی سب اپنے اپنے محاذوں پر آکھڑے ہوئے۔ اس تلخ تجربے نے علمائے " اہلحدیث " کو پھر سوچنے پر مجبور کیا کہ ترکِ تقلید کا یہ انداز آخر کہاں تک چلتا رہے گا کہیں یہ ساری جماعت کو ہی اسلام سے لا باہر نہ کرے۔

---

[1] ترجمان وہابیہ ص۹۶ [2] ایضاً ص۱۱

اکابر جماعت اہلحدیث کے بیانات

مرزا غلام احمد قادیانی کے پرانے دوست مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی لکھتے ہیں :۔

پچیس برس کے تجربہ سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ جو لوگ بے علمی کے ساتھ مجتہد مطلق اور مطلق تقلید کے تارک بن جاتے ہیں وہ آخر اسلام کو سلام کر بیٹھتے ہیں۔[۱]

پھر آپ یہ بھی لکھتے ہیں :۔

گروہ اہلحدیث میں جو بے علم یا کم علم ہو کر ترک تقلید کے مدعی ہیں وہ ان نتائج سے ڈریں۔ اس گروہ کے عوام آزاد اور خود مختار ہوتے جاتے ہیں۔[۲]

مولانا سید علی میاں ندوی کے والد مولانا سید عبدالحی مرحوم نزہۃ الخواطر کی آٹھویں جلد میں مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی کے ذکر میں لکھتے ہیں :۔

وشدد النکیر علی مقلدی الائمۃ الاربعۃ لاسیما الاحناف وتعصب فی ذلک تعصباً غیر محمود ثارت بہ الفتن وازدادت المخالفۃ بین الاحناف واھل الحدیث ورجعت المناظرۃ الی المکابرۃ والمجادلۃ والمقاتلۃ ثم لما کبرت سنہ ورای ان ھذہ المنازعۃ کانت سبباً لوھن الاسلام ورجع المسلمون الی غایۃ من النکبۃ والمذلۃ رجع الی ما ھو اصلح لھم فی ھذہ الحالۃ ـــــــ

واما ما کان علیہ من المعتقد والعمل فھو علی ما قال فی بعض الرسائل :

ان معتقدہ معتقد السلف الصالح مما ورد بہ الاخبار وجاء فی صحاح الاخبار ولا یخرج مما علیہ اھل السنۃ والجماعۃ ومذھبہ فی الفروع مذھب اھل الحدیث المتمسکین بظواھر النصوص۔[۳]

ترجمہ۔ مولانا بٹالوی نے مقلدین ائمہ اربعہ خصوصاً احناف کے خلاف شدت اختیار کی اور اس میں ایسے تعصب سے چلے کہ اسے اچھا نہیں کہا سکتا پس اس سے

۱؎ اشاعۃ السنۃ جلد ۱۱ نمبر ۴ ص ۵۳ ۱۸۸۸ء ۲؎ ایضاً ۳؎ تقدمہ علی الاجوبۃ الفاضلۃ لاسئلۃ العشرۃ الکاملۃ للشیخ عبدالفتاح ابی غدہ ص ۸ مطبوع حلب

فتنے بھڑک اُٹھے اور احناف اور فرقہ اہلحدیث کے مابین مخالفت زیادہ ہوگئی مناظرے، مکابرہ، مجادلہ بلکہ مقاتلہ تک پہنچے۔ پھر جب آپ بڑی عمر کو پہنچے اور آپ نے دیکھا کہ مقلدین سے یہ کھچاؤ ضعف اسلام کا سبب ہوگیا ہے اور مسلمان رسوائی اور بدبختی کے گڑھے میں جا رہے ہیں. آپ پھر اس طرف لوٹے جو مسلمانوں کے لیئے اس حالت میں بہتر تھا ــــــــ ہاں جہاں تک آپ کے اعتقاد اور عمل کا تعلق ہے وہ اس پر تھے جیسا کہ آپ نے اپنے بعض رسالوں میں کہا ہے کہ ان کا اعتقاد سلف صالحین کا سا ہے جو اخبار اور صحیح احادیث میں آیا ہے اور وہ اس حد سے نہیں نکلیں گے جو اہل السنۃ والجماعت کی راہ ہے۔ رہیں فروعات تو اس میں وہ ان اہلحدیث کے طریقے پر رہیں گے۔ جو نصوص کے ظواہر سے تمسک کرتے ہیں۔

مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی کی فکری کروٹ پر پُوری جماعت اہلحدیث کی روش بدل جانی چاہیئے تھی. لیکن افسوس کہ وہ لفظ حنفی اور شافعی وغیرہ سے اسی طرح سیخ پا رہے کہ کسی درجہ میں وہ فقہ کے قریب آنے کے لیئے تیار نہ ہوئے۔ یہ شیخ الکل میاں نذیر حسین صاحب دہلوی اور مولانا محمد حسین بٹالوی کے مسلک کے خلاف فرقہ وارانہ منافرت کی ایک لہر تھی. جو جماعت کے بیشتر علماء کو لے ڈوبی. بہت کم تھے جو معتدل مزاج رہے اور اہل السنۃ والجماعت کے دائرہ کے اندر رہے۔ غالباً ۱۳۲۴ھ کا واقعہ ہے کہ جماعت اہلحدیث کے اعیان وارکان لاہور میں جمع ہوئے اور انجمن اہلحدیث کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جس کے صدر مولانا محمد حسین بٹالوی قرار پائے. مولانا بٹالوی مرزا غلام احمد قادیانی کا حال دیکھ کر ضرور سمجھتے تھے کہ غیر مقلدین فقہ اور مقلدین سے جو نفرت بڑھا رہے ہیں. اس سے اندیشہ ہے کہ کسی نہ کسی وقت یہ لوگ (غیر مقلدین) پُورے اسلام سے ہی منحرف نہ ہو جائیں۔ انہوں نے اہلحدیث کے ساتھ اپنے کو حنفی کہنے کی بھی راہ نکالی۔ مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی لکھتے ہیں:۔

لاہور میں ایک مجلس اہلحدیث کے نام سے نامزد ہو کر قائم ہوئی ہے[1] جس کے

---

[1] یہ مجلس نامزد ہو کر قائم ہوئی تھی حکومت برطانیہ نے یہ نام اہلحدیث انہیں الاٹ کیا تھا۔

صدر ہونے کی عزت اس ناچیز کو بخشی گئی ہے۔ اس میں یہ امر بحث میں آیا تھا کہ اہلحدیث (جس کی طرف یہ انجمن منسوب ہوئی ہے) کی کیا تعریف ہے اور اہلحدیث سے کون شخص موسوم ہو سکتا ہے (جو اس انجمن کے ارکان اور مجلس منتظم میں داخل ہونے کا استحقاق رکھتا ہو۔ اس کا تصفیہ رسالہ اشاعۃ السنۃ جلد ۲۰ کے صفحہ ۱۵۹ (جو اہلحدیث قوم کا اور گورنمنٹ میں مہتمم ایڈوکیٹ Representative ریپریزنٹیٹو ہے) کے اس بیان سے ہو گیا کہ (۱) اہلحدیث وہ ہے جو اپنا دستور العمل والاستدلال احادیث صحیحہ اور آثار سلفیہ[۱] کو بناوے اور جب اس کے نزدیک ثابت و محقق ہو جائے کہ ان کے مقابلہ میں کوئی معارض مساوی یا اس سے قوی پایا نہیں جاتا۔ تو وہ ان احادیث و آثار پر عمل کرنے کو مستعد ہو جاوے اور اس عمل سے اس کو کسی امام یا مجتہد کا قول بلا دلیل[۲] مانع نہ ہو۔

ازآنجا کہ اس تعریف کی رُو سے بے تعصب و منصف مزاج مقلدین مذاہب اربعہ حنفیہ وغیرہ جو عمل بالحدیث کو جائز رکھتے اور سعادت سمجھتے تقلید مذہب ان کو اس عمل بالحدیث سے مانع نہ ہوتی، داخل ہو سکتے ہیں۔ نظر برآں اس انجمن کے صدر خاکسار کی یہ رائے قرار پائی کہ اس انجمن کے نام میں ایسی تعمیم و توسیع ہو جانی چاہیے۔ کہ اس کا نام سنتے ہی وہ مقلدین جو عمل بالحدیث کو سعادت سمجھتے ہیں داخل سمجھے جائیں بنا بر علیہ اس کے تجویز یہ ہوئی کہ لفظ انجمن اہلحدیث کے ساتھ بریکٹ میں حنفیہ وغیرہ بڑھا دیا جائے[۳]

پھر مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی کی اپنی رائے ملاحظہ کیجیے:۔

---

[۱] احادیث کے ساتھ آثار سلفیہ کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ صحابہ کرام کے ارشادات کو بھی اپنے لیے سند سمجھے

[۲] غیر مقلد علماء لفظ بلا دلیل کو ہمیشہ قول کی صفت بتاتے ہیں۔ یعنی وہ بات جس پر شریعت میں کوئی دلیل نہ ہو ظاہر ہے کہ اس کا ماننا کسی کے ہاں معتبر نہیں۔ مقلدین اسے قول کی صفت نہیں، ماننے کی صفت بتلاتے ہیں کہ کسی مجتہد کی بات کو اس سے دلیل طلب کیے بغیر اس کے اعتماد پر مان لینا کہ قرآن و حدیث کے مطابق ہی بتلا رہا ہو گا۔ [۳] ماہنامہ الہدیٰ بابت ماہ ذیقعد ۱۳۱۲ھ صفحہ ۵۰ باہتمام مولوی کریم بخش مہتمم ومالک اسلامیہ سٹیم پریس لاہور

صدر انجمن خاکسار چونکہ با وجود اہلحدیث ہونے کے حنفی بھی کہلانا جائز رکھتا تھا. لہٰذا اس امر کا اظہار اپنے ماہوار رسالہ[1] اور سراج الاخبار کے ذریعہ کر دیا. یہ امر ہمارے رُوحانی فرزند[2] نوجوانوں کو جو صرف اہلحدیث کہلاتے ہیں اور وہ حنفی وغیرہ کہلانا پسند نہیں کرتے ناگوار گزرا اور انہوں نے خاکسار کے اس اظہار کے خلاف اپنے اخبار اہلحدیث میں یہ نوٹ شائع کرا دیا...... الخ

مولانا ثناء اللہ صاحب نے اپنے اختلافی نوٹ میں لکھا تھا۔ ”کسی کا ہو رہے کوئی نبی کے ہو رہیں گے ہم“ ــــــ مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی نے اس کے جواب میں لکھا۔

نبی کے ہیں سبھی حنفی نہ مرزائی نہ چکڑالی ــــ نہ معتزلی جو جاحظ کی کرتے ہیں شاگردی

لفظ اہلحدیث ماضی میں ایک علمی شان رکھتا تھا. فرقہ اہلحدیث میں جب جاہل بھی اہلحدیث کہلانے لگے تو پوری کی پوری جماعت نت نئے نئے اُٹھنے والے فتنوں کا دروازہ بن گئی. مرزا غلام احمد کے پہلے جانشین حکیم نورالدین بھی پہلے اہلحدیث بنے[3] تھے. پھر مرزائی بنے.

قاضی عبدالواحد صاحب خانپوری کی رائے

ان حالات سے متأثر ہو کر جماعت اہلحدیث کے مقتدر عالم قاضی عبدالواحد صاحب خانپوری نے اپنی جماعت کو جھنجھوڑا اور کہا:۔

اس زمانہ کے جھوٹے اہلحدیث مبتدعین، مخالفین سلف صالحین جو حقیقت ما جاء بہ الرسول سے جاہل ہیں وہ اس صفت میں وارث اور خلیفہ ہوئے شیعہ و روافض کے ــــــ جس طرح شیعہ پہلے زمانوں میں باب و دہلیز

---

[1] اشاعۃ السنہ صہ [2] مولانا ثناء اللہ امرتسری جوان دنوں پرچہ اہلحدیث کے ایڈیٹر تھے [3] تاریخ احمدیت جلد چہارم صہ ۶۹ میں ہے ”حرمین سے واپسی پر نورالدین نے وہابیت اختیار کی اور ترک تقلید پر وعظ کیے. اور عدم جواز تقلید پر کتابیں تصنیف کیں. بھیرہ میں ہیجان عظیم پیدا ہو گیا ــــــ چودھری ظفراللہ خاں قادیانی بھی اپنے دادا چوہدری سکندر خاں کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

”جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا ہے وہ اہلحدیث فرقے سے تعلق رکھتے تھے“ تحدیث نعمت صہ ۳

کفر و نفاق کے تھے اور مدخل ملاحدہ اور زنادقہ کا تھے۔ اسی طرح یہ جاہل، بدعتی اہلحدیث اس زمانہ میں باب اور دہلیز اور مدخل ہیں ملاحدہ اور زنادقہ منافقین کے بعینہ مثل اہل التشیع کے۔[1]

اس عبارت سے واضح ہے کہ ان پڑھ جاہلوں کا اہلحدیث کہلانا کس طرح آئندہ دینی فتنوں کی اساس بنتا رہا ہے اور یہ بھی عیاں ہے کہ اس جماعت غیر مقلدین کے اعتدال پسند علماء کتنی دردمندی سے ترک تقلید کے کڑوے پھل چکھتے رہے ہیں اور ان کا ذائقہ بھی ساتھ ساتھ بتاتے رہے ہیں

مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی نے اچھا کیا جو اپنے آپ کو اہلحدیث حنفی کہنے لگے۔ یہ کسی نہ کسی دائرہ میں فقہ کی طرف لوٹنے کا ایک قدم تھا۔ اس پر دیگر علماء فرقہ ہذا بہت سیخ پا ہوئے۔ تاہم مرزا غلام احمد کے انجام کا یہ ایک طبعی اثر تھا۔ جو اس کے پرانے دوست مولانا محمد حسین صاحب پر اس تبدیلی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ مشہور غیر مقلد عالم مولانا عبدالحق سیالکوٹی لکھتے ہیں :۔

ارباب فہم و ذکاء اصحاب صدق و صفا کی خدمت میں عرض ہے کہ کچھ عرصہ سے جناب مولوی ابوسعید محمد حسین بٹالوی نے اپنے آپ کو اہلحدیث حنفی لکھا ہے۔ آپ کے اس لقب پر مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری ایڈیٹر اخبار اہلحدیث نے ایک نوٹ لکھا ہے۔[2]

اس سے واضح ہے کہ مولانا محمد حسین بٹالوی میں یہ تبدیلی بعد میں آئی۔ اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کی دینی تباہی آنکھوں سے دیکھی تھی۔

مولانا وحید الزماں کی رائے

غیر مقلدین کا گروہ جو اپنے تئیں اہلحدیث کہلاتے ہیں۔ انہوں نے ایسی آزادی اختیار کی ہے کہ مسائل اجماعی کی پرواہ نہیں کرتے نہ سلف صالحین اور صحابہ اور تابعین کی ــــ قرآن کی تفسیر صرف لغت سے ــــ اپنی من مانی کر لیتے ہیں۔ حدیث شریف میں جو تفسیر آ چکی ہے اس کو بھی نہیں مانتے۔[3]

---

[1] کتاب التوحید والسنۃ فی رد اہل الالحاد والبدعۃ صد ۲۶۲ [2] الانصاف لرفع الاختلاف صد مصنفہ مولانا عبدالحق مطبوعہ ۱۹۱۰ء رفاہ عام سٹیم پریس لاہور۔ [3] وحید اللغات مادہ شعب، حیات وحید الزماں صد ۱۰۲

مولانا عبدالعزیز سیکرٹری جمعیت مرکزیہ اہلحدیث ہند

اہلحدیث جو اپنے ایمانیات و عقائد کی پختگی میں ضرب المثل تھے...... معتزلہ اور متکلمین کی شریعت کو دوبارہ زندہ کرنے والے حضرات ہم میں پیدا ہو گئے اور اُن کی حوصلہ افزائی کی گئی ـــــــ نتیجہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج جمعیت اہلحدیث ایک جسم بلا رُوح رہ گئی، بلکہ جسم کہتے ہوئے بھی قلم رُکتا ہے۔ آج ہم میں تفرق و تشتت کی یہ حالت ہے کہ شاید ہی کسی جماعت میں اس قدر اختلاف و افتراق ہو۔[۱]

ترکِ تقلید کا یہ نتیجہ ان حضرات کے اپنے قلم سے آپ کے سامنے ہے۔ کاش کہ یہ حضرات مولانا محمد حسین بٹالوی کی بات مان لیتے۔ مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری نے اس وقت تو اپنے استاد مولانا بٹالوی کی مخالفت کی، لیکن ترک فقہ کے نتیجہ میں جب ترکِ حدیث کی اٹھتی ہوئی لہر دیکھی تو اُن کے ذہن نے بھی پھر پلٹا کھایا۔ مرزا غلام احمد کے ترکِ تقلید نے مولانا محمد حسین بٹالوی میں فکری تبدیلی پیدا کی، تو مولوی عبداللہ چکڑالوی کی تحریک ترکِ حدیث نے مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کو سوچنے پر مجبور کیا۔ کہ ترکِ حدیث کی ان لہروں کا پس منظر کیا ہے۔ مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری مولوی عبداللہ چکڑالوی امام مسجد چینیاں والی لاہور کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

جب انہوں نے دیکھا کہ اب لوگ فقہ کی بندش سے تقریباً آزاد ہو گئے ہیں تو انہوں نے احادیث پر نکتہ چینی شروع کر دی اور جب کچھ دنوں میں یہ مرحلہ بھی طے ہو جائے گا تو وہ جمع و تدوینِ قرآن میں رخنے نکالنا شروع کر دیں گے اور جب تک لوگوں کو اس عیاری کا پتہ نہ چلے گا وہ عوام اور نئے تعلیم یافتہ طبقے کے دل و دماغ کو اتنا مسموم کر چکے ہوں گے کہ اس کا تدارک کسی سے نہ ہو سکے گا۔[۲]

آزادیٔ رائے کا غلط استعمال

میاں نذیر حسین صاحب سے لے کر مولانا محمد حسین بٹالوی تک ہندوستان میں مطلق

---

۱ فیصلہ مکہ ص ۲، ص ۳ ۲ فتاوے ثنائیہ جلد ا صفحہ ۲۸

تقلید کا انکار کہیں نہ تھا۔ غیر مقلدین بھی صرف تقلیدِ شخصی کے خلاف تھے اور جملہ موحدینِ ہند اجتہادی مسائل میں فقہ حنفی کا فیصلہ لیتے تھے۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری کے عہد سے غیر مقلدین مطلق تقلید کے انکار کے درپے ہوئے پھر انہی کے عہد میں ترکِ تقلید کی فضا اپنی پوری بہار پر آئی۔ غیر مقلدین نہ صرف مقلدین سے برسرِ پیکار ہوئے۔ بلکہ آپس میں بھی ایک دوسرے کے خلاف محاذ آراء ہو گئے۔

قاضی عبدالاحد صاحب خانپوری نے مولانا ثناء اللہ کے خلاف ایک کتاب لکھی۔ اور اس کا نام کتاب التوحید والسنۃ فی رد اہل الالحاد والبدعہ رکھا اور اسے اظہارِ کفر ثناء اللہ بجمیع اصول آمنت باللہ سے ملقب کیا کہ مولوی ثناء اللہ ایمان کی تمام بنیادوں کا منکر ہے۔

غزنوی حضرات نے مولانا ثناء اللہ کے خلاف اربعین لکھی اور اس پر چالیس کے قریب علماء اہلحدیث (باصطلاح جدید) نے دستخط کیے اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کو اہلحدیث سے خارج قرار دیا۔ مولانا ثناء اللہ صاحب نے مظالم روپڑی بر مظلوم امرتسری لکھ کر جماعت کی اندرونی حالت پوری طرح بے نقاب کی۔[۲]

مولانا عبدالوہاب ملتانی کے خلاف بانوے[۹۲] علماء اہلحدیث نے دستخط کیے اور کہا کہ مدعیِ امامت (مولانا عبدالوہاب ملتانی) گمراہ ہے۔ اہلحدیث سے خارج ہے اور حدیث من لم یعرف امام زمانہ کو نہیں سمجھا۔ پھر مولانا عبدالوہاب کے شاگردِ خصوصی مولانا محمد جوناگڑھی نے مولانا عبداللہ روپڑی کے بارے میں لکھا:۔

یہ مولوی صاحب جھوٹے ہیں بدعقیدہ ہیں اسے علمِ دین سے بلکہ خود دین سے بھی مس نہیں..... اس کا وعظ ہرگز نہ سنو بلکہ اگر بس ہو تو وعظ کہنے بھی نہ دو۔ نہ اس کے پیچھے جمعہ جماعت پڑھو۔[۳]

مولوی محمد یونس مدرسِ اوّل مدرسہ میاں نذیر حسین صاحب دہلوی نے حافظ

---

[۱] دیکھئے سیرتِ ثنائی ص۳۷۲ اور ہندوستان میں پہلی اسلامی تحریک ص۳۹ مؤلفہ مسعود عالم ندوی
[۲] مظالمِ روپڑی ص۴۲ تالیف مولانا ثناء اللہ امرتسری ص

عبداللہ صاحب روپڑی کے بارے میں فرمایا :-

شخص مذکور ملحد ہے ..... ایسے لوگوں سے قطع تعلق ضروری ہے[1]

ان حضرات کی یہ نبرد آزمائی صرف اپنے علماء تک محدود نہ تھی۔ مولانا عبدالوہاب صاحب نے عوام اہلحدیث کو بھی اپنے اس فتوے میں گھسیٹ لیا۔ مولانا عبدالجبار صاحب کھنڈیلوی مولانا عبدالوہاب سے نقل کرتے ہیں :-

جب تک مسلمان امام کو نہیں مانتا اس کا اسلام ہی معتبر نہیں[2] ..... کوئی کام نکاح ہو یا طلاق بغیر اجازت امام وقت جائز نہیں[3]

ان حضرات کے اخبار محمدی کی ایک سرخی ملاحظہ ہو۔ روپڑ کا خوفناک بھیڑیا[4]

ان کتابوں اور عنوانوں سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ترکِ تقلید کے جوش میں یہ لوگ اپنے گھر میں کیسی خوفناک آگ سے دوچار تھے۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری کی خدمات اہلحدیث پر ان کے ہمنوا علماء انہیں سردار اہلحدیث کہتے تھے۔ مولانا عبداللہ روپڑی کو ان کی یہ حیثیت پسند نہ تھی۔ آپ نے مولانا ثناء اللہ صاحب کو مخاطب کرکے فرمایا:-

ٹھیلے تلے کتا چل رہا تھا وہ سمجھا کہ ٹھیلے کو میں کھینچ رہا ہوں تمہاری مثال یہ ہے[5]

غیر مقلدین کی اس سرد جنگ سے یہ بات بآسانی سمجھی جا سکتی ہے کہ ترکِ تقلید کی تحریک اس وقت کس مرحلہ میں داخل ہو چکی تھی

ان بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ ائمہ دین اور سلف صالحین سے بے نیازی کی روش جماعت اہلحدیث میں کہاں تک آزادی پیدا کر چکی تھی تاہم یہ غنیمت ہے کہ جماعت کے بعض حضرات کو اس کا شدت سے احساس ہوا اور جو لوگ ترکِ تقلید میں حد سے بڑھتے جا رہے تھے وہ اپنی اپنی جگہ

---

[1] [2] مقاصد الامامۃ ص۱۶ [3] ایضاً
[4] اخبار محمدی دہلی یکم جون ۱۹۳۹ء [5] ثنائی نزاع تالیف عبداللہ روپڑی صاحب

خود ہی جماعت سے نکل گئے اور اہلحدیث (بہ اصطلاح جدید) اپنی موجودہ شکل میں کچھ نہ کچھ سنبھل گئے اور انہوں نے صحابہ کرام سے تمسک کرنے کو اپنے اصولوں میں داخل کرلیا۔

مسلک اہلحدیث میں اقوال صحابہ کا درجہ

اہل السنۃ والجماعت کی بنیاد ہی صحابہ کرام سے وابستگی پر ہے اور یہی جماعت ہے جس کی طرف منسوب ہو کر وہ اہل السنۃ والجماعت کہلاتے ہیں۔ جب تک ان کے قول وفعل سے تمسک رہے غیر مقلدین بھی جماعت اہلحدیث (بہ اصطلاح جدید) کے دائرہ میں رہیں گے اور اس گروہ کے جو لوگ حضرات صحابہ سے علیحدگی کو ہی سچائی کا نشان سمجھیں۔ وہ انجام کار اسلام کی سرحد کو ہی پار کر جائیں گے۔ جماعت کے مقتدر عالم حافظ محمد عبداللہ صاحب روپڑی لکھتے ہیں :۔

جب انسان کو کوئی مسئلہ قرآن وحدیث سے صراحۃً نہیں ملتا۔ تو وہ قرآن وحدیث میں اجتہاد و استنباط کرتا ہے اور وہ اجتہاد و استنباط قرآن وحدیث سے الگ نہیں کہلاتا۔ اسی طرح صحابی کے اس قول کو جو اجتہاد و استنباط کی قسم سے ہو اس کو قرآن وحدیث سے الگ نہ سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ قرآن وحدیث میں داخل سمجھنا چاہیئے۔[1]

اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ صحابہ کے اقوال میں اوّل تو رفع یعنی رسولؐ کی حدیث ہونے کا احتمال قوی ہے اور اگر کہیں فہم کا دخل ہو تو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روش کی طرف زیادہ نزدیک ہیں۔ کیونکہ صحابہ آپ کی طرز استدلال کو دیکھتے تھے اور آپ کے کنایہ اور اشارے سے خوب سمجھتے تھے اور جتنی باتیں مشاہدہ سے تعلق رکھتی ہیں اُن سے خوب واقف تھے اور بعد کے لوگ ان باتوں سے محروم ہیں۔ اس لیئے پچھلوں کے اجتہاد پر صحابہ کے اقوال کو مقدم کرنا لازم ہے اور صحابہ چونکہ ان باتوں میں برابر ہیں اس لیئے ان کے اقوال آپس میں ایک دوسرے کو ماننے لازم نہیں۔[2]

---

[1] ضمیمہ رسالہ اہلحدیث ص۷ [2] ایضاً ص۸

مولانا حافظ محمد عبداللہ صاحب روپڑی اس سے پہلے ساری بحث کا حاصل ان لفظوں میں لکھ آئے ہیں :-

اقوال صحابہ کے ساتھ استدلال کرنا ٹھیٹھ اسلام میں داخل ہے۔[1]

کتنا اچھا ہو کہ گروہ اہلحدیث کے دیگر حضرات بھی صحابہ کے قول وعمل سے استناد کرنا جائز سمجھیں اور اسے اپنی رائے پر ہر حال میں مقدم کریں۔ یہ صحابہ کی اتباع اور پیروی کا عقیدہ ہے جو اہلحدیث حضرات کو اہل السنۃ والجماعت میں داخل کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ائمہ کرام کا اکرام و احترام بھی ضروری ہے۔ ان کے کسی فیصلے سے اختلاف اور بات ہے اور مجموعی طور پر اُن کی جلالت قدر سے کھیلنا اور ان کی علمی امامت کے انکار سے پُورے اکابر امت کی تجہیل کرنا یہ وہ خوفناک روش ہے کہ اس راہ پہ چلنے والا کبھی اہل السنۃ والجماعۃ میں نہیں رہ سکتا جماعت اہلحدیث کے جو علماء ائمہ حدیث وفقہ اور مجمع علیہم مجتہدین ائمہ اربعہ کا اکرام و احترام کرتے ہیں۔ انہیں چند فروعی اختلافات کی بناء پر اہل السنّت کے دائرہ حقہ سے باہر نہ سمجھنا چاہیئے۔

"علماء اہلحدیث" کے ہاں امام ابوحنیفہ کا مقام

مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کے بہت قریبی دوست ہونے کے باعث علماء دیوبند سے بھی اتنے ہی قریب تھے۔ امام ابوحنیفہؒ کے بہت معتقد تھے۔ اکثر فرماتے کہ امام ابوحنیفہؒ کا احترام مجھے رُوحانی طور پر بتلایا گیا ہے۔

میں ان شخصوں کو جن کو حضرت امام سے حسن عقیدت نہیں ہے کہا کرتا ہوں۔ افتمارونہ علی مایریٰ میں نے جو کچھ عالم بیداری اور ہوشیاری میں دیکھ لیا اس میں مجھ سے جھگڑا کرنا بے سود ہے۔[2]

جو شخص ائمہ دین اور خصوصاً امام ابوحنیفہ کی بے ادبی کرتا ہے اس کا خاتمہ اچھا نہیں ہوتا۔[3]

آپ نے تاریخ اہلحدیث کے نام سے محدثین اور اپنے اکابر جماعت کی ایک تاریخ لکھی۔ اس میں آپ نے امام ابوحنیفہ کا بھی ذکر کیا۔ آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس دہلی اس کو شائع کرنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ لوگ اس پر رضامند نہ تھے۔ کہ امام ابوحنیفہ کو محدثین میں ذکر کیا جائے۔

---

[1] ضمیمہ رسالہ اہلحدیث ص۳ [2] تاریخ اہلحدیث ص۷۹ [3] ایضاً ص۴۲۸ نقلاً عن الحافظ عبدالمنان

انہوں نے مولانا سے درخواست کی کہ وہ حضرت امام صاحب کا ذکر اس کتاب سے نکال دیں۔ مولانا ابراہیم صاحب نے کتاب ان سے واپس لے لی۔ مگر امام صاحب کا نام اس کتاب سے نہ نکالا اور فرمایا کہ امام ابوحنیفہؒ کا نام محدثین سے کبھی الگ نہیں ہو سکتا۔

غزنوی خاندان کے علماء بھی حضرت امام صاحب کی شان میں بہت مؤدب رہے ہیں۔ سید ابوبکر غزنوی نے اپنے والد مولانا محمد داؤد غزنوی کے سوانح حیات میں مولانا محمد اسحٰق بھٹی کا ایک مقالہ بھی درج کیا ہے۔ اس میں آپ سید محمد داؤد غزنوی کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

ائمہ کرام کا اُن کے دل میں انتہائی احترام تھا۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا اسم گرامی بے حد عزت سے لیتے۔ ایک دن میں اُن کی خدمت میں حاضر تھا کہ جماعت اہلحدیث کی تنظیم سے متعلق گفتگو شروع ہوئی۔ بڑے دردناک لہجہ میں فرمایا:۔

مولوی اسحٰق! جماعت اہلحدیث کو حضرت امام اُبوحنیفہؒ کی رُوحانی بددُعا لے کر بیٹھ گئی ہے۔ ہر شخص اُبوحنیفہ اُبوحنیفہ کر رہا ہے۔ کوئی بہت ہی عزت کرتا ہے تو امام ابوحنیفہ کہہ دیتا ہے۔ پھر ان کے بارے میں ان کی تحقیق یہ ہے کہ وہ تین حدیثیں جانتے تھے یا زیادہ سے زیادہ گیارہ۔ اگر کوئی بڑا احسان کرے تو وہ اُنہیں سترہ حدیثوں کا عالم گردانتا ہے۔ جو لوگ اتنے جلیل القدر امام کے بارے میں یہ نقطۂ نظر رکھتے ہوں ان میں اتحاد اور یک جہتی کیوں کر پیدا ہو سکتی ہے۔ "مولانا داؤد غزنوی" ص ۱۳۶

ان دنوں حضرت امام ابوحنیفہؒ کی وصیت جو آپ نے اپنے بیٹے حماد کے نام لکھی۔ نئی نئی طبع ہو کر آئی تھی۔ آپ اسے آنے جانے والوں کو دکھاتے اور فرماتے۔ حضرت امام ابوحنیفہ کی نظر کم از کم پانچ لاکھ احادیث پر تھی۔

اب بھی جماعت اہلحدیث میں اچھے خاصے لوگ ملیں گے جو ائمہ کرام اور فقہاء اسلام کا خاصا احترام کرتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ چند ناعاقبت اندیش متعصب افراد کی جسارت اور دوسروں کی اس پر مصلحت کیش خاموشی پوری جماعت کو اہل السنت والجماعت سے لا باہر کھڑا کرتی ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

لیکن افسوس کہ ان کے خطیب قسم کے علماء اور جماعت میں اپنی جھوٹی شخصیت اُبھارنے والے فقہ حنفی سے برسرِعام کھیلتے ہیں۔ حضرت امام کے علم حدیث کا مسخر اڑاتے ہیں اور یہ مسخرے نہیں جانتے کہ حضرت امام کی بددعا جس کے بھی شاملِ حال ہوئی وہ قادیانی ہو کر مرا یا رفض کی گود میں گیا یا اسے منکرینِ حدیث میں جگہ ملی اور یا وہ پاگل ہو گیا۔ سلامتی سے اُسے یہاں سے رخصتی نہیں ہوئی۔ اعاذنا اللہ من سوء الادب فی الائمۃ المجتہدین۔

یہ درست ہے کہ اس حلقے میں بعض حضرات معتدل مزاج بھی تھے۔ انہوں نے کوشش کی کہ جماعت کو مطلق العنان ہونے سے بچایا جائے اور انہیں پابند کیا جائے کہ کسی مسئلہ میں سلف کی حدود سے نہ نکلیں۔ اس جذبہ سے بہت سے لوگ سلفی کہلائے پہلے جو لوگ قال اللہ اور قال الرسول کے سوا کچھ نہ سنتے تھے۔ اب سلف کی پیروی میں فخر محسوس کرنے لگے۔ یہ ان لوگوں میں پہلی نظریاتی تبدیلی ہے جو عمل میں آئی ہے۔

ز اجتہادِ عالماں کوتاہ نظر اقتدار رفتگاں محفوظ تر

ہمیں پورا احساس ہے کہ موضوعِ زیرِ بحث اہلحدیث (باصطلاح جدید) کا تعارف ہے۔ یہ چند باتیں ہم نے صرف تاریخی پہلو سے کہی ہیں۔ کسی فریق کے کسی موقف کا اثبات یا ابطال ہرگز پیشِ نظر نہیں۔ حدیث کے طلبہ کے لیئے حدیث سے متعلق جملہ مباحث لائقِ مطالعہ ہوتے ہیں۔ ہم نے ضرورت کے مطابق یہ تاریخی نقشہ آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ کسی عزیز نے کسی بات پر کوئی گرانی محسوس کی ہو تو ہم اس سے معذرت خواہ ہیں۔ تاریخی حقائق سے صرف نظر تو کی جا سکتی ہے لیکن انہیں مٹایا نہیں جا سکتا۔

یہ بات بآسانی سمجھی جا سکتی ہے کہ جو درخت تقریباً ایک صدی پہلے ترکِ تقلید کے نام سے بویا گیا تھا اس کے نکیلے کانٹوں سے خود اس کے داعی بھی خون آلودہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ غزنوی حضرات اس لئے ان مفاسد سے بچے رہے کہ وہ سلوک و احسان کے قائل تھے مولانا عبدالجبار غزنوی کی کتاب اثبات الالہام والبیعۃ کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

یہ کتاب مولوی غلام علی قصوری کی ایک کتاب کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ مقلدین کے بارے میں آپ کا نظریہ یہ تھا:۔

مذاہب اربعہ حق ہیں اور ان کا آپس کا اختلاف ایسا ہے جیسا صحابہ کرام میں بعض مسائل کا اختلاف ہوا کرتا تھا۔ باوجود اختلاف کے ایک دوسرے سے بغض و عداوت نہیں رکھتے اور باہم سب وشتم نہیں کرتے مثل خوارج و روافض کے صلحاء، اور ائمہ دین کی محبت جزوِ ایمان ہے۔[1]

مولانا عبدالجبار غزنوی مولانا عبداللہ غزنوی کے بیٹے تھے۔ مولانا عبدالجبار کے بیٹے مولانا محمد داؤد غزنوی اور مولانا عبدالغفار تھے۔ مولانا عبداللہ غزنوی کے ایک دوسرے پوتے مولانا اسماعیل غزنوی تھے۔ جو سعودی عرب کے ملک عبدالعزیز بن آل سعود کے مقربین میں سے تھے۔ ان کے باعث سعودی حکومت اور موحدینِ ہند میں خاصے روابط پیدا ہوئے اور اب تک یہ روابط قائم ہیں۔ اس مناسبت سے پھر سے لفظ وہابی ان حلقوں میں عام ہوگیا ہے۔ یہ حضرات اب اس لفظ سے نفرت نہیں کرتے۔ سعودی عرب سے تعلقات رکھنے کے لئے انہیں اب اس نام کی ضرورت ہے، ورنہ علماء، آلِ سعود تو مقلدین ہیں اور حنبلی مذہب رکھتے ہیں۔

مولانا وحید الزمان حیدر آبادی۔ المتوفی ۱۳۳۸ھ / ۱۹۲۰ء

کتبِ حدیث کے اردو تراجم اور وحید اللغات لکھنے کے باعث آپ فرقہ اہلِ حدیث میں سب سے بڑے مصنف سمجھے جاتے ہیں۔ نواب صدیق حسن خان کے بعد اس باب میں انہی کا نام ہے۔ پہلے نواب صاحب نے آپ کو تراجم کے لیے تنخواہ پر ملازم رکھا۔ آپ کے دور میں مولوی شمس الحق عظیم آبادی، مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی، مولوی عبداللہ غازی پوری، مولوی فقیر اللہ صاحب پنجابی غیر مقلدین کی نمایاں شخصیتیں تھے۔ مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری بھی خاصے معروف ہو چکے تھے۔

آپ نے میاں نذیر حسین صاحب سے حدیث پڑھی۔ غیر مقلد ہونے کے بعد شیعیت

---

[1] اثبات الالہام والبیعۃ صہ ۲ طبع دوم

کی طرف خاصے مائل ہوگئے۔ آپ کی کتاب ہدیۃ المہدی آپ کے انہی خیالات کی ترجمان ہے۔

مجھ کو میرے ایک دوست نے لکھا کہ جب سے تم کتاب ہدیۃ المہدی تالیف
کی ہے تو اہلحدیث کا ایک بڑا گروپ ...... تم سے بددل ہوگئے ہیں۔
اور عامہ اہلحدیث کا اعتقاد تم سے جاتا رہا ہے۔[1]

آپ فخرالدین الطریحی شیعی (۱۰۸۵ھ) کی کتاب مطلع نیّرین اور مجمع البحرین سے خاصے متاثر تھے۔ وحید اللغات کی اس قسم کی عبارات انہی خیالات کی تائید کرتی ہیں۔

شیخین رض کو اکثر اہلسنت حضرت علی رض سے افضل کہتے ہیں اور مجھ کو اس امر پہ
بھی کوئی قطعی دلیل نہیں ملتی۔ نہ یہ مسئلہ کچھ اصولِ دین اور ارکانِ دین سے
ہے۔ زبردستی اس کو متکلمین نے عقائد میں داخل کر دیا ہے۔[2]

"حضرت علی رض اپنے تئیں سب سے زیادہ خلافت کا مستحق جانتے تھے اور ہے بھی یہی۔"[3]

حضرت امیر معاویہ رض کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

ان کی نسبت کلماتِ تعظیم مثل حضرت و رضی اللہ عنہ سخت دلیری اور بیباکی ہے۔[4]

پھر محرم کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

یہ مہینہ خوشی کا نہیں رہا ...... محرم کا مہینہ شہادت کی وجہ سے غم کا ہے۔[5]

ان خیالات کے باوجود جماعت اہلحدیث انہیں اپنے بزرگوں میں سے سمجھے۔ تو ایسے وہ جانیں۔ جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں مولانا وحید الزماں شیعہ کتب حدیث کو اہلسنت کتب حدیث کی کتابوں کے قریب لانا چاہتے تھے اور اسی لیے انہوں نے مسلک اہلحدیث اختیار کیا تھا۔ حالانکہ شیعہ کتب حدیث ہمارے ہاں اصلاً ثابت نہیں ہیں۔ آپ کی لغاتِ حدیث اسی فکر پر مرتب ہوئی ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔ آپ خود لکھتے ہیں:۔

انوار اللغۃ جو جامع لغات احادیث مع احادیث فریقین یعنی امامیہ و اہلسنت
ہے۔ بڑی محنت اور جانفشانی سے مرتب کی ہے۔[6]

انوار اللغۃ، اسرار اللغۃ، وحید اللغات ایک ہی کتاب کے نام ہیں۔

مبحث اہلِ حدیث یہاں ختم ہوتا ہے۔

---

[1] وحید اللغات مادہ شر [2] مادہ عشر [3] مادہ عجز [4] ایضاً [5] مادہ عود [6] جلد ۱ ص ۲ طبع بنگلور

مُنکرینِ حدیث

الحمد للہ وسلامٌ علی عبادہ الذین اصطفیٰ۔ امابعد:

ابتدائے آفرینش سے حق کے مقابلے میں باطل اور نُور کے بالمقابل ظلمت نبرد آزمار ہے ہیں۔ آدم نے ابھی خلعتِ خلافت نہ پہنی تھی کہ ابلیس ملائکہ کی صف سے علیحدہ ہوگیا۔ اور ابراہیم علیہ السلام ابھی پیدا نہ ہوئے تھے کہ اقتدار نمرُود کے ہاتھوں میں تھا۔ کون نہیں جانتا کہ حضرت موسیٰ کے بیدار ہونے سے پہلے تختِ مصر پر فرعون براجمان تھا۔ حدیث نبوی نے جس طرح قرآن کریم کے گرد حفاظت کا پہرہ دیا اور عملاً ایک امت کی تشکیل کی اور اُسے توارث عمل بخشا ——— ضروری تھا کہ اس کے بالمقابل پھر ظلمت کی گھٹا اُٹھے۔ امت کو اتحاد کی بجائے انتشار ملے۔ قرآن اپنے احکام کے تعین میں ممبران اسمبلی کا دست نگر ہو اور عقل کی ہر بدلتی لہر تعلیم نبوت کے کنارے توڑتی رہے۔ منکرینِ حدیث انہی تقاضوں سے اُٹھے۔ اور مختلف عنوانوں سے سامنے آئے۔

انکارِ حدیث کی تحریک کسی دور میں منفی عنوانوں سے نہیں چلی۔ اُس نے اپنی منفی آواز کے لیئے ہمیشہ سے کسی نہ کسی مثبت عنوان کا سہارا لیا ہے۔ منکرین حدیث کبھی ① جامعیت قرآن کا نعرہ لے کر اُٹھے کہ قرآن کریم کے ہوتے ہوئے اور کسی چیز کی ضرورت نہیں (یعنی حدیث کی ضرورت نہیں)، کبھی اُن لوگوں نے کہا ② قرآن کریم کے ابدی قوانین ہر زمانے کے نئے تقاضوں کے تحت طے ہونے چاہییں۔ قرآنی احکام کی جو تشکیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہوئی۔ وہ صرف اس دور کے لیئے تھی۔ اس نئے دور میں قرآنی احکام کی تشکیل اسمبلیوں کے ذریعے ہونی چاہیئے۔ ③ کبھی ان لوگوں نے بعض حدیثوں کے خلافِ عقل ہونے کا سہارا لیا اور ان کے ذریعہ کل ذخیرہ حدیث کو گدلا کرنا چاہا۔ ابتدائی عنوان ان کا یہ رہا کہ ہم ان حدیثوں

کو کیسے مان لیں جن میں یہ مضامین ہیں ـــــــ ان لوگوں نے چند متشابہات کے باعث کل احادیث ہی لائق انکار ٹھہرادیں اور (۴) کہیں انہوں نے باطنی تاویلات کی راہ سے احادیث کا انکار کیا. کہ ہم اہل معرفت خود ہی حدیث کو دیکھ لیتے ہیں. تمہارے ذخیرہ حدیث میں سے ہمیں کسی حدیث کی ضرورت نہیں. اہل قال اہل حال کو کیا سمجھیں ـــــــ کوئی کچھ کہتا رہا کوئی کچھ ـــــــ آوازیں مختلف اٹھتی رہیں. لیکن یہ بات اپنی جگہ حقیقت رہی اور اس میں شک نہیں کہ انکار حدیث کی تحریک پوری تاریخ میں کبھی منفی عنوان سے نہیں چلی. چودھویں صدی ہجری نے جہاں اور بہت سے گل کھلائے، انگریزی نبی کھڑے کیے. فتنہ انکار حدیث کو بھی نیا عروج بخشا. اب یہ فتنہ اچھا خاصا معروف ہو چکا ہے اور کچھ لوگ اب منفی عنوان اختیار کرنے سے بھی نہیں چوکتے اور یہ تحریک اب زور پکڑتی جا رہی ہے. ایک منکر حدیث کہتا ہے اور کتنا کھل کر کہتا ہے :-

> یہ سنت ہی تھی جس نے اسلام کے ابتدائی جمہوری مزاج میں بگاڑ پیدا کیا یہ سنت ہی تھی جس نے مسلمانوں کو متعدد فرقوں میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُن کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا. یہ سنت ہی تھی جس نے بنوامیہ اور بنوعباس کے عہد میں مذہبی لوگوں کو غیر معمولی اہمیت دلوائی. اور یہ سنت ہی تھی جس نے دولت عثمانیہ کو ناقابل علاج مریضوں کی آماجگاہ بنایا.[1]

یاد رکھیے فتنہ انکار حدیث کی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خبر دے چکے تھے حضرت مقدامؓ (۸۷ھ) کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

> الا یوشك رجل شبعان علی اریکته یقول علیکم بهذا القرآن فما وجدتم فیه من حلال فاحلوه وما وجدتم فیه من حرام فحرموه.[2]

ترجمہ. قریب ہے کہ ایک امیر آدمی اپنے صوفہ پر بیٹھے درس دے. کہ تمہیں یہ قرآن کافی ہے تم اس میں جو حلال پاؤ اسے حلال سمجھو اور جس چیز کو حرام پاؤ اسے ہی حرام کہو.

---

[1] بشکریہ روزنامہ تسنیم لاہور ۹ فروری ۱۹۵۵ء صـ۱ کالم ۴ [2] مشکوٰۃ صـ۲۹

اس حدیث میں جہاں اس فتنے کی خبر دی، ایک یہ اشارہ بھی کر دیا کہ انکارِ حدیث کی آواز پہلے امراء کے اسی قسم کے حلقوں سے اُٹھے گی۔ لوگ صوفوں پر بیٹھے، کوٹھیوں میں محفلیں لگائے حدیث کا انکار کریں گے اور یہی لوگ ہیں جو منکرینِ حدیث کی صف باندھیں گے۔

پیشتر اس کے کہ ہم فتنۂ انکارِ حدیث کی کچھ تفصیل کریں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ معتزلہ شیعہ اور قادیانیوں کے حدیثی موقف کو جو بعض پہلوؤں سے تحریک انکارِ حدیث سے مل جاتا ہے کچھ پہلے بیان کر دیں، تاکہ ان میں اور اس زمانے کے دوسرے منکرینِ حدیث میں کچھ مطابقت واضح ہو جائے۔

معتزلہ کا انکار

معتزلہ اخبارِ احاد کو حجت مان کر اہل السنت والجماعت کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ کلامِ الٰہی کا اس کی صفت ہونا مخلوق نہ ہونا، معجزات کا خرقِ عادت ہونا انہیں ظاہری اسباب سے مسبب نہ بتلانا، عذابِ قبر ان امور کی نفی خبرِ واحد کو حجت مان کر ان کے لئے عملاً ممکن نہ تھی۔ انہوں نے حیلہ کیا کہ عام عقل کو ارشادِ رسالت پر غالب کر کے ان تعلیمات کے ارشادِ رسالت ہونے سے ہی انکار کر دیا جائے۔ اخبار احاد کے انکار سے حدیث کا ذخیرہ بہت سمٹ جاتا تھا۔ بہت کم احادیث رہ جاتی تھیں جو تواتر پر پوری اتریں وہ پھر ان میں بھی تاویل کی راہ اختیار کرتے۔ جن احادیث کو مانتے ان کا ماننا بھی نہ ماننے کے برابر رہ جاتا۔ ان کے اس طریق عمل سے پورے کا پورا ذخیرۂ حدیث ان کے ہاں مشتبہ تھا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے بھی اصولی طور پر حجیتِ حدیث کا انکار نہیں کیا۔ گو یہ صحیح ہے کہ ان کی فکر عام عقل سے شرعی تقاضوں کے فیصلے لیتی رہی تاہم دائرہ عقلیت اہل السنت والجماعت کے مقابلہ میں دائرۂ اقلیت ہی رہا۔ حضرت مولانا بدر عالم میرٹھیؒ لکھتے ہیں:۔

> اسلام میں تقریباً پہلی صدی تک صحیح احادیث کو بلاتفصیل متفقہ طور پر حجت سمجھا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ معتزلہ ظاہر ہوئے۔ ان کے دماغوں پر عقل کا غلبہ تھا۔ انہوں نے حشر و نشر، رویۃ باری تعالیٰ، صراط و میزان، جنت و جہنم اور

اس قسم کی اور احادیث کو قابل تسلیم نہ سمجھا اور اپنے اس مزاجی فساد کی وجہ سے اخبار متواترہ کے سوا بقیہ احادیث کا سرے سے انکار کر دیا اور بہت سی قرآنی آیات میں جو اپنے مذاق کے خلاف دیکھیں تاویلیں کر ڈالیں[1]

حافظ ابن حزمؒ (۴۵۶ھ) فرماتے ہیں کہ

اہل سنت، خوارج، شیعہ، قدریہ تمام فرقے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان احادیث کو جو ثقہ راویوں سے منقول ہوں برابر قابل حجت سمجھتے رہے۔ یہاں تک کہ پہلی صدی کے بعد متکلمین معتزلہ آئے اور انہوں نے اس اجماع کے خلاف کیا[2]

معتزلہ کا یہ فتنہ ایک علمی فتنہ تھا۔ اس لیے انکار حدیث میں انہیں بہت کچھ پس و پیش کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ ایک جماعت نے یہ تصریح کی کہ خبر واحد اگر عزیز ہو جائے (یعنی اس کے راوی اوّل سے آخر تک ہر طبقہ میں دو دو رہیں) تو چونکہ وہ مفید یقین ہو جاتی ہے۔ اس لیے وہ حجت ہو جائے گی۔ حافظ ابن حجرؒ (۸۵۵ھ) نے ابو علی جبائی (ھ) سے نقل فرمایا کہ حدیث کی صحت کے لیے اس کا عزیز ہونا شرط ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انکار حدیث سے ان کا مقصد دین سے پوری سبکدوشی حاصل کرنا نہ تھا۔ بلکہ وہ ایک اصولی غلطی تھی جو ان کے دماغوں میں ایک غلط بنیاد پر قائم ہو گئی تھی[3]

تحریک اعتزال کا بانی واصل بن عطا تھا۔ جو پہلی صدی ہجری کے آخر میں اُبھرا اور عقل کے ہتھیاروں کی تیزی میں بہت سے ذخیرۂ حدیث کو کچلتے ہوئے آگے نکل گیا۔ دوسری صدی میں حضرت امام شافعیؒ اُٹھے اور آپ نے سب سے پہلے اس فتنہ انکار حدیث کا رد کیا۔

نیچریوں کا انکار

اس تحریک کے بانی سر سید احمد خاں تھے۔ اُن کے شاگرد نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی (۱۸۹۵ء) جیسے لوگ ایک مستقل فکری حلقہ بنا چکے تھے۔ تیرہویں صدی کے آخر میں یہ

---

[1] ترجمان السنۃ جلد ۱ صفحہ ۹۲ [2] الاحکام جلد ۱ صفحہ ۱۱۴ [3] ترجمان السنۃ جلد ۱ صفحہ ۹۲

معتزلہ کی نشأۃ جدید تھی۔ ان کا انکار بھی علمی شبہات کی اوٹ میں پروان چڑھا۔ انکارِ حدیث کا عنوان انہوں نے بھی اختیار نہ کیا تھا۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ مسلمانوں نے اگرچہ سرسید کا ساتھ دیا تو وہ اُن کی تعلیمی پالیسی کی وجہ سے تھا۔ مذہبی پہلو سے وہ اُن کے ساتھ نہ تھے مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری ایک مقام پر لکھتے ہیں:-

> پہلی تحریک علی گڑھ سے اُٹھی، جس کے محرک سرسید احمد خاں مرحوم تھے۔ یہ تحریک انگریزی تعلیم کی ترقی کے لیے تھی۔ اس لیے مسلمان اس کے حامی کار ہوئے۔ مگر سرسید مرحوم نے مسلمانوں کے عقائد میں دخل دینا شروع کیا۔ تو بگاڑ شروع ہو گیا۔[۱]

سرسید اور ان کے حلقۂ فکر میں اسلام کسی قسم کی نشو و نما پا رہا تھا یا انگریزی سلطنت کے سایہ تلے پورے اسلام کی بیخ کنی ہو رہی تھی؟ اس سوال کا جواب مولوی چراغ علی صاحب کی اس صاف گوئی سے ملتا ہے:-

> مردم شماری ہوئی تو انہوں نے مذہب کے خانہ میں اپنی بیوی کے نام کے سامنے لفظ شیعہ لکھ دیا لیکن اپنے اور اپنے بیٹوں کے نام کے مقابل صفر صفر لکھ دیئے۔[۲]

جہاں تک ان کے کسی مکتبِ فکر یا مسلک کا تعلق تھا۔ حق یہ ہے کہ وہ صفر ہی تھا۔ احادیث کو چھوڑ کر جو مسلک قائم ہوگا وہ صفر سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

شیعہ کا انکار

شیعہ حضرات اہل سنت کے سامنے جب کبھی ان حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں۔ جو اہل السنت والجماعت کے ہاں متداول ہیں یا صحاح ستہ سمجھی جاتی ہیں۔ تو وہ انہیں الزامی طور پر پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ اس بات کے مدعی ہوتے ہیں کہ یہ روایات اہل السنت کے ہاں معتبر ہیں۔ لیکن جہاں تک ان کے اپنے عقیدے کا تعلق ہے۔ وہ نہ ان کتابوں کو معتبر سمجھتے ہیں

---

[۱] مولانا مودودی سے خطاب [۲] چند ہمعصر ڈاکٹر مولوی عبدالحق ص۴۲ طبع ۱۹۵۰ء انجمن ترقی اردو پاکستان

نہ اُن کے مؤلفین سے انہیں کوئی عقیدت ہے نہ وہ انہیں اپنے ہاں مومن تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے ہاں حدیث کی اپنی کتابیں ہیں۔ جو اصول اربعہ کے نام سے معروف ہیں۔ سو شیعہ حضرات کا صحاح ستہ کی احادیث سے انکار دراصل ان کتابوں سے انکار ہے۔ حدیثِ رسولؐ سے اصولی انکار نہیں۔ ارشادِ رسالت کے حجت ہونے کے وہ بہرحال قائل ہیں۔ گو یہ صحیح ہے کہ انہوں نے کتاب اللہ و سنتی[1] (اللہ کی کتاب اور میری سنّت کو لازم پکڑو) کی بجائے کتاب اللہ و عترتی (اللہ کی کتاب اور میری اولاد کو تم سند اور حجت جانو) کی روایت اختیار کی ہے۔ اہل السنت و الجماعت کی کتب احادیث میں جہاں یہ روایت کتاب اللہ وعترتی پائی جاتی ہے۔ اس کی اسناد میں کوئی نہ کوئی شیعہ راوی ضرور موجود ہوتا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اصلاً یہ شیعہ کی روایت تھی۔

مثلاً ترمذی شریف میں ہے:۔

یا ایھا الناس انی ترکت فیکم ما ان اخذتم بہ لن تضلوا کتاب اللہ وعترتی اھل بیتی۔[2] رواہ الترمذی ۲ ص ۵۸۹ لکھنؤ۔

ترجمہ: اے لوگو میں تم میں وہ چیز چھوڑ رہا ہوں کہ اگر تم نے اس سے تمسک کیا تو تم کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ کتاب اللہ اور اپنے اہل بیت۔

اس کی سند میں دور سے ہی عبدالرحمٰن الکوفی نظر آئیں گے اور انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو گا کہ یہ کوفہ سے کون بزرگ آ رہے ہیں جو یہ روایت سُنا رہے ہیں اور کوفی کا شیعی ہونا لوگوں کو پہلے سے معلوم ہوتا ہے۔ پھر شیعہ اس بات کے بھی قائل ہیں۔ کہ ان کا امام معصوم ہر دور میں موجود رہا ہے اور یہ صرف امام کی بات ہے جو اُن کے ہاں حدیث کا درجہ رکھتی ہے۔ سو اس کی احادیث

---

[1] مؤطا امام مالک ص ۳۷۹ [2] جامع ترمذی جلد ۲ ص ۲۱۹ یہ روایت صحیح ہو تو بھی اس میں خلافت عترت کی کوئی راہ نہیں۔ اس میں لفظ فیکم (تم میں)، لائق غور ہے۔ حضورؐ صحابہ کو نصیحت فرما رہے تھے کہ قرآن کریم اور میری عترت کو ساتھ لے کر چلنا اور ان سے تمسک کرنا ـــــ جانتے والا نصیحت کس کو کرتا ہے؟ جانشین کو ـــــ معلوم ہوا کہ جانشینی رسول صحابہ کے پاس آ رہی تھی۔ تبھی تو ان کو نصیحت کر رہے تھے کہ قرآن اور عترت کو ساتھ لے کر چلنا ـــــ جانشینی رسالت عترت کے پاس آنی ہوتی: تو عترت کو فرماتے کہ قرآن اور صحابہ کو ساتھ لے کر چلنا ـــــ لیکن ایسا نہ فرمایا اس کے برعکس فرمایا۔

کے ہوتے ہوئے انہیں جناب رسالت مآبؐ کی احادیث کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔

قادیانیوں کا انکار حدیث

قادیانی لوگ علمی مباحث میں جب کبھی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ تو ان کی بھی یہ کوشش بر سبیل الزام ہوتی ہے۔ خود وہ حدیث کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ وہ یہ انداز محض اس لیئے اختیار کرتے ہیں کہ مسلمان حدیث نبوی کے قائل ہوتے ہیں اور وہ اُسے اپنے لیئے خزانۂ اعتماد سمجھتے ہیں اور علم وعمل کی سند جانتے ہیں۔

ورنہ جہاں تک قادیانیوں کا اپنا تعلق ہے وہ اعتقاد رکھتے ہیں۔ کہ مرزا غلام احمد قادیانی اس پوری امت کے لیئے حکم بن کر آیا ہے۔ اور اب حدیث وہی قابل قبول ہے جسے وہ صحیح قرار دے اور وہ حدیث ضعیف ہے جسے وہ ناقابل قبول ٹھہرائے۔ ان کا یہ عقیدہ مرزا غلام احمد کی ایک تحریر میں اس طرح مرقوم ہے:۔

> اور جو شخص حکم ہو کر آیا ہو اس کو اختیار ہے حدیثوں کے ذخیرہ میں سے جس انبار کو چاہے خدا سے علم پا کر قبول کرے اور جس ڈھیر کو چاہے خدا سے علم پا کر رد کر دے۔[۱]
>
> میرے اس دعویٰ کی حدیث بنیاد نہیں بلکہ قرآن اور وحی ہے جو میرے پر نازل ہوئی۔ ہاں تاکیدی طور پر ہم وہ حدیثیں بھی پیش کرتے ہیں جو قرآن شریف کے مطابق ہیں اور میری وحی کے معارض نہیں اور دوسری حدیثوں کو ہم ردّی کی طرح پھینک دیتے ہیں۔[۲]

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی۔ کہ معتزلہ، شیعہ اور قادیانیوں کے اختلافات عام مسلمانوں سے کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے حجت اور سند ہونے پر یہ پھر بھی متفق ہیں۔ حدیث کے ثبوت اور عدم ثبوت پر تو ان میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ کسی حدیث کے منسوخ ہونے یا نہ ہونے میں بھی ان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حجیت پیغمبر پر ان لوگوں نے بھی عام مسلمانوں سے کہیں اختلاف نہیں کیا۔ حضرت امام شافعیؒ (م ۲۰۴ھ) فرماتے ہیں:۔

---

[۱] حاشیہ تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۰ [۲] ضمیمہ نزول مسیح صفحہ ۳۰

اگر بالفرض کسی خاص مسئلہ کے متعلق کسی کے لیئے یہ کہنا جائز ہوتا کہ اس پر مسلمانوں کا ہمیشہ اجماع رہا ہے تو خبر واحد کی حجیت کے لیئے بھی میں یہ لفظ کہہ لیتا۔ مگر احتیاط کے خلاف سمجھ کر اتنا پھر بھی کہتا ہوں کہ میرے علم میں فقہاء مسلمین میں کسی کا اس میں اختلاف نہیں۔ ترجمان السنۃ جلد ا ص۱۷۶

قادیانی تو ویسے ہی پاکستان میں غیر مسلم اقلیت ہیں۔ شیعہ کے عوام پر گو غیر مسلم ہونے کا فتوے نہیں۔ تاہم یہ ضرور ہے اثنا عشری شیعہ علماء اسلامی صفوں میں کچھ وزن نہیں رکھتے۔ ان کے جمہور مسلمانوں سے اختلافات اصُولی اور بنیادی ہیں۔ فروعی اور صرف مسلکی نہیں۔ اتنے اصولی اختلافات کے باوجود یہ لوگ بھی کھُلم کھلا حدیث کا انکار نہیں کر سکے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عقیدہ توحید کے بعد اسلام کا سب سے پختہ اتفاق یہ ہے کہ پیغمبر کی علمی و عملی آقائی اور سیادت کسی پہلو سے بھی محل بحث نہ بننے پائے۔

رہے معتزلہ تو ان کا اعتزال اس دور میں مستقل نہیں رہا۔ شیعیت اور نیچریت میں جذب ہو چکا ہے۔ شیعہ حضرات ائمہ اہلبیت کے نام سے معتزلہ کی عقل پسندی کا ساتھ دیتے ہیں اور نیچری حضرات قانونِ فطرت اور کائنات کی عادتِ عامہ کے سہارے ذخیرۂ احادیث کی اخبارِ احاد کا انکار کرتے ہیں۔

مستشرقین نے بھی اس پہلو سے صف اسلام میں بہت انتشار پیدا کیا ہے۔ حدیث سے اعتماد اٹھانے میں شک کے کانٹے دور تک بکھیرے۔ گولڈ زیہر اور مسٹر شاخٹ نے اس معرکے میں اپنی عمریں صرف کر ڈالیں اور عرب ممالک میں حدیث کے خلاف ہر طرف تشکیک کی راہیں کھول دیں ـــــ الحمد للہ کہ ان ممالک میں جامعہ ازہر اور سعودی عرب کے بعض علمائے نے اس محاذ پر کام کیا ہے اور اس فتنے کا پوری طرح سدِّ باب کیا ہے۔

برصغیر پاک و ہند براہ راست برطانوی عملداری میں تھا یہاں ان لوگوں کو کام کرنے کے بہت مواقع میسر آئے۔ عربی زبان نہ جاننے کے باعث بڑے بڑے مفکرین اُن سے متاثر ہوئے اور حقیقت یہ ہے کہ فتنہ انکارِ حدیث جو اور کسی جگہ اپنی جڑیں زیرِ زمین نہ لے جا سکا تھا پاک و ہند میں الحاد کی پُوری توانائی اور کم علمی کی پوری ڈھٹائی سے جدید طبقوں میں اپنا پرچم لہرانے لگا ـــــ سو ہم یہاں صرف اسی علاقے کے منکرین حدیث کا ذکر کریں گے۔

ہندوستان کے منکرینِ حدیث

① مولوی عبداللہ چکڑالوی

پہلا شخص جس نے ہندوستان میں کھلم کھلا حدیث کا انکار کیا قاضی غلام نبی تھا۔ یہ شخص چکڑالہ ضلع میانوالی کا رہنے والا تھا اور قاضی نور عالم مرحوم کا بیٹا تھا۔ حدیث سے یہاں تک نفرت بڑھی کہ اپنا نام غلام نبی بدل کر عبداللہ رکھ لیا۔ اسی کو عبداللہ چکڑالوی کہتے ہیں۔

قاضی غلام نبی المعروف بہ عبداللہ چکڑالوی ڈپٹی نذیر احمد کے شاگرد تھے۔ ۱۲۸۲ھ میں علوم دینیہ کی تکمیل کی۔ ڈپٹی نذیر احمد ترکِ تقلید کی طرف مائل تھے۔ اُن کے زیر اثر قاضی غلام نبی صاحب بھی آہستہ آہستہ ترکِ تقلید کی رو میں بہنے لگے۔ کچھ عرصہ اہلحدیث رہنے کے بعد انہوں نے سرے سے حدیث کا انکار شروع کر دیا۔ چکڑالہ کے لوگوں نے آپ کو خطابت اور افتاء سے الگ کر دیا اور آپ نے جلال پور ضلع ملتان جاکر ملازمت کرلی۔ پھر اس علاقے کی دینی قیادت قاضی قمرالدین صاحب کے سپرد ہوئی۔ قاضی قمرالدین صاحب قاضی غلام نبی کے چچازاد بھائی تھے۔ آپ نے حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری سے حدیث پڑھی تھی اور حضرت مولانا احمد حسن کانپوری سے بھی علمی استفادہ کیا تھا۔ آپ نے فتنۂ انکارِ حدیث کا خوب کھل کر مقابلہ کیا۔ مولوی عبداللہ کے لڑکے قاضی ابراہیم نے اپنے والد کے مسلک کو قبول کرنے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ والد کی جائداد سے بھی محروم ہوگئے۔ اُن کے بھائی قاضی محمد عیسیٰ کچھ دنوں تک اپنے والد کے ساتھ رہے۔ انجام کار وہ بھی اس سے منحرف ہوگئے اور انکار حدیث سے تائب ہوکر مسلکِ حق اختیار فرمایا ـــــــ مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی نے ترجمۃ القرآن بآیات القرآن کے نام سے ایک تفسیر بھی لکھی جس کے چند اقتباسات ملاحظہ کریں۔ ان سے مولوی عبداللہ چکڑالوی کا نظریہ انکارِ حدیث کھل کر سامنے آتا ہے:۔

کتاب اللہ کے مقابلہ میں انبیاء اور رسولوں کے اقوال و افعال یعنی احادیث قولی، فعلی، تقریری پیش کرنے کا مرض ایک قدیم مرض ہے۔ محمد رسول اللہ سلام علیہ کے مقابل و مخاطب بھی قطعی اور یقینی طور پر اہلحدیث ہی تھے۔[۱]

کسی جگہ سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ قرآن کریم کے ساتھ کوئی اور شے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔ اگر کوئی شخص کسی مسئلہ میں قرآن کریم کے سوا کسی اور چیز سے دین اسلام میں حکم کرے گا۔ تو وہ مطابق آیات مذکورہ بالا کافر، ظالم اور فاسق ہو جائے گا۔[۲]

رسول اللہ کی زبان مبارک سے دین کے متعلق یا قرآن شریف نکلتا تھا۔ اور یا سہواً اپنے خیالات و قیاسات، جن میں القاء شیطانی موجود ہوتا تھا۔ جن کو خدا تعالیٰ نے منسوخ و مذکور فی القرآن کر کے آپ کی ان سے بریت کر دی۔[۳]

مولوی عبداللہ چکڑالوی کی ان تصریحات میں ان کا اعتقادی چہرہ بہت کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ کاش کہ وہ ترک تقلید کے زیر سایہ تعلیم نہ پڑھتے اور ترک تقلید انہیں اس گڑھے میں نہ اتارتی۔ مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی پہلے فقہ کی بندش سے آزاد ہوئے۔ پھر حدیث سے آزادی کی راہ ہموار کرنے لگے۔ مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری نے پیشگوئی کی کہ اس کے بعد وہ قرآن کریم کی جمع و تدوین کے پیچھے پڑیں گے۔ دین سے آزادی حاصل کرنے کی یہ آخری منزل ہے ـــــ مولانا ثناء اللہ صاحب لکھتے ہیں :۔

امام اہل قرآن نے نفسیات کے اس مسئلہ پر اچھی طرح غور کر لیا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ جماعت کے عقائد دیر میں اور بتدریج بدلتے ہیں۔ اس لئے جب انہوں نے دیکھا کہ اب لوگ فقہ کی بندش سے تقریباً آزاد ہو گئے ہیں تو انہوں نے حدیث پر نکتہ چینی شروع کر دی اور جب کچھ دنوں میں یہ مرحلہ بھی طے ہو جائے گا تو وہ جمع و تدوین قرآن میں رخنے نکالنے شروع کر دیں گے۔[۴]

مولانا ثناء اللہ صاحب ان اہل قرآن کے بارے میں مزید لکھتے ہیں :۔

---

[۱] تفسیر ترجمۃ القرآن ص ۹۷ مطبوعہ ۱۳۲۰ھ [۲] ایضاً ص ۴۲ [۳] ایضاً ص ۴۴ [۴] فتاویٰ ثنائیہ جلد ۱ ص ۲۸۰

ان کا ہر شخص خود امام ہے اور مجتہد ہے۔ اس کو کسی کی تقلید کی ضرورت نہیں کیونکہ تقلید نام ہے پابندی کا اور اسی پابندی سے بھاگنے کے لیئے تو یہ سارا کھیل کھیلا گیا ہے۔ اس لیئے یہ لوگ ایک دوسرے کی بالکل نہیں سنتے ہر شخص قرآن مجید کو جس طرح سمجھتا ہے۔ اسی طرح اس پر عمل پیرا ہونے کا دعوی کرتا ہے[1]

اس میں شبہ نہیں کہ انکارِ حدیث کی تحریک غیر مقلدوں کے جوشِ ترکِ تقلید سے اٹھی۔ مشہور مؤرخ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:۔

اہلحدیث جماعت کے جوش و خروش کا دوسرا نتیجہ طبقہ اہل القرآن کا آغاز ہے۔ اہلحدیث اپنے آپ کو غیر مقلد کہتے ہیں۔ وہ فقہی ائمہ مثلاً امام ابوحنیفہؒ کی تقلید سے آزاد ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ کئی طبیعتوں کو جو زیادہ آزاد خیال تھیں فقط فقہاء کی تقلید سے آزادی کافی معلوم نہ ہوئی اور انہوں نے مختلف اسباب کی بناء پر احادیث سے بھی آزادی حاصل کرنا چاہی۔ اس گروہ کا ایک مرکز پنجاب میں ہے۔ جہاں لوگ انہیں چکڑالوی کہتے ہیں اور یہ اپنے آپ کو اہل القرآن کا لقب دیتے ہیں۔ اس گروہ کا بانی مولوی عبداللہ چکڑالوی پہلے اہلحدیث تھا[2]

مولوی عبداللہ کے لئے سب سے بڑی مشکل نماز کا مسئلہ تھا۔ قرآن کریم بار بار نماز کا حکم دیتا ہے لیکن اس میں نماز کی کوئی پوری تشکیل مذکور نہیں۔ نماز کا سارا عملی نقشہ اُمت کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا ہے اور بدوں حدیث تسلیم کئے کوئی شخص قرآن کریم کے حکم واقیموا الصلوٰۃ پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا۔ مولوی صاحب کے لئے انکار نماز بھی آسان نہ تھا اور کوئی ارکان نماز کی عملی تشکیل میں قرآن سے سامنے لانا یہ ان کے لئے اس سے بڑھ کر مشکل تھا۔ مولوی صاحب نے قرآن کے نقشہ نماز کیلئے برہان الفرقان علی صلوٰۃ القرآن، ایک کتاب لکھی جو چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ نماز سیکھنے کے لئے چار سو صفحات کی ورق گردانی کون کریگا اور مولوی صاحب کے اس میں استدلالات کیا کیا ہیں۔ یہ اس وقت ہمارا موضوع نہیں۔ ہمیں اس وقت صرف یہ بتانا ہے کہ مولوی عبداللہ چکڑالوی کا نظریہ حدیث کیا تھا مولوی

---

[1] فتاویٰ ثنائیہ جلد ۱ صفحہ ۲۸ [2] موج کوثر صفحہ ۵۲

صاحب پہلے اطاعت رسول کو زیر بحث نہیں لاتے، حدیث کے موجودہ لٹریچر کو جعلی اور وضعی بتلاتے ہیں
"حدیث کی تشریح و تفصیل کتاب اللہ المجید کے سراسر مخالف ہے ۔۔۔۔ اس وجہ سے مجھے اس بارہ میں شک ہوا کہ حدیث محمد رسول اللہ سلام علیہ کا قول و فعل اور تقریر نہیں ہے ۔۔۔۔۔ اور میں نے دیکھا کہ وہ ایک نہایت ہی کریہہ المنظر بد صورت، زشت رُو بدشکل مصنوعی چیز ہے۔ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ کی وفات سے سینکڑوں برس پیچھے بعض خود غرض لوگوں نے از خود یہ جزئیات گھڑ لیں اور کمال سیاہ دلی سے ان کو ناحق محمد رسول اللہ سلام علیہ کے ذمے لگا دیا ہے۔ یہ کام زیادہ تر بعض یہود و نصاریٰ دشمنانِ اسلام کا معلوم ہوتا ہے جنہوں نے اسلام کی بیخکنی کی یہ بہترین راہ سوچی کہ وہ مسلمانی کے لباس میں لوگوں کو قرآن حکیم کی طرف سے ہٹا کر اور طرف لگا دیں[1]"

پھر ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"فی الحقیقت حدیث میں اس قدر لغویات جزئیات اور دور از کار اور بے سرا پا باتیں مندرج ہیں کہ وہ اس کی شکل کو نہایت ہی بدنما بناتی ہیں، لیکن واضعین حدیث (حدیث بنانے والوں) نے یہ بڑی کارگیری کی کہ اس کو خاتم النبیین کی طرف منسوب کر دیا اور اس طرح اس کے بدشکل چہرہ پر سفیدہ (پاؤڈر) مل دیا[2]"

اس تشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کا حملہ پہلے براہ راست اطاعت رسول کے لازم ہونے اور حدیث کی حجیت پر نہ تھا، وہ صرف موجودہ ذخیرہ حدیث کو ناقابلِ اعتماد سمجھتے تھے اور ان کے پاس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح تعلیمات تک پہنچنے کے لئے اور کوئی راہ بھی تو نہ تھی مجبوراً انہوں نے یہ راہ اختیار کی کہ قرآن مجید کو ہر طرح سے ہر بات میں کافی اور وافی کہیں تا کہ اور کسی طرف انہیں دھیان نہ کرنا پڑے۔ ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

"قرآن مجید میں دینِ اسلام کی ہر ایک چیز من کل الوجوہ مفصل و مشرح طور پر بیان ہو گئی ہے تو اب وحی خفی یا حدیث کی کیا حاجت رہی بلکہ اس کا ماننا اور دینِ اسلام میں اس پر عمل درآمد کرنا سراسر کفر و شرک اور ظلم و فسق ہے۔"[3]

اس پر بس نہیں، ذرا آگے چلئے:

---

[1] الزکوٰۃ والصدقات ص ۱۲، ۱۳ ۔ [2] برہان الفرقان صہ ۱۰۹ [3] مناظرہ صہ ۱۹

"نہ صرف زمانہ محمد رسول اللہ سلام علیہ کے لوگ ہی کتاب اللہ کے مقابلہ میں احادیث انبیاء پیش کرتے تھے، بلکہ یہ ملعون کام اس سے بھی پرانا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ فرعون بھی اہل حدیث ہی تھا اور موسیٰ سلام علیہ کے مقابلہ میں یوسف سلام علیہ کی احادیث پیش کرتا تھا" [1]

حدیث لٹریچر معتمد ذخیرہ حدیث ہے یا نہ ؟ اس کی بحث تدوین حدیث کے زیر عنوان پہلے ہو چکی ہے ۔ آپ اس وقت صرف چکڑالوی صاحب کے موقف پر غور کریں ۔ اس کا حاصل یہ ہے

حدیث کا کوئی وجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہ تھا۔ حضور نے قرآن کے سوا کبھی کوئی بات نہ کی تھی۔ صحابہ نے حضورؐ کے کسی قول یا عمل کو کبھی کسی کے سامنے نقل کیا تھا نہ ان میں حضورؐ کی وفات کے بعد حضورؐ کی کسی بات کو آگے نقل کرنے کا داعیہ پیدا ہوا اور نہ ہی اگلوں نے پچھلوں سے حضور یا صحابہ کے زمانے کی کوئی بات پوچھی ۔ انہی حالات پر اسلام کی دو تین صدیاں بسر ہوئیں اور اس کے بعد یہود و نصاریٰ کے کہنے سے حدیث کی کتابیں یکایک لکھ دی گئیں اور مسلمان یکایک انکی باتوں میں آکر ان جزئیات کو دین سمجھنے لگے ۔ پہلی تین صدیوں میں جو قرآنی نماز قائم تھی ۔ وہ یکایک ترک ہوگئی اور نماز کا موجودہ نقشہ جو سراسر قرآن کے خلاف تھا مسلمانوں میں قائم ہوگیا ۔ اسلامی دنیا جہانتک وسیع ہوتی گئی، یہی عجمی نماز ہر جگہ پہنچی اور کسی عربی دان کو قرآن کے مطالعہ سے قرآن میں یہ نقشہ نماز نظر نہ آیا جو مولوی عبداللہ چکڑالوی نے اب برہان القرآن علی صلوٰۃ القرآن میں درج فرمایا ہے ۔ پھر مسلمانوں میں ان قرون اولیٰ اور قرون وسطیٰ میں جتنے بھی قانون دان اور ماہرین فقہ گزرے ۔ ان میں سے کسی کو پتہ نہ چل سکا کہ یہ معتبر راویوں کے نقل کئے ذخائر حدیث ہرگز ماخذ علم نہیں، بلکہ یہ سب جزئیات کا ایک ذخیرہ ہے جو دشمنانِ اسلام نے مسلمانوں کی بیخ کنی کے لئے تیار کیا ہے ۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

چکڑالوی صاحب کا یہ تبصرہ صرف اس امت پر نہیں ۔ وہ پہلی امتوں کو بھی برابر کا مجرم قرار

---

[1] برہان القرآن ص ۱۷

دیتے ہیں اور مولوی صاحب کا دعویٰ ہے کہ اتباع حدیث کی تجویز پہلے ادوار میں بھی تھی۔ فرعون اہل حدیث میں سے تھا اور موسیٰ علیہ السلام تورات کے سوا اور کسی چیز کو بنو اسرائیل کے لئے حجت نہ سمجھتے تھے اور نہ آپ نے کبھی کسی اور بات کی دعوت دی تھی

مولوی صاحب کی یہ بات پنبہ کجا کجا نہم کا مصداق ہے۔ ہم ان کی کس کس بات پر مرہم رکھیں اور ان کے لگائے کس کس زخم کو مندمل کرنے کی کوشش کریں۔ تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملی تھی اور وہ اسرائیل کے لئے بے شک تشریعی پیغمبر تھے۔ ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام تو صاحب کتاب نہ تھے، پھر قرآن کریم میں یہ بات کیوں ہے کہ انہوں نے بھی قوم کو اپنی پیروی کی دعوت دی؟ اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ نبی اور رسول اسی لئے تو بھیجے جاتے ہیں کہ ان کی پیروی کی جائے اور ان سے رضاء الٰہی کے طریقے جاری ہوں۔ بنو اسرائیل جب سامری کے چکر میں گھرے تو حضرت ہارون علیہ السلام نے کیا یہ نہ کہا تھا: دیکھئے پ ۱۶ طٰہٰ آیت ۹۰،

یقوم انما فتنتم به وان ربكم الرحمٰن فاتبعوني واطيعوا امري۔

ترجمہ: اے میری قوم بات یہی ہے کہ تم بہک گئے اس (بچھڑے) کے ساتھ اور بے شک تمہارا رب تو رحمان ہے، سو میری پیروی کرو اور مانو میری بات۔

قرآن کریم کی اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ بنو اسرائیل کے لئے صرف تورات ماننے کی دعوت نہ تھی، اتباع رسالت بھی ان کے ذمہ تھا اور موسیٰ علیہ السلام تو اپنی جگہ لے ہے۔ حضرت ہارون علیہ السلام کی اتباع اور پیروی بھی ان پر لازم تھی۔ حدیث ماننے کا سبق پہلی امتوں میں اس وقت کے نبیوں کے زیر تربیت رہا ہے۔ یہ کہنا کہ یہ ملعون کام پہلے سے ہوتا چلا آیا ہے بڑی جسارت ہے ہندوستان کے منکرین حدیث میں مولوی عبداللہ چکڑالوی کے بعد جناب حافظ محمد اسلم کا نام آتا ہے

(۲) حافظ اسلم صاحب جیراجپوری

آپ بھوپال کے مشہور اہلحدیث گھرانہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مشہور غیر مقلد عالم جناب مولانا سلامت اللہ صاحب کے بیٹے تھے۔ آپ کے عقائد ملاحظہ ہوں :-

نہ حدیث پر ہمارا ایمان ہے اور نہ اس پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے۔

نہ حدیث کے راوی پر ہمارا ایمان ہے نہ اس پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا

گیا ہے نہ حدیث کی سند میں جو رجال ہیں ان پہ ہمارا ایمان ہے نہ اُن پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے۔ پھر یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ ایسی غیر ایمانی اور غیر یقینی چیز کو ہم قرآن کی طرح حجت مانیں[۱]

قرآن میں جہاں جہاں اللہ و رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے مراد امام وقت یعنی مرکز ملت کی اطاعت ہے۔ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم امت میں موجود تھے ان کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ اور آپ کے زندہ جانشینوں کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہوگی اور اطاعة عربی میں کہتے ہیں زندہ کی فرمانبرداری کو[۲]

مولوی صاحب کا یہ استدلال درست نہیں کہ اطاعت زندہ کی ہی ہو سکتی ہے فوت شدہ کی نہیں۔ فوت شدہ کی پیروی کے لیئے بھی لفظ اطاعت حدیث میں موجود ہے۔ ایک عورت حضرت عمرؓ کے بارے میں کہتی ہے۔ ماکنت لاطیعه حیاً واعصیه میتاً[۳] (ترجمہ) یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اُن کی زندگی میں تو اُن اطاعت کرتی رہوں اور جب وہ چل بسے تو اُن کے خلاف چلوں۔

اسلم صاحب کا یہ نظریہ مشہور غیر مقلد عالم مولانا وحید الزمان سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ یہی نظریہ شیعہ علماء کا ہے۔ مولانا وحید الزمان لکھتے ہیں:۔

جو مجتہد فوت ہو چکا ہے اس کی تقلید جائز نہیں۔ اس میں شیعہ ہمارے ساتھ ہیں[۴]

(نوٹ) فوت شدہ مفتی کے فتوے پر عمل کی نفیس بحث حافظ ابن قیمؒ (۷۵۱ھ) نے بھی کی ہے[۵]

حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں۔ من کان مستنا فلیستن بمن قد مات۔ مشکوۃ صہ ۳۲۔

حافظ اسلم۔ خاندانی طور پر غیر مقلد تھے۔ پھر انکار حدیث کرنے لگے۔ خود لکھتے ہیں:۔

ہمارا گھر مقامی اور بیرونی اہلحدیث علماء کا مرجع تھا[۶]

شیخ محمد اکرام صاحب بھی رقمطراز ہیں:۔

مولانا محمد اسلم بھی اوائل عمر سے اہلحدیث سے منسلک تھے[۷]

---

[۱] مقام حدیث جلد ۱ صہ ۱۲۹ [۲] ایضاً صہ ۱۵۵ [۳] موطا امام مالک صہ ۱۶۵ [۴] ہدیۃ المہدی صہ ۱۱۱
[۵] دیکھئے اعلام الموقعین صہ ۲۵۹ مصر مطبع النیل ۱۳۲۵ھ [۶] نوادرات صہ ۲۴۴ [۷] موج کوثر صہ ۵۴

حافظ محمد اسلم جیراجپوری نے ایک مؤرخ کی حیثیت سے زیادہ شہرت پائی۔ تاریخ الامۃ کئی حصّوں میں تحریر کی۔ آپ حدیث کے اصولاً خلاف تھے۔ مگر اسوۂ رسول کو اصولاً حجت مانتے تھے۔ آپ نے بھی حدیث کے خلاف بہت کام کیا ہے۔ اسوۂ رسول کے بارے میں ایسی ایسی قیود لگائیں کہ انجام انکار حدیث کے ہی قریب رہا۔ حضرت مولانا سید بدر عالم مدنی[؟] ایک جگہ حافظ صاحب کے مسلک پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

مولانا اسلم صاحب اسوۂ رسول کو تو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر اس کو متواتر فرماتے ہیں۔ ہمیں علمی لحاظ سے مولانا سے یہ سخت شکوہ ہے کہ وہ حدیث کے لیئے پورے پورے ثبوت بھی ناکافی سمجھتے اور انہیں شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن جب خود کوئی دعوے کرتے ہیں تو اس کے لیئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اگر اسوۂ رسول کے تواتر سے اُن کی غرض یہ ہے۔ کہ آپ نے نماز پڑھی تھی اور بس۔ تو اس کے لیئے صرف قرآن ہی کا تواتر کافی ہے۔ لیکن اگر اس سے آگے کی تفصیل مُراد ہے تو ان کو یہ صاف کرنا ضروری تھا کہ کن کن ارکان میں ان کو تواتر مسلم ہے اور کن میں نہیں۔ اسی طرح قرآن کی تمام عبادات کی ادائیگی کا نقشہ انہوں نے کیا اختیار کیا ہے؟ آپ کے اُسوہ حسنہ میں آپ کی امامت آپ کا نظم ونسق امت۔ اور فصل قضایا بھی شامل ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو صرف بہ حیثیت رسالت یا یہاں کوئی اور تقسیم ہے۔ اگر ہے تو وہ تقسیم بھی تواتر سے ثابت ہے یا نہیں؟ بہر حال جتنی بات قرآن سے ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ رسول تمہارے لیئے مطلقاً بلاکسی تخصیص کے اُسوہ اور نمونہ بنایا گیا ہے اور بلاکسی تقسیم کے وہ تمہارا رسول ہے۔ پس جب رسول کی ذات بلاکسی تفصیل کے اُسوہ ہے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ جو کچھ بھی عملی پہلو میں اس نے کر دکھلایا ہے وہ سب مولانا کے نزدیک بھی قرآنی امر کے ماتحت واجب التسلیم ہونا چاہیئے۔ اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری کی پوری زندگی آپ کا تمام

کا تمام اسوۂ حسنہ حرف بحرف بطریق تواتر منقول ہے یا اس کا ایک حصہ متواتر ہے اور بڑا حصہ غیر متواتر۔ پہلی صورت تو تواتر کے خلاف ہے۔ دُنیا میں کوئی شخص بھی یہ دعوے نہیں کر سکتا۔ کہ آپ کے عبادات معاملات کا ہر ہر پہلو تواتر سے ثابت ہے۔ لا محالہ یہی کہنا پڑے گا۔ کہ اس کا ایک حصہ متواتر اور دوسرا غیر متواتر ہے۔ بلکہ بڑا حصہ غیر متواتر ہے۔ مثلاً یہ متواتر ہے کہ آپ نے ظہر کی نماز پڑھی۔ یہ بھی متواتر ہے کہ چار رکعتیں پڑھیں، رکوع سجدہ کیئے۔ رکوع پہلے کیا پھر سجدہ، نماز کے آخر میں بیٹھے اور سلام بھی پھیرا، شروع نماز میں ہاتھ اُٹھائے، اس کے بعد ایک آدھی بات کا اور اضافہ کر بیٹھے۔ لیکن صرف متواتر امُور سے بھی نماز کی پُوری ہیئت مکمل نہیں ہوتی۔ پھر دین کے اس حصہ کے متعلق مُلّانا کا کیا فیصلہ ہو گا جو صحابہ کے سامنے اُسوۂ رسول میں نظر آنے کی وجہ سے قابلِ قبول تھا اور اب تواتر کے ساتھ منقول نہ ہونے کی وجہ سے قابلِ تسلیم نہیں رہا۔ ان جزئیات کے لیئے اب تجویز کیا ہے۔[1]

پھر ایک اور جگہ ان کے جواب میں لکھتے ہیں۔ اس ضمن میں قارئین کو مولانا اسلم صاحب کی علمی سطح کا بھی کچھ اندازہ ہو جائے گا:۔

مولانا اسلم صاحب جیراجپوری کو یہاں عجیب شبہ گزرا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ کہ ما اٰتاکم کی آیت مالِ غنیمت کی تقسیم کے بارے میں ہے۔ حدیث سے اس کا دُور کا واسطہ نہیں ہے۔ یہاں "اٰتا" کے لفظ کو جو "نھی" کے بالمقابل واقع ہے لوگوں نے غلط فہمی سے امر یا قال کے معنی میں سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ یہ لفظ قرآن میں سینکڑوں جگہ آیا ہے اور کہیں ان معنوں میں مستعمل نہیں ہوا۔ بلکہ ہر جگہ اس کے معنی دینے ہی کے ہیں۔ لہذا یہ استدلال بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ حدیثیں اقوال ہیں۔ اُن کے لیئے لینے دینے کا لفظ نہیں کہا جا سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو چیز دی ہے وہ قرآن ہے۔ انتہٰی

---

[1] ترجمان السنۃ جلد اوّل صد۲۳۱

مولانا کو چونکہ قرآن کی جامعیت کا علم ہی نہیں۔ اس لیئے یہاں بھی انہوں نے آیتِ بالا کو صرف مالِ غنیمت سے خاص کر ڈالا۔ قائلینِ حدیث کے نزدیک آیتِ بالا اپنی شانِ جامعیت کی وجہ سے صرف مال کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ ان ساری ہدایات کو بھی شامل ہے جو آپ نے اپنی امت کو دی ہیں[1]

حضرت مولانا لکھتے ہیں :۔

مولانا کی قرآن دانی کی یہ انتہا ہے کہ انہیں سینکڑوں جگہ میں ایسی کوئی آیۃ نظر نہیں آئی جہاں یہ لفظ ایسے معنی میں مستعمل ہو جو حدیث پر بھی بولے جا سکیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔ والذین اوتوا العلم درجات (اللہ تعالیٰ درجے بلند کرتا ہے مومنین کے اور ان کے جن کو علم دیا گیا ہے) اگر علم کے لیئے یہ لفظ مستعمل ہو سکتا ہے تو کیا حدیث ایک علم ہی نہیں؟ دوسری جگہ فرمایا۔ وآتیناہ الحکم۔ وآتیناہ من لدنا علما۔ آتینا لقمٰن الحکمۃ۔ اتانی الکتاب وجعلنی نبیا۔ واتاکم مالم یؤت احدًا من العلمین۔ اتیناہ الحکم وفصل الخطاب۔ ان آیات میں "اتا" کا لفظ کتاب کے لیئے علم کے لیئے حکمت کے لیئے۔ حکم اور نبوت کے لیئے۔ فضائل و کمالات کے لیئے اور آخری آیت میں "فصل الخطاب" یعنی اقوال کے لیئے بھی مستعمل ہوا ہے۔ اس لیئے مولانا کا دعویٰ بالکل بے دلیل ہے۔ یہ چند سطور ہی مولانا کے دعویٰ کی تردید کے لیئے کافی ہیں[2]

(۳) نیاز صاحب فتحپوری

ماہنامہ نگار کے مدیر نیاز فتحپوری بھی انکار حدیث میں نمایاں شخصیت تھے۔ من ویزداں انہی کی تصنیف ہے۔ آپ انکار حدیث میں یہاں تک آگے نکلے۔ کہ مسلمانوں کی تمام خرابیوں کا ذمہ دار حدیث کو ٹھہرایا۔ خود لکھتے ہیں :۔

---

[1] ترجمان السنۃ جلد ا ص ۱۱۴ [2] ایضاً

اگر مولویوں کی جماعت واقعی مسلمان ہے تو میں یقیناً کافر ہوں۔ اور اگر میں مسلمان ہوں تو یہ سب نا مسلمان ہیں۔ کیوں کہ ان کے نزدیک اسلام نام ہے صرف کورانہ تقلید کا اور تقلید بھی رسول و احکام رسول کی نہیں۔ بلکہ بخاری و مسلم و مالک وغیرہ کی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ حقیقی کیفیت یقین کی اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ جب تک ہر شخص اپنی جگہ غور کر کے کسی نتیجہ پر نہ پہنچے۔ قصۂ مختصر یہ کہ اولین بیزاری اسلامی لٹریچر کی طرف سے مجھ میں احادیث نے پیدا کی۔[۱]

اس میں نیاز صاحب نے مقلدین ائمہ اربعہ کو ہی نہیں کوسا بخاری و مسلم کے مقلدین جو اہلحدیث کہلاتے ہیں۔ انہیں بھی مقلد ہی قرار دیا ہے۔ ائمہ اربعہ کے نہ سہی، بخاری و مسلم کے ہی سہی۔ نیاز صاحب لکھتے ہیں:۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کے متعلق قرآن کے بتائے ہوئے تصورات، دوزخ و جنت، حشر و نشر وغیرہ عقائد ان سب کا مفہوم میرے لیئے کچھ سے کچھ ہو گیا ہے۔ کیونکہ اب مجھے نہ صرف عقائد بلکہ خود مذاہب کا وجود بچوں کا کھیل نظر آنے لگا۔[۲]

اب دیکھئے حدیث میں شک کے کانٹے نکالنے والا قرآن مجید کے ساتھ کہاں تک وفادار رہا؟ اسے اس کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے:۔

کلام مجید کو نہ میں کلام خداوندی سمجھتا ہوں اور نہ الہام ربانی۔ بلکہ ایک انسان کا کلام جانتا ہوں۔[۳]

قرآن کریم کے بارے میں یہ بد اعتقادی کہاں سے پیدا ہوئی؟ انکار حدیث سے ـــــ اور حدیث سے انکار کی یہ جرأت کہاں سے پیدا ہوئی؟ ترک تقلید سے ـــــ معجزات کے بارے میں نیاز صاحب کا عقیدہ ملاحظہ کیجئے:۔

معجزے کبھی ظاہر ہی نہیں ہوتے۔ بلکہ یہ سب داستانیں ہیں جو صدیوں بعد گھڑی گئیں۔[۴]

---

[۱] من یزداں حصہ اول ص۵۴۷ [۲] ایضاً ص۵۴۹ [۳] ایضاً ص۴۰۵ [۴] ایضاً ص۴۰۴

④ علامہ تمنّا عمادی پھلواری

منکرینِ حدیث کے حلقے میں یہ نسبتہً صاحب علم سمجھے جاتے ہیں۔ آپ کا نظریۂ حدیث حسب ذیل ہے:۔

وہی ایک حدیث صحیح ہے جو قرآن سے قریب تر ہو[1] اور باقی سب غلط ــــ چاہے ان باقی کے راوی کیسے ہی ثقہ کیوں نہ ہوں اور وہ صحاح ستہ کی متفق علیہ حدیثیں ہی کیوں نہ ہوں اور وہ ایک حدیث جو قرآن سے قریب تر ہے اس کا راوی کیسا ہی مجروح کیوں نہ ہو اور وہ صحاح ستہ سے باہر ہی کی حدیث کیوں نہ ہو۔ بلکہ شیعوں کی اصُول کافی وغیرہ ہی کی حدیث کیوں نہ ہو۔[2]

عہدِ رسالت میں حدیث لکھنے کا عمل اور اُس کا نسخ

بعض صحابہ نے عہدِ نبوی میں حدیثوں کا لکھنا شروع کر دیا تھا اور وہ جو کچھ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتے تھے یا آپ کو کرتے ہوئے دیکھتے تھے اس کو لکھ لکھ کر جمع کرنے لگے تھے تو یہ آیتیں اُتریں۔ یا ایھا الناس قد جاء تکم موعظۃ من ربکم ..... ھو خیر مما یجمعون۔ (سورہ یونس ع ۶)
اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حدیثیں لکھنے سے منع کر دیا۔[3]

جمہور مسلمانوں کے ہاں لکھنے سے ممانعت پہلے دور میں تھی اور بعض صحابہ کو اجازت بعد میں ملی۔ مگر تمنا صاحب نے کس بے دردی سے یہ ترتیب بدلی اور کس دائو سے انکارِ حدیث کی راہ نکالی۔ تاہم یہ صحیح ہے کہ انہوں نے صحابہ کا حدیثیں لکھنا کسی نہ کسی درجہ میں ضرور مان لیا ہے۔

---

[1] یہ فیصلہ کون کرے گا کہ یہ حدیث قرآن کے مطابق ہے اور یہ نہیں؟ تمنا صاحب یا پرویز صاحب اور اگر کسی فیصلے کا قطعاً کوئی اعتبار نہیں تو پھر یہ بھی فیصلہ کیجئے کہ ایک شخص کا فہم دوسرے سے اگر مختلف ہو تو فیصلے کی صورت کیا ہوگی؟ [2] اعجاز القرآن جلد ۱ صفحہ ۵ مؤلفہ مولانا تمنا عمادی [3] ایضاً صفحہ ۲

دروغ گو را حافظہ نباشد

یہی تمنا صاحب جو یہاں کتابتِ حدیث کا اقرار کر چکے ہیں۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

یہ سب من گھڑت افسانے ہیں۔ دراصل کسی صحابی نے حدیثوں کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں کیا تھا۔ اگر دو چار حدیثیں بھی کوئی صحابی کسی ورق پر لکھ لیتے۔ تو وہ ورق تبرک کے طور سے ضرور محفوظ رکھا جاتا۔[۱]

احادیث کو تو ان لوگوں نے اس طرح مشتبہ کر دیا۔ باقی رہا قرآن تو قرآن کریم کی تفسیر میں اگر کوئی بات حضورؐ سے یا صحابہؓ سے نقل ہوئی کتابوں میں ملی تو اسے ان لوگوں نے جو دین سے مکمل آزادی حاصل کرنے کی تمنا لیئے ہوئے تھے اور پادری عماد الدین کے حلقے سے تعلق رکھتے تھے اس طرح ناقابلِ اعتبار بنا دیا تمنا عمادی کی جرأت ملاحظہ ہو:۔

راویانِ احادیث تفسیر میں جو لوگ زیادہ پیش پیش تھے تقریباً سب کے سب ناقابلِ اعتبار اور اس جماعت میں وضاعین و کذابین کی ایک بہت بڑی اکثریت کارفرما ہی۔ مفسرین متقدمین نے ہر آیت کے متعلق متضاد و متخالف روایتیں جھوٹی سچی ہر طرح کی حدیثیں اور ہر طرح کے اقوال جمع کر کے آیاتِ قرآنی کے معانی کو مشتبہ کر دیا۔[۲]

ماہنامہ طلوعِ اسلام ستمبر ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں اُن کا ایک مضمون شائع ہوا جو حدیث کے بارے میں اُن کے نظریات کی پوری وضاحت کرتا ہے۔ تمنا صاحب لکھتے ہیں:۔

اور منافقینِ عجم نے اپنے مقاصد کے ماتحت جمع احادیث کا کام شروع کرنا چاہا تو انہیں منافقینِ عجم کے آمادہ کرنے سے اس وقت خود ابن شہاب کو خیال ہوا کہ ہم حدیثیں جمع کرنا شروع کر دیں۔ تو یہ مدینہ پہنچے اور کوفہ بھی۔ اور مختلف مقامات سے حدیثیں حاصل کیں اور بیسیوں راویوں کے ساتھ رہے۔[۳]

---

[۱] اعجاز القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۰ [۲] ایضاً صفحہ ۹ [۳] طلوعِ اسلام صفحہ ۴۸ ستمبر ۱۹۵۵ء

اہل علم سے مخفی نہیں کہ ابن شہاب زہری (۱۲۴ھ) نے حضرت عمر بن عبد العزیز کے حکم سے حدیث لکھنی شروع کی تھی۔ صالح بن کیسان (۱۴۲ھ) بھی آپ کے ساتھ تھے۔ مگر تمنا صاحب کا شوقِ تحقیق دیکھیے کس وضاحت سے اسے عجمی سازش کہہ رہے ہیں۔ لکھتے ہیں :۔

انہیں منافقین عجم کی ایک جماعت نے ابنا رسوخ فی الدین اور ظاہری زہد و تقوےٰ دکھا کر ابن شہاب زہری کو جمع احادیث پر آمادہ کیا۔ یہ اپنے تجارتی وزراعتی کاروبار کی وجہ سے اپنے وطن مقام ایلہ میں رہا کرتے تھے۔ مگر ایک بہت بڑی دینی خدمت سمجھ کر اس مہم پر آمادہ ہو گئے ...... اور وہی منافقین خود بھی پھر اُن کے پاس آ آ کر حدیثیں لکھوانے لگے اور دوسرے وضاعین اور کذابین کو ان کے پاس بھیج کر اُن سے بھی حدیثیں ان کے پاس جمع کرنے لگے[1]

⑤ ڈاکٹر غلام جیلانی برق

ان کی کتابوں میں دو قرآن، دو اسلام، جہانِ نو اور حرفِ محرمانہ بسلسلہ انکارِ حدیث دیکھنے کے لائق ہیں۔ ایک جگہ مرزا غلام احمد کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

مرزا صاحب درست فرماتے ہیں کہ تمام حدیثیں تحریف معنوی ولفظی سے آلودہ یا سرے سے موضوع ہیں[2]

علماء اسلام پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

اپنے ہر خطبہ میں اپنے رسول کو خیر الانبیاء کہہ کر لا نفرق بین احد منھم کی صریح خلاف ورزی کر رہے ہیں[3]

رسُولوں کی اطاعت درکنار رہی برق صاحب کے ہاں خود اُن پر بھی ایمان لانا ضروری نہیں۔ خدا تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان ہو تو نیک اعمال شرفِ قبولیت پا لیتے ہیں۔ رسُولوں پر ایمان ہونا ضروری نہیں ——— لکھتے ہیں :۔

---

[1] طلوع اسلام ص۵۴ ستمبر ۱۹۵۰ء [2] حرف محرمانہ ص۴۵ [3] جہانِ نو ص۱۳۵

اللہ تعالیٰ نے آمنوا باللہ والیوم الآخر کو قبول اعمال کی بنیادی شرط قرار دیا ہے
اس میں ایمان بالرسل شامل نہیں[1]
ایک جگہ علماء کو خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔
آپ کے ہاں اسلام چند عقائد کا نام ہے اور قرآن کے نزدیک صرف نیکی کا۔
اس لیئے خدا اور رسول کا صحیح پیرو وہ ہے جو ان اعمال پر عمل کر رہا ہو۔ خواہ
اس پر عیسائیت کا لیبل لگا ہوا ہو یا یہودیت کا۔ نہ وہ جو خدا اور رسول کا
صرف زبانی قائل ہو اور عملاً کافر[2]
مُلّا سے میرا نزاع اس بات پر ہے کہ وہ حدیث کو آگے لا کر بے شمار ظواہر کو
جزوِ اسلام بتانا چاہتا ہے[3]

ہدایت اللہ کے اختیار میں ہے۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق جو انکار حدیث میں اس قدر آگے نکلے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی دستگیری کی اور وہ انکارِ حدیث سے یکسر تائب ہو گئے ان کی آخری تصنیف تاریخ حدیث (برق) ہے۔ جس میں اُنہوں نے علماء کی سطح پر حدیث کو قبول کرنے کا غیر مشروط اقرار کیا ہے۔

(۶) چودھری غلام محمدؐ پرویز

چودھری صاحب کا عقیدہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس کوئی طے شدہ شریعت نہیں جسے ابدیت حاصل ہو اور اس میں ہمیشگی ہو۔ ان کا موقف یہ ہے کہ جزئیات مختلف حالات کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ ان کے ہاں ان بدلتی جزئیات کو ہی شریعت کہتے ہیں۔ جو وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلنی چاہیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی شریعت صرف اُس دور کے لیئے تھی اِس دور کے لیئے نہیں۔ ہمارے زمانے کی شریعت یہ ملت (وفاقی اسمبلی) طے کرے گی۔ اُنہیں حدیث سے طے کرنا درست نہیں۔ پرویز صاحب کی مندرجہ ذیل عبارات ملاحظہ ہوں :۔

---

[1] ایک اسلام ص۴۸ [2] دو اسلام ص۱۹۳ [3] ایضاً ص۱۱۴

جن جزئیات کو خدا نے خود متعین نہیں کیا۔ ان کے متعلق خدا کا منشا یہی تھا۔
کہ وہ ہر زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتی رہیں اور جن جزئیات کو رسول اللہ
نے متعین کیا۔ ان کے متعلق حضورؐ کا بھی یہ منشا نہیں تھا کہ وہ قیامت تک کے
لیئے ناقابلِ تغیر و تبدل رہیں۔[1]

ہم قرآنی اصولوں کی روشنی میں اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق اپنے قوانین
خود متعین کریں یہی قوانین شریعت اسلامی کہلائیں گے نہ کہ وہ قوانین جو اپنے
زمانے کے حالات کے مطابق کسی سابقہ اسلامی حکومت (حضورؐ کی حکومت)
نے وضع کیئے تھے۔[2]

اگر خدا کا منشا یہ ہوتا کہ زکوٰۃ کی شرح قیامت تک کے لیئے اڑھائی فیصد
ہونی چاہیئے تو وہ اُسے قرآن میں خود بیان نہ کر دیتا۔ اس سے ہم اس نتیجہ پہ
پہنچتے ہیں کہ یہ منشائے خداوندی ہی نہیں کہ زکوٰۃ کی شرح ہر زمانے میں
ایک ہی رہے۔[3]

جناب غلام محمد پرویز کے دور میں فتنۂ انکارِ حدیث پورے عروج کو پہنچا ہے۔ آپ کا
اندازِ تصنیف کچھ زیادہ سلیقہ دار اور اُلجھا ہوا ہے۔ جس میں جہاں تک کہ اصل فتنے کی نشاندہی کرنا
واقعی ایک بڑا مشکل کام ہے۔ آپ نے تفسیر مفہوم القرآن کئی جلدوں میں تحریر کی ہے۔ جو
اردو عبارت اور حسن طباعت میں نفیس کتاب ہے۔ لیکن اس میں کس طرح اسلام کے قطعی
نظریات سے کھیلا ہے۔ وہ مطالعہ سے ہی پتہ چلتا ہے کہ انکارِ حدیث کا نظریہ پرویز صاحب
کو کہاں تک اسلام سے دُور لے گیا ہے۔ اس کے لیئے اُن کی یہ تحریرات ملاحظہ ہوں:۔

اب آیئے قرآن کریم کی طرف —— اس میں یہ بالتصریح کہیں نہیں لکھا کہ
حضرت عیسیٰ کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی تھی۔[4]

مسلمانو! کیا یہ وہی عقیدہ نہیں جو قادیانیوں کا ہے؟ کیا قرآن حضرت عیسیٰ کو بار بار

---

[1] مقام حدیث جلد ۲ ص ۲۹۹ [2] ماہنامہ طلوع اسلام اکتوبر ۱۹۵۵ء ص ۲۷ پرویز صاحب کا مضمون زکوٰۃ پر [3] ایضاً ص ۲۷ و مقام حدیث جلد ۲ ص ۲۹۳ [4] معارف القرآن جلد ۳ ص ۵۴۷

مسیح بن مریم نہیں کہتا ؟ کیا آپ سورہ آل عمران رکوع ۵ میں اور آپ سورہ مریم رکوع ۲ میں اس پر مفصل بحث نہیں ملتی ؟ اس وقت ہم اس موضوع پر بحث نہیں کر رہے۔ بتلانا یہ مقصود ہے کہ دیکھو انکارِ حدیث کس طرح پرویز صاحب کو قادیانیوں کے قریب لے گیا ہے ــــ اور ملاحظہ کیجئے :۔

> حضرت عیسیٰ کے اب تک زندہ ہونے کی تائید قرآن کریم سے نہیں ملتی۔ قرآن پاک آپ کے وفات پا جانے کا بصراحت ذکر کرتا ہے۔[۱]

ہمیں تو اب تک قرآن پاک میں کہیں وہ آیت نہیں ملی جس میں خاص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات صراحت سے مذکور ہو۔ رہی الفاظ کی کھینچا تانی اور دور از کار تاویلات تو اس سے قادیانیوں کا لٹریچر بھرا ہوا ہے۔ پرویز صاحب لکھتے ہیں :۔

> کوئی روایت جو حضرت عیسیٰ کی آمد کی خبر دیتی ہے وضعی اور جھوٹی ہے۔ جو ہمارے لیئے سند نہیں ہو سکتی۔[۲]

جناب جب آپ کے ہاں کل ذخیرہ حدیث ہی جعلی اور وضعی ہے تو یہاں حدیث مسیح کی تخصیص کس لیئے ہے ؟
پرویز صاحب نے جس طرح قرآن پر یہ بہتان باندھا ہے۔ کہ وہ حضرت عیسیٰ کی وفات کا بصراحت ذکر کرتا ہے۔ اسی طرح قرآن پاک پر اُن کا دوسرا بہتان بھی ملاحظہ کیجئے :۔

> قرآن کریم نے کس شدت اور تکرار سے اس کی صراحت فرما دی ہے کہ نبی اکرم کو کوئی حسی معجزہ نہیں دیا گیا اور حضور کا معجزہ صرف قرآن ہی ہے۔[۳]

پرویز صاحب تو اس باب میں شدت اور تکرار کے مدعی ہیں۔ لیکن ہمیں تو ایک آیت بھی ایسی نہیں ملی جس میں بصراحت کہا گیا ہو کہ حضور اکرمؐ کو کوئی حسی معجزہ نہیں دیا گیا۔ معتزلہ نے اسی پہلو سے معجزات کا انکار کیا تھا۔ فتنہ انکار حدیث اپنی لپیٹ میں اسلام کے ہر بنیادی عقیدہ کو کھینچ رہا ہے اور اس دور میں مسٹر غلام احمد پرویز قلعہ اسلام کے لیئے دوسرے غلام احمد کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ زیادہ اعتماد یہود و نصاریٰ پر کرتے ہیں۔ کوئی بات صاف نہیں کرتے۔ دلیل کی بجائے تحکم اور جذبات سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ لیکن دیوارِ اسلام کو گرانے میں وہ کسی دوسرے ملحد سے پیچھے نہیں۔

---

[۱] معارف القرآن جلد ۳ صفحہ ۵۲۲ [۲] ایضاً صفحہ ۵۸۵ [۳] ایضاً جلد ۴ صفحہ ۴۲۹

ہندوستان میں انکار حدیث کی باقاعدہ تحریک مولوی عبداللہ چکڑالوی سے چلی تھی پاکستان بننے پر مسٹر پرویز اس کشتی کو کھیتے رہے پرویز نے اپنے خیالات کی اشاعت میں اپنی سرکاری پوزیشن بھی استعمال کی اور افسران کے ایک حلقے کو جو پہلے سے علماء سے بغض رکھتا تھا متاثر کیا اور جدید تعلیمیافتہ لوگ کسی درجے میں اس کے گرد جمع ہو گئے پرویز نے اپنے اس موقف پر ادبی انداز میں خاصا لٹریچر پھیلا کیا ہے۔
پہلے اس خیال کے لوگوں کو چکڑالوی کہا جاتا تھا اب انہیں پرویزی کہتے ہیں یہ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ سب سے پہلے پرویز کسریٰ ایران نے حضور کے نامہ مبارکہ کو پارہ کیا تھا حدیث کا یہ پہلا انکار تھا۔
پرویز کے بعد اب ضلع گوجرانوالہ ان لوگوں کی زد میں ہے اور یہ لوگ غیر مقلدوں کی محنت پر اپنی فصل کاٹنا چاہتے ہیں۔ فالی اللہ المشتکیٰ!

(۷) علی پور چٹھہ ضلع گوجرانوالہ کے   صاحب کچھ دوسرے ارباب قلم کے ساتھ مل کر تفسیر القرآن بالقرآن کے نام سے ایک کتاب لکھ رہے۔ ادارہ بلاغ القرآن ۱۱۰۔ این سمن آباد لاہور اسے شائع کر رہا ہے۔ پہلی جلد سورہ بقرہ تک ۴۸۲ صفحات میں دوسری سورہ نسأ تک ۴۷۶ صفحات میں اور تیسری سورہ اعراف تک ۵۱۲ صفحات میں شائع ہو چکی ہے ——
تیسری جلد کے آخر میں لکھا ہے:۔

"ادارہ بلاغ القرآن کی شائع کردہ تفسیر القرآن بالقرآن چند اہل علم کی بشری کاوش کا نتیجہ ہے جو صرف خدمت قرآن کے جذبہ سے معمور ہے۔ . . . . حتیٰ کہ ان حضرات نے اپنے اسم گرامی بھی شائع کرنے کی اجازت نہیں دی۔"

ادارہ بلاغ القرآن نے جلد دوم اور جلد سوم کے متن قرآنی کی تصحیح قاری اظہار احمد صاحب تھانوی اور مولانا حامد حسن صاحب فاضل دیوبند سے کرائی ہے اور ان جلدوں کے آخر میں اُن کے نام لکھ دیئے ہیں۔ یہ عام لوگوں کو مغالطہ دینے کے لیے ہے کہ گویا یہ تفسیر ان حضرات کی مصدقہ ہے۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں۔ ادارہ جب اصل مؤلفین کے ناموں کو سامنے نہیں لا رہا۔ تو متن قرآن کے مصححین کے نام ذکر کرنے میں اور کیا مصلحت ہو سکتی تھی۔

۸۔ انکارِ حدیث متشابہات کے سائے میں

یہاں متشابہات کا لفظ عام اصطلاحی معنوں میں نہیں۔ ایک وسیع تر مفہوم میں ہے۔ کئی ایسے مضامین ہوتے ہیں جو اپنے ظاہری مفہوم میں مغالطہ انگیز ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا چہرہ اس وقت کھلتا ہے جب انہیں محکمات کے ساتھ مطابق کیا جائے۔ منکرینِ حدیث نے اس قسم کے مروی مضامین سے بہت فائدہ اٹھایا ہے اور جو لوگ علم دین سے واقف نہیں ہوتے۔ انہیں وہ ایسی جذباتی تعبیر میں لے جاتے ہیں کہ احادیث ظاہر عقل سے ٹکرانے لگتی ہیں۔ ان سرسری پڑھنے والوں کو وہ اس قسم کی احادیث کے ظاہر پیرایہ سے بہت مغالطے دیتے ہیں۔ مثلاً صحیح بخاری کے حوالے سے قتل کعب بن اشرف کے بارے میں یہ تأثر دیتے ہیں:۔

> خلفائے بنی امیہ و بنی عباس کا ایک دستور یہ بھی تھا کہ کبھی کبھی وہ اپنے دشمنوں کو مخفی تدبیروں سے قتل کرا دیا کرتے تھے اور اس کو اپنی بساطِ سیاست کی ایک اچھی چال سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے حامیوں اور حاشیہ نشینوں نے ایسی روایتیں بنائیں کہ اس قسم کے قتل کو رسالت مآبؐ کا فعل ثابت کریں۔ تاکہ ان سلاطین کو اپنی کارروائیوں کے جواز کی سند مل سکے۔[1]

کعب بن اشرف کے قتل کی اصل وجہ

اشرف طائی سے مکہ میں ایک قتل ہو گیا اور وہ بھاگ کر مدینہ میں چلا آیا۔ یہاں یہود کے قبیلہ بنو نضیر سے مل گیا۔ یہیں اس کی شادی ہوئی۔ کعب بن اشرف اسی کا بیٹا تھا جو اپنے اثر و رسوخ اور وجاہت سے علماء یہود کا دینی سرپرست بن گیا تھا۔ علماء یہود کو آنحضرتؐ کے خلاف کرنے میں اس کا بڑا دخل ہے۔ جنگِ بدر کے بعد یہ مکہ گیا اور وہاں مقتولین بدر کے وارثوں اور رشتہ داروں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بہت بھڑکاتا رہا۔ کعب بڑا

---

[1] طلوع اسلام جلد ۳ شمارہ ۲ ذوالحجہ ۵۸ھ فروری ۴۰ء

شاعر تھا اور اس کی یہ سب قابلیت حضورؐ کے خلاف استعمال ہوتی تھی۔

ایک دفعہ اس نے حضورؐ کو دھوکے سے ایک جگہ بلایا۔ اس کا حضورؐ کو قتل کرنے کا پروگرام تھا۔ جبریلِ امین اُترے اور انہوں نے آپ کو اپنے پروں میں چھپا لیا (نقل فی الفتح)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لائے تو آپؐ نے فرمایا۔ "کون شخص کعب بن اشرف کو قتل کرنے کا شرف حاصل کرے گا؟" اس نے اللہ کے رسولؐ کو بے حد تکلیف دی ہے نقضِ عہد کیا ہے اور مشرکین مکہ سے ملا ہوا ہے۔ محمد بن مسلمہ انصاریؓ نے کہا۔ "میں اس کے لیے حاضر ہوں" آپؐ نے اجازت دے دی اور اس کے ساتھ چار اور ساتھی ہو گئے۔ یہ کعب کے پاس گئے اسے قلعہ سے باہر بلایا اور قتل کر دیا۔

آپ غور کریں اس تمام واقعہ میں شرارت اور سازش کا سرغنہ کون ہے؟ کعب بن اشرف یا کوئی اور ـــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اکیلے کو سزا دلوا کر اس کی پوری قوم کو جنگ کے شعلوں سے بچا لیا۔ اگر آپ اس سے اعلانیہ جنگ کرتے تو معلوم نہیں کتنے لوگ اس کی حمایت میں آ کھڑے ہوتے اور پھر معلوم نہیں کتنے مسلمان ان کے ہاتھوں سے مارے جاتے اور جو فضا ایک سازشی کے قتل سے قائم ہو سکتی تھی۔ اس کے لیے کتنی جانیں دینی پڑتیں۔

کافروں سے "نہ لڑنا ظاہر کر کے" پیچھے ہٹنا اور پھر بڑھ کر انہیں قتل کر دینا کیا اس کی تعلیم قرآن پاک میں موجود نہیں (دیکھئے پ ۹ الانفال آیت ۱۶) اگر ہے اور لڑائی واقعی ایک چال ہے تو کیا یہ بہترین چال نہیں کہ دشمن کو ختم کرنے کا وہ طریق اختیار کیا جائے جس میں انسانی جانیں کم از کم تلف ہوں۔ معلوم ہوا قتل سرّی کوئی جرم نہیں۔ نہ یہ کوئی خلاف عقل اقدام ہے اور جن کے ہاں یہ جرم ہے وہ میدانِ جنگ میں بھی دشمن کو قتل کرنا جائز نہیں سمجھتے۔ وہ سرے سے ہی جہاد و قتال کے قائل نہیں۔ ایک شخص کے قتل سے اگر فتنہ کی جڑ کٹتی ہے اور اس کی پوری قوم بچتی ہے تو اسے قتلِ سرّی سے کھلے میدان میں لے آنا اور قوموں کی جنگ بنا دینا یہ کوئی دانائی نہیں ہے۔

ابُو رافع سلام بن ابی الحقیق کا قتل

کعب بن اشرف کے قتل کے بعد عام یہودی دُب گئے اور ان کی روز مرہ کی شرارتیں رُک گئیں۔ مگر تین سال بعد ابو رافع سلام بن ابی الحقیق نے پھر سر اُٹھایا۔ قبائل کو مسلمانوں کے خلاف برانگیختہ کرنے لگا۔ غزوۂ خندق کے موقعہ پر عرب قبائل کو مسلمانوں کے خلاف لانے میں اس کا مرکزی کردار رہا۔ انصارِ مدینہ اس کی ان حرکتوں کو بھانپ چکے تھے۔ انہوں نے آنحضرت کی خدمت میں اس کی سازشوں کی شکایت کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن عتیک انصاری اور اس کے چند ساتھیوں کو اس کے قتل پر مامور فرمایا اور حکم دیا کہ کسی بچے اور عورت کو قتل نہ کرنا ——— صرف وہی سزا پائے جو فتنے کی جڑ ہے ——— عبداللہ بن عتیک گئے اور اس کا کام تمام کر دیا۔

یہ ابو رافع سلام کون تھا؟ اس نے نقضِ عہد کیا تھا۔ مسلمانوں کے خلاف جو لوگ اور طاقتیں کام کرتی تھیں انہیں مالی امداد دیتا تھا۔ غزوۂ خندق کا اصل سبب یہی ہوا تھا ——— عبداللہ بن عتیک کے قتل سے یہ اپنے کیفرِ کردار کو پہنچا اور مسلمانوں کو چین نصیب ہوا۔

مسٹر پرویز کے نزدیک یہ دونوں واقعات خلافِ واقعہ ہیں اور امام بخاری اور امام مسلم جیسے محدثین نے اپنی طرف سے گھڑ لیے ہیں۔ قرآن اس کی اجازت نہیں دیتا کہ نبی اپنے دشمن کو قتل سری سے ختم کرے ——— کس قدر غلط یہ مفروضہ ہے اور بنائے فاسد علی الفاسد کی کتنی کھلی مثال ہے۔

ہم اس طرح کے قتل سری کو قیامِ امن کی عمومی مصلحت کے پیشِ نظر غلط نہیں سمجھتے مخفی تدبیروں سے بڑے بڑے فتنوں کا سدباب کرنا نہ عقل کے خلاف ہے نہ قرآن کریم کے خلاف ——— منکرین حدیث واقعات کی ظاہری سطح سے عوام کو دھوکہ دیتے ہیں۔ لیکن اپنے موقف کو کسی علمی سطح پر حق بجانب ثابت نہیں کر سکتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اُمر فرمایا تھا کہ کسی بچے اور عورت کو قتل نہ کرنا اور قرآن مجید میں حضرت خضر کا حضرت موسےٰ کی موجودگی میں ایک بچے کو قتل کرنا صریح طور پر مذکور ہے۔ کیا قتل سری نہ

تھا؟ کیا اس وقت کے کھلے معاشرتی دائرہ میں اس قتل کی گنجائش تھی؟ اب اس واقعہ کی وجہ سے قرآن کریم کے خلاف بھی فضا بناؤ ــــــ اگر اس واقعہ کی بنا پر قرآن نہیں چھوڑا جا سکتا تو کعب بن اشرف اور ابو رافع سلام کے واقعاتِ قتل سے حدیث کی آب پر بھی کوئی دھبہ نہیں آتا اور نہ اس کے باعث حدیث چھوڑی جا سکتی ہے۔

منکرینِ حدیث ان دو واقعات پر طلوعِ اسلام کا یہ بیان خوب اُچھالتے ہیں اور نہیں جانتے کہ مسٹر پرویز کے پیشرو اسلم جیراجپوری ان واقعاتِ قتل کو بالکل حق بجانب قرار دے چکے ہیں ــــــ اسلم جیراجپوری لکھتے ہیں :-

چونکہ اسلام کی ترقی سے یہود کا ڈیوی اثر اور اقتدار نیز ان کی دینی عظمت کا سکہ اٹھتا جاتا تھا۔ اس لیے کعب مسلمانوں کا سخت ترین دشمن تھا۔ جنگِ بدر کے بعد اس نے مکہ معظمہ جا کر کشتگانِ بدر کے مرثیے بنا کر سنائے اور قریش کو مسلمانوں سے انتقام لینے کے لیے آمادہ کیا اور وہاں سے آکر اپنے اشعار میں مسلمانوں کی ہجو اور بے حرمتی کرنے لگا اور در پردہ اس فکر میں پڑا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرا دے . . . . . اس کی فتنہ انگیزیوں سے مجبور ہو کر ربیع الاول ۳ھ میں محمد بن مسلمہ کو مع دو صحابیوں کے بھیجا انہوں نے جا کر اس کو قتل کر دیا۔[1]

دیوبند کے مشہور متکلم اسلام حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں :-

(یہود) جب خون کے مستحق ہو چکے تھے اور ہر اعتبار سے ہو چکے تھے۔ لیکن ان کے ہزاروں کے خون کو صرف کعب بن اشرف اور ابو رافع دو ہی آدمیوں کے خون سے کیوں محفوظ کر دیا گیا؟ بہت بڑا ذخیرہ شر ہے جس کے ذریعہ سے کسی عظیم و جلیل شر کا سدِ باب ہوتا ہو، قصاص میں زندگی ہے۔ بلاشبہ ان دونوں کی موت میں اور تمام یہودیوں کی زندگی کی ضمانت تھی۔ جو ان کے بعد زندہ رہے۔[2]

---

[1] تاریخ الامت جلد ۱ ص [2] النبی الخاتم ص

صحیح بخاری کی ایک اور حدیث پر اعتراض

قرآن کریم میں ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رب العزت سے عرض کی مجھے دکھا دیجئے آپ مُردوں کو کیسے زندہ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کیا تو اس پر ایمان نہیں لایا۔ حضرت ابراہیمؑ نے عرض کی "کیوں نہیں" لیکن چاہتا ہوں کہ (آنکھوں سے دیکھ لوں تاکہ) دل قرار پکڑے۔ یہ واقعہ پ۳ البقرہ کی آیت ۲۶۰ میں مذکور ہے۔ اس میں یہ بات واضح ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ کی قدرت میں شک نہ تھا۔ وہ علم الیقین سے عین الیقین میں آنا چاہتے تھے۔ بلیٰ کہہ کر وہ اپنے ایمان ویقین کی خبر دے چکے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ انبیاء کا ذکر بڑی تواضع اور نیازمندی سے کر رہے تھے۔ اس میں آپ نے حضرت ابراہیم اور حضرت یوسف علیہم السلام کی عظمت و عزیمت کا ذکر فرمایا ——— یہ جتلانے کے لیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی اس صفت احیاء میں کوئی شک نہ تھا۔ آپ نے آپ کو تواضعاً ان سے نیچلے درجہ میں رکھا اور فرمایا شک کے ہم ان سے زیادہ حق دار ہیں۔ جب ہمیں اللہ کی صفات کے بارے میں کوئی شک نہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس میں کسی طرح کا کوئی شک کیسے ہو سکتا تھا ——— شک نہ یہاں ہے نہ وہاں تھا ——— بات بس اتنی تھی۔

طلوع اسلام کی اکتوبر ۱۹۵۰ء کی اشاعت میں اسلم جیراجپوری کا ایک مضمون شائع ہوا اس میں صحیح بخاری کی اس حدیث کو یہ کہہ کر رد کیا گیا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیشک ابراہیم علیہ السلام شک میں تھے۔ (معاذ اللہ)

عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم نحن احق بالشك من ابراهيم اذ قال رب ارنی كيف تحی الموتی۔[1]

ترجمہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ ہم ابراہیم کی نسبت شک کے زیادہ سزاوار ہیں ابراہیم نے کہا تھا اے اللہ مجھے دکھا تو کس طرح مُردوں کو زندہ کریگا؟

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صد ۶۵۱۔

اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے شک کا اثبات ہرگز نہیں۔ یہاں ان سے شک کی نفی مقصود ہے۔ محدثین نے اس کے یہی معنی لکھے ہیں :۔

ان ذلک لم یکن من ابراھیم لاجل الشک بل لزیادۃ العلم اذ نحن احق بالشک فاذا لم نشک لم یشک ھو فھذا تواضع منہ صلی اللہ علیہ وسلم [۱]

ترجمہ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے یہ بات شک کے طور پر نہ تھی۔ یہ سوال زیادتی علم کے لیے تھا ہم ان کی نسبت شک کے زیادہ اہل تھے جب ہمیں اس قدرتِ خداوندی میں شک نہیں تو حضرت ابراہیم اس میں کیسے شک کر سکتے تھے۔ یہ بات حضورؐ نے تواضعاً فرمائی۔

اس روایت میں شک کا لفظ ایمان کے مقابلے میں نہیں۔ ایمان تو خود اسی آیت میں مذکور ہے جو یہاں اس حدیث میں پڑھی گئی معلوم ہوا یہاں اس کا مفہوم ظاہر پر مبنی نہیں مراد کچھ اور ہے ——— یہاں اس کی الزاماً نفی مقصود ہے کہ جب ہم یہاں شک نہیں کر سکتے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس قدرتِ الٰہی میں کیسے شک ہو سکتا تھا۔

ایک اور اعتراض

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ایک اور حدیث نقل کی جاتی ہے :۔

لم یکذب ابراھیم الا ثلث کذبات ثنتین منھن فی ذات اللہ قولہ انی سقیم وقولہ بل فعلہ کبیرھم ھذا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الحدیث [۲]

اس میں کہا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے تین باتیں خلافِ واقعہ کہیں ——— ان میں سے دو کا ذکر قرآن پاک میں ہے۔ ایک پ۲۳ سورہ الصافات آیت ۸۹ میں اور دوسری پ۱۷ سورہ الانبیاء آیت ۶۳ میں مذکور ہے۔ ظاہراً آپ نے یہ دونوں باتیں خلافِ واقعہ کہیں۔ اب قرآن کا ہر طالبعلم انہیں حل کرنے کے لیے کوئی توجیہ یا تاویل ضرور اختیار کرتا ہے۔ قرآن اور حدیث میں اگر فرق ہے تو صرف یہ ہے کہ قرآن میں ان میں سے دو باتیں مذکور ہیں اور حدیث میں تین۔ اب دیانت

---

[۱] مرقات شرح مشکوٰۃ جلد ص [۲] صحیح مسلم جلد ۲ ص۲۶۶ مشکوٰۃ ص۵۰۶۔

اور شرافت کیا اس کی مقتضی نہیں کہ جس طرح ان میں سے دو باتوں کی توجیہ کی جاتی ہے اسی طرح تیسری بات کی بھی کوئی توجیہ کرلی جائے۔ ورنہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ قرآن میں بھی (معاذ اللہ) بہت غلط باتیں موجود ہیں اور اس طرح انکار حدیث انکار رسالت کی ایک سیڑھی قرار پائے گی (۲) یہاں لفظ کذب کا اطلاق سو یاد رہے کہ یہ اردو کے لفظ جھوٹ سے بہت مختلف ہے۔ عرب مطلق خلاف واقعہ بات پر بھی کذب کا لفظ بول دیتے ہیں۔ خواہ اس میں تعمد اور نیت نہ بھی ہو۔ علامہ خطابی نے معالم میں اس کی تصریح کی ہے۔ جلد ۱ صفحہ ۱۳۴

حدیث غسل ام المومنین پر ایک اعتراض

فہم حدیث میں کسی جگہ کے عرف، محاورے اور استعمال کو بھی سامنے رکھنا ہوتا ہے شلاً دو شخصوں میں دیانت داری سے اس موضوع پر نزاع ہو گیا کہ نہانے کے لیے کم از کم پانی کتنا ہونا چاہیئے۔ ایک نے کہا میں دو سیر پانی سے نہا سکتا ہوں۔ دوسرے نے کہا ایسا نہیں ہو سکتا تم نہا کر دکھاؤ۔ وہ دو سیر پانی لے کر خلوت میں چلا گیا۔ نہا کر آیا اور کہا میں نے دو سیر پانی سے پورا غسل کرلیا ہے۔ ایک دوسرے کی دیانت پر انہیں پورا اعتماد تھا —— اب پہلا شخص اگر یہ کہتا ہے کہ آدمی دو سیر پانی سے نہا سکتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ فلاں شخص میرے سامنے دو سیر پانی سے نہایا تو ایسے موقعوں پر گفتگو کا یہ انداز غلط نہیں ہو گا۔ نہ اس کے پیش نظر یہ بات غلط ہوگی۔ سامنے نہانے سے یہاں اس طرح نہا کر دکھانا مراد ہے نہ یہ کہ وہ دوسرا پہلے کے سامنے برہنہ ہوا تھا اور بالکل اس کے سامنے ہی نہایا تھا۔

حدیث میں ایسا کوئی واقعہ آجائے تو منکرین حدیث اسے نہایت چھوٹی سوچ سے سوچتے ہیں اور نہیں جانتے کہ دنیا میں تجربے اور مافی الضمیر کے اظہار کے لیے عرف اور ماحول کے کتنے پیمانے استعمال ہوتے ہیں۔ کیا مندرجہ ذیل حدیث کو سامنے کے اس عرفی پیمانے میں نہیں سمجھا جا سکتا؟

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رض کے بھانجے ابو سلمہؓ اور آپ کے بھائی (رضاعی) عبداللہ بن یزید آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بھائی نے حضرت ام المومنین سے پوچھا حضور ؐ

کتنے پانی سے غسل فرمالیتے تھے۔ آپ نے پانی منگایا جو ایک صاع (ایک پیمانہ) کے مطابق ہوگا اور غسل فرمایا اور آپنے اوپر سر سے پانی بہایا۔

صحیح بخاری میں یہاں صراحت سے منقول ہے کہ حضرت ام المومنینؓ اور ان کے بھائی اور بھانجے کے مابین پردہ تھا۔ اس تصریح سے بات وہی آتی ہے جو ہم کہہ چکے ہیں۔ مگر منکرینِ حدیث ہیں کہ اس حدیث کو (اس پردے کی بحث سے یکسر جُدا کر کے) نہایت تمسخر سے نہ صرف پیش کرتے ہیں، بلکہ اس کے حوالے سے اپنے منکرینِ حدیث ہونے پر ناز کرتے ہیں۔

فسألها اخوها عن غسل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فدعت بإناء نحو من الصاع فاغتسلت وافاضت علی رأسها وبیننا وبینها حجاب[1]

ترجمہ: پس آپ سے آپ کے بھائی نے حضورؐ کے غسل کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے ایک برتن میں پانی منگوایا جو صاع (ایک پیمانہ) کے برابر ہوگا اور اس سے غسل کیا اور اپنے سر سے پانی بہایا۔ ہمارے اور آپؓ کے مابین پردہ تھا۔

منکرینِ حدیث نے حدیث کو وہ مضحکہ خیز صورت دے رکھی ہے کہ کوئی انسان کسی سنجیدہ موضوع کو اس بے دردی سے پامال نہیں کرتا۔ جو ان لوگوں نے حدیث کے بارے میں اختیار کر رکھی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ مباشرت ایک دوسرے سے اکٹھے ہونے اور ملنے کا نام ہے بعض جاہل قومیں عورت سے اس کے ایام میں اتنی نفرت برتتی تھیں کہ اسے گھر کے اندر رہنے کی بھی اجازت نہ ہوتی تھی۔ وہ باہر خیمے میں اپنے دن گزارتی اور کوئی اس سے ہاتھ ملانے تک کے لیے تیار نہ ہوتا تھا۔ اسلام نے عورت کو جہاں اور بہت سی عظمتیں بخشیں وہاں اسے اس قعرِ مذلت سے بھی نکالا۔ عورت اپنے ایام میں ہو تو اس کے ہاتھ کا پکا کھانا جائز کیا۔ اس کے دھوئے کپڑے پاک بتلائے۔ اور کہا کہ ماسوائے جماع کے اس سے ہر طرح مباشرت جائز ہے۔ ایام میں وہ کوئی ڈائن نہیں بن جاتی کہ اس سے اس قدر نفرت کی جائے۔

مباشرت کا لفظ کنایہ کے طور پر جماع کے لیے بھی آتا ہے۔ گو یہ اس کے حقیقی معنی نہیں اب

---

[1] صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۳۹ کلاں

اگر کہیں حدیث میں آگیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ازواج کو ایام میں بھی خدمت کرنے کا موقع دیتے تھے۔ ان سے مباشرت جائز سمجھتے۔ تو ان لوگوں نے طوفان سر پر اٹھالیا کہ دیکھو حدیث میں ہے حضورؐ ایام میں بھی عورتوں سے مباشرت کرتے تھے۔ فلاں حدیث میں ہے کہ روزے میں بھی آپؐ مباشرت کر لیتے تھے۔ عوام بے چارے مباشرت کے معنی سے بے خبر تھے۔ وہ اس کے ایک خاص معنی سے ہی آشنا تھے۔ ان کے حلقوں میں اسی قسم کی روایات سے ان لوگوں نے ایسا طوفان کھڑا کر دیا ہوتا ہے کہ جب تک عوام کو اس لفظ اور ان احادیث کے پورے پس منظر سے آشنا نہ کیا جائے۔ ان کا زنگ دُھلنے نہیں پاتا۔

اس قسم کی روایات میں جماع کی صریح نفی مروی ہے۔ مگر یہ لوگ اسے ذکر تک نہیں کرتے اور لفظ مباشرت کا اتنا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں کہ الامان والحفیظ ——— کیا علمی دیانت اسی کا نام ہے مذہب کے نام پر دھوکہ بازی کیا ان کو میراث میں ملی ہے؟ یا دھوکہ منڈی کی پوری آڑھت انہی کے نام ہے ——— حدیث کے یہ الفاظ دیکھئے اور ان لوگوں کے علم و دیانت کا ماتم کیجئے :۔

کان یأمرنی فاتزر فیباشرنی وانا حائض وکان یخرج رأسہ الیّ وھو معتکف فاغسلہ وانا حائض [1]

ترجمہ۔ آپ مجھے حکم دیتے کہ اپنا ازار باندھے رکھوں۔ آپ پھر مجھے ملتے اور میں ایام میں ہوتی۔ آپ مسجد میں اعتکاف کی حالت میں ہوتے۔ اپنا سر مبارک آپؐ مسجد سے باہر (میرے حجرے کی طرف) کرتے میں اسے دھو دیتی۔ حالانکہ میں ایام حیض میں ہوتی تھی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ عورت کے ہاتھ اگر صاف ہوں تو وہ اپنے ایام میں کپڑے تک بھی دھو سکتی ہے۔ آٹا گوندھ سکتی ہے۔ نہلا سکتی ہے اور اس کے ساتھ رہنا سہنا کسی طرح ممنوع نہیں۔ سوائے اس کے کہ اس خاص معنی میں اس سے مباشرت جائز نہیں۔

راقم الحروف نہایت دُکھے دل سے یہ بات نقل کرتا ہے کہ پاکستان ضلع کیمبل پور کا ایک مسلمان جو یہاں (انگلینڈ میں) اولڈہم میں مقیم ہے۔ عیسائی پادریوں کے اس ایک حوالے سے

---

[1] صحیح بخاری جلد ۱ صـ۴۴ کلاں

مرتد ہو گیا (عیسائی بن گیا) کہ حضور پیغمبر اسلامؐ ایام حیض میں بھی ازواج سے مباشرت کر لیتے تھے ــــــ نہ پوری حدیث ان پادریوں کے سامنے تھی نہ اس پڑھنے والے کے سامنے بعض اردو رسائل سے انہوں نے یہ مضمون لیا اور منکرین حدیث کی اس علمی محنت سے وہ مسلمان کفر کی گود میں چلا گیا معلوم نہیں منکرین حدیث کی اس قسم کی کوششوں سے کتنے مسلمان گھروں کے چراغ بجھے ہوں گے اور کتنے مسلمان اس بے علمی اور غلط فہمی میں کفر کی گود میں گرے ہوں گے

قصہ طلاق امیمۃ بنت النعمان - الجونیہ

بنی کندہ کے سردار نعمان بن جون کندی نے اپنی لڑکی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں دی اور اسے ابو اسید کی نگرانی میں حضورؐ کے پاس بھجوایا اسے حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ کے پاس ٹھہرایا گیا البتہ خاندان حکومت سے ہونے کے زعم میں ہوئے خاندان میں جانے کے لیے ذہناً تیار نہ تھی حضورؐ جب اسکے پاس خلوت میں گئے اسنے کہا ملکہ اپنے کو کب رعیت کے سپرد کر سکتی ہے حضورؐ نے اسے سامنے طلاق دے دی اور طلاق کے دو کتانی جوڑے دے کر رخصت فرما دیا۔ اس پر امام بخاریؒ نے یہ باب باندھا ہے۔

هل يواجه الرجل امرأته بالطلاق[1] کیا مرد اپنی عورت کو سامنے طلاق دے۔

طلاق سے صاف ظاہر ہے کہ جونیہ آپکی ازواج میں سے تھی اور اس کا حضورؐ سے نکاح ہو چکا تھا اس روایت میں دو جملے متشابہات میں سے ہیں۔

۱۔ آپ کا اسے هبي نفسك (مجھے اپنا آپ بخش دے) کہنا نکاح کے لیے نہ تھا زوجیت پر آمادہ کرنے کے لیے تھا یہ الفاظ نکاح کے لیے بھی آتے ہیں لیکن یہاں یہ دوسرے معنی میں ہیں اور سیاق کلام اسی کا تقاضا کرتا ہے ملحدین یہاں یہ کہتے ہیں کہ اس روایت کی رو سے آپ (معاذ اللہ) بغیر نکاح اسکے پاس گئے تھے اور اسکے انکار پر پیچھے ہٹ گئے اور وہ یہ نہیں سوچتے کہ پھر طلاق کا موضوع کیوں زیر بحث آگیا۔ اور محدثین اسے کتاب الطلاق میں کیوں لائے

۲۔ جونیہ کے جملہ هل تهب الملكة نفسها للسوقة (کیا ملکہ اپنے کو رعیت کے سپرد کر سکتی ہے) کو بھی غلط معنی پہناتے ہیں اور سوقہ کے معنی بازاری کے کرتے ہیں کہ اس نے کہا میں اپنے آپ کو کیسے بازاری کے سپرد کروں استغفر اللہ علامہ فیومی لکھتے ہیں

وقولهم رجل سوقة ليس المراد انه من اهل الاسواق كما تظنه العامة بل السوقة عند العرب خلاف الملك[2]

متشابہات کے سائے میں یہ بدترین مثال ہے جس پر منکرین حدیث ناز کرتے ہیں۔

---

[1] صحیح بخاری ۲ صفحہ ۷۹۰ [2] مصباح المنیر جلد اصفحہ ۱۳۵ قال الشاعر

فبينا نسوس الناس والامر امرنا اذا نحن فيهم سوقة نتنصف

⑧ خارجیت انکارِ حدیث کے سائے میں

انکارِ حدیث کی تحریک ادارہ طلوعِ اسلام یا بلاغ القرآن تک نہیں ٹھہری۔ کراچی کا فتنہ خارجیت بھی انکارِ حدیث کی اسی اساس پر اُٹھا ہے۔ محمود احمد عباسی کے حلقہ کے ایک صاحب عزیز احمد صاحب صدیقی ہیں، اُنہوں نے "اُم المؤمنین سیدہ خدیجہؓ" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ دیکھئے آپ اس میں کس طنزیہ انداز میں حدیث کا انکار کرتے ہیں۔ عزیز احمد صاحب صدیقی صحیح بخاری کے متعلق لکھتے ہیں:۔

یہ کتاب قرآن کے بعد سب سے زیادہ سچی کتاب کہلاتی ہے۔ کیونکہ یہ قرآن کی ناسخ ہے۔ مسلمان حدیث کو قرآن پر جو ترجیح دیتے ہیں۔ اس لئے دیتے ہیں کہ اس میں وہ مزیدار باتیں ہیں جو قرآن میں نہیں۔[1]

پھر لکھتے ہیں:۔

بخاری صاحب نے اپنے مجوسی معاشرے کی حرامکاری، عیاشی اور بدکاری کو کس خوبی سے مشرف بہ اسلام فرمایا ہے۔[2]

پھر اپنی دوسری کتاب اَنمٹ باتیں میں لکھتے ہیں:۔

ہماری تاریخ، ہماری فقہ، ہماری روایات یعنی حدیثیں اور تفسیریں سب مجوسیوں نے تیار کی ہیں۔[3]

فتنہ انکارِ حدیث یہیں تک نہیں رُکا کہ عباسی صاحب کے حلقہ کو حلقہ بدام کہہ کے کچھ آرام کرلے۔ ہمیں افسوس ہے کہ مولانا احمد رضا خاں کے حلقے کے بھی بعض ناعاقبت اندیش علماء اسی حلقے کے اسیر نکلے۔ صحیح بخاری کے بارے میں جو زبان عزیز احمد صاحب صدیقی نے استعمال کی ہے وہی زبان اس حلقے کے بعض علماء صحیح بخاری کے بارے میں استعمال کرچکے ہیں۔ انذارِ شریعت ان کے پانچ علماء کا مشترکہ فتاویٰ ہے۔ جو فیصل آباد سے دو جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ اس میں صحیح بخاری کے متعلق یہ زبان استعمال کی گئی ہے:۔

---

[1] ام المؤمنین سیدہ خدیجہ ص۹۵ [2] ایضاً ص۱۰۴ [3] انمٹ نقوش ص۲

امام بخاری نے مرجیہ وشیعہ وقدریہ وجہمیہ واہل بدعت وہوایہ فرقہ سے حدیثیں نقل کی ہیں جن کی باتوں پر اعتماد کرنا منع ہے انوار شریعت ۲ صہ ۴۲۷

بخاری شریف کی بہت سی حدیثیں کتاب اللہ کے خلاف ہیں۔ ایضاً ۲ صہ ۲۳۶

بیشک بخاری میں ایک دوسرے کے خلاف بھی بہت سی حدیثیں درج ہیں ایضاً ۲ صہ ۲۳۶

امام بخاری وغیرہ نے تمام مذاہب باطلہ کے لوگوں سے حدیثیں لی ہیں جن کا ذکر جلد اول کے ضمیمہ میں گذر چکا ہے ایضاً ۲ صہ ۲۳۴

پھر ان حضرات نے اپنے مولانا عبدالکریم سے نقل کیا ہے:۔

امام بخاری نے تو صحابہ کرام رسول علیہ السلام کی سخت توہین کی ہے وھو: ھذا باب قول الرجل للرجل اخساء بخاری مطبوعہ احمدی صہ ۹۱۱ یعنی یہ باب ہے قول رجل کا واسطے رجل کے اخسا۔ پس یہاں پہ رجل اول سے مراد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور رجل دوم سے مراد ابن صیاد ہے باب قول الرجل مرحبا بخاری صہ ۱۱۱۲۔ اس جگہ بھی رجل سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں سوم باب ماجاء فی قول الرجل ویلک یعنی یہ باب ہے قول میں رجل کے ویلک بخاری صہ ۹۱۰ یہاں بھی رجل سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔باب قول الرجل شئی لیس بشئی بخاری صہ ۹۱۷۔ اس مقام پر بھی رجل سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں پس اب دیکھئے کہ بخاری کی متعدد جگہوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں لفظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ کہا بلکہ بجائے اس کے لفظ رجل کا جو کہ عوام الناس کے حق میں بولا جاتا ہے کس کشادہ پیشانی سے بے دھڑک استعمال کیا گیا ہے کہ جو ہر حال میں سخت افسوس کے قابل ہے بخاری پرست جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مثل اپنے ایک آدمی جانتے ہیں اس کا ماخذ بھی کتاب بخاری ہو تو تعجب نہیں

انوار شریعت جلد ۲ صہ ۴۲۶، صہ ۴۲۷

یہ عبارت نقل کرنے کے بعد ملا نظام الدین نے اس پر کوئی نکیر نہیں کی مندرجہ ذیل عبارت سے جلتی پہ اور تیل ڈالا ہے دیکھئے جلد ۲ صفحہ ۴۲۷

بیان کریں کہ بدوں کتاب اللہ کے کونسی کتاب علم حدیث میں ہے جسمیں حدیثیں بناوٹی اور نامعقول باتیں درج نہیں اگر کہو کہ صحاح ستہ میں سے بخاری شریف اعلیٰ کتاب بعد کتاب اللہ قابل عمل ہے تو میں کہتا ہوں کہ یہ بات بالکل لغو اور بناوٹی ہے کیونکہ اس مجموعہ بخاری کی حدیثوں کی صحت پر کسی زمانہ میں کسی محدث کا اتفاق نہیں ہوا۔ جلد ۳ صفحہ ۴۲۷

یہ جامع الفتاویٰ مولانا احمد رضا خاں، حامد رضا خاں، نعیم الدین مراد آبادی اور نظام الدین ملتانی کے فتووں کا مجموعہ ہے۔ جسے غلام سرور قادری رضوی نے لکھا مولانا محمد اسلم علوی قادری رضوی نے مرتب کیا اور سنی دارالاشاعت رضویہ نے جھگڑ روڈ لائلپور سے شائع کیا ہے۔

یہ خیال نہ کیا جائے کہ یہ ساتوں علماء صرف صحیح بخاری کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں موصوف کی یہ عبارت بھی دیکھ لیجئے

امام بخاری وغیرہ نے تمام مذاہب باطلہ سے حدیثیں لی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ذر ہمدانی مرجیہ سے تھا کتاب بخاری ایتمہ للوجہ والکفین اور ترمذی نسائی اور ابن ماجہ کا حال بھی عنقریب لکھا جائے گا انوار شریعت ۲ صہ ۲۳۴۔

بایں ہمہ تحریرات انہیں منکرین حدیث میں جگہ نہیں دی جاسکتی یہ منکرین کتب حدیث تو ہو سکتے ہیں منکرین حدیث نہیں لیکن یہ بات پھر حل طلب ہے کہ اگر حدیث کے موجودہ ذخیرے ان کی نظروں میں یہی درجہ رکھتے ہیں تو پھر وہ کون سے با اعتماد ذرائع ہیں جن سے ان کی علم نبوت تک رسائی ہوتی ہوگی۔ اس کا جواب ان کے پاس نہیں ہے۔

علمائے دیوبند کا موقف ان کتب حدیث کے بارے میں وہی ہے جو محدثین دہلی حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ؒ کا تھا وہ ان کتابوں کو بڑی عظمت سے دیکھتے دورہ حدیث پڑھاتے اور ہر وہ شخص جو ان کتابوں کی توہین کرے اسے بدعتی اور گمراہ سمجھتے تھے۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی ؒ لکھتے ہیں :۔

ونحن بحمد اللہ نعتقد فی ھذین الکتابین الجلیلین بما اعتقد ونقول بما قال بہ شیخ شیوخنا و مقدم جماعتنا مولانا الامام الشاہ ولی اللہ الدھلوی قدس اللہ روحہ فی حجۃ اللہ البالغہ وھذا لفظہ اما

الصحیحان فقد اتفق المحدثون علیٰ ان جمیع ما فیہما من المتصل المرفوع صحیح بالقطع (ای بالتفصیل الذی ذکرنا) وانہما متواتران الیٰ مصنفیہما وانہ کل من یہون امرہما فہو مبتدع (ضال) متبع غیر سبیل المومنین
فتح الملہم جلد ۱ صـ ۱۰۸

(ترجمہ) اور ہم خدا کے فضل سے ان دو جلیل کتابوں (صحیح بخاری اور صحیح مسلم) کے بارے میں وہی عقیدہ رکھتے ہیں اور وہی بات کہتے ہیں جو ہمارے اساتذہ کے استاد اور جماعت کے سردار امام شاہ ولی اللہ دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں کہی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ صحیحین کے بارے میں محدثین کا اجماع ہے کہ ان میں جو بھی (سنداً) متصل اور (حضور تک پہنچنے والی) مرفوع حدیثیں ہیں سب یقینی طور پر صحیح ہیں اس تفصیل سے جو ہم ذکر کر آئے ہیں اور دونوں اپنے مصنفین تک تواتر سے پہنچتی ہیں اور جو کوئی ان دو کتابوں کی توہین کرے وہ بدعتی ہے گمراہ ہے اور اس راہ پر چلا ہے جو مومنین کی راہ نہیں۔

ہندوستان میں انکار حدیث کی صدا اٹھی تو حضرۃ شیخ الاسلام کے تلامذہ میدان میں نکلے اور ان شبہات کا دامن پوری مستعدی سے چاک کیا جو منکرین کی اساس تھے علماء دیوبند نے علماء مصر کو بھی اپنا ہمنوا بنایا چند کتابوں کے نام ہم یہاں ذکر کئے دیتے ہیں۔

تدوین حدیث مولانا مناظر احسن گیلانی ضرورت حدیث مولانا کریم بخش مظفر گڑھی کتابت حدیث مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی حجیت حدیث مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ مقدمہ ترجمان السنہ حضرت مولانا بدر عالم مدنی حدیث رسول کا قرآنی معیار از حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ فہم القرآن از مولانا سعید احمد اکبر آبادی اس باب میں اہم اور مفید کتابیں ہیں جو انکار حدیث کی تردید میں لکھی گئیں ہیں، مولانا محمد ادریس میرٹھی (کراچی) نے مصر کی کتاب السنۃ ومکانتہا اور اردو ترجمہ کر کے اس باب میں ایک گرانقدر خدمت کی ہے۔

فتنۂ انکارِ حدیث کیخلاف علماء کی جدوجہد

علمائے اہلسنت والجماعت نے جس طرح تاریخ کے پہلے دور میں اسلام کے خلاف اُٹھنے والے ہر فتنے کا پُوری قوتِ علمی سے مقابلہ کیا ہے معرُوف ہیں۔ وہ اس دور میں بھی اس فتنے سے غافل نہیں رہے۔ عرب ممالک میں تو ان منکرینِ حدیث کی آواز نہیں پہنچی۔ وہاں یہ کام مستشرقین ادا کرتے رہے ہیں اور الحمدللہ کہ علمائے مصر، سعودی عرب اور امارات نے وہاں بھی اُن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔ رہے یہ منکرین حدیث جن کے قائد اس وقت پرویز صاحب ہیں۔ تو الحمدللہ علمائے ہند و پاک نے اس فتنے اور اس کے اسبابِ عروج کا بڑی تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور منکرین حدیث کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔ چند اسماء گرامی ملاحظہ کیجئے اور ان علمائے حق کی عظیم علمی خدمات کی داد دیجئے۔ ان میں بیشتر حضرات حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے شاگرد ہیں معلوم ہوتا ہے جس طرح شاہ صاحب فتنۂ انکارِ ختم نبوّت کے خلاف بڑی مستعدی سے ڈٹے۔ آپ نے فتنۂ انکارِ حدیث کے خلاف بھی اپنے شاگردوں میں عظیم عزیمت کی رُوح پھُونکی تھی۔

(۱) حضرت مولانا مناظر حسن صاحب گیلانیؒ

آپ کی شہرہ آفاق تالیف تدوین حدیث مجلس علمی نے ۱۹۵۶ میں شائع کی پھر مکتبہ اسحاقیہ کراچی نے ۱۹۷۰ میں اسے ۴۸۰ صفحات میں شائع کیا ہے۔

(۲) محدث کبیر حضرت مولانا سید بدر عالم میرٹھی ثم المدنیؒ

حضرت مولانا بدر عالمؒ (ھ) نے ترجمان السنّہ کے مقدمہ میں جو بڑی تقطیع کے صفحات تک پھیلا ہوا ہے۔ حجیت حدیث اور اس سے متعلقہ مضامین پر سیر حاصل بحث کی ہے کہیں کہیں اسلم جیراجپوری کے نظریات بھی نقل کیے ہیں اور ان کے شافی جوابات دیئے ہیں۔

(۳) شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ

آپ نے جامع مسجد نیلا گنبد لاہور میں حجیت حدیث پر قسط وار تقاریر فرمائیں جو چھپتی رہیں آپ کی تالیف حجیت حدیث ان کے متن کی حیثیت رکھتی ہے ۔

(۴) حکیم الاسلام حضرۃ مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند

آپ کا تحقیقی مقالہ حدیث رسول کا قرآنی معیار اس باب کی نہایت بلند پایہ تالیف ہے بعض تعلیمی اداروں میں یہ داخل نصاب بھی ہے۔ اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ حجیت حدیث کے بارے میں پھیلنے والے جملہ اعتراضات وشبہات کا اس میں ازالہ کیا گیا ہے۔

حضرت قاری صاحب نے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی تقریر بخاری فضل الباری شرح صحیح البخاری کا مبسوط مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔ جو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں آپ نے حجیت حدیث، قواعد حدیث اور اُن سے متعلقہ دوسرے مباحث پر نہایت فاضلانہ بحث کی ہے۔ اس کا بھی انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ جو فضل الباری جلد اوّل کے ترجمے کے ساتھ چھپ چکا ہے۔ یونیورسٹی طلباء اور دورہ حدیث کے طلباء کے لیے بہت مفید اور جامع تالیف ہے۔

(۵) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ دیوبندی ثم کراچوی

آپ کے فاضل فرزند حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی نے کتابت حدیث کے نام سے ایک نہایت گراں قدر تالیف مرتب فرما کر اپنے والد مرحوم کے علم کی یاد تازہ کر دی ہے۔

(۶) محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری

آپ نے حجیت حدیث کو ایمانیات میں شمار کیا ہے اور اسکے منکر کو دائرہ اسلام سے باہر بتلایا ہے آپ نے اس پر علماء کی تصدیقات حاصل کی ہیں یہ فاضلانہ مقالہ تاریخی حیثیت کا حامل ہے ۔

⑦ حضرت مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی

آپ کی تالیف فہم قرآن اس سلسلہ کی غالباً پہلی کڑی ہے۔ جس نے ضرورت حدیث اور حجیت حدیث جیسے موضوعات پر جدید تعلیم یافتہ کو متاثر کیا۔ اسلوب بیان فاضلانہ اور طرز استدلال حکیمانہ ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور اور دوسرے کئی تعلیمی اداروں نے اسے اپنے منتہی طلبہ کے لیئے داخل نصاب کیا ہوا ہے۔

⑧ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب دیوبندی صدر وفاق المدارس پاکستان

حضرت مولانا مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیو ٹاؤن کراچی کے جلیل القدر استاذ حدیث ہیں۔ آپ نے مصر کے مشہور محقق کی کتاب السنۃ ومکانتہا کا اردو ترجمہ کر کے طالبان حدیث پر بڑا احسان کیا ہے۔

⑨ حضرت مولانا پروفیسر کریم بخش صاحب لاہوریؒ

آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر تھے۔ حدیث میں حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری کے مجاز تھے۔ آپ نے ضرورت حدیث کے نام سے نہایت ایجاز سے ایک مختصر رسالہ قلمبند فرمایا۔ جسے اس موضوع کا متن متین کہنا چاہیئے۔

⑩ شیخ الحدیث حضرت مولانا سرفراز خاں (گوجرانوالہ)

آپ حضرت مولانا حسین علی صاحبؒ (واں بھچراں) اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کے ممتاز شاگرد ہیں اور اپنے اساتذہ کے طرز پر پنجاب میں منبع فیض ہیں۔ آپ نے اہمیت حدیث اور حجیت حدیث پر نہایت قابل قدر تالیفات پیش کی ہیں۔

۱۔ انکار حدیث کے نتائج ۲۔ شوق حدیث

آپ نے ان میں منکرین حدیث کے افکار و نظریات کا فاضلانہ تعاقب کیا ہے۔

منکرین حدیث نے عرب ممالک میں سے لیبیا کو اپنے ساتھ لے رکھا ہے یہ درست نہیں کہ لیبیا کے ارباب درس وافتاء حدیث کو شریعت کا جزو نہیں مانتے کرنل معمر قذافی کی بعض آراء سے اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک حجیت حدیث کی اصولی حیثیت کا تعلق ہے کوئی عرب ریاست اور اہل علم کا کوئی طبقہ اس کا منکر نہیں ہے۔

الدکتور محمد بن عبدالکریم الجزائری محتاج تعارف نہیں آپ کی تالیف القذافی والمتقولون علیہ ۳۰۴ صفحات پر مشتمل ہے اسمیں ان لفظوں میں سنت نبوی کی اصولی حیثیت کا اقرار کیا ہے۔

ان وظیفۃ السنۃ النبویۃ فی الشریعۃ الاسلامیہ ھی فی خدمۃ القرآن الکریم من تفسیر غامضہ وتوضیح مبھمہ وتفصیل مجملہ وتخصیص عامہ وتقیید مطلقہ وغیر ذلک[1]

پھر تدوین حدیث کی بحث میں لکھا ہے کہ :-

وکان الرسول ینھی اصحابہ عن کتابتہ خشیۃ اختلاطہ بالقرآن کریم ص۴۹

اس میں اس وہم کا شائبہ تک نہیں کہ آپ کا کتابت حدیث سے روکنا اس لیے تھا کہ حدیث قانون اسلامی میں حجت نہ سمجھی جائے (معاذ اللہ) کوئی مسلمان اصولاً حجیت حدیث کا انکار نہیں کر سکتا۔

دکتور جزائری نے ص ۴۹ پر حضرت عمر بن عبدالعزیز کا وہ حکم بھی نقل کیا ہے جو آپ نے جمع احادیث کے لیے صادر فرمایا تھا اور پھر موطا امام مالک، مسند امام احمد، صحیح البخاری، صحیح مسلم اور کتب سنن کا بھی ذکر کیا ہے

سو یہ بات صحیح نہیں کہ وہاں کے علماء سنت کی اصولی حیثیت کا تو اقرار کرتے ہیں لیکن حدیث کو حجت اور سند نہیں مانتے کتب حدیث میں سنت کی حفاظت کا ہی پورا اہتمام کیا گیا ہے ——

رہا یہ عنوان کہ ان القرآن شریعۃ المجتمع تو اسے اسی طرح انکار حدیث کا زینہ نہ سمجھا جائے جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خطبے میں حجیت حدیث کا انکار منطوی نہیں قرآن کی طرف دعوت ہے۔

فقال علیکم بالقرآن وانکم سترجعون الی قوم یشتھون الحدیث عنی فمن عقل شیئاً فلیحدث بہ ومن افتری علی فلیتبوأ بیتاً اومقعداً فی جھنم[2]

---

[1] القذافی والمتقولون علیہ ص ۴۶ [2] رواہ الطحاوی فی مشکل الآثار جلد ا ص ۱۷۱۔

مدارسِ حدیث

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ. امابعد فقد قال رسول اللہ ﷺ.
حدثوا عنی ولو آیہ او کما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم.

صحابہؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سُنا اور آپ کو جو کچھ کرتے ہوئے پایا اُسے آگے پہنچایا اور اگلوں نے صحابہؓ کے نام سے اس حدیث کی سند جاری کردی — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی ایک معلم تھے اور آپ نے حدثوا عنی کہکر ہر ایک صحابی کو معلم ٹھہرایا۔ اس جہت سے ہر ایک صحابی کا حلقۂ تعلیم ایک مستقل مدرسہ تھا اور طالبانِ حدیث مدرسہ بہ مدرسہ جاکر اس فن کی تکمیل کرتے — اصحابِ رسولؐ پہلے اساتذۂ حدیث ہیں جن میں سے ایک ایک شمسِ منیر کی بدولت آسمانِ ہدایت پر پُوری تابانی سے چمکا۔ ہر صحابی ہدایت کا روشن ستارہ ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ بعض ستارے تیز روشن ہوتے ہیں اور بعض مدھم — لیکن ہر ستارے سے روشنی ہی ملے گی اندھیرا نہیں اور جہاں ستارہ چمکے گا اندھیرا چھٹے گا اور لوگوں کو رستے ملیں گے وعلٰمٰت وبالنجم ھم یھتدون۔ پ۱۴ النحل ۲۴

مدارس کی ہیئت وصُورت

پہلے دنوں مدارسِ حدیث کے لیے بڑی بڑی بلڈنگیں نہ ہوتی تھیں۔ جہاں کوئی ہدایت کا ستارہ چمکا یا کوئی نامور استاد آیا وہیں طالبینِ حدیث نے حلقہ بنالیا اور یہ حلقہ مستقل مدرسہ کہلایا۔ ان دنوں مدارس بلڈنگوں اور انتظامات سے نہیں اساتذہ کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ بعض جگہ ایک ایک مسجد میں کئی مدرسے لگتے اور ایک ایک میدان میں روایتِ حدیث کے متعدد خیمے نصب ہوتے۔ محدث اُونچی جگہ پر بیٹھتا۔ اور

طالبانِ حدیث اس کے گرد حلقہ بنا لیتے ــــــــ دور دور تک شیخ کی آواز پہنچتی اور اس کے آگے تلامذہ بلند آواز سے اگلوں کے لیے حدیث نقل کرتے چلے جاتے اور دور دور تک حدیث کی تحدیث ہوتی جاتی. کہیں غیر عرب تلامذہ ہوتے تو محدث کے ساتھ مترجم بھی آ بیٹھتے اور حدیث پورے اہتمام سے آگے پڑھی جاتی اور پہنچائی جاتی تھی.

قرنِ اوّل کی ممتاز درسگاہیں

پہلے دور میں بلادِ اسلامی میں پانچ دینی درسگاہیں زیادہ ممتاز ہوئیں. ۱. مدینہ منورہ. ۲. مکہ معظمہ. ۳. کوفہ و بصرہ. ۴. شام. ۵. مصر. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں علمی پہلو سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (۳۲ھ) مرکزی حیثیت رکھتے تھے. حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب کوفہ و بصرہ آباد کیے تو ان نو آبادیات میں بہترین عربوں کو بسایا جو قوموں کا حاصل تھے اور ان کی دینی تعلیم کے لیے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو معلم بنایا.

کوفہ کا مدرسہ حدیث

کوفہ میں آپ نے اپنی مسندِ علمی لگائی. آپ کے تلامذہ میں ایسے ایسے جبالِ علم اُبھرے کہ ان سے استفادہ کرنے کے لیے بعض دفعہ اصحابِ رسولؐ بھی حاضر ہوتے.

پھر حضرت علی المرتضیٰؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں کوفہ کو اپنا مرکز بنایا اور اس علاقے کو اور علمی جلا بخشی ــــــــ حضرت امام ابو حنیفہؒ (۱۵۰ھ) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی اسی علمی مسند کے وارث تھے. حضرت امام سفیان ثوریؒ (۱۶۱ھ) بھی اسی سرزمین کے تھے. کوفہ اسلامی دنیا میں ایک عظیم مرکزِ علم بن گیا تھا. حضرت امام نوویؒ (۶۷۶ھ) کوفہ کو دارالفضل ومحل الفضلاء[1] کہہ کر ذکر کرتے ہیں. حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں کی بدولت وہاں سینکڑوں مدارس حدیث قائم ہوئے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اس کی علمی شان سے متاثر ہو کر فرمایا. الکوفۃ قبۃ الاسلام[2] مشہور تابعی قتادہ بن دعامہ (۱۱۸ھ) کہتے ہیں کوفہ میں پندرہ سو صحابہؓ کا قیام تھا جن میں سے

---

[1] شرح صحیح مسلم للنووی جلد ۱ صد ۱۸۵ [2] مستدرک حاکم جلد ۳ صد ۸۹

چوبیس بدری تھے۔ امام محمد بن سیرین تابعی (۱۱۰ھ) کہتے ہیں جب میں کوفہ پہنچا تو وہاں چار ہزار طلبہ حدیث پڑھ رہے تھے۔[۲]

امام مالکؒ کا مدرسہ حدیث

مدینہ منورہ میں سینکڑوں مدارسِ حدیث قائم تھے۔ مدینہ منورہ کی سب سے ممتاز بڑی درسگاہ حضرت امام مالک (۱۷۹ھ) کی تھی۔ آپ عمل اہلِ مدینہ کی روشنی میں حدیث پڑھاتے تھے۔ مؤطا امام مالک اس حلقے کی ممتاز علمی دستاویز ہے۔ جس کی سند لینے کے لیے دور دراز سے علماء وہاں آتے۔ حضرت امام محمد (۱۸۹ھ) جیسے جلیل القدر امام جو خود مجتہد تھے مدینہ کے اس مدرسہ حدیث میں گئے اور وہاں امام مالکؒ سے موطا کی سند لی جہاں حضرت امام محمد کی تحقیق حضرت امام مالک کے موافق نہ ہوئی امام محمد نے اسے الحجۃ علی اہل المدینۃ کے نام سے مرتب کیا۔ یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب سابق مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند کے تحقیقی نوٹوں کے ساتھ چھپ چکی ہے۔ ہاں جس اصول پر سب مجتہد متفق ہوئے وہ حضرت امام مالکؒ کے الفاظ میں یہ ہے:۔

انزل اللہ کتابہ و ترک فیہ موضعاً لسنۃ نبیّہ وسنّ نبیّہ السنن وترک فیہ موضعاً للرای والقیاس۔[۳]

ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم نازل فرمایا اور اس میں اپنے نبی کی سنت کے لیے جگہ چھوڑی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنتیں قائم کیں تو ان میں رائے اور قیاس کی گنجائش چھوڑ دی۔

اس رائے اور قیاس سے صحابہ کرامؓ اور مجتہدین عظام نے آگے شریعت کی دیگر جزئیات مکمل کیں۔ انہوں نے یہ مسائل ایجاد نہیں محض دریافت کیے ہیں۔ مجتہد احکام کا موجد نہیں ہوتا۔ صرف مظہر ہوتا ہے کہ اس نے اس اصول میں چھپی ایک بات ظاہر کر دی۔

---

[۱] کتاب الاسماء والکنیٰ للدولابی ص ۱۴۲ جلد اول [۲] تدریب الراوی ص ۴۷۵
[۳] نصب الرایہ للزیلعی جلد ۴ ص ۶۴ مصر

شام کا مدرسہ حدیث

شام کے مدارسِ حدیث میں امام اوزاعی (۱۵۷ھ) کی درسگاہ زیادہ معروف ہوئی۔ صحابہ میں حضرت ابو الدرداءؓ (۳۲ھ) اور حضرت امیر معاویہؓ (۶۰ھ) جیسے جبال علم اس علاقہ میں قیام فرمارہے۔ اور ان کی وجہ سے یہ سرزمین علم کا گہوارہ بن گئی۔ مشہور تابعی امام مکحولؒ (۱۱۸ھ) کی قدر و منزلت سے کون واقف نہیں۔ آپ کا علمی میدان یہی سرزمین شام تھی۔ امام اوزاعی آپ کے ہی شاگرد رشید تھے۔ اہل کوفہ اور اہل مدینہ کے مقابل میں اہل شام حدیث اور اصولِ فقہ کے اپنے مستقل نظریات رکھتے تھے۔ اس علاقے میں چھٹی صدی ہجری تک امام اوزاعیؒ کی تقلید جاری رہی۔ پھر یہ لوگ امام شافعی کے پیرو ہوگئے۔

مصر کا مدرسہ حدیث

صحابہ میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ (۶۷ھ) مکثرین حدیث میں سے ہیں۔ اور آپ کی حدیثی خدمات اظہر من الشمس ہیں۔ آپ نے کثرت سے حدیث روایت کی ہے کثرتِ روایت میں آپ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پایہ کے ہیں۔ آپ حضرت عمرو بن عاصؓ فاتحِ مصر کے بیٹے تھے اور اسی تعلق سے یہ زمین آپ کے فیض کا گہوارہ بنی۔ مصر ابتداء میں ہی علم حدیث کا گہوارہ بن چکا تھا۔ تبع تابعین کے عہد میں امام لیث مصری (۱۷۵ھ) یہاں علم کا مرکز تھے۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی درسگاہ جامع ازہر اسی ملک میں ہے۔ جو آج بھی اپنی ہزار سالہ روشن تاریخ کے ساتھ قاہرہ میں قائم ہے۔

بر سر مطلب آمدیم

اس وقت ہمیں عرب ممالک کی موجودہ اور سابقہ درسگاہوں سے بحث نہیں آپ برصغیر پاک و ہند میں رہتے ہیں اور ہم آپ کو اس علاقہ کے مدارسِ حدیث سے متعارف کرانا چاہتے ہیں تاکہ آپ جان سکیں کہ آپ کے گرد و پیش علم کی خدمت کہاں کہاں ہوتی رہی ہے یا ہو رہی ہے۔ آپ پہلے یہ جانیں کہ برصغیر پاک و ہند میں علم حدیث کب آیا۔

علم حدیث ہندوستان میں

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ. امابعد :-

برصغیر پاک و ہند کو یہ فخر حاصل ہے کہ محدث کبیر حضرت الربیع بن الصبیح (۱۶۰ھ) یہاں تشریف لائے۔ سندھ شروع سے ہندوستان کے لیے اسلام کا دروازہ رہا ہے۔ پہلی صدی ہجری کے آخری حصہ سے لے کر تیسری صدی کے نصف تک سندھ کا تعلق دمشق اور بغداد کی خلافتوں سے رہا ہے۔ پہلے مؤرخین سندھ سے آگے ہند کا آغاز کرتے تھے محمد بن قاسم کا قافلہ پہلے یہیں اُترا تھا اور پھر یہیں سے اسلام کے قافلے وسطِ ہند کی طرف چلے تھے۔ فتوح السند والہند سے کون واقف نہیں۔

آپ نے مشہور محدث عبد بن حمید (۲۴۹ھ) کا نام سُنا ہو گا۔ حدیث کی مشہور کتاب مسند عبد بن حمید انہی کی تالیف ہے۔ یہ کہاں کے رہنے والے تھے؟ سندھ کے علاقہ کچھ کے ــــ اسے عربی میں کس لکھتے ہیں۔ آپ کچھ میں پیدا ہوئے۔ پھر حدیث پڑھنے کے لیے عرب پہنچے اور وہاں امام ابوحنیفہؒ (۱۵۰ھ) کے شاگردوں عبد الرزاق بن ہمام (۲۱۱ھ) یزید بن ہارون (۲۱۷ھ) اور علی بن عاصم (۲۰۱ھ) سے حدیث سُنی اور ایک عالم ان سے حدیث میں فیضیاب ہوا۔

(**نوٹ**) بعض علماء نے کچھ کو سمرقند کا قصبہ کش لکھا ہے یہ صحیح نہیں۔ علامہ یاقوت حموی (۶۲۲ھ) لکھتے ہیں :-

> کس (کچھ)، سندھ کا ایک مشہور شہر ہے اس کا ذکر مغازی میں بھی آتا ہے۔ اس شہر سے نسبت رکھنے والوں میں عبد بن حمید بن نصر الکسی صاحب مسند بن حمید بھی ہیں[1]

ہندوستان میں مسلمانوں کی عام آمد مسلم فاتحین کے ساتھ ہوئی۔ پھر صوفیائے کرام

---

[1] معجم البلدان جلد ۷، صـ ۲۵

نے یہاں کے عوام کو متاثر کیا اور ان کے زیر اثر لوگ مسلمان ہوتے گئے۔ علوم اسلامی میں علم تفسیر اور علم فقہ نے یہاں رواج پایا۔ علم حدیث اپنی باضابطہ شکل میں یہاں کچھ بعد میں آیا ہے۔

عرب، عراق اور شام میں بھی ترتیب تقریباً یہی رہی ہے۔ سعید بن جبیر (۹۵ھ) طاؤس (۱۰۵ھ) قاسم بن محمد (۱۰۷ھ) حسن بصری (۱۱۰ھ) عطاء (۱۱۵ھ) اور قتادہ بن دعامہ (۱۱۸ھ) ائمہ تفسیر پہلے ہوئے۔ امام ابوحنیفہ (۱۵۰ھ) امام اوزاعی (۱۵۷ھ) امام مالک (۱۷۹ھ) سفیان ثوری (۱۶۱ھ) امام شافعی (۲۰۴ھ) اور امام احمد (۲۴۱ھ) مجتہدین کرام ان کے بعد آئے اور ارباب فن حدیث امام بخاری (۲۵۶ھ) امام مسلم (۲۶۱ھ) اور امام ابوداؤد (۲۷۲ھ) کچھ اور بعد میں آئے۔

ہندوستان میں سندھ، گجرات، کشمیر، متحدہ صوبجات اور دہلی کے علماء علم حدیث کی طلب میں حجاز پہنچے اور بہت سے بزرگوں نے وطن واپس آ کر اس ملک میں حدیث کو فروغ دیا۔ بعض بزرگ بعد میں آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

برصغیر پاک و ہند کے پہلے محدثین

سندھ میں علمائے دُیبل فن حدیث میں بہت معروف رہے ہیں۔ ابوالحسن علی بن احمد بن محمد تیسری صدی کے نامور محدث یہیں کے تھے۔ علامہ تاج الدین السبکی (۷۷۱ھ) نے طبقات شافعیہ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ابو جعفر محمد بن ابراہیم دُیبلی (۳۲۲ھ) نے ابوعبداللہ سعید بن عبدالرحمٰن کے واسطے سے سفیان بن عیینہ (۱۹۸ھ) کی کتاب التفسیر اور امام عبداللہ بن مبارک (۱۵۶ھ) کی کتاب کتاب البر والصلہ کی احادیث روایت کی ہیں ——— ابراہیم بن محمد دیبلی مکہ مکرمہ کے مشہور محدث محمد بن ابراہیم کے بیٹے تھے۔ بغداد میں حدیث پڑھاتے رہے۔ پھر یہاں آ کر اس علم کو فروغ بخشا ——— محمد بن حسین بن محمد (۳۲۹ھ) بھی دیبل کے رہنے والے تھے۔ آپ نے شام کو اپنا مسکن بنایا۔ امام ابوالحسن علی بن عمر دارقطنی آپ کے شاگردوں میں سے تھے۔

حسین بن محمد بن اسد ابوالقاسم دیبلی نے بھی دمشق میں قیام کیا اور امام ابویعلیٰ

موصلی (۳۰۷ھ) سے حدیث سُنی۔ حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ابوالعباس احمد بن عبداللہ (۳۴۳ھ) بھی اسی علاقے کے تھے۔ حاکم صاحبِ مستدرک ان کے شاگرد ہیں۔ سندھ کے علماء کی یہ عظیم حدیثی خدمت ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ حضرات جب اُن ملکوں میں گئے تو بیشتر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔

سندھ میں علم حدیث

قرونِ وسطیٰ کے آخر میں سندھ میں بہت علمی شخصیتیں اُبھریں۔ شیخ عبداللہ بن سعد اللہ سندھی، شیخ رحمت اللہ سندھی، طاہر بن یوسف (۱۰۰۴ھ) مولانا عثمان سندھی شارح صحیح البخاری (۱۰۰۸ھ) شیخ عیسیٰ بن قاسم سندھی (۱۰۳۱ھ) سے کون واقف نہیں۔ شیخ ابوالحسن سندھی (۱۱۳۸ھ) وسیع النظر آزاد خیال عالم تھے جن کے حاشیے صحاح ستہ کی تقریباً سب کتابوں پر موجود ہیں۔ شیخ محمد حیات سندھی آپ کے شاگرد تھے۔ شیخ خیرالدین سورتی (۱۲۰۶ھ) نے شیخ محمد حیات سندھی سے حدیث پڑھی اور پھر سورت میں نصف صدی تک حدیث پڑھاتے رہے۔ آپ کے مدرسہ کا نام مدرسہ خیریہ تھا۔

سندھ کے مخدوم عبدالواحد سیہوانی (۱۲۲۴ھ) بڑے عظیم المرتبت محدث تھے۔ آپ کی تالیفات الازہار المتناثرہ فی الاخبار المتواترہ اور الاربعین فی فضل المجاہدین مشہور ہیں۔

ٹھٹھہ اور بوبک سندھ کے عظیم علمی مرکز رہے ہیں۔ محدث سندھ مولانا محمد طاہر برہانپوری، مولانا محمد عثمان بوبکانی، قاضی عبدالسلام سندھی ان علاقوں کے مشہور علماء میں سے ہیں۔ شیخ رحمت اللہ سندھی کی علمی شان جاننے کے لیے یہی کافی ہے کہ حضرت مُلا علی قاری جیسے محدث نے ان کی بعض کتابوں کی شرحیں لکھی ہیں۔ وکفیٰ بہ فضلاً وفخراً۔ پیر جھنڈا کا قدیمی کتب خانہ سندھ کے علمی مرکز کی منہ بولتی تصویر ہے۔ یہاں کچھ خاندانی اختلافات ہوئے۔ مگر معلوم نہیں انہوں نے بلا وجہ کیوں مسلکی اختلاف کی شکل اختیار کر لی؟ سندھ کی علمی مرکزیت کا یہ ایک سانحہ ہے۔

حضرت پیر راشد اللہ شاہ (صاحبِ عَلَم اول) کے خاندان میں راشد اللہ شاہ سجادہ نشین کے

دو بیٹوں ضیاء الدین شاہ اور احسان اللہ شاہ میں باپ کی جانشینی پر اختلاف چلا آئینت میں پیر ضیاء الدین آگے تھے مگر مریدوں کے پاس آنا جانا احسان اللہ شاہ کا تھا۔ فریقین میں طے پایا کہ اس اختلاف میں دیوبند کا فتویٰ حاصل کیا جائے دیوبند کا فیصلہ ضیاء الدین شاہ کے حق میں ہوا جس پر حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب اور حضرت مولانا انور شاہؒ کے دستخط تھے احسان اللہ شاہ بگڑ کر دیوبند کے خلاف ہو گیا اور اس کے دو لڑکے محب اللہ اور پیر بدیع الدین غیر مقلد ہو گئے۔ گدی پر پیر وھب اللہ شاہ راشدی ہیں یہ حضرت دیوبندی مسلک کے ہیں۔

پنجاب میں علم حدیث

شیخ محمد اسماعیل محدث لاہوری (۴۴۸ھ) ـــــ بخارا کے سادات عظام میں سے تھے۔ سلطان مسعود غزنوی کے ساتھ (۴۲۵ھ) میں لاہور آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ حضرت علی بن عثمان ہجویری (۴۶۵ھ) لاہور میں فروکش ہوئے۔ شیخ محمد بن حسن الصغانی (۶۵۰ھ) صاحب مشارق الانوار نے بھی لاہور کو وطن بنایا اور مصباح الدجیٰ فی احادیث المصطفیٰ، کشف الحجاب فی احادیث الشہاب اور الرسالہ فی الاحادیث الموضوعہ جیسی کتابیں لکھیں۔ اس علاقے میں حدیث کی خدمت قطب الدین محمد بن علاء الدین (۶۹۵ھ) نے بھی کی، مکہ مکرمہ اور مصر گئے اور نور الدین ابو الفتح سے حدیث کی سند لی۔ ابو یوسف محمد یعقوب بنانی لاہوری (۱۰۹۸ھ) نے صحیحین کی شرح الخیر الجاری بشرح صحیح البخاری اور المعلم بشرح صحیح مسلم لکھیں۔ شیخ محمد صدیق لاہوری (۱۱۴۳ھ) کے والد کابل سے پنجاب آئے اور پھر یہیں رہ گئے۔ آپ جامع مسجد وزیر خاں لاہور میں امام تھے اور آپ کے صاحبزادہ شیخ محمد صدیق حدیث پڑھاتے تھے۔ ان دنوں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا دہلی میں درس جاری تھا۔

پنجاب میں علم حدیث کی یہ خدمت متفرق قسم کی تھی۔ ابھی اس نے یہاں باضابطہ تدریس کی شکل اختیار نہ کی تھی۔ ہندوستان میں جو علاقہ سب سے پہلے حدیث کا مرکز بنا۔ وہ گجرات ہے۔ یہاں کے علماء جس کثرت سے حجاز پہنچے اور پھر جس ولولے سے انہوں نے اپنے ہاں علم حدیث کا چرچا کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کے بعد دہلی کا نام ہے۔ یہاں حدیث کی مرکزیت قائم ہوئی۔ اور پھر دہلی سارے ہندوستان کا مرکز بن گیا۔

گجرات میں علمِ حدیث

گجرات کے علاقہ احمد آباد کے ایک عالم راجح بن داؤد (۹۰۴ھ) حرمین پہنچے۔ اور حافظ شمس الدین سخاوی سے حدیث کی سند حاصل کی۔ ان کی تین روایات عشاریات (حضورؐ تک دس واسطوں سے پہنچنے کی سند) میں سے ہیں۔ جن میں سے ایک حضرت امام ابو حنیفہؒ کے واسطے سے مروی ہے۔ حافظ سخاوی نے الضوء اللامع میں راجح بن داؤد کو شیخ فاضل اور بارع کامل کے الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ گجرات میں اس سے پہلے (۸۵۱ھ) کا لکھا ہوا صحیح بخاری کا ایک نسخہ ملا ہے جو کسی گجراتی عالم کے ہاتھ کا لکھا ہے۔ مکہ کے شیخ ابو القاسم بن احمد جب گجرات آئے تو اپنے ساتھ فتح الباری کا ایک قلمی نسخہ بھی لائے تھے۔ شیخ علی المتقی (۹۷۵ھ) گجرات سے حجاز گئے اور حافظ سخاوی سے حدیث کی سند حاصل کی۔

شیخ محمد بن طاہر (۹۸۶ھ) صاحب مجمع البحار گجرات کے نامور عالم ہیں۔ آپ حجاز سے ہی حدیث پڑھ کر آئے تھے۔ آپ کی لغاتِ حدیث کی کتاب مجمع البحار بڑی ضخیم کتاب ہے اور اپنی مثال آپ ہے۔ آپ کے گجرات واپس آنے سے یہاں علم حدیث کو بہت فروغ ہوا۔ آپ کے عہد میں یہاں علم حدیث کا بہت چرچا تھا اور صحیح بخاری، صحیح مسلم اور موطا بڑے اہتمام سے پڑھی جاتی تھیں۔ شیخ عبدالقادر الحضرمی الگجراتی نے النور السافر ۹۰۴ھ کے وقائع میں لکھا ہے کہ امیر صالح الغ خاں کے ہاں ۲۷ رجب کو ختم بخاری بڑے اہتمام سے ہوتا ہے اور امیر کی طرف سے اس کے لیے ایک بڑی دعوت کا انتظام کیا جاتا ہے۔ یہ صورتحال بتاتی ہے کہ علم حدیث اس علاقے میں اس سے بہت پہلے متعارف ہو چکا تھا۔ علاقہ گجرات میں جو علماء باہر سے آئے اور یہاں درسِ حدیث دیتے رہے ان میں شیخ احمد بن محمد النہروانی (۹۴۹ھ) اور شیخ احمد بن بدرالدین مصری (۹۹۲ھ) مشہور ہیں۔ شیخ احمد بن بدرالدین شیخ الاسلام زکریا انصاری کے شاگرد تھے اور انہوں نے حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) سے حدیث کی سند لی تھی۔

علم حدیث وسط ہند میں

نواب صدیق حسن خاں صاحب ہندوستان میں علم حدیث کا آغاز شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۰۵۲ھ) شارح مشکوٰۃ سے کرتے ہیں۔ آپ نے حجاز میں شیخ ــــــ علی المتقی صاحب کنزالعمال سے حدیث پڑھی تھی۔ آپ کی علمی شہرت نے آپکو سارے ہندوستان کا مرکز بنا دیا تھا۔ یہاں تک کہ گجرات سے بھی علماء ان کے پاس پہنچتے اور حدیث کی سند لیتے تھے۔ شیخ احمد بن سلیمان گجراتی بھی دہلی آئے اور حضرت الشیخ سے اس کی سند لی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے پوتے شیخ نورالحق (۱۰۷۳ھ) نے صحیح بخاری کی شرح فارسی میں لکھی۔ جو علماء میں بہت مقبول اور متداول ہے۔

ان حضرات کے بعد دہلی کی یہ نہضت علمی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خاندان میں منتقل ہوئی۔ آپکے والد حضرت شاہ عبدالرحیم جو فتاوےٰ عالمگیری کی تدوین میں اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ کام کر چکے تھے۔ دہلی کے مدرسہ رحیمیہ کے بانی تھے۔ آپ کے بعد آپ کے بیٹے حضرت شاہ ولی اللہ اس مسند کے وارث ہوئے۔ حضرت شاہ صاحب نے حجاز کا سفر کیا اور شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم سے دوبارہ حدیث پڑھی حضرت شاہ ولی اللہ کے بعد آپ کے بیٹے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سرپر آرائے مسند حدیث ہوئے۔ آپ کی علمی سلطنت مصر و شام اور بلخ و بخارا تک پھیلی ہوئی تھی۔ آپ کے بعد آپکے نواسے حضرت شاہ محمد اسحٰق یہاں درس و افتاء کا مرجع بنے۔ یہ مسند حدیث اس وقت تک سارے ہندوستان کا علمی مرکز تھی۔ گنگوہ سے شیخ عبدالنبی حدیث پڑھنے حجاز گئے اور واپس آکر یہاں علم حدیث کی خدمت کی۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی بھی اپنے وقت میں مرجع خلائق بنے۔ اور آخری دور میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی گنگوہ میں دورۂ حدیث پڑھاتے رہے۔ ان کے بعد دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور جیسے ادارے عالم وجود میں آئے اور ان سے ایک عالم سیراب ہوا۔

ہندوستان کے مدارس حدیث

علاقہ گجرات کاٹھیاواڑ

پرانے دور میں ان مدارس کی علمی خدمات کا بہت چرچا تھا۔

۱۔ مدرسہ سرخیز اس کے بانی شیخ احمد کتو تھے۔ ۱۹۲۱ء تک اس مدرسہ کے آثار باقی رہے۔

۲۔ مدرسہ شمع برھانی۔ شیخ محمد عثمان برہانی (۸۶۳ھ) ــــ الملقب بہ شمع برہانی اس کے بانی تھے۔ اس میں حدیث بھی پڑھائی جاتی تھی۔

۳۔ مدرسہ شیخ محمد طاہر (۹۸۲ھ)

۴۔ مدرسہ علویہ عالیہ احمد آباد۔

۵۔ مدرسہ شیخ وجیہ الدین علوی (۹۹۸ھ) شارح شرح نخبۃ الفکر۔

۶۔ مدرسہ فیض صفا سلطان عالمگیر۔

۷۔ مدرسہ صدر جہاں احمد آباد۔

۸۔ مدرسہ عالیہ کاٹھیاواڑ۔

۹۔ مدرسہ ہدایت بخش ۱۱۰۹ھ میں بنا۔ شیخ الاسلام اکرام الدین اس کے ناظم تھے۔ علامہ سید مرتضیٰ زبیدی (۱۲۰۵ھ) شارح احیاء العلوم اسی مدرسہ میں ٹھہرتے اور درس دیتے تھے۔

۱۰۔ مدرسہ لاجپور سورت۔ یہ شیخ سلیمان بن عبدالاحد نے بنایا تھا۔ انگریزوں نے ۱۲۸۹ھ میں اس پر قبضہ کرلیا اور آہستہ آہستہ اسے بند کر دیا۔ مولانا محمد حسن سملکی بانی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل اسی مدرسہ کے پڑھے ہوئے تھے۔

عہد جدید میں اس علاقے کے جو مدارس طلبہ حدیث کا مرجع ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ معروف یہ ہیں:۔

۱ ــــ دارالعلوم اشرفیہ راندھیر۔ ۱۲۸۱ھ میں قائم ہوا۔ حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی اور حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے ارشاد پر حاجی اسماعیل اشرف راندیری نے اسے

قائم کیا تھا۔ حضرت مولانا احمد علی کے شاگرد شیخ برکت اللہ اس کے پہلے صدر مدرس تھے اور پہلے مہتمم قاضی رحمت اللہ (۱۳۴۲ھ) تھے۔ پھر شیخ محمد اشرف راندھیری جو حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ کے شاگرد تھے اس کے مہتمم ہوئے۔ آج کل مولانا محمد رضا اجمیری اس کے شیخ الحدیث ہیں۔

۲۔۔۔۔ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل۔ یہ عظیم اسلامی درسگاہ (۱۳۲۲ھ) میں قائم ہوئی۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے شاگرد شیخ احمد بزرگ اس کے پہلے مہتمم ہوئے۔ آپ نے اہتمام چھوڑا تو مفتی اسمٰعیل اللہ صاحب اس کے مہتمم بنے جو ۱۳۷۱ھ تک اس منصب پر فائز رہے۔ ۱۳۷۹ھ سے اس کا اہتمام جناب احمد بزرگؒ کے صاحبزادے حضرت مولانا محمد سعید صاحب کے پاس ہے اس درسگاہ کی تاریخی عظمت اور علمی سطوت کے لیے یہ جاننا کافی ہے کہ رئیس المحدثین حضرت مولانا انور شاہ کشمیری، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت الشیخ عبدالرحمٰن امروہی، محدث کبیر حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی، شیخ الاسلام حضرت مولانا شمس الحق افغانی، محدث کبیر حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی، محدث العصر مولانا محمد یوسف بنوری، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی جیسے جہابذہ علم اس میں درسِ حدیث دیتے رہے ہیں۔

ان دنوں شیخ الحدیث حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کے شاگرد مولانا محمد ایوب ہیں ۱۹۷۵ء میں شیخ الازہر شیخ عبدالحلیم محمود بھی یہاں تشریف لائے تھے۔

۳۔ جامعہ حسینیہ راندھیر ۱۳۲۵ھ میں قائم ہوا۔ شیخ المحدثین حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نے سنگ بنیاد رکھا۔ ان دنوں مہتمم حافظ اسماعیل بن احمد راندھیری اور شیخ الحدیث حضرت مولانا احمد اللہ ہیں۔ آپ کئی دفعہ انگلستان کے تبلیغی دوروں پر بھی تشریف لے گئے ہیں۔ آپ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے شاگرد ہیں۔

۴۔۔۔۔ فلاح الدارین ترکیسر۔ ترکیسر سورت سے تقریباً چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے دینی فکر رکھنے والے حاجی غلام احمد راوت شیخ آدم پٹیل، حاجی یوسف راوت، حاجی موسیٰ راوت کی محنتوں سے یہ درسگاہ قائم ہوئی۔ مفتی احمد بن ابراہیم بیمات آج کل یہاں صدر مدرس ہیں۔

۵۔۔۔۔ دارالعلوم بھڑوچ کنتھاریہ۔ سنگ بنیاد شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی

نے رکھا۔ پہلے مدیر شیخ آدم منوبری تھے۔ جو ۱۹۷۲ء تک اس منصب پر فائز رہے۔ پھر یہ ذمہ داری جناب علی بن یوسف پر آئی۔ آج کل مولانا اسماعیل منوبری (جو پہلے انگلستان رہے) اس کے مدیر ہیں اور مولانا یعقوب بن اسماعیل سامرودی صدر مدرس ہیں۔

۶۔۔۔۔ دارالعلوم ماٹلی والا۔ جنوبی افریقہ کے جناب حاجی موسے ماٹلی والا اس کے سرپرست ہیں۔ شیخ ابوالحسن بہاری صدر مدرس ہیں۔ ہندوستان کے مشہور خطیب اور مناظر اسلام حضرت مولانا عبدالحنان صاحب اسی مدرسہ میں درس حدیث دیتے ہیں۔

۷۔۔۔۔ دارالعلوم بڑودہ۔ مولوی ولی احمد کاوی اس کے مدیر ہیں اور شیخ الحدیث مولانا احمد رویدی ہیں۔

۸۔۔۔۔ جامعہ اسلامیہ آنند ضلع کیرا۔ یہ جامعہ احمد آباد سے ۵۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے پہلے یہ مدرسہ تاراپور میں تھا۔ شیخ غلام نبی تاراپوری اس کے بانی ہیں۔ آج کل صدر مدرس مولانا ابراہیم پالنپوری ہیں۔

۹۔۔۔۔ دارالعلوم چھاپی۔ شمالی گجرات کی درسگاہ بہت قدیم ہے۔ پہلے اس کا نام مدرسہ کنز المرغوب تھا۔ آج کل پٹنہ کے شیخ محمد سعید اس کے ناظم ہیں۔

۱۰۔۔۔۔ مدرسہ عربیہ اسلامیہ (ددالی)۔ ان دنوں اس کے صدر مدرس شیخ فضل الرحمن صاحب پشاوری ہیں۔

(نوٹ ۱) بچیوں کی دینی تعلیم کے لیے علاقہ گجرات میں مدرسۃ البنات (سیملک) اور مدرسہ حیات الصالحات (راندھیر) خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ کئی اور مقامات پر بھی بچیوں کی درسگاہیں قائم کی جارہی ہیں۔

(نوٹ ۲) اس علاقہ میں مولانا احمد بن محمد سامرودی (۱۳۱۵ھ) سے "اہلحدیث" مکتب فکر قائم ہوا۔ آپ دہلی گئے اور مولانا نذیر حسین صاحب سے حدیث پڑھی۔ آپ کے بعد مولانا محمد جلیل سامرودی اس مسلک کا مرکز بنے۔ مولانا رحمت اللہ لاجپوری نے بھوپال جاکر حسین بن محسن یمانی سے حدیث پڑھی۔

دہلی کے مدارس حدیث

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۰۲۵ھ) سے دہلی میں علم حدیث کا چرچا ہوا۔ ہندوستان کے طلبہ مختلف اطراف سے یہاں آتے اور حدیث کا درس لیتے تھے۔ شیخ سلیمان ابو احمد الکردی یہیں سے پڑھ کر گجرات گئے تھے۔ ان کے بعد دہلی میں دورۂ حدیث کی باقاعدہ شکل مدرسہ رحیمیہ سے شروع ہوئی۔ اس کے مدیر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے والد حضرت شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ اپنے والد سے تکمیل علوم کے بعد ۱۱۴۳ھ میں حجاز پہنچے اور شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم سے حدیث کی سند لی۔

مدرسہ رحیمیہ کی علمی سلطنت بلخ اور بخارا اور مصر و شام تک پہنچی۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۷۶ھ) حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (۱۲۳۹ھ) حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی ۱۸۴۶ء یکے بعد دیگرے اس کے مسند نشین رہے۔

ان مسند نشینوں کے پہلو بہ پہلو جنہوں نے حدیث و تفسیر کی خدمات سر انجام دیں ان میں حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی (۱۲۳۰ھ) حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی (۱۲۳۳ھ) حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی (۱۲۲۵ھ) شاہ اسماعیل شہید (۱۲۴۶ھ) شاہ عبدالغنی مجددی اور مولانا مملوک علی سرفہرست ہیں۔

دہلی میں انگریزی تسلط کے باعث اس مدرسہ پر بھی تاخت و تاراج ہوئی۔ یہاں مولانا نذیر حسین دہلوی صاحب کو مسند نشین بنا دیا گیا۔ مولانا نذیر حسین صاحب کا مسلک حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب کے مسلک سے کچھ مختلف تھا۔ لیکن دور دراز کے طلبہ اس سے واقف نہ تھے۔ وہ پچھلی شہرت کی بنا پر برابر اس مدرسہ کی طرف کھچے آتے رہے۔ مولانا نذیر حسین کے کثرتِ تلامذہ کی وجہ ان کی شخصیت نہیں مدرسہ رحیمیہ کی مرکزی شہرت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے تلامذہ میں ہر مسلک کے لوگ نظر آتے ہیں۔ مولانا نذیر حسین صاحب نے خود بھی حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب سے حدیث پوری نہ پڑھی تھی۔ اطراف سنا کر سند لے لی تھی۔

حکومت اب اس مدرسہ سے کسی درجہ میں خائف نہ تھی۔ بلکہ اس مدرسہ میں جو

فکری نزاع اور فقہی اختلاف راہ پا رہے تھے۔ انگریز حکومت کے لیے حوصلہ افزا تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمان جس قدر فرقوں میں تقسیم ہوں گے اتنا ہی ان کا اقتدار طویل ہو گا۔

مولانا امیر علی بن معظم علی (۱۳۳۷ھ) صاحب مواہب الرحمٰن و عین الہدایہ و مترجم فتاویٰ عالمگیری، مولانا فاروق احمد چڑیا کوٹی مولانا نذیر حسین صاحب کے خاص تلامذہ میں سے ہیں۔ آپ نے ان کتابوں کے ترجمے عربی دان ہونے کی وجہ سے کیے ہیں حنفی ہو کر نہیں۔

حضرت مولانا وحید الزمان (۱۳۳۸ھ) کا ترجمہ شرح وقایہ کتنا مقبول ہے۔ مگر مسلکاً آپ غیر مقلد تھے اور میلان شیعیت کی طرف تھا معلوم نہیں جماعت اہلحدیث انہیں اپنے بزرگوں میں سے کیوں سمجھتی ہے

دہلی کی اس مرکزی درسگاہ میں یہ انقلاب آیا تو حضرت شاہ عبدالغنی مجددی اور مولانا مملوک علی کے تلامذہ دوسرے شہروں کی طرف رُخ کرنے لگے۔ اکابر اب نئے مدارس قائم کرنے کی تلاش میں نکلے۔ یہاں تک کہ دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور، مدرسہ شاہی مراد آباد، مفتاح العلوم مظفر نگر جیسی درسگاہیں قائم ہوئیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دہلی ان کی توجہ کا برابر مرکز رہا۔ دہلی کی مرکزی درسگاہ مدرسہ رحیمیہ گو حکومت کے تسلط میں چلی گئی تھی لیکن ان حضرات نے دہلی کے دوسرے علاقوں میں حدیث کی نئی درسگاہیں قائم کر لیں اور کچھ پچھلی درسگاہوں کو اور آباد کیا اور اس طرح اسی علاقہ کی ذمہ داری پوری طرح سنبھال لی۔ دہلی کے ان مدارس حدیث میں زیادہ مشہور یہ درسگاہیں ہوئیں:۔

۱۔ مدرسہ امینیہ۔ اس مدرسہ کی علمی عظمت کے لیے یہ جاننا کافی ہے کہ مفتی اقلیم ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی سالہا سال اس مدرسہ کے شیخ الحدیث رہے اور دارالعلوم دیوبند کے بعد یہ درسگاہ ہے جو سالہا سال مرجع طلبہ و علماء بنی رہی۔ مولانا انور شاہ صاحب بھی یہاں پڑھاتے رہے ہیں۔

۲۔ مدرسہ جامع مسجد فتح پوری۔ دیوبند کے مشہور محدث مولانا شبیر احمد عثمانی اس مدرسہ کے شیخ الحدیث رہے۔ بعد میں آپ دیوبند اور ڈابھیل تشریف لے گئے۔ مدرسہ مسلک دیوبند کے مطابق تھا۔ مگر جامع مسجد فتح پوری کا نظم ان کے ہاتھ میں نہ تھا۔

۳۔ مدرسہ عبدالرب دہلی۔ ہندوستان کے نامور عالم مولانا عبدالعلی یہیں پڑھاتے تھے۔

یوپی کے مشہور مدارس حدیث ہندوستان کی سب سے بڑی دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند اسی صوبہ میں ہے گولڑہ کے مولانا فیض احمد حضرت پیر مہر علی صاحب کے تذکرہ میں لکھتے ہیں ۔

۱۲۹۰ھ میں ہندوستان تشریف لے گئے ان دنوں وہاں لکھنؤ ۔ دیوبند ۔ رام پور کانپور ۔ علی گڑھ ۔ دہلی اور سہارنپور میں بڑے بڑے علمی مراکز قائم تھے لکھنؤ میں مولانا عبدالحی متوفی ۱۳۰۴ھ مرجع خلائق تھے جن کی ذات محتاج تعارف نہیں دیوبند میں مدرسہ کا افتتاح ۱۲۸۳ میں ہو چکا تھا اور مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی کی سرپرستی میں یہ مدرسہ کافی ترقی کر رہا تھا ان ایام میں وہاں مولوی محمد یعقوب صاحب نانوتوی خلف مولوی مملوک علی صاحب مدرس اعلیٰ تھے جو اجمیر شریف میں بھی مدرس رہ چکے تھے . . . . رام پور میں مولانا فضل حق خیر آبادی کے فرزند مولانا عبدالحق مدرسہ عالیہ نواب صاحب کے پرنسپل تھے [۱]

مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی پہلے اجمیر شریف مدرس اعلیٰ رہے پھر دیوبند ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان دنوں اجمیر شریف اور دیوبند میں کوئی مسلکی بُعد نہ تھا دونوں اہل سنۃ والجماعۃ کی دینی درسگاہیں سمجھی جاتی تھیں مولانا محمد یعقوب صاحب کے دیوبند آنے کے بعد اجمیر میں مولانا معین الدین صاحب صدر مدرس ہوئے یہ وہی بزرگ ہیں جنہوں نے مولانا احمد رضا خاں صاحب کے خلاف تجلیات انوار المعین نامی کتاب لکھی اور ان کے شوق تکفیر کی سخت مخالفت کی ہے ۔

بریلی کا مدرسہ مصباح العلوم ۱۲۸۹ھ میں قائم ہوا اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی نے دیوبند سے آکر اس کا افتتاح کیا مولانا احمد رضا خاں کا مدرسہ اس کے تقریباً نصف صدی بعد بنا اس کا پہلا سالانہ جلسہ ۱۳۲۹ میں ہوا ۔ مظاہر العلوم سہارنپور مدرسہ شاہی مراد آباد اپنے اپنے درس حدیث میں پورے ہندوستان کا مرکز تھے ۔

لکھنؤ کے مشہور مدارس

حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی کی ذات محتاج تعارف نہیں مدرسہ عالیہ فرنگی محل پورے ہندوستان کا علمی مرکز تھا ہندوستان کی عظیم دینی درسگاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھی یہیں

---

[۱] مہر منیر صہ ۷۲

ہے مولانا شبلی اور حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کا مرکز علم یہی ندوہ ہے حضرت مولانا عبدالشکور لکھنوی ؒ کا عظیم علمی مرکز بھی یہیں تھا جس کی عالمی شہرت تھی اور دوسرے ممالک کے علماء بھی یہاں کھچے چلے آتے تھے۔

بنگال کے مدارس حدیث

۱۔ جامعہ امدادیہ کشور گنج۔ حضرت مولانا اطہر علی ؒ خلیفہ حضرت تھانوی ؒ کا قائم کردہ ہے اب اس کے نائب مہتمم مولانا عطاء الرحمٰن خاں ہیں جو بنگلہ دیش کی مدارس عربیہ کی تنظیم وفاق المدارس العربیہ بنگلہ دیش کے ناظم عمومی بھی ہیں۔

۲۔ مدرسہ نوریہ اشرف آباد ڈھاکہ۔ اس کے مہتمم مولانا عظیم الدین ہیں۔

۳۔ جامعہ محمدیہ، محمد پور، ڈھاکہ۔ مہتمم مولانا عزیز الحق اور مفتی اور نائب صدر کے طور پر مولانا منصور الحق کام کر رہے ہیں۔

۴۔ مدرسہ اسلامیہ بدلکرٹ ٹوا کھلی۔ مولانا حبیب اللہ مصباح اس کے مہتمم ہیں۔

۵۔ جامعہ قرآنیہ لال باغ ڈھاکہ۔ قائم کردہ مجاہد اعظم مولانا شمس الحق فریدپوری۔

۶۔ جامعہ کمرنگیر چر (ڈھاکہ) تحریک خلافت کے قائد مولانا محمد اللہ حافظ جی کا قائم کردہ ہے۔

۷۔ جامعہ اشرف العلوم بڑا کٹرہ ڈھاکہ۔

۸۔ دارالعلوم اعزازیہ جسر (حضرت مولانا شاہ ابوالحسن خلیفہ مفتی عزیز الحق صاحب)

۹۔ دارالعلوم اسلامیہ پورشا (راجشاہی)

۱۰۔ دارالعلوم خادم الاسلام گوہرڈانگہ گوپال گنج فرید پور۔ باہتمام مولانا عبدالمنان (قائم کردہ شاہ مولانا عبدالوہاب)

۱۱۔ جامعہ مدنیہ اسلامیہ قاضی بازار سلہٹ، بنگلہ دیش، مولانا حبیب الرحمٰن رئیس جامعہ ہیں۔

۱۲۔ مدرسہ نوریہ اشرف آباد (ڈھاکہ) مولانا عظیم الدین۔

۱۳۔ دارالعلوم معین الاسلام جامعہ اہلیہ ہاٹھزاری صانگام (چٹاگانگ) حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی بھی کچھ عرصہ یہاں صدر مدرس رہے ہیں اس کے سرپرست حضرت تھانوی تھے اب صدر حضرت علامہ احمد شفیع خلیفہ حضرت مدنی ؒ ہیں اسے اس علاقہ کا دیوبند سمجھا جاتا ہے

۱۴۔ الجامعہ الاسلامیہ (ضمیریہ قاسم العلوم) پٹیہ صاتغام قطب الارشاد حضرت مولانا گنگوہی رح کے خلیفہ مولانا ضمیر الدین نے اسے قائم کیا اس کے صدر شیخ المشائخ مولانا محمد یونس ہیں۔

۱۵۔ جامعہ عربیہ اسلامیہ جیری صاتغام۔ زبدۃ الفقہا مفتی نور الحق صاحب جو اس علاقے میں ختم نبوت کا کام بھی کر رہے ہیں اس کے صدر ہیں

۱۶۔ الجامعہ قاسم العلوم چاریہ ہاٹہزاری صاتغام۔ اسے محدث العصر مولانا سعید احمد نے قائم کیا تھا آپ دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے بھی رکن تھے اس مدرسہ کے مہتمم اب آپ کے صاحبزادہ عزیز احمد ہیں۔

۱۷۔ جامعہ عزیز العلوم بابو نگر فنکچاری صاتغام۔ اس کے رئیس زبدۃ العارفین مولانا محمد ہارون تھے

۱۸۔ جامعہ اسلامیہ عبیدیہ ناتوں پور چٹاگانگ عظیم روحانی شخصیت شیخ سلطان احمد اس کے مہتمم ہیں یہ مدرسہ مرجع خواص و عوام رہا ہے۔ اور ہے

۱۹۔ جامعہ اسلامیہ مظاہر العلوم چکتائی صاتغام۔ حضرت تھانوی رح کے متوسلین میں سے مولانا اسمٰعیل اس کے روح رواں ہیں۔

۲۰۔ جامعہ اسلامیہ ناظرہاٹ فنکچری صاتغام (مولانا شاہ نور احمد)

۲۱۔ جامعہ دار السنہ ٹھیلا گکسبازار صاتغام بانی حضرت گنگوہی رح کے خلیفہ زبدۃ العارفین قاری ابراہیم تھے اب مہتمم مولانا منظور احمد ہیں۔

۲۲۔ جامعہ اسلامیہ اوجانی (چاند پور) ۲۳۔ مدرسہ عزیزیہ امداد العلوم راؤجان چاٹگام

۲۴۔ جامعہ نور العلوم فینی نواکھلی ۲۵۔ مدرسہ فیضیہ عیسیٰ پور (مولانا عبدالرحمٰن)

۱۳۔ مدرسہ فریدیہ — حضرت تھانوی رح کے خلیفہ ارشد اس کے بانی تھے۔

پاکستان کے مدارس حدیث

بلوچستان میں

۱۔ جامعہ عربیہ مطلع العلوم (رجسٹرڈ) بروری روڈ کوئٹہ۔

مولانا عرض محمد تلمیذ حدیث حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی و خلیفہ مجاز شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری اس کے بانی ہیں آپ کی وفات (۱۹۷۱) کے بعد مولانا عبدالواحد اس کے مہتمم ہوئے ۱۹۴۰ سے یہاں دورہ حدیث ہو رہا ہے حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری کے شاگرد مولانا محمد سعید شیخ الحدیث ہیں مدرسہ وفاق سے ملحق ہے

۲۔ مدرسہ مظہر العلوم شالدرہ کوئٹہ

۱۹۴۳ میں قائم ہوا مولانا عبدالغفور صاحب شاگرد حضرت مدنی رح اس کے بانی مہتمم اور پہلے شیخ الحدیث ہیں اب مولانا عبداللہ اجمیری شیخ الحدیث کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں

۳۔ مدرسہ مفتاح العلوم سٹیلائیٹ کوئٹہ شہر۔

وفاق سے ملحق ہے۔ مولانا عبدالباقی اس کے مہتمم اور شیخ الحدیث ہیں۔

۴۔ جامعہ رحیمیہ کوئٹہ

حاجی محمد رحیم رئیس اعظم کوئٹہ اس کے بانی ہیں مطلع العلوم کے پرانے فاضل مولانا عبدالستار شاہ اس کے مہتمم اور شیخ الحدیث کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

۵۔ مدرسہ تجوید القرآن کوئٹہ

قاری غلام نبی اس کے بانی ہیں حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی نے اس کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اب حضرت مدنی رح کے شاگرد قاری مہر اللہ اس کے مہتمم ہیں اب یہاں حدیث کا درس بھی شروع کر دیا گیا ہے قاضی عبدالقادر صاحب شیخ الحدیث ہیں۔

۶۔ مدرسہ بحر العلوم مَنَہ (زیارت)

اس کے بانی مولانا جان محمد ہیں اور شیخ الحدیث ——— ہیں

۷۔ جامعہ انوار العلوم کوّاس (زیارت)

اس کے بانی مولانا نیاز محمد فاضل قاسم العلوم ملتان ہیں۔ ۱۹۷۰ سے دورہ حدیث

شروع ہے آپ ہی اس کے مہتمم اور شیخ الحدیث ہیں۔ وفاق سے ملحق ہے جامعہ کے بورڈ پر لکھا ہے یادگار حضرت شیخ لاہوری رح

۸ ـــ دار العلوم الاسلامیہ (لورالائی) اس علاقے کی یہ مرکزی درسگاہ ہے۔

۹ ـــ مدرسہ مفتاح العلوم پنجگور (مکران)
حضرت مولانا حسین احمد مدنی رح کے تلمیذ خاص مولانا رحمت اللہ اس کے بانی مہتمم اور شیخ الحدیث ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی مدارس بلوچستان میں دین کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔

سندھ میں

۱ ـــ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی ۵
محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری شارح ترمذی شریف نے اسے قائم کیا آپ اس کے پہلے شیخ الحدیث ہیں آپ کے بعد حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب اس کے شیخ الحدیث مقرر ہوئے اور حضرت مولانا مفتی احمد الرحمن صاحب (جو حضرت مولانا عبد الرحمن صاحب کیمل پوری سابق صدر مدرس مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے صاحبزادے ہیں) اس کے مہتمم مقرر ہوئے نائب مہتمم ڈاکٹر حبیب اللہ مختار ہیں جو امام ترمذی کے موضوع خاص وفی الباب پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ محدث شہیر حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی شاگرد خاص حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری بھی یہاں کے مشہور استاد حدیث ہیں۔ جو تیس سال سے یہاں کام کر رہے ہیں۔

۲ ـــ دار العلوم کراچی
فقیہ العصر مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع مؤلف تفسیر معارف القرآن اس کے بانی ہیں حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی سالہا سال یہاں شیخ الحدیث رہے حضرت مرحوم کے صاحبزادگان مفتی محمد رفیع عثمانی اور جسٹس مولانا تقی عثمانی کی علمی شخصیات اور مساعی جمیلہ سے دار العلوم بہت ترقی پر ہے شیخ الحدیث حضرت مولانا سبحان محمود حدیث میں ممتاز علمی شہرت رکھتے ہیں۔ دار العلوم کی وسیع لائبریری ہے مستقل دار التالیف ہے ماہنامہ البلاغ اس کا علمی آرگن ہے

۳ــ جامعہ فاروقیہ کراچی

شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب وفاق المدارس العربیہ جو حضرت مولانا مسیح اللہ خاں خلیفہ ارشد حکیم الامۃ حضرت مولانا تھانوی کے زیر اہتمام ــ منظر نگر میں سالہا سال درس حدیث دیتے رہے ہیں اس کے مہتمم اور شیخ الحدیث ہیں۔ جامعہ کی عظمت اور خدمت کے لیے حضرت کا نام نامی کافی ضمانت ہے مدرسہ نہایت عالی شان دار الاقامہ عظیم جامع مسجد اور اعلیٰ دفتری نظام سے ممتاز ہے

۴ــ انوار القرآن آدم ٹاؤن نارتھ کراچی

حافظ الحدیث حضرت مولانا عبد اللہ درخواستی نے اسے ۱۹۷۵ء میں قائم کیا مولانا فدا الرحمٰن درخواستی اس کے مہتمم ہیں مولانا انیس الرحمٰن درخواستی اس کے پہلے استاد حدیث ہیں اب دورہ حدیث بھی شروع کر دیا گیا ہے۔

۵ــ انوار العلوم کراچی

مولانا محمد زکریا فاضل دیوبند ممبر سندھ صوبائی اسمبلی اس کے مہتمم ہیں مدرسہ کی عظیم جامع مسجد وسیع عمارات عمدہ نظام تعلیم اور طلبہ کی کثرت سے پورے سندھ میں مشہور ہے۔

۶ــ مدرسہ مفتاح العلوم حیدر آباد

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الرؤف سندھ کی مشہور علمی شخصیت اس کی روح رواں ہیں۔ حضرت مولانا عبد الحق ناظم اعلیٰ ہیں۔ یہ مدرسہ پورے حیدر آباد کا علمی مرکز سمجھا جاتا ہے۔

سرحد میں

۱ــ جامعہ امداد العلوم پشاور۔ حضرت مولانا فقیر محمد خلیفہ حضرت تھانوی کے صاحبزادے مولانا عبد الرحمٰن اس کے مہتمم ہیں حضرت مولانا فقیر محمد صاحب کی روحانی سرپرستی میں یہ مدرسہ بہت کام کر رہا ہے۔

۲ــ دار العلوم سرحد مولانا محمد ایوب بنوری اس کے مہتمم اور شیخ الحدیث ہیں۔ سرحد کا مرکزی مدرسہ ہے

۳ــ جامعہ اشرفیہ پشاور مولانا محمد یوسف قریشی اس کے مہتمم ہیں حضرت مولانا عبد الرحمٰن (لاہور) اسکے سرپرست ہیں۔

۴ــ مدرسہ ہادیہ نوبہار کالونی پشاور میں ہے۔

۵ــ دار العلوم نعمانیہ ڈیرہ اسماعیل خاں مولانا علاء الدین اس کے مہتمم اور شیخ الحدیث مولانا احمد حسین ہیں۔

۶ــــ دارالعلوم نجم المدارس کلاچی (ڈیرہ) پاکستان کی مشہور علمی شخصیت مولانا قاضی عبدالکریم اس کے مہتمم ہیں ۔ قاضی عبداللطیف ممبر پاکستان سینٹ آپکے بھائی ہیں ۔

۷ــــ معراج العلوم بنوں حضرت مولانا صدرالشہید سابق ممبر قومی اسمبلی پاکستان اس کے شیخ الحدیث اور مہتمم ہیں ۔

۸ــــ دارالعلوم الاسلامیہ لکی مروت مولانا فضل اللہ امیر تنظیم اہل سنت صوبہ سرحد اس کے مہتمم ہیں

۹ــــ دارالعلوم شیر گڑھ ضلع مردان ۔ ۱۰ــــ دارالعلوم رستم ضلع مردان ۱۱ــــ مدرسہ تحفظ القرآن مردان

۱۲ــــ دارالعلوم الاسلامیہ اضاخیل تحصیل نوشہرہ (مہتمم مولانا ثناء اللہ) مشکوۃ تک حدیث کی تعلیم ہے

۱۳ جامعہ الاسلامیہ اکوڑہ خٹک مولانا بادشاہ گل اس کے بانی ہیں ان کے صاحبزادے مولانا گوہر علی شاہ آج کل اس کے مہتمم ہیں ۔

۱۴ــــ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک یہ صوبہ سرحد کا بڑا دینی مدرسہ ہے اس کے شیخ الحدیث شارح ترمذی شریف حضرت مولانا عبدالحق سابق استاد حدیث دارالعلوم دیوبند ہیں آپ پاکستان کی قومی اسمبلی کے ممبر بھی ہیں آپ کے صاحبزادے مولانا سمیع الحق مدرسہ کے ماہانہ آرگن الحق کے مدیر اعلیٰ ہیں ۔

۱۵ــــ جامعہ اشاعۃ القرآن حضرو مولانا محمد صابر مولانا عبدالسلام اور مولانا محمد امتیاز اس کے ممتاز اساتذہ حدیث ہیں مہتمم مولانا سکندر خاں ہیں ۔ یہاں کا دورہ حدیث پورے علاقے میں مشہور ہے ۔

۱۶ــــ مدرسہ تعلیم القرآن کوہاٹ حضرت مولانا نعمت اللہ شاگرد شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی اس کے شیخ الحدیث ہیں

۱۷ــــ جامعہ مدنیہ اٹک قاضی محمد زاہد الحسینی خلیفہ شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری اس کے مہتمم ہیں

۱۸ــــ مدرسہ مظہر العلوم سوات مہتمم مولانا فضل احمد کے اہتمام میں یہ اس علاقے کا علمی مرکز ہے

۱۹ــــ مدرسہ اسلامیہ رحمانیہ (ہیبودی) حضرت مولانا عبدالرحمٰن کیمبلپوری سابق صدر مدرس مظاہر العلوم سہارنپور کی یاد میں یہ مدرسہ قائم ہے ۔

۲۰ــــ دارالعلوم نصیریہ (غورغشتی) یہ مدرسہ شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیر الدین صاحب خلیفہ حضرت مولانا حسین علی کی یاد میں سالہا سال سے حدیث کی خدمت سرانجام دے رہا ہے

۲۱ مدرسہ عربیہ سراج العلوم جوڑی (ہزارہ) مولانا سید غلام نبی شاہ صاحب اسکے مہتمم اور صدر مدرس ہیں

۲۲۔ مدرسہ معارف القرآن جامع مسجد مانسہرہ شیخ الہند کے شاگرد اور کارکن خلافت مولانا محمد اسحاق کا قائم کردہ ہے ان دنوں مہتمم مولانا عبداللہ خالد سرپرست مجلس ختم نبوت ہیں

۲۳ مدرسہ قاسم العلوم مانسہرہ (مہتمم مفتی داؤد) ۲۳ جامعہ حسینیہ شنکیاری (مولانا نواب حسین شاہ)

۲۴ دارالعلوم شہیدیہ بالاکوٹ (قاضی خلیل احمد) ۲۵ جامعہ اسمعیل شہید بستی سریش (مولانا محمود الحسن)

۲۶ مدرسہ احسن المدارس سکندرپور تحصیل ہری پور ۲۷ مدرسہ لوہی گھاٹ ضلع اٹک (مولانا عبدالحی)

۲۸ مدرسہ انوار الاسلام کہال ایبٹ آباد (مولانا شفیق الرحمٰن)

۲۹ مدرسہ بستی ولولہ ضلع ایبٹ آباد (قاضی محمد صادق) ۳۰ مدرسہ معہد القرار مانسہرہ (قاضی فضل ربی صاحب)

۳۱ مدرسہ عربیہ نواں شہر ایبٹ آباد (قاضی محمد نواز) ۳۲ مدرسہ حاجی خونا گل مینگورہ ضلع سوات

سرحد میں اور بھی کئی مدارس ہیں جہاں حدیث پڑھائی جاتی ہے

کشمیر میں

۱۔ جامعہ اسلامیہ راولاکوٹ مولانا عبدالعزیز فاضل دیوبند خطیب جامع مسجد اس کے مہتمم ہیں

۲۔ دارالعلوم تعلیم القرآن پلندری ــــ شیخ الہند کے شاگرد مولانا غلام حیدر اس کے بانی تھے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یوسف فاضل دیوبند ہیں جو منگ (پلندری سے ۵ میل شمال) کے ہیں

۳۔ جامعہ العلوم الاسلامیہ ایف ۲ میرپور انگلینڈ کے الحاج محمد بوستان اسکے بانی اور مہتمم ہیں۔

۴۔ مدرسہ عربیہ چناری خطیب الاسلام مولانا محمد الیاس اسکے صدر مدرس اور مہتمم ہیں

۵۔ مدرسہ تعلیم القرآن باغ مولانا امین الحق اس کے مہتمم ہیں۔ بانی مولانا محمد عبداللہ تھے۔

۶۔ مدرسہ انوار العلوم دھیرکوٹ مولانا عبدالحی اس کے مہتمم ہیں۔

۷۔ مدرسہ فاروقیہ جامع مسجد عمر کھڑک راولاکوٹ حاجی محمد ابراہیم خاں اس کے بانی اور مولانا محمد سعید مہتمم ہیں۔

جامعہ صدیقیہ کلیال میرپور مولانا عبدالغفور صاحب اس کے مہتمم ہیں خطیب حضرت مولانا عبدالشکور ہیں

پنجاب میں

پنجاب میں تینوں مسالک کے اپنے مدارس ہیں (۱) مسلک اہل سنت والجماعت دیوبند۔ (۲) مسلک جماعت اہل حدیث (غیر مقلدین) اور مسلک بریلوی کچھ مدارس جماعت اسلامی کے ہیں خانقاہی مدارس جیسے تونسہ شریف اور گولڑہ شریف کے مدارس ان کے علاوہ ہیں انکی اپنی انفرادیت ہے

مسلک اہل سنت دیوبند

۱۔ جامعہ قاسم العلوم فقیر والی ضلع بہاولنگر ۔ قائم شدہ ۱۹۲۷ء

جامع شریعت و طریقت مولانا فضل محمد صاحب تلمیذ رشید شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی نے ۱۵۔ اگست ۱۹۲۷ء میں اسکی بنیاد رکھی آپ حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے بیعت تھے اور آپ نے زیادہ تر تعلیم خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں پائی نصف صدی تک آپ اسی مدرسہ کے مہتمم رہے مندرجہ ذیل علماء اعلام نے اس درسگاہ کو تدریس کا شرف بخشا ہے۔

۱۔ حضرت مولانا عبدالکریم گمتھلوی خلیفہ ارشد حضرت تھانویؒ والد گرامی مفتی عبدالشکور صاحب ترمذی ساہیوال ضلع سرگودھا۔

۲۔ حضرت مولانا فاروق احمد برادر زادہ عمدۃ المحدثین حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ

۳۔ حضرت مولانا عبدالقدیر محدث کیمبلپوری تلمیذ رئیس المحدثین حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیریؒ۔

۴۔ حضرت مولانا مفتی فقیر اللہ رائپوری تلمیذ رشید حضرت شیخ الہند وہم سبق شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

۵۔ حضرت مولانا محمد نعیم دیوبندی صاحب کمالین علی الجلالین۔

۶۔ شیخ الحدیث مولانا عبداللہ رائپوری خلیفہ ارشد حضرت شاہ عبدالقادر رائپوری و حضرت شیخ الحدیثؒ

نوٹ ۔ مدرسہ ہذا ۸۴ کنال رقبے پر مشتمل ہے مہتمم صاحبزادہ مولانا محمد قاسم اور شیخ الحدیث مولانا بشیر احمد قادری نعمانی ہیں مدرسہ میں امام ابوحنیفہ اکیڈمی بھی قائم ہے مدرسہ اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ دارالافتاء کا قلم عرصہ چالیس سال سے مولانا عبداللطیف فاضل دیوبند کے ہاتھ میں ہے۔

جامع العلوم بہاولنگر اس علاقے کا دوسرا مرکزی مدرسہ ہے علاقہ چین کے حضرت مولانا نیاز احمد فاضل دیوبند سالہاسال سے یہاں دورہ حدیث پڑھا رہے ہیں۔

۲۔ جامعہ رشیدیہ ساہیوال۔

پہلے رائپور (ضلع جالندھر) میں ۱۹۰۰ میں قائم ہوا پھر منٹگمری میں ۱۹۴۸ء میں اس کی نشاۃ جدیدہ ہوئی حضرت شاہ عبدالرحیم رائپوری نے اس کا سنگ بنیاد رکھا اور حضرت گنگوہیؒ کی نسبت سے یہ رشیدیہ سے موسوم ہوا حضرت گنگوہیؒ کے خلیفہ حافظ محمد صالح غالباً اس کے پہلے مہتمم اور حضرت شیخ الہندؒ کے تلمیذ خاص حضرت مفتی فقیر اللہ صاحب رائپوری اس کے صدر مدرس تھے

حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب بھی اس میں پڑھاتے رہے ہیں پاکستان بننے پر مولانا حبیب اللہ شاگرد خاص حضرت مولانا حسین احمد مدنی رح نے اسے شروع کیا اور آپ کی نظامت میں مدرسہ بہت جلد ملک کا مرکزی ادارہ بن گیا شیخ الحدیث مولانا عبداللہ رائپوری رح کی شخصیت کی کشش ہے کہ مرکز تبلیغ رائے ونڈ کے طلبہ دورہ حدیث کے لیے یہاں آتے ہیں دوسرے مشہور اساتذہ میں حضرت علامہ غلام رسول کا نام نامی سرفہرست ہے پاکستان کے دیگر سب مدارس تاریخی حیثیت سے اس کے بعد کے بعد کے ہیں اس پہلو سے اسے ام المدارس العربیہ پاکستان کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

۳ ۔ جامعہ اشرفیہ لاہور۔

مخدوم العلماء حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب خلیفہ ارشد حضرت حکیم الامت نے امرتسر سے لاہور آنے پر اس جامعہ کی بنا رکھی امرتسر میں آپ مدرسہ نعمانیہ کے صدر مدرس تھے لاہور آنے پر آپ نے نیلا گنبد کی ایک متروکہ عمارت میں جامعہ کا آغاز کیا جامعہ نے بہت جلدی ترقی کی اور اب یہ پاکستان کی عظیم دینی درسگاہ مسلم پارک میں ایکڑ زمین میں نہایت خوبصورت منظر اور انتہائی دلکشا فضا اور بلند شان عمارات میں قائم ہے اسے پاکستان کا دیوبند کہنا بے جا نہ ہوگا۔ دارالعلوم کے مشہور اساتذہ جامع منقول و معقول استاذ المحدثین حضرت مولانا رسول خاں، شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی سابق مفتی اعظم واستاذ الحدیث مظاہر العلوم سہارنپور مولانا سید فیض علی شاہ سابق مدرس دارالعلوم دیوبند، اس میں سالہا سال درس حدیث دیتے رہے ہیں ان دنوں مولانا محمد مالک کاندھلوی، حضرت مولانا محمد سرور صاحب خلیفہ ارشد حضرت مفتی محمد حسن صاحب امرتسری محدث جلیل حضرت مولانا محمد موسیٰ بازی اور شیخ التفسیر والحدیث مولانا عبدالرحمٰن زینت آرا مسند حدیث ہیں حضرت مفتی صاحب رح کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا عبید اللہ صاحب اس کے مہتمم ہیں ۔ جامعہ نیلا گنبد شاخ کا اہتمام مولانا حافظ فضل رحیم تلمیذ رشید حضرت مولانا شمس الحق افغانی رح کے ہاتھ میں ہے طالبات کے مدرسہ فضیل کے بھی آپ ہی مہتمم ہیں ۔ جامعہ کا ماہانہ آرگن الحسن ہے ۔

۴ ۔ جامعہ خیر المدارس ملتان

محدث پنجاب حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رح نے ۹ مارچ ۱۹۳۱ میں جالندھر میں اس کی

بنیاد رکھی خیر المدارس کو حضرت مولانا انور شاہ کشمیری اور حکیم الامت حضرت تھانوی رح کی تاحیات سرپرستی حاصل رہی تقسیم ملک کے بعد حضرت مولانا جالندھری نے ۸ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ملتان میں اس کی نشاۃ ثانیہ کا سنگ بنیاد رکھا اور جامعہ اپنی تعلیمی خصوصیات کے باعث بہت جلد پاکستان کا دار العلوم دیوبند بن گیا ملک کی مشہور تنظیم وفاق المدارس العربیہ کی بنیاد یہیں ڈالی گئی اور حضرت مولانا خیر محمد صاحب تاحیات اس کے صدر رہے اب تک وفاق کا دفتر بھی یہیں چلا آتا ہے۔

اکابر اساتذہ حدیث میں حضرت مولانا عبد الرحمن کیمبلپوری سابق صدر مدرس مظاہر العلوم سہارنپور محدث العصر علامہ محمد شریف کشمیری، شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد اللہ رائیپوری، شیخ الحدیث حضرت مولانا فیض احمد صاحب، شیخ الحدیث حضرت مولانا جلال الدین صاحب، شیخ الحدیث حضرت مولانا نذیر احمد، حضرت مولانا مفتی عبد الستار صاحب حضرت مولانا مفتی عبد اللہ صاحب ملتانی حضرت مولانا محمد صدیق صاحب حضرت مولانا منظور احمد صاحب کے اسماء گرامی سرفہرست ہیں۔

حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا محمد شریف جالندھری اس کے مہتمم ہوئے۔ جامعہ کی خدمات سرانجام دینے کے بعد آپ نے کو مکہ مکرمہ میں وصال فرمایا اور جنت المعلیٰ میں دفن ہوئے ان کے بعد مجلس شوریٰ نے جامعہ خیر المدارس ملتان کا اہتمام ان کے بیٹے مولانا محمد حنیف جالندھری کے سپرد کیا آپ نے باوجود کمسنی کے جامعہ کی ذمہ داریاں اس طرح ادا کیں کہ چند سالوں میں اسے خدمت و شہرت کے آسمان پر پہنچا دیا مدرسہ کا ماہانہ آرگن الخیر اس دور ترقی کی ایک منہ بولتی تصویر ہے۔ رسالہ کا وقار مولانا محمد ازھر کے عزم اور قلم سے قائم ہے۔ مدرسہ کے کئی ذیلی مدارس بھی ہیں جن میں مدرسۃ البنات سرفہرست ہے۔

۵۔ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

پاکستان کی مرکزی دینی درسگاہ ہے شیخ الحدیث حضرت مولانا صوفی عبد الحمید صاحب سواتی اسکے مہتمم ہیں اس شہر کی تاریخی خصوصیات میں سے ہے کہ شیخ الہند رح کے مشہور شاگرد محدث پنجاب حضرت مولانا عبد العزیز کا مسکن رہا ہے مولانا قاضی شمس الدین صاحب بھی یہاں حدیث پڑھاتے رہے ہیں ان دنوں شیخ الحدیث محدث جلیل حضرت مولانا سرفراز احمد صاحب ہیں جن کی خدمات تالیف تدریس اور تبلیغ حق عالمی سطح کی ہیں شعبان اور رمضان میں یہاں دورۂ تفسیر بھی ہوتا ہے

ہے مولانا سرفراز احمد صاحب حضرت مولانا حسین علی صاحب رح کے طرز پر تفسیر پڑھاتے ہیں دیگر ممتاز اساتذہ میں مولانا عبدالقیوم صاحب مفتی محمد عیسیٰ اور مولانا حبیب اللہ زیادہ معروف ہیں

۶۔ جامعہ قاسم العلوم ملتان۔

یہ مدرسہ ملتان کا قدیمی مدرسہ ہے قیام پاکستان سے کئی سال پہلے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی مرحوم نے اس کی بنیاد رکھی دارالعلوم دیوبند کے ممتاز استاذ حدیث مولانا عبدالخالق اس کے پہلے شیخ الحدیث تھے شیخ التفسیر مولانا مفتی محمد شفیع تھے جو ملتان کی بلند پایہ علمی شخصیت تھے پھر حضرت مولانا مفتی محمود اس کے شیخ الحدیث اور مفتی رہے ہیں یہ شیخ الحدیث مولانا عبدالقادر صاحب قاسمی بھی یہاں دورہ حدیث کی کتابیں پڑھاتے رہے ہیں آج کل اس کے شیخ الحدیث حضرت مولانا فیض احمد صاحب (مالک مکتبہ امدادیہ) ہیں۔

۷۔ جامعہ امدادیہ فیصل آباد۔

محدث پنجاب حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رح کے شاگرد خاص اور حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحی صاحب (کراچی) کے خلیفہ مجاز شیخ الحدیث مولانا نذیر احمد صاحب اس کے بانی اور مہتمم ہیں یہاں کا دورہ حدیث پاکستان میں شہرت رکھتا ہے یہ جامعہ تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبہ کی تربیت میں خاص طور پر ممتاز ہے فیصل آباد بابر چوک کے قریب حبیب شہید کالونی میں یہ جامعہ وسیع عمارات کی دلکشا فضا میں قائم ہے۔

۸۔ سراج العلوم سرگودھا۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کے مایہ ناز شاگرد مولانا مفتی محمد شفیع اس کے بانی تھے جامع معقول ومنقول شیخ الاسلام حضرت مولانا شمس الحق افغانی حضرت مولانا خدا بخش بھیروی (سابق استاذ حدیث مدرسہ امینیہ دہلی)، محدث جلیل مولانا محمد نور صاحب شیخ التفسیر حضرت مولانا صالح محمد، سابق خطیب شاہی مسجد چنیوٹ اور کئی دیگر نامور اساتذہ حدیث یہاں درس حدیث دیتے رہے ہیں آج کل شیخ الحدیث جامع معقول ومنقول حضرت مولانا احمد سعید ہیں مولانا قاری عبدالسمیع بھی یہیں استاذ حدیث ہیں یہ مدرسہ خانقاہ سراجیہ کندیاں کی سرپرستی میں چل رہا ہے حضرت مفتی صاحب مرحوم بھی مرکز رشد وہدایت کندیاں کے خلیفہ مجاز تھے۔

۹۔ مخزن العلوم خانپور

اس مدرسہ کے تعارف کے لیے حافظ الحدیث حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی کا نام نامی اور اسم گرامی کافی ہے آپ نصف صدی سے یہاں قال اللہ اور قال الرسول کی صدائیں بلند کر رہے ہیں یہاں کا دورہ تفسیر ملکی شہرت کا حامل رہا ہے پورے ملک سے طلبا اور علماء یہاں کھچے چلے آتے تھے حضرت نے جب دورہ پڑھانا چھوڑ دیا تو حضرت مولانا شفیق الرحمن درخواستی اور مفتی حبیب الرحمن صاحب درخواستی اور حضرت مولانا محمد منظور نعمانی جیسے ممتاز اساتذہ یہاں دورہ پڑھاتے ہیں

۱۰۔ دارالعلوم کبیر والہ ضلع خانیوال۔

عمدۃ المحدثین حضرت مولانا عبدالخالق اس کے بانی مہتمم اور شیخ الحدیث تھے ملتان سے آکر آپ نے اس عظیم درسگاہ کی بنیاد رکھی آج کل شیخ الحدیث حضرت مولانا علی محمد صاحب ہیں دوسرے ممتاز اساتذہ حدیث جامع معقول و منقول حضرت مولانا منظور الحق صاحب شیخ تفسیر مولانا ظہور احمد برادر زادہ حضرۃ شیخ الحدیث اور مولانا عبدالمجید صاحب (حال شیخ الحدیث کروڑ پکا) معروف شخصیتیں ہیں

۱۱۔ جامعہ حنفیہ جہلم

مولانا عبداللطیف صاحب تلمیذ حضرت مولانا حسین احمد مدنی ؒ وخلیفہ مجاز حضرت شیخ التفسیر لاہوری ؒ نے نصف صدی پہلے یہ مدرسہ جامع مسجد گنبد والی شہر جہلم میں قائم کیا تھا اب یہ مدرسہ اپنی مستقل شاندار عمارات کے ساتھ مدنی محلہ میں قائم ہے

۱۲۔ جامعہ اسلامیہ صدر راولپنڈی

۱۹۶۰ء میں قائم ہوا مہتمم مولانا قاری سعید الرحمن محدث العصر حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب کیملپوری سابق صدر مدرس مظاہر العلوم سہارنپور) کے صاحبزادے ہیں مولانا سراج الحق اس کے شیخ الحدیث ہیں۔

۱۳۔ انوار العلوم محلہ امام باڑہ راولپنڈی

مولانا محمد اسحاق مانسہروی کا قائم کردہ ہے مولانا سید چراغ الدین شاہ اس کے مہتمم ہیں۔ شاہ صاحب نے مستقل نئی عمارات میں جامعہ سراجیہ کے نام سے دورہ حدیث شروع کرا رکھا ہے

۱۴۔ دارالعلوم تعلیم القرآن راجہ بازار راولپنڈی مولانا غلام اللہ خاں اس کے مہتمم ہیں محدث العصر حضرت مولانا عبدالقدیر تلمیذ خاص رئیس المحدثین حضرت مولانا انور شاہ کشمیری ؒ شیخ الحدیث ہیں

۱۵ - جامعہ عربیہ فریدیہ اسلام آباد مرکزی جامع مسجد اسلام آباد محلہ آب پارہ کے خطیب مولانا محمد عبداللہ اس کے مہتمم ہیں ۱۳۰۵ھ میں یہ مدرسہ قائم ہوا مشکوٰۃ تک یہاں درس حدیث ہو رہا ہے

۱۶ - جامعہ عربیہ چنیوٹ - مولانا منظور احمد چنیوٹی اس کے مہتمم ہیں مشکوٰۃ تک یہاں درس حدیث ہو رہا ہے

۱۷ - مدرسۃ العلوم الشرعیہ جھنگ حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور حضرت مولانا عبدالشکور لکھنوی کے نامور شاگرد مولانا سید صادق حسین شاہ ، یہاں حدیث پڑھاتے ہیں ۔ یہ جھنگ کا مرکزی مدرسہ ہے ۔

۱۸ - جامعہ فاروقیہ شیخوپورہ مولانا محمد عالم بالاکوٹی فاضل جامعہ اشرفیہ لاہور اس کے مہتمم ہیں

۱۹ - مدرسہ اشرفیہ چوک سرور شہید ضلع مظفرگڑھ ۔ مولانا عبدالمجید شیخ الحدیث ہیں ۔

۲۰ - مدرسۃ العلوم الشرعیہ ساہیوال مولانا مقبول احمد خطیب جامع مسجد بلاک ۱۴ اس کے مہتمم ہیں

۲۱ - جامعہ مدنیہ ڈسکہ ضلع سیالکوٹ کی مرکزی درسگاہ ہے مولانا محمد فیروز خاں فاضل دیوبند اس کے مہتمم ہیں

جماعت اہلحدیث

۱ - جامعہ سلفیہ فیصل آباد - مولانا محمد عبدہٗ مترجم المفردات علامہ راغب اس کے شیخ الحدیث ہیں

۲ - دارالعلوم تقویۃ الاسلام لاہور غزنوی حضرات کی تعلیمی یادگار ہے مولانا محمد اسحاق شیخ الحدیث ہیں

۳ - مدرسہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن ضلع فیصل آباد ۔ صوفی محمد عبداللہ اس کے بانی ہے حافظ بنیامین اس کے شیخ ہیں

۴ جامعہ محمدیہ اوکاڑہ لکھوی حضرات کی مرکزی درسگاہ ہے مولانا عبدالحلیم علوی اسکے مہتمم ہیں

۵ - جامعہ اسلامیہ گوجرانوالہ مولانا حافظ محمد گوندلوی کی علمی یادگار ہے مولانا ابوالبرکات احمد مدارسی شیخ الحدیث ہیں

۶ - جامعہ ابی بکر کراچی فرقہ امامیہ کے مولانا عبدالستار دہلوی کا مرکزی ادارہ ہے مولانا محمد صادق شیخ الحدیث ہیں ۔

مسلک بریلوی

۱ - دارالعلوم حزب الاحناف لاہور مولانا دیدار علی شاہ مولانا ابوالحسنات اور مولانا ابوالبرکات کی مرکزی یادگار رہ گیا ہے

۲ - جامعہ نعیمیہ گڑھی شاہو لاہور ۔ مولانا نعیم الدین مرادآبادی کی یاد میں بنا ہے مفتی محمد حسین نعیمی شیخ الحدیث ہیں ۔

۳ - دارالعلوم امجدیہ کراچی ۔ مولانا امجد علی خلیفہ خاص مولانا احمد رضا خاں کے نام پر بنا ہے ۔

۴ - جامعہ نظامیہ اندرون لوہاری دروازہ لاہور ۔ مفتی عبدالقیوم ہزاروی اسکے مہتمم ہیں ۔

۵ - جامعہ رضویہ مظہر الاسلام فیصل آباد ، مولانا سردار احمد گورداسپوری کا قائم کردہ ہے ۔

۶ - انوار العلوم ملتان ۔ مولانا احمد سعید کاظمی امروہوی اس کے مہتمم ہیں

یہ بطور نمونہ چند مدارس کے نام ہیں۔ پاکستان ہندوستان بنگلہ دیش اور برما میں سب سے زیادہ عربی مدارس مسلک اہل سنت دیوبند کے ہیں علماء وطلبہ کی زیادہ تعداد انہی میں ہے سوادِ علم کے معنی یہی ہوں تو سوادِ اعظم یہی لوگ ہیں گو کم سواد اسے نہیں سمجھتے خانقاہی مدارس اس کے علاوہ ہیں جیسے تونسہ اور گولڑہ کے مدارس۔ یہ اپنے مسلک اور مزاج میں دیوبندی بریلوی نزاع سے بالا ہیں پھر ہر مسلک کے اور بھی کئی مدارس ہیں۔ جن کے نام ہم یہاں نہیں دے سکے اہل مدارس دارالمعارف کو اپنے کوائف سے مطلع فرمائیں تو اگلے ایڈیشن میں اس کمی کو پورا کیا جاسکتا ہے یہ چند نام صرف برائے تعارف تھے جہاں حدیث کی کسی درجے میں خدمت ہو رہی ہے ——— وللہ الحمد اولاً وآخراً وظاھراً وباطناً

تم الجلد الثانی ویتلوہ الجلد الثالث ان شاء اللہ واوّل بابہ اختلاف الحدیث

الاعتذار والاعتراف

آثار الحدیث کے یہ تیس مضامین حضرت علامہ خالد محمود صاحب کے مسودات میں پراگندہ پڑے تھے کہ راقم الحروف نے انہیں یکجا کرنے اور مرتب کرنے کا بیڑہ اٹھایا جو حصے نامکمل ملے انہیں آپ سے مزید لکھوایا اور انہیں کتابی شکل میں لانے کی سعی کی۔ الحمد للہ کہ یہ دوسری جلد اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔

ہوسکتا ہے کہ کسی مقام پر کچھ حوالے درج کرنے سے رہ گئے ہوں یا کچھ مؤلفین کے سِنین ساتھ نہ دیئے جاسکے قارئین کرام سے معذرت خواہ ہوں کہ جلدی طباعت کے باعث مجھ سے تالیف و ترتیب کا حق ادا نہیں ہوسکا اگر کسی جگہ کوئی کوتاہی پائیں تو اسے مرتب کی جلدی یا قصورِ مطالعہ پر محمول کریں علامہ صاحب اپنی جگہ ہر مضمون کی صحیح نشاندہی کرتے ہیں۔ محمد اقبال عفا اللہ عنہ